اردو نعت کی شعری روایت

• تعریف • تاریخ • رجحانات • تقاضے

صبیح رحمانی

سیّد صبیح الدین رحمانی ایک مدت مدید سے ''نعت رنگ'' کو سنوارنے، نکھارنے اور اُردو شاعری کا جلی عنوان بنانے میں منہمک چلے آ رہے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ مقالات میں انھوں نے اُردو دنیا کے سرکردہ نقادوں اور باکمال شاعروں کے نعت گوئی کی تفہیم و تحسین میں لکھے گئے مضامین کو یکجا کر دیا ہے۔ یوں اس کتاب میں نعت کی تعریف اور تاریخ سے لے کر اُردو شاعری میں نعت کے جدید اور جدید ترین رجحانات تک مختلف و متنوع موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔

ان گراں قدر مقالات سے استفادہ کرتے وقت مجھے رہ رہ کر علامہ اقبال یاد آتے رہے ہیں جن کی تفسیر و تعبیرِ دین کا سب سے بڑا سرچشمہ آنحضورﷺ کا اُسوۂ حسنہ ہے۔ یہ اسی تعبیرِ اسلام کا فیضان ہے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران جب بیشتر علمائے دین متحدہ ہندوستانی قومیت کی تبلیغ میں مصروف تھے، علامہ اقبال نے:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبیست!

کی صدائے حق بلند کر کے مسلمان عوام کو جداگانہ مسلمان قومیت کے پرچم تلے جمع کر دیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات کے اسی فیضان سے پاکستان کا تصور اسلامیانِ ہند کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو کر رہ گیا اور یوں پاکستان کا تصور پاکستان کی حقیقت بن گیا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو سیّد صبیح الدین رحمانی بیک وقت ہماری روحانی اور سیاسی زندگی کو سرسبز و شاداب بنانے میں کوشاں ہیں۔ دل سے بے ساختہ دُعا نکلتی ہے کہ اللہ اُن کی ان مساعی کو بار آور بنا دے۔

فتح محمد ملک

صبیح رحمانی ہماری نعتیہ روایت کے رسمی احیا کی کوشش نہیں کر رہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس مطلوبہ تعلق کی تجدید کی جدوجہد میں وارفتگی کے ساتھ مصروف ہیں جو ہمارے موجود ہونے کا واحد جواز ہے۔ ایمان کے روحانی اور جمالیاتی تقاضوں کو گہرائی اور تازگی کے ساتھ پورا کرنے کا یہ کام اللہ کے فضل سے کامیاب ہو گیا تو امتِ مسلمہ کے دل پر چھائی ہوئی خزاں کا خاتمہ ہو سکتا ہے، ہمیں سب سے زیادہ اسی کا انتظار ہے کہ ہمارے مرجھائے ہوئے دل پر کب بہار آئے گی؟

''اُردو نعت کی شعری روایت'' دراصل فروغ اور تفہیمِ نعت کے نئے زاویے پیدا کرنے والی کتاب ہے جو ہمارے فکر و نظر کی گرد اُتارنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ایسی کاوشیں ستائش کے لائق ہیں اور حوصلہ افزا بھی۔ یہ کتاب نعت کے مباحث کے لیے بھی مفید ہے اور خود ہماری تنقید کے لیے بھی فکر و فہم کے نئے در وا کرتی ہے۔ میں اس کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

احمد جاوید

اردو نعت کی شعری روایت

صبیح رحمانی

اُردو نعت کی شعری روایت

• تعریف • تاریخ • رجحانات • تقاضے

مرتب

صبیح رحمانی

اکادمی بازیافت

محمد حسن عسکری کے نام

جنھوں نے پہلی بار اُردو نعت کی ادبی، جمالیاتی

اور فکری اقدار کا تعین کیا

فہرست

حرفِ آغاز	صبیح رحمانی	۱۱

تعریف

نعت کی تعریف	ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق	۲۳
محرکاتِ نعت	ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی	۵۰
اُردو نعت گوئی کے موضوعات	ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط	۷۴
نعتیہ شاعری کے لوازمات	ظہیر غازی پوری	۱۰۶
نعت کا مثالی اسلوبِ نظم	حافظ محمد افضل فقیر	۱۲۵
نعت — تفہیمِ کائنات کا استعارہ	پروفیسر انوار احمد زئی	۱۳۹

تاریخ

اردو میں نعت گوئی کا ارتقا	ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی	۱۴۵
اُردو کی نعتیہ شاعری کا تاریخی وتہذیبی مطالعہ	ڈاکٹر مظفر حسن عالی	۱۵۹
اُردو میں نعت نگاری — ایک جائزہ ۱۹۷۵ء تک	ڈاکٹر انور سدید	۲۲۸

رُجحانات

محسنؔ کاکوروی	محمد حسن عسکری	۲۷۵
صنفِ نعت	مجید امجد	۳۰۱

جدید اُردو نعت	عارف عبدالمتین	۳۰۳
نعت کے فکری زاویے	ممتاز حسن	۳۱۶
نعت گوئی کا تصورِ انسان	جمال پانی پتی	۳۴۴
نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم	ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی	۳۶۸
نعت گوئی اور جدید شعور	شمیم احمد	۴۱۰
جدید اُردو نعت اور علامت نگاری	احمد ہمدانی	۴۱۷
نعت: ''موضوعِ محض'' سے ''معجزۂ فن'' تک	ڈاکٹر ریاض مجید	۴۲۵
نعت اور اردو کی شعری تہذیب	مبین مرزا	۴۳۰
نعت — کچھ روایتی اور کچھ غیر روایتی معروضات	ڈاکٹر ناصر عباس نیّر	۴۶۳
نعتیہ رویہ	پروفیسر سمیع اللہ قریشی	۴۷۳
جدید اردو غزل میں نعتیہ تخلیقی رویے کا وفور	ڈاکٹر نثار ترابی	۴۷۶
نعتیہ شاعری میں متنی رشتوں کی تلاش	ڈاکٹر عزیز احسن	۴۸۲
اردو نعت نگاری پر مابعد جدیدیت کے اثرات	کاشف عرفان	۴۹۶
نعت میں جدید طرزِ احساس	پروفیسر محمد فیروز شاہ	۵۱۸

تقاضے

اردو نعت گوئی میں ہیئت کے تجربوں کی ضرورت	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۵۵۳
نقدِ نعت — تناظر اور تقاضے	پروفیسر سحر انصاری	۵۵۵
تحقیقِ نعت: صورتِ حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	۵۶۰
نعت اور نقدِ نعت — چند گزارشات	ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی	۵۷۲
نعت کہیے مگر احتیاط کے ساتھ	ڈاکٹر محمد اقبال جاوید	۵۸۳

اہلِ دانش کی آرا

رشید احمد صدیقی	۵۹۳
پروفیسر کرار حسین	۵۹۵
ڈاکٹر سیّد عبداللہ	۵۹۵
پروفیسر میرزا محمد منوّر	۵۹۶

مولانا منتخب الحق قادری ۵۹۷
احسان دانش ۵۹۸
احمد ندیم قاسمی ۵۹۹
ڈاکٹر وزیر آغا ۵۹۹
ڈاکٹر سلیم اختر ۶۰۰
شان الحق حقی ۶۰۱
ڈاکٹر وحید قریشی ۶۰۱
پروفیسر اسلوب احمد انصاری ۶۰۲
تابش دہلوی ۶۰۳
سلیم احمد ۶۰۴
سیّد ضمیر جعفری ۶۰۵
پروفیسر منظور حسین شور ۶۰۶
پروفیسر عارف عبدالمتین ۶۰۶
عرش صدیقی ۶۰۸
شہزاد احمد ۶۰۸
حفیظ تائب ۶۰۹
عبدالعزیز خالد ۶۱۰
ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۶۱۱
اشفاق احمد ۶۱۱
پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی ۶۱۲
پروفیسر حسنین کاظمی ۶۱۲
حمایت علی شاعر ۶۱۳
شبنم رومانی ۶۱۴
مشفق خواجہ ۶۱۴
صہبا اختر ۶۱۵
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ۶۱۵

ڈاکٹر خورشید رضوی	۶۱۷
علامہ شمس بریلوی	۶۱۷
نعیم صدیقی	۶۱۸
پروفیسر جعفر بلوچ	۶۱۸
ڈاکٹر عاصی کرنالی	۶۱۹
پروفیسر شفقت رضوی	۶۲۰
پروفیسر سحر انصاری	۶۲۰
ڈاکٹر تحسین فراقی	۶۲۱
ڈاکٹر سیّد حامد حسین	۶۲۱
ڈاکٹر علیم اللہ حالی	۶۲۱
پروفیسر انور جمال	۶۲۲
شاعر لکھنوی	۶۲۲
ریاض حسین چودھری	۶۲۳
کاوش بدری	۶۲۴
ڈاکٹر مظفر شہ سیّدی	۶۲۴

حرفِ آغاز

اپنے ادبی سفر کے آغاز میں، اہلِ دانش کی کسی محفل میں ایک بات کان میں پڑی تھی:
آدھا علم تو سوال میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ زندگی اور ادب دونوں ہی کے حقائق اور دقائق کا شعور تو اُس وقت کیا تھا، لیکن یہ نکتہ جیسے دل میں ترازو ہوگیا۔ بعدازاں کچھ اور اہلِ علم سے اس موضوع پر گفتگو رہی۔ فکر و نظر کے کچھ اور جواہر بھی دامن میں سمیٹنے کا موقع ملا۔ تاہم چند ماہ پہلے ایک واقعے نے اس نکتے کو قال سے حال بنا دیا۔ یوں ایک سچائی علم اور مشاہدے کے مرحلے سے آگے بڑھ کر تجربے کے اس سانچے میں ڈھل گئی جو حافظے کا دائمی نقش اور یقین کی مستقل کیفیت بن جاتا ہے۔

''نعت رنگ'' کے پچّیس ویں (سلور جوبلی) شمارے کی تیاری کا مرحلہ چل رہا تھا۔ خواہش تھی کہ اس موقعے پر ذرا ایک یادگار اور فکر انگیز دستاویز مرتب کی جائے۔ چناں چہ اس حوالے سے مختلف موضوعات پر مقالات کے لیے معروف و ممتاز ادیبوں سے رابطے اور فرمائشیں کی جارہی تھیں۔ مبین مرزا میرے بہت عزیز اور دیرینہ دوست ہیں۔ وہ اس دور کے نہایت سنجیدہ اور معتبر لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ عصری ادبی سرگرمیوں اور تہذیبی رویّوں پر بھی اُن کی نظر گہری ہے۔ ان سے بھی اس شمارے کے لیے ایک مقالے کا تقاضا کیا گیا۔ بحمداللہ انھوں نے مقالہ لکھا اور اپنے انداز اور اپنی سطح کے مطابق لکھا جو اس شمارے میں خصوصیت کے ساتھ اداریے کے طور پر شائع ہوا۔ بہرحال اُن دنوں نعتیہ ادب کی مختلف جہتوں پر اُن سے اکثر گفتگو رہتی تھی۔ انھوں نے ایک روز پوچھا، ''ہمارے نعتیہ ادب کی روایت اب کس منزل میں ہے اور آج کل اس کے کون سے مباحث ناقدین کی توجہ کا مرکز ہیں؟''
بہ ظاہر یہ ایک سادہ سا سوال تھا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کا کوئی جواب مجھ سے نہ

بن پڑا۔ اس لیے نہیں کہ نعتیہ ادب کی روایت نے کوئی سفر طے نہیں کیا تھا، یا یہ کہ وہ سفر قابلِ اعتنا نہیں تھا، یا یہ کہ میں اس سفر سے اور اس کے نمایاں سنگِ ہائے میل سے واقف نہیں تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نعتیہ ادب کی روایت نے اردو زبان کے شعری اور تنقیدی تناظر میں خواہ دیر سے ہی سہی، لیکن ایک سفر بہر حال طے کیا تھا، اس ضمن میں ادبی اور نعتیہ رسائل و جرائد نے اپنا ایک کردار بھی ادا کیا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی ایسی جامع تنقیدی، فکری اور علمی دستاویز نہیں تھی جو اس قبیل کے سوالوں کا فوری اور شافی جواب فراہم کر سکے اور ہمیں یہ بتا سکے، یہ ہے ہمارے نعتیہ ادب کا شعری و فکری تناظر جس میں اُس نے ایسے اور اتنے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں اور اب اس کے پیشِ نظر فلاں فلاں مباحث ہیں۔

چناں چہ مبین مرزا کے استفسار نے میرے لیے بصیرت کا ایک نیا در وا کر دیا اور مجھے اس تقاضے کے رُو بہ رُو لا کھڑا کیا جو پیدا تو ایک دوست کے ذہن میں ہوا تھا، لیکن یہ فقط ایک ذہن کا مطالبہ نہیں، بلکہ اس کے پس منظر میں ہمارے پورے عہد کا تقاضا گونج رہا تھا۔ اب واقعی ایک عہد یہ جاننے کا خواہاں ہوسکتا ہے کہ کیا کوئی کتاب ایسی ہے جو عصرِ حاضر کے پڑھنے والوں کو نعت کی تعریف، تاریخ، محرکات، لوازمات، مقتضیات اور رُجحانات کے ساتھ ساتھ جدید اردو نعت کے جمالیاتی و اسلوبیاتی خصائص کے علاوہ اُس کی معنی آفرینی اور اثر پذیری کی صورتِ حال سے آگاہ کر سکے؟ میں سچائی اور ذمے داری کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اُس وقت اس سوال کا جواب اگر نفی میں نہیں تھا تو حقیقت یہ ہے کہ اثبات میں بھی نہیں تھا۔ نفی میں اس لیے نہیں تھا کہ اس حوالے سے کچھ نہ کچھ کام تو بہر حال ہوا تھا جو اِن معاملات کے بارے میں ہمیں آگاہ کرتا تھا، لیکن جواب اثبات میں اس لیے نہیں تھا کہ یہ مباحث مرتب صورت میں اور یک جا نہیں تھے۔ دوسری بات یہ کہ خود اب تک ہونے والے کام کی قدر و قیمت کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی تھی اور اس لیے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ اس کام کو عصرِ رواں کے بنیادی سوالوں کے تناظر میں تخمین وظن کے مرحلے سے گزار کر نہیں دیکھا گیا تھا۔ بہر حال میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سوال بصیرت افروز ہی نہیں چشم کشا بھی ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے آئندہ کام کا شعور اور لائحۂ عمل دونوں فراہم ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب جو نعت کی تعریف سے تقاضوں اور تاریخ سے عصری رُجحانات تک کے مباحث کا احاطہ کرتی ہے، دراصل مبین مرزا اور اس عہد کے اسی بنیادی سوال کے جواب کی جستجو سے عبارت ہے۔

اردو نعت گوئی کی تاریخ قلم بند کرنا سرِ دست میرا مقصود ہے اور نہ ہی اس کے فکری اور

علمی مباحث کو موضوع بنانا میرا منصب ۔ میں تو اِس مختصر تحریر میں صرف اُن تصورات اور احساسات کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو اس کتاب کے دائرۂ کار کے بارے میں سوچتے اور اس کے لیے لوازمہ ترتیب دیتے ہوئے میرے پیشِ نظر رہے۔ ان تصورات اور احساسات کا بیان یوں بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب کے جملہ قارئین کو قلب و نظر کی اُس کیفیت اور احساس کے اُس تجربے میں شریک کیا جائے جو اس تالیف و تدوین کی بنیاد بنا۔غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ فکر ونظر کا ہر قرینہ اپنی تمام تر انفرادیت کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی جہت بھی رکھتا ہے۔ اسی لیے علم و ادب اور فکر و دانش کی دنیا کے سارے بنیادی سوالات اور اساسی استفسارات بے شک اٹھتے تو ایک ذہن میں ہیں یا بیان تو ایک زبان سے ہوتے ہیں، لیکن اُن کے پس منظر میں درحقیقت پورے ایک عہد کا شعور، ایک زندہ سماج کا ضمیر اور ایک خود آگاہ تہذیب کا نفسِ ناطقہ کارفرما ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایسے سوالات اور مباحث سامنے آتے ہیں تو وہ فی الاصل ایک دور کی ذہنی تشکیل اور ایک تہذیب کی صورت گری میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سیرتِ رسول ﷺ اور مدحِ رسول ﷺ اوائلِ عمری ہی سے میری ذہنی اور جذباتی وابستگی کا مرکز و محور رہے ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک تو کہیں بہت بعد میں ہوا کہ میں نعت گوئی سے بھی طبعی مناسبت رکھتا ہوں اور خود جنابِ رسالت مآب ﷺ میں اپنے جذبہ و احساس کا ہدیہ گزارنے کی دولتِ پُرمایہ سے بھی اللہ رب العزت نے مجھے نوازا ہے۔ جب اس امر سے آگاہی نہ تھی، تب بھی نعت کی طرف میرا دل بہرحال کھنچتا تھا۔ آگے چل کر دل کی یہی کیفیت مجھے کوچۂ مدحت گزراں میں لے آئی اور نعت گوئی اور نعت خوانی میری زندگی کا جزوِ لاینفک قرار پائی۔ اگر اتنا ہی رہتا تو بھی یہ قابلِ فخر اعزاز تھا، لیکن قدرت جس کو چاہے اور جس طرح چاہے نواز دے۔ خدمتِ نعت میں مزید سعادتیں میرا مقدر بننے والی تھیں۔ اس لیے آگے چل کر نعتیہ ادب کے سنجیدہ فکری اور تنقیدی مطالعات کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور یوں ''نعت رنگ'' کا اجرا ہوا۔

اب پلٹ کر دیکھتا ہوں تو خوشی کے ساتھ ساتھ کسی قدر حیرت بھی ہوتی ہے کہ ''نعت رنگ'' نے بیس برسوں کے اس سفر میں نعتیہ ادب کے کیسے کیسے سوالات اٹھائے، کن کن مباحث اور موضوعات پر توجہ مرکوز کی اور اردو نعت کو ادب کے مرکزی دھارے سے کس کس انداز سے مربوط کیا۔ بلاشبہ اس کام کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کا انعام تھا اور کارگزاری کا جو ادنیٰ سا گراف سامنے آتا ہے، وہ بھی ربِ کریم کے پیدا کیے ہوئے حالات اور وسائل ہی کا نتیجہ ہے۔ میرے لیے یہ نعمت ہی مایۂ افتخار ہے کہ اُس نے مجھ ایسے عاجز کو یہ دولتِ بے بہا ارزانی کی کہ جس سے میری دُنیا اور

آخرت کی بھلائی کا سامان فراہم ہوا۔

بھلا کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُس نے شانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے فروغ میں کوئی کردار ادا کیا ہے؟ اس لیے کہ اس بابرکت کام کو تو ربِ کریم نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اُس نے خود اپنے بندے اور ہادیِ برحق کے ذکر کو بلند کیا اور جس کو اس کام پر مائل کیا اُس کی توقیر بڑھا دی۔ یہ سب تو سراسر نصیب کی بات اور کرم کے فیصلے کا معاملہ ہے۔ تاہم اتنی بات پورے عجز و انکسار کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ہاں ایک طویل مدت تک نعتِ نبی ﷺ کو محض عقیدت و محبت کا پیرایہ سمجھا گیا۔ یہی سبب ہے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کی دو اڑھائی صدیوں میں نعت کو عقیدت کے زمرے میں رکھے جانے کی وجہ سے اُس کی علمی، فکری اور جمالیاتی حیثیت سے اغماز کی فضا پیدا ہوگئی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حالی اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں ادب و سخن کے معیارات، قواعد اور اصولوں پر ساری بات کرتے ہیں مگر نعت کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ یہ فضا کم و بیش بیس ویں صدی کے وسط تک برقرار رہتی ہے۔ اب جا کر گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں ہمیں کہیں کوئی اِکا دُکا آواز اپنے ایوانِ ادب و نقد میں ایسی سنائی دیتی ہے جو نعت کے فکری پہلو اور ادبی جہت کو موضوع بناتی ہو، مثلاً امیر مینائی کا محسن کاکوروی پر اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب اور محسن کے دفاع میں لکھنا اور پھر بعدازاں محمد حسن عسکری کا وہ مضمون ایسے ہی موضوعات کو اجاگر کرتا ہے جو انھوں نے محسن کاکوروی پر لکھا تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ عسکری صاحب مغربی ادب کے شناور سمجھے جاتے تھے۔ جوئس، بودلیئر، راں بو، ٹامس مان اور سمرسٹ ماہم اُن کے حافظے اور حوالے کے خاص نشانات تھے۔ اللہ رب العزت نے ان سے کیسا کام لیا۔ اُن کا سب سے طویل شخصی مضمون محسن کاکوروی پر ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے کیسے کیسے بلیغ نکتے اٹھائے اور نعت کو ادب کے مرکزی موضوع کے طور پر دیکھنے کے لیے کیا کیا پہلو اور زاویے پیش کیے ہیں۔ یہ مضمون نعتیہ ادب ہی نہیں خود ہماری فکری تنقید کے روشن تر حوالوں میں سب سے نمایاں ہے۔

اس کے بعد ہمیں بڑے ادیبوں کے ہاں نعتیہ ادب کے سلسلے میں فکر انگیز نکات کچھ اشارات کی صورت میں یہاں وہاں تو ملتے ہیں، لیکن کوئی جامع اور فکر انگیز مطالعہ اس سطح پر نہیں سامنے آتا جو امیر مینائی اور عسکری صاحب کے یہاں ہوا ہے۔ یہی وہ مسئلہ تھا جس نے دراصل میرے لیے مہمیز کا کام کیا اور ''نعت رنگ'' کے ذریعے نعتیہ ادب کی تنقید و تفہیم کی راہ ہموار کرنے کا نکتہ مجھے سجھایا۔ ''نعت رنگ'' اور اس کے سلسلۂ فکر و نظر سے وابستہ اہلِ ادب و دانش کا اس میں کتنا حصہ

ہے، یہ ایک بالکل الگ موضوع ہے جس پر گفتگو اس وقت مقصود نہیں۔ البتہ اس امر کی طرف اشارہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ نعتیہ ادب کے تجزیاتی، تنقیدی اور فکری مطالعات کا اہم اور بیشتر کام گزشتہ بیس پچّیس برسوں میں خصوصیت اور تسلسل کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ میں تاریخی تناظر میں تو اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا ہوں، لیکن اجمالاً ہی سہی اس منظرنامے کو آپ کے سامنے پیش ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ سو تنقیداتِ نعت کی صورتِ حال پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے چلیے:

۱۹۵۵ء میں ناگ پور یونی ورسٹی (بھارت) سے ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق نے ''اردو میں نعتیہ شاعری'' پر پہلا تحقیقی کام مکمل کیا۔ یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۷۶ء میں اردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے پاکستان میں شائع کیا۔ البتہ اس اثنا میں، یعنی ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''اردو کی نعتیہ شاعری'' کے عنوان سے ایک مبصرانہ کتاب پیش کی۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کی کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' بھی ۱۹۷۴ء میں ہی بہار، انڈیا سے شائع ہوئی۔ بعدازاں ڈاکٹر ریاض مجید نے ''اردو میں نعت گوئی'' کے عنوان سے پاکستان میں پہلا پی ایچ ڈی کی سطح کا مقالہ قلم بند کیا جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ نعت پر کام کی تحقیقی نوعیت اپنی جگہ، لیکن ان مقالوں میں نعت کی تعریف، تاریخ اور آداب پر مجملاً کچھ لکھا گیا ہے۔ البتہ شعرا کے تذکروں میں قدیم و جدید نعتیہ ادب کے کچھ نقوش بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں اور یوں اجمالاً اور ناتمام ہی سہی مگر ایک طرح سے نعتیہ ادب کی تاریخ کے تسلسل کے ساتھ ایک منظرنامہ سا ابھرآتا ہے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے کا نعتیہ منظرنامہ نعت کی تخلیقی نہج پر تو بقعۂ نور نظر آتا ہے، لیکن تنقیدی اور تحقیقی کام کی نوعیت پر گھٹا ٹوپ اندھیرے کا گمان ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ نعت کی اس روایتی تخلیقی نہج کو اس عہد کے بڑے نقادوں نے بہ وجوہ کچھ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور اس پر وہی پرانا عقیدت کا عنوان چسپاں کر کے اسے ادب کے مرکزی دھارے سے الگ رکھا۔ یہ حقیقت رشید احمد صدیقی جیسی بلند پایہ شخصیت کی رائے سے مترشح ہے۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی بائیں بازو کے نظریات کے حامی نہ تھے، بلکہ اُن کا جھکاؤ دائیں بازو کے افکار کی طرف تھا۔ اس کے باوجود روایتی نعتیہ فضا کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی:

> نعتیہ کلام کی محرومی یہ رہی کہ ہمارے بیشتر شعرا نے اسے ایک مقدس رسم سمجھ کر اختیار کیا اور سننے والوں نے ثواب کی خاطر آہ یا واہ کرلی۔ اس طرح کے کلام، اس طرح کے شعرا اور اس طرح کے مقاصد نے مل جل کر نعت کو شریفوں یا شاعروں کا شیوہ نہیں، میراثیوں کا پیشہ بنا دیا۔

اس رائے میں تعصب یا غصے کا نہیں، بلکہ رنج اور تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ احساس بہر حال فطری اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ رشید احمد صدیقی نے نعتیہ ادب کے بارے میں اپنا آدرش اس طور پیش کیا جس سے کچھ اندیشے جنم لے رہے تھے، جیسے نعت کا تخلیقی سفر حالی اور اقبال پر آکر رک گیا ہو۔ یہ رائے بھی ملاحظہ ہو:

> نعت ہمارے شعر و ادب کی قابلِ قدر روایت بن گئی ہے۔ ایسی روایت جو شاعری میں عبادت کے عنصر و عوامل کے ساز و برگ کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ نعت کو شاید اور کسی مذہب و ملت میں وہ اہمیت حاصل نہ ہو جو ہمارے شعر و ادب میں ہے۔ اس کو مقصد دینے، متحرک کرنے اور متحرک رکھنے کی ابتدا حالی نے کی جسے اقبال نے اس درجے تک پہنچا دیا ہے جس سے آگے پہنچانا اب کسی دوسرے اقبال ہی کا کارنامہ ہوگا اور مستقبل بعید میں کسی دوسرے اقبال کا ظہور پانا آسان نہیں معلوم ہوتا۔

لیکن الحمد للہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کی برکات نے صورتِ حال کا وہ نقشہ نہ بننے دیا جس کے لیے تشویش کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں ادب و شعر کا منظرنامہ درخشندگی کے ساتھ ظاہر ہوا اور نعتیہ ادب نے تو ایسا فروغ پایا کہ جسے مثال کے درجے میں رکھنا چاہیے۔ اس کا احساس بھی ہمارے اہلِ علم کو ہے۔ یہ احساس ایک طرف طمانیت سے مملو ہے تو دوسری طرف اس میں زیریں سطح پر یہ شعور بھی پایا جاتا ہے کہ اس میں اب کس شے کی ضرورت ہے اور یہ کارواں آگے کس منزل کی سمت بڑھ رہا ہے جس کی چند ایک جھلکیاں دیکھتے چلیے:

> ابتدائے اسلام سے اب تک نعتیہ ادب کا ایک عظیم ذخیرہ اور قیمتی خزانہ جمع ہوگیا ہے جو ادبی اور علمی لحاظ سے خود دنیا کا بہترین ادب شمار ہوتا ہے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس ادب کی تحقیق، تنقید اور تشریح کی طرف دنیائے اسلام میں تا حال کماحقہٗ توجہ نہ ہوسکی۔ شکر ہے کہ ہمارے دور میں احساس بیدار ہوا ہے اور اب ایسے اربابِ علم و ادب اور ادارے فروغ پا رہے ہیں جنھوں نے اس کام کو آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔
>
> (ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق)
>
> قیامِ پاکستان کے بعد چوں کہ اسلامی اقدار، اسلامی اخلاق، اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایات کی طرف قدرتی طور پر رجحان بڑھا تو

قرآن اور رسول ﷺ سے متعلق موضوعات اور مضامین کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ اور یہ محض عقیدت کا اظہار ہی نہیں، بلکہ شعری فن کی حیثیت سے بھی ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ یہ پاکستان کے قیام کے بعد پیدا ہونے والے ادب کا ایک ممتاز عنصر ہے جو اپنے دور اور اس کے فکر کے انداز کی ترجمانی کرتا ہے۔

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

اردو کی نعتیہ روایت میں صدر ضیاء الحق کے زمانے میں بیش از بیش اضافہ ہوا۔ اور یہ صنفِ ادب دین کی صنف سے بڑھ کر ادب کی قلم رو میں داخل ہوئی۔

(ڈاکٹر وحید قریشی)

ڈاکٹر وحید قریشی نے بہت درست کہا کہ ضیاء الحق کے دورِ اقتدار سے ہی نعت اپنی پوری معنویت کے ساتھ سامنے آنے لگی۔ اسی عہد میں شعرا کو نعتیہ مجموعوں کی ترتیب کا خیال آیا اور پھر ان کتب پر کچھ اہلِ قلم نے تقریظیں لکھیں تو ان تحریروں میں بھی جستہ جستہ نعتیہ تاریخ، آداب، تعریف اور کسی حد تک تنقیدی اشارے بھی نظر آنے لگے۔

اس عہد کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ نعت اس درجہ مقبول ہوئی کہ ترقی پسند شعرا نے بھی نعتیہ ادب کی تخلیق میں خصوصی دل چسپی لی۔ مختلف افکار و نظریات رکھنے والے تخلیق کاروں اور اہلِ نقد کے نعت اور نعتیہ ادب کی طرف متوجہ ہونے کا پہلا اہم نتیجہ یہ سامنے آیا کہ نعتیہ ادب کے روایتی اسالیب میں ادبی عناصر بھی داخل ہوئے اور اس طرح نعتیہ ادب میں فکر و اظہار کے نئے در وا ہونے لگے اور اسلوبیاتی سطح پر بھی تازگی محسوس ہونے لگی۔ اسی دور میں اسلامی ادب کی تحریک سے وابستہ شعرا نے نعت کو تبلیغی مقاصد کے لیے بھی بروئے کار لانے کے امکانات کا جائزہ لیا اور انھیں اپنے اپنے انداز سے تخلیقی تجربے میں ڈھالا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادب و فکر کے سانچے میں اسلامی اقدار، اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایت سے مملو ایک نیا منظرنامہ نمود کرنے لگا۔

یہاں حوالے اور نام تو چار چھ نہیں، درجنوں اور بھی درج کیے جا سکتے ہیں، لیکن مقصد ناموں کی کھتونی نہیں، بلکہ منظرنامے کو واضح کرنا ہے۔ سو ان حوالوں پر اکتفا کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔ تاہم مندرجہ بالا ناموں اور حوالوں کے ساتھ ہمیں عارف عبدالمتین، ممتاز حسن اور شمیم احمد جیسے لوگوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے، جنھوں نے تفصیل اور تسلسل کے ساتھ تو بے شک نعتیہ ادب کی تنقید کے شعبے میں کام نہیں کیا، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جن کے ایک آدھ مقالے میں بھی تفہیمِ نعت کا

کوئی ایسا نکتہ یا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے جو اس صنفِ ادب کو اُس کے اعلیٰ فکری اور تہذیبی معیارات کے ساتھ سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

اس کے بعد بیس ویں صدی کی آخری دہائی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی اور جمال پانی پتی جیسے ناقدین نعتیہ ادب کی تجزیاتی تفہیم اور فکری مطالعات کے لیے بہت غیر معمولی کام کرتے ہیں۔ ان حضرات کا کام اپنی اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کے ساتھ تنقیدِ نعت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ چناں چہ ان کے ہاں نعتیہ ادب کسی ہمدردانہ توجہ کا طالب نظر نہیں آتا، بلکہ اپنے ادبی محاسن کی بنیاد پر اور فکری جہات کے ساتھ تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اور اُس کی تخمین وظن کا کام ادب کے آفاقی معیار کے پیمانوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم ایک اور نقاد کو دیکھتے ہیں جنھوں نے بہت تواتر سے نعتیہ تنقیدی افکار کو پیش کیا، یہ ہیں ڈاکٹر عزیز احسن۔ انھوں نے اپنے موضوعات اور مباحث سے نہ صرف نعتیہ تنقید کو عصری تنقیدی تناظر سے مربوط کرنے پر توجہ دی، بلکہ دوسرے ناقدین کی توجہ بھی اس جانب مبذول کرائی۔

اب آیئے نعتیہ ادب کے عصری تنقیدی منظرنامے پر۔ اس میں سب سے پہلے ہماری نظر مبین مرزا پر ٹھہرتی ہے کہ انھوں نے اردو نعت کی شعری روایت کو جس طرح اپنی تہذیب کے فکری، ادبی اور جمالیاتی سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا ہے، وہ پروفیسر سحر انصاری کے بہ قول نعت شناسی کے ضمن میں اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ حالیہ عرصے میں جو لوگ اس حوالے سے سامنے آتے ہیں، اُن میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور کاشف عرفان اپنے موضوعات اور تجزیاتی نظر کی وجہ سے اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں سے توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں کہ اردو ادب و تہذیب اور نئے نظریات و افکار کے تناظر میں اقلیمِ نعت کی منور اور معنی آفریں جہات کو اُجاگر کریں گے اور نعت کے فکری و جمالیاتی ابعاد کو نئے قرینے سے سامنے لائیں گے۔

کسی بھی عہد کے ادب کا مطالعہ کیا جائے، اس امر کا اندازہ جلد ہوجاتا ہے کہ فکر و ادب کا کوئی بھی سنجیدہ اور بڑا کام یک پرتی نہیں ہوتا، بلکہ اُس کے اظہار و ابلاغ اور فکر و معنی کی ایک سے زیادہ سطحیں ہوتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ سب سطحیں معنی آفریں اور مفیدِ مطلب ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ ایک ہی عہد کے وہ لوگ جو مختلف نظریات و افکار کے حامل ہوتے ہیں اپنے اپنے اندازِ نظر اور طرزِ اظہار کے موافق بیانیہ تشکیل دیتے ہیں۔ اس نکتے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نعت کے فکری و انتقادی ادب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عمومی تناظر کے متوازی کچھ اہلِ نقد و ادب ایسے بھی ہیں جنھوں نے فکر و نظر کی تمام سرگرمیوں کو خصوصیت کے ساتھ نعت سے منسوب و

موسوم کیا اور اس کی ترویج اور فروغ کے لیے جی جان سے منہمک ہوکر مختلف جہتوں میں ایسے کار ہائے نمایاں انجام دیے جس سے نعتیہ تنقید کے دوش بہ دوش نعتیہ تحقیق، تدوین و تالیف اور تعارف و تبصرے کے حوالے سے بھی نعت کے علمی، ادبی اور مطالعاتی ذوق کا دائرہ وسیع ہوا۔ ایسے چند نام جو اس وقت ذہن میں تازہ ہیں، وہ یہ ہیں:

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط، ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری، ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی، ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، نعیم صدیقی، پروفیسر حفیظ تائب، اصغر حسین نظیر لدھیانوی، پروفیسر محمد اقبال جاوید، ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی، حمایت علی شاعر، پروفیسر محمد اکرم رضا، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، ڈاکٹر سیّد شمیم احمد گوہر، ادیب رائے پوری، رشید وارثی، علامہ شمس بریلوی، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر سراج احمد قادری، ڈاکٹر افضال احمد انور، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، گوہر ملسیانی، راجا رشید محمود، ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی، ڈاکٹر سیّد وحید اشرف کچھوچھوی، حلیم حاذق، ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن رحیمی، نور احمد میرٹھی، ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، ڈاکٹر تنظیم الفردوس، ڈاکٹر شہزاد احمد، محمد اقبال نجمی، غوث میاں، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، منظر عارفی، طاہر سلطانی، شاکر القادری، سرور حسین نقشبندی، سیّد محمد قاسم، ساجد صدیقی لکھنوی، ڈاکٹر شوکت زریں چغتائی، ڈاکٹر راحت سلطانہ، چودھری محمد یوسف ورک، ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی، اسد ثنائی، ڈاکٹر داؤد عثمانی، خالد شفیق۔ ان سب نے اپنے اپنے انداز سے اُس بابِ عظمت پر اثاثۂ دانش و خرد ہدیہ کیا اور توقیر پائی۔ اس سچائی کا اعتراف برملا کیا جانا چاہیے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چراغ کی روشنی کو اس وقت پھیلانے کے لیے ہر ممکن کام کیا، جب ادب کے ایوان میں نعت کی تنقید کا رواج نہ تھا اور اسے ادب و نقد کا شعبہ ہی باور نہ کیا جاتا تھا۔ آج بحمداللہ ایسا نہیں ہے۔ اس فضا کے بدلنے اور اس کو ادب کی مجموعی فضا سے جوڑنے میں ان لوگوں کے جذبہ و جستجو کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ ان لوگوں کا کام اس لیے بھی اہم اور توجہ سے دیکھا جانے والا ہے کہ انھوں نے اپنی ادبی کارگزاری کو جاری رکھتے ہوئے، نعت اور تنقیدِ نعت کو فوقیت دی اور اُسے ادبی دُنیا میں اُس کے اصل مقام تک لانے کے لیے مساعیِ جمیلہ کیے۔

ایک سوال کے جواب کی جستجو میں مرتب ہونے والی یہ کتاب میرے لیے محض ترتیب و تالیف کا نہیں، بلکہ ایک آرزو کی صورت گری کا مرحلہ ہے۔ یہ آرزو کہ انتقادیاتِ نعت کو ہمارے ادبِ عالیہ کے ناگزیر اور مؤقر حصّے کے طور پر دیکھا جائے، دیر سے میرے دل میں تھی۔ خدا کے فضل و کرم سے اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ نعت کی تنقید اپنے

معیارات پر ہی نہیں ادب کے پیمانوں پر بھی پوری اترتی اور فکر و نظر کی سیرابی کا سامان کرتی نظر آتی ہے۔ اس کا ثبوت زیرِ نظر کتاب کے متعدد مضامین سے بھی ملتا ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک ایسے نصاب کا درجہ رکھتی ہے جس میں تعریف اور لوازمات سے لے کر تہذیب و اقدار کے اعلیٰ تر مباحث کو سمیٹ لیا گیا ہے۔

اس کتاب کو چار بنیادی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: تعریف، تاریخ، رُجحانات اور تقاضے۔ ان ابواب کے تعین اور ان کے لیے مقالات کے انتخاب میں یہ بات بالخصوص سامنے رکھی گئی ہے کہ اس موضوع کے مبتدی سے لے کر اسکالرز تک کی ضرورت کا سامان بہم پہنچایا جاسکے۔ جو لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ نعت کے لوازمات کیا ہیں اور اِس صنفِ ادب نے اب تک فکر و فن کے کیا مراحل طے کیے ہیں اور آج یہ کس منزل تک آ پہنچی ہے، اُنھیں اپنے سوالوں کا شافی جواب میسر آ سکے — اور سب سے اہم بات یہ کہ فکر و فہم کا یہ سارا سرمایہ آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے نئے موضوعات کی فراہمی اور غور و فکر کے نئے پہلوؤں کی دستیابی کا ماخذ بن سکے۔ اس حوالے سے کتاب کا آخری حصہ خاص توجہ کا مستحق ہے جس میں بیس ویں صدی کے نابغۂ روزگار ادیبوں شاعروں کے اُن اقتباسات کو پیش کیا گیا ہے جو اُن کی ایسی تحریروں سے اخذ کیے گئے ہیں جو بہ راہِ راست تنقیدِ نعت کے زمرے میں تو نہیں آتیں، لیکن ان کے اقتباس میں نعتیہ فکر و تنقید کا کوئی نہ کوئی روشن موتی ضرور دمکتا دکھائی دیتا ہے۔

آخر میں بس یہ عرض کرنا ہے کہ کوئی بھی انتخاب حتمی اور جامع نہیں ہوسکتا۔ اُس کی کسی نہ کسی کمی کی طرف اشارہ بہرحال کیا جاسکتا ہے۔ میں بھی اس انتخاب کو آخری یا تکمیلی شے نہیں سمجھتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میرے نزدیک تو یہ کتاب دراصل اس نوعیت کے کام کا آغاز ہے۔ یہ پہلی کڑی ہے جو اللہ کے فضل اور نسبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے آنے والے دنوں میں فکری اور انتقادی دونوں حوالوں سے حلقہ در حلقہ آگے بڑھے گی، ان شاء اللہ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آنے والے وقتوں میں نعتیہ ادب و تنقید میں بھی اُس سطح اور معیار کا مزید کام سامنے آئے گا جو صرف اس شعبے ہی کے لیے نہیں، بلکہ خود اردو تنقید کے لیے بھی فکر و نظر کے نئے زاویے روشن کرے گا اور سرمایۂ افتخار ٹھہرے گا۔

صبیح رحمانی

تعریف

ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق

نعت کی تعریف

نعت کی تعریف:

النعت وصف الشئ بما فیہ من حسن مالہ الجلیل ولایقال فی المذموم الا بتکلّف متکلّف فیقول نعت سوء. فاما الوصف فیقال فیھما ای فی المحمود والمذموم. (الحافظ ابوموسیٰ)☆[1]

یعنی نعت وصفِ محمود کو کہیں گے۔ اگر بہ تکلّف اس میں وصفِ مذموم کا مفہوم پیدا کرنا ہو تو ''نعت سوء'' سے اسے ظاہر کریں گے۔ نعت جب وصفِ محمود ہے تو وصف کیا ہے؟ وصف کے معنی ہیں کشف اور اظہار۔ شاعرانہ اصطلاح میں وصف کسی چیز کے عوارض اور اس کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کو کہتے ہیں۔

جاوید ہمیں باش بایں نعت و بایں وصف
پاکیزہ باخلاق و پسندیدہ بہ افعال
وصفش ہمہ تقدیس ز پیوند و ز فرزند
نعتش ہمہ تنزیہہ ز امثال و زا قران
(میر معزی)

ابنِ قدامہ کے نزدیک ''بہتر وصف شعار شاعر وہ ہے جو اپنے شعر میں ان اوصاف کے اکثر حصے لائے جن سے موصوف مرکب ہے۔ اس کے بعد وہ اوصاف اس قسم کے ہوں جو موصوف سے زیادہ نمایاں ہیں اور اس کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتے ہیں۔''☆[2]

☆۱۔ جامع الترمذی مطبوعہ مطبع اصح المطابع لکھنؤ ۱۳۱۷ھ ص:۵۶۸، حاشیہ۳۔

☆۲۔ شعر الہند حصہ دوم، ص:۳۸۹ (مولانا عبدالسلام ندوی) مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ۔

ابنِ رشیق نے جو وصف کی تعریف کی ہے وہ نہایت بلیغ اور جامع ہے۔

ابلغ الوصف ما قلب السمع بصرا.

بلیغ ترین وصف وہ ہے جو کان کو آنکھ بنا دے۔

نعت کے معنی یوں تو وصف کے ہیں، لیکن ہمارے ادب میں اس کا استعمال مجازاً صرف حضرت رسولِ کریم سیّد المرسلین ﷺ کے وصفِ محمود و ثنا کے لیے ہوا ہے جس کا تعلق دینی احساس اور عقیدت مندی سے ہے۔ لہٰذا اسے خالص دینی اور اسلامی ادب میں شمار کیا جائے گا۔

رسول ﷺ کے وصف میں نعت کے لفظ کا پہلے پہل استعمال:

نعت کا لفظ جو حضور اکرم ﷺ کے وصف کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے، غالباً اسلامی ادب میں اس معنی میں اس کا استعمال پہلی دفعہ کیا گیا ہے۔ اس حدیث میں آپ ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لیے بجائے واصف کے ناعت استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

من راہ بداھة ھابه. ومن خالطه معرفة احبّه یقول ناعته لمراء قلبه ولا بعدہ مثله صلی اللہ علیه وسلم

(شمائل ترمذی، ص: ۵۶۷)

آپ پر یکا یک جس کی نظر پڑ جاتی ہے، ہیبت کھاتا ہے۔ جو آپ سے تعلقات بڑھاتا ہے، محبت کرتا ہے۔ آپ کا وصف کرنے والا یہی کہتا ہے کہ آپ سے پہلے نہ آپ کے جیسا دیکھا اور نہ آپ کے بعد آپ کے جیسا دیکھا۔

مضامین نعت کے ماخذ:

(۱) قرآن

قرآنِ مجید جس طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اسی طرح وہ اسلامی ادب کی بھی پہلی کتاب ہے۔ اس میں رسولِ مقبول ﷺ کی نعت کے مضامین ملتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے خلقِ محمد ﷺ کی تعریف میں ''خلقه القرآن'' کہہ کر ساری کتابِ آسمانی کو نعت کے موضوع سے متعلق کر دیا۔ اس پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں صرف ان اوصاف کا ذکر

کیا جائے گا جو آپ ﷺ کے دیگر اوصاف کی بنیاد ہیں، مثلاً عبدیت، رسالت، محبوبیت۔ بنی آدمؑ سے آپ کی رافت و رحمت۔ دیگر انبیائے کرامؑ پر آپ ﷺ کی فضیلت وغیرہ۔

(۱) عبدیت:

قرآنِ مجید میں رسول اللہ ﷺ کی صفتِ عبدیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شرف کی زیادت صرف وصفِ عبدیت کے کمال پر منحصر ہے۔ رشتۂ عبدیت جس قدر قوی ہوتا جائے گا اسی قدر شرف بھی بڑھتا جائے گا۔ آپ ﷺ کا یہی کمال ہے جس کی بنا پر آپ ﷺ ساری مخلوق میں یکتا ہیں۔ محبوبیت میں یکتا ہیں اور مقامِ محمود آپ کو حاصل ہے۔

عبدیت کی صفت پر جو قرآنِ مجید نے اس قدر زور دیا ہے، اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بندگانِ حق کی عظمت کے مسئلے میں فہمِ انسانی نے اکثر دھوکا کھایا ہے اور عبد کو معبود کا درجہ دیا۔ چناں چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت عزیز علیہ السلام نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہم کے باب میں مخلوق اسی کج فہمی کا شکار ہوئی، لیکن قرآنی تعلیم کی شان ہے کہ باوجود معجزات اور خوارقِ عادات کی کثرت کے اور گونا گوں فضائل کے رسولِ کریم ﷺ کی ذات گرامی کو کسی نے اس وصف سے مہتم نہیں کیا گو یہ امر بھی مسلّم ہے کہ آپ کی ذات سے آپ ﷺ کی اُمت کی الفت و محبت جو والہانہ کیفیت رکھتی ہے، وہ کسی اور نبی علیہ السلام کی اُمت کو نصیب نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بھی اپنی اس عبدیت ہی پر افتخار فرمایا۔ معراج کے بیان میں یہ نکتہ پوری وضاحت سے سامنے آتا ہے کہ کمالِ رفعت صرف اس بنا پر تھا کہ اس سعادت کی ساعت میں جو خطاب آپ کو رب کی طرف سے عطا کیا گیا، وہ یہی ''عبد'' ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِی اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا۔

(القرآن ۱/۱۷)

ترجمہ: وہ پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تا کہ دکھلائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے۔

(۲) رسالت:

لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ علیہِ مَاعَنِتُّمْ حَرِیْصٌ

عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡم۔ (القرآن ۹/۱۳)

ترجمہ: آیا ہے تمھارے پاس رسول تم میں کا شاق ہے اس پر جس سے تم کو تکلیف پہنچے حریص ہے تمھاری بھلائی پر۔ ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا رسول آیا کہ جسے تم خود جانتے ہو۔ اس کی منزلت کو پہچانتے ہو۔ اس کے صدق کا یقین رکھتے ہو اور اس کے امین ہونے پر خود شاہد ہو۔ اگر ہم انفسکم کے فاء کو بالفتح پڑھیں جیسا کہ بعض نے پڑھا ہے تو معنی یہ ہوں کہ وہ رسول ﷺ جو تم میں اشرف ترین، بلند ترین اور افضل ترین ہے۔ آپ کے وصف میں یہ مدح انتہائی ہے جو کسی کی ہوسکتی ہے۔ حریص فرما کر خداوند تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس رافت و رحمت کی طرف اشارہ کیا ہے جو آپ کو اللہ کی مخلوق کے ساتھ تھی۔ یہ ثنا آپ ﷺ کی بکثرت کی گئی ہے کہ دُنیا کو گمراہی میں دیکھ کر مضطرب قلب ہمیشہ پیچ و تاب کھاتا رہا کہ کاش دُنیا اس رشد و ہدایت کی دولت سے محروم نہ رہتی جسے پروردگارِ عالم نے آپ کو عطا فرمائی تھی۔ بالمؤمنین رؤف الرحیم کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں سے دو صفات بخشی ہیں۔ آپ کے یہ اوصاف، ایک جگہ نہیں کئی جگہ بیان فرمائے ہیں، مثلاً:

(۱) لَقَدۡ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡبَعَثَ فِھِمۡ رَسُوۡلاً مِّنۡ اَنۡفُسِھِمۡ (القرآن ۳/۱۵۹)

اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول ﷺ انھی میں کا۔

(۲) ھُوَ الَّذِیۡ یَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلاً مِّنۡھُمۡ (القرآن ۳/۶۲)

اللہ وہی ہے جس نے اُٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول ﷺ انھی میں کا۔

(۳) کَمَا اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلاً مِنۡھُمۡ (القرآن ۲/۱۴۶)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول ﷺ تم ہی کا۔

جعفر بن محمد نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ اپنی مخلوق کے عجز سے خوب واقف تھا جو انھیں اللہ کی اطاعت میں لاحق ہوتا، لہٰذا اس نے ایک ایسا سفیر بھیجا جو مخلوق ہی کی جنس سے تھا اور اسے رافت و رحمت کی صفات سے نوازا، اور اس کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا۔

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ (القرآن ۴/۸۳)

جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا۔

(۳) رحمۃ للعالمین:

اس کے ساتھ آپ کو جمالِ رحمت سے زینت بخشی۔ چناں چہ آپ کا وجود رحمت ہے۔ آپ کی تمام صفات رحمت ہیں۔

وَ مَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (القرآن ۲۱/۱۰۸)

اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کو جہان کے لوگوں پر۔

حتیٰ کہ آپ کی زندگی اور آپ کا عالم برزخ میں منتقل ہو جانا دونوں رحمت ہیں۔ آپ نے خود ارشاد فرمایا:

حَیَاتِیۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ وَمَمَاتِیۡ خَیۡرلکم قال عَلیه السلام اِذَاَرَاد اللّٰہُ رَحۡمَۃً بِاُمَّۃٍ قَبَضَ نَبِیَّھَا قَبۡلَھَا فَجَعَلَہٗ لَھَا قَرَطًا وَّسَلَفًا۔

آپ ﷺ کی ذات کا رحمتِ عالم بن کر جلوہ گر ہونا صرف آدمؑ کی اولاد ہی کے لیے نہیں بلکہ جن و انس اور تمام مخلوق کے لیے ہے۔ جہاں مومنین کے لیے آپ چشمۂ ہدایت ہیں تو منافقین کے لیے بھی امان ہیں اور کافرین کے لیے تاخیرِ عذاب کا باعث بن کر رحمت ہیں۔ جن و انس کے علاوہ کائنات کے لیے اس طور پر رحمت ہیں کہ بزمِ ہستی کی آراستگی اس رحمت سے ہے کہ آپ ہی ساری کائنات کے وجود کا حاصل ہیں۔

(۴) نورِ محمدی ﷺ:

زندگی کی تاریکیوں کو روشن کرنے والی ذاتِ گرامی کو اللہ تعالیٰ نے نور سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ صفت بھی اللہ ہی کی ہے جو اس نے اپنے بندے کو بخشی ہے۔ ارشادِ باری ہے۔

اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡھَا مِصۡبَاحٌ۔

(القرآن ۲۴/۳۶)

اللہ روشنی ہے اور آسمان کی اور زمین کی مثال اس کی روشنی کی ایسے ہے جیسے ایک طاق اس میں ہو ایک چراغ۔

کعب بن جبیر نے کہا کہ یہاں نورِ ثانی سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ مثل نور سے مراد نورِ محمد ﷺ ہے۔ دیگر مقامات پر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو نور فرمایا ہے۔ چناں چہ ارشادِ باری ہے:

قَدۡ جَاءَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ نُوۡرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیۡنٌ (القرآن ۵/۱۹)

بے شک تمھارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی۔

اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ شَاھِدًا و مُبَشِّراً و نَذِیْرًا او دا عِیًا اِلَی اللہِ بِاُذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْراً (القرآن ۴۴/۳۳)

اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا بتانے والا (گواہ) اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ۔

(۵) محبوبیت:

رسولِ کریم ﷺ کے خصائص میں سے یہ امر بھی بکثرت ثابت ہے کہ جمیع انبیا علیہم السلام کو خداوند تعالیٰ نے ان کے ناموں سے خطاب فرمایا ہے، مثلاً یا آدم، یا نوح، یا ابراہیم، یاداوٗد، یا زکریا، یا یحیٰ، یا عیسیٰ، یا موسیٰ لیکن رسولِ کریم ﷺ کے ساتھ یہ خصوصیت ہے کہ آپ کو آپ کے نام کے ساتھ خطاب کرنے کے بجائے یاایہاالرسول، یاایہاالنبی، یاایہاالمزمل، یاایہاالمدثر وغیرہ سے خطاب فرمایا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ آپ کی قدر و منزلت اور آپ کی محبوبیت خالقِ کائنات کی نظر میں نہایت بلند و ارفع ہے اور آپ بارگاہِ حق کے پیارے بندے ہیں۔ اس لیے خطاب بھی انھی الفاظ میں کیا گیا جن سے شانِ محبوبیت پوری طرح نمایاں ہوتی ہے رسولِ مقبول ﷺ کو خطاب بھی طرح طرح سے کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی ہر ادا مقبول اور ہر انداز محبوب ہے۔ قسمیں بھی کھائی جارہی ہیں تو اس پاکیزہ زندگی کی۔ **لعمرکَ انعم لفی سکرتھم یعمھون** ۷۲/۱۵۔

اہلِ تفسیر کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدتِ حیات کی قسم کھائی ہے یعنی اے محمد ﷺ قسم ہے تیری حیات کی۔ خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب میں سوائے رسولِ کریم ﷺ کی رسالت کے کسی اور نبی کی رسالت کی قسم نہیں کھائی۔ (قال النقاص)

(۶) عطائے الٰہی:

عہدۂ رسالت سے سرفرازی اور رحمتہ للعالمین کی بخشش اور عطائے نور کے ساتھ ظرف کی بے پایاں وسعت کے لیے جو سامان کیے گئے ہیں ان کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ الَّذِیْ ۙ

اَنْقَضَ ظَهْرَکَ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ ؕ (القرآن ۹۵)

کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ اور اُتار رکھا ہم نے تجھ پر سے بوجھ تیرا جس نے جھکا دی تھی پیٹھ تیری اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا۔

حضرت سہیل نے فرمایا شرحہ بنور الرسالۃ، حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا شرحہ بالاسلام اور الحسن کا قول ہے کہ ملا حکما و علما۔ گویا رسولِ کریم ﷺ کا سینۂ مبارک نورِ رسالت کے لیے کھول دیا، اسلام کے لیے کھول دیا اور علم و حکمت سے بھر دیا اور آپ ﷺ کے نام کو کائنات میں بلند کیا۔

حضرت قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ قلب کو ایمان اور ہدایت کے لیے کھول دیا اور قلب میں وسعت دی کہ علوم کو سمجھیں اور امورِ حکمت کے متحمل ہوں نیز امورِ جاہلیت کے بوجھ کو آپ ﷺ سے اُٹھا لیا۔

حضرت قتادہ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذکر کو دُنیا اور آخرت دونوں میں بلند فرمایا۔ اس کی حقیقت ہر خاص و عام پر ظاہر ہے کہ جہاں ہر کلمہ گو آپ کا نام لیوا ہے وہاں عالمِ ملکوت میں بھی آپ ﷺ پر درود و سلام کا ورد جاری ہے۔

اِنَّ اللہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْ تَسْلِیْما (القرآن ۳۳/۵۷)

اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر ایمان والو، رحمت بھیجو اس پر اور سلام بھیجو۔

جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ مربوط فرمایا وہاں آپ کے ذکر کو اپنے ذکر کے ساتھ شامل فرمایا ہے۔

اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اٰمنوا باللہ ورسولہ

ترجمہ: اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

نبوت کے عہدہ پر فائز کر کے خداوند تعالیٰ نے جن صفات سے متصف فرمایا ان کا بیان یہ ہے:

یَا اَیُّھَا النَّبِی اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّراً وَ نَذِیْراً وَدَاعِیًا اِلَی اللہِ بِاِذْنِہ وَسَرَاجاً مُّنِیْرا (القرآن ۳۳/۴۴)

اے نبی ﷺ ہم نے آپ تک آپ کی رسالت پہنچا کر آپ کو شاہد مقرر کیا اور اہلِ طاعت کے لیے مبشر یعنی خوش خبری دینے والا بنایا۔ ساتھ ہی اہلِ معصیت کے لیے نذیر یعنی ڈرانے والا مقرر کیا۔ اور توحید و رسالت کی طرف

داعی بنا کر بھیجا۔ نیز راہ کی تاریکی کو روشنی بخشنے کی خاطر سراجاً منیرا بنایا۔

قال اللہ تعالیٰ:

والضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذا سَجٰی مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرضٰی (القرآن ۹۴)

قسم دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جائے نہ رخصت کر دیا تجھ کو تیرے رب نے اور نہ بیزار ہوا البتہ آخرت کی زندگی پہلی زندگی سے بہتر ہے اور آگے دے گا تجھ کو تیرا رب پھر تو راضی ہوگا۔

اس سورۃ میں رسولِ کریم ﷺ کی کرامت وعظمت حسبِ ذیل وجوہ کی بنا پر ہے۔

اوّل یہ کہ خداوند تعالیٰ نے آپ ﷺ کے حال کی خبر دینے سے پہلے قسم کھائی ہے والضحٰی یعنی ورب الضحٰی۔ دوسرے یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس رسولِ کریم ﷺ کا کیا مقام ہے، فرمایا "ما ودعک بعد ان اصطفاک" جس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تجھے چھوڑا اور..... یا یہ کہ "ما اھملک بعذ ان اصطفاک" مقام اصطفا عطا کیا ہے اور مصطفٰی بنایا۔ آپ ﷺ کے لیے تیسری بزرگی "للاٰخرۃ خیر لک من الاولیٰ" بتائی یعنی الطاف وعنایت، کرامت اور بزرگی جو آپ کے لیے آخرت میں مقرر ہے وہ اس دُنیا کے اکرام سے بہتر ہے۔

سہل نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ جو مقامِ محمود اور شفاعت کا اکرام آپ ﷺ کے لیے آخرت میں رکھا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو اس دُنیا میں عطا کیا گیا ہے۔

چہارم یہ کہ "وَلسوف یعطیک ربک وترضٰی" فرما کر گویا گونا گوں انعامات کرامت اور سعادت کے اکرام کا اظہار ہے۔ جو دُنیا اور آخرت میں آپ کے شاملِ حال ہیں۔ ابنِ اسحاق نے کہا ہے کہ رسولِ کریم ﷺ کو اللہ جل شانہٗ راضی کرے گا دُنیا میں کامیابی سے اور آخرت میں ثواب سے (بالفلج ای الگوز فی الدنیا و فی الثواب فی الاخرہ) نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کو حوض اور شفاعت عطا فرمائے گا۔

پنجم یہ کہ خداوند تعالیٰ نے اپنی نعمتیں گنائی ہیں کہ کس کس حال سے اللہ تعالیٰ نے درجات کی بلندی عطا فرمائی۔ ہر حال کو ایک امتیازی شان بخشی۔ آپ ﷺ کے پاس مال نہ تھا مال عطا فرمایا، قلب کو عنایت ودیعت کر کے غنی بنایا، یتیمی کے زمانے میں دادا اور چچا کی صحبت کی آغوش میں پالا اور نہایت عزت واکرام سے خبر گیری کی، اللہ تعالیٰ کی یہ لطف کی نظر اس وقت بھی رہی جب معرفتِ الٰہی کی منزل دُور تھی۔

قال اللہ تعالیٰ:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوىٰ مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوىٰ وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحىٌ يُّوحىٰ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوىٰ ذُوْمِرَّةٍ ط فَاسْتَوىٰ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ثُمَّ دَنَافَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحىٰ اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحىٰ مَاكَذَبَ الفواد مَارَاىٰ (القرآن ۵۳)

قسم ہے تارے کی جب گرے، بہکا نہیں تمھارا رفیق اور نہ بے راہ چلا اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا اس کو سکھلایا مضبوط قوت والے نے پھر سیدھا بیٹھا اور وہ تھا اونچے کنارہ آسمان کے پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا پھر رہ گیا فرق دو کمان برابر یا اس سے بھی نزدیک پھر حکم بھیجا اللہ نے اپنے بندے پر جو بھیجا نہ غلطی کی دل نے جو اس نے دیکھا۔

ان آیاتِ فضیلت میں کئی امور بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قسم کے ساتھ آپ ﷺ کی ہدایت پر، خواہشات سے پاکی پر، نیز پیام کی صداقت پر شہادت دیتا ہے کہ آپ ﷺ کا ہر قول اور فعل وحیِ الٰہی کے تابع ہے۔ پھر آپ ﷺ کی اس فضیلت کا ذکر فرماتا ہے جو اللہ کے کسی اور بندے کو نصیب نہ ہوئی۔ آپ ﷺ نے اللہ کی بڑی شان دیکھی۔ عجائب الملکوت کا مشاہدہ فرمایا۔ فَاَوْحىٰ اِلٰى عَبْدِ مَا اَوْحىٰ میں ایجاز کا بلیغ ترین نمونہ ہے اور اس کنایہ کا تعلیمی پہلو بھی واضح ہے۔ "لَقَدْ رَاٰى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى" میں تفصیل وحی اور تعین آیات کبریٰ سے فہم عاجز ہے۔ قلب کی پاکیزگی "مَا كَذَبَ الْفُوآ وُمَا رَاىٰ" سے واضح ہے۔ زبان پر الطاف تقدس کے نزول کو مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوى کہہ کر بیان کیا ہے۔ کائنات کو دیدۂ بینا بخشنے والی آنکھ کی کیفیت "مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى" کہہ کر بیان کی ہے کہ جس میں بارگاہِ قدس کی تجلیاں بسی ہوئی ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ:

ن والقلم وَمَا يَسْطُرُوْنَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القرآن ۶۸)

قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں تو نہیں اپنے رب کے فضل سے دیوانہ اور تیرے واسطے بدلہ ہے بے انتہا اور تو پیدا ہوا ہے بڑے خلق پر۔

حضرت مصطفیٰ ﷺ کی تنزیہ پر قسم کے بعد حسنِ خطاب "مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ" سے فرمایا۔ "اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ" میں ان نوازشوں اور ثواب دائم کا ذکر

ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے رکھا ہے۔ "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم" کی تفسیر میں خلقہ القرآن، الاسلام، الطبع الکریم کہا گیا ہے۔ نیز یہ کہ لَیْسَ لَکَ ھِبَۃٌ الا لِلّٰہِ تعالیٰ اب وہ آیت درج کی جاتی ہے جس میں آپ ﷺ کے بے پایاں جذبۂ عبادت کا اظہار کیا گیا ہے اور آپ کو اس میں مبالغہ سے روکا گیا ہے۔

مَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی (القرآن ۲۰/۱۹)

ہم نے تجھ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تو تکلیف میں پڑے۔

جب اللہ اپنے بندے کو قریب کرتا ہے تو غیریت کے سارے پردے اُٹھا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی زبان اس کی اپنی زبان نہیں رہتی بلکہ منزل بن کر بارگاہِ قدس سے رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ "مَا یَنْطِقُ عَنِ الھَوٰیٰ اِن ھوا الّا وحیٌ—" سے یہ حقیقت ظاہر کی جا چکی ہے۔

دوسرے کہ یہ کہ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہ" (تحقیق جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے) اور "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ" (اللہ کا ہاتھ ہے اوپر ان کے ہاتھ کے) سے بھی یہ مضمون واضح ہے۔ "مَارَمَیْتَ اذا رَمَیْتَ ولکنّ اللّٰہ رمٰی" بھی اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے۔

ساقیِ کوثر کے لیے عطائے الٰہی کی یہ بھی صورتیں ہیں:

اِنَّا اَعْطَیناکَ الْکَوثَر فصَلِّ لِرَبِّکَ وَانحر اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ

(القرآن ۱۰۸)

بے شک ہم نے دی تجھ کو کوثر، سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر بے شک جو دشمن ہے تیرا وہی رہ گیا پیچھا کٹا۔

وَلَقَدْ اٰتَینَاکَ سَبعا مِّنَ الْمَثَانِی و القرآن العظیم

(القرآن ۱۵/۸۷)

اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں اور قرآن بڑے درجہ کا۔

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ و عَلَّمَکَ مَا لَم تَکُنْ تَعلَمُ و کَانَ فُضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا (القرآن ۴/۱۱۴)

اور اللہ نے اُتاری تجھ پر کتاب اور حکمت اور سکھائیں وہ باتیں جو تو نہ جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بہت بڑا ہے۔

فضلِ عظیم سے نبوت مراد لی گئی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ فضیلت

ہے جو ازل میں آپ کو بخشی گئی۔ نیز الواسطی نے احتمال روایت الٰہی کو بڑا فضل قرار دیا ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی محروم رہے۔

(۷) بنی نوع انسان سے آپ ﷺ کی رافت و رحمت:

بنی نوع انسان کی گمراہی اور زندگی کے خسارے کو دیکھ کر رحمتہ للعالمین کا پیچ و تاب، اضطراب، تأسف اور افسوس ذیل کی مختصر عبارت سے واضح ہو جائے گا۔

فَلَعَلَّکَ باخِعٌ نفْسَکَ عَلیٰ اٰثارِھِم ان تم یومنوا بِھٰذ الحَدِیثِ اسفا (القرآن ۱۷/۶)

سو کہیں تو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو پچتا پچتا کر۔

(۸) فضیلتِ رسولِ کریم ﷺ:

وَاِذْ اَخَذَ اللهُ مِیثَاقَ النَّبِیِّنَ لِمَا آتَیْتُکُم مِنْ کِتَابٍ وَّ حِکْمَۃُ (القرآن ۱۷۔۳)

اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتب اور علم۔

مفسرین نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے میثاقِ وحی کے ذریعے لیا کہ اگر وہ آپ کا زمانہ پائیں گے تو آپ ﷺ پر ایمان لائیں گے۔ نیز اس حقیقت کو اپنی اُمت پر ظاہر کریں گے۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ (القرآن ۲/۲۲۵)

یہ سب رسول فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے۔

درجات کی رفعت سے مراد رسولِ کریم ﷺ ہیں اس لیے کہ آپ ﷺ اسود و احمر کے لیے مبعوث ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے ''کَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَیْکَ عَظِیمًا'' فرما کر آپ کی فضیلت میں میثاقِ انبیا، نبوت، رسالت، خلۃ و محبت، رویت و قربت، اصطفی و اسرا، وحی، شفاعت، وسیلہ، درجہ رفیعہ، مقامِ محمود، براق، معراج، بعثۃ الی الاسود والاحمر، سیادت، امانت، ہدایت، رحمتِ عالم، کوثر، شرحِ صدر، رفعِ ذکر، نصرت و امانت الٰہی، سکینہ، تائید ملائک، علم و حکمت سبعا من المثانی والقرآن العظیم، صلوٰۃ الٰہی و ملائک وغیرہ وغیرہ کو شامل فرما دیا۔ پھر جبلتِ رسولِ کریم ﷺ میں کمال خلقت، جمالِ صورت،

قوتِ عقل، صحتِ فہم، فصاحتِ زبان، قوتِ حواس، قوتِ اعضا، اعتدالِ حرکات و سکنات، شرف قوم ونسب بھی اللہ کے فضل ہی کا نتیجہ ہے۔ آپ کے خلقِ عظیم میں بھی اللہ کا فضل آپ کے علم، حلم، وقار، بصیرت، عدل، زہد، تواضع، عفو، عفت، جود وسخا، شجاعت، مروت، شرم و حیا، رافت و رحمت، حسنِ ادب، حسنِ معاشرت سے ظاہر ہے۔

اتنے اخلاقِ کریمہ کا ایک انسان میں بہ درجۂ کمال جمع ہو جانا کمالِ بشریت کے انتہائی مقام کو ظاہر کرتا ہے جس کے بیان میں نعت گوشعرا نے بہتر سے بہتر الفاظ کو بھی عظمت کے صحیح اظہار کے لیے تہی داماں پایا۔ زیادہ سے زیادہ تخیل نے پرواز کی بھی تو یہ کہہ کر رہ گئے کہ:

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

لیکن اس سے بھی منعوت ﷺ کا صحیح مقام متعین نہ ہو سکا اور آخر اپنے عجز کے اعتراف میں کہنا پڑا کہ:

لایمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(ب) حدیث:

قرآنِ کریم کے بعد مستند طور پر جہاں نبی ﷺ کا ذکر ملتا ہے ان میں سب سے بڑا ذخیرہ حدیث کا ہے۔ بہت سی احادیث میں حضور اکرم ﷺ کی تعریف اور نعت ملتی ہے۔ سیرت و شمائل کی تمام حدیثیں اس میں داخل ہیں۔ یہاں ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(ا) وہ احادیث ہیں جن میں حضور اکرم ﷺ نے تحدیثِ نعت اور نفسِ واقعہ بیان کرنے کے لیے ایسے الفاظ بیان فرمائے ہیں جن سے نعت کا پہلو بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے لیے مندرجۂ ذیل احادیث بطورِ نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراھیم اسماعیل بنی کنانۃ و اصطفٰے من بنی کنانۃ قریشا و اصطفٰی من قریش بن ھاشم و اصطفانی من بن ھاشم۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو منتخب فرمایا اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں بنی

کنانہ کو اور بنی کنانہ کی اولاد میں قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔

قال الامام الترمذی رحمته علیه هذا حدیث حسن صحیح۔

(ابواب المناقب ترمذی، ص ۵۱۹، ج ۲)[☆۱]

امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

(۲) وفی روایة عن الترمذی باسناده عن العباس بن عبدالمطلب قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فانا خیرهم نفسا و خیرهم بیتا۔ (ترمذی، ص ۵۱۹، ج ۲)

ترمذی نے اپنی سند سے عباس بن عبدالمطلب سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''بس میں ان سب میں ذات اور خاندان کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوں۔''

(۳) عن انس بن مالک قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انا اول الناس خروجا اذا بعثوا وانا خطیبهم اذا وفدوا وانا مبشرهم اذا ایسوا لواء الحمد یومئذ بیدی وانا اکرم ولد بنی آدم علی ربی والا فخر۔ (ترمذی، ص ۵۱۹، ج ۲)

انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''(قیامت کے روز) لوگ جب اُٹھائے جائیں گے تو میں پہلا شخص ہوں گا (جو قبر سے اُٹھے گا) اور جب وفد بنا کر پیش کریں گے تو میں ان کی ترجمانی کرنے والا ہوں گا۔ اور میں ان کو بشارت دوں گا جب کہ وہ نا اُمید ہوں گے۔ اس دن میرے قبضے میں حمد کا جھنڈا ہوگا۔ اور میں اپنے پروردگار کے نزدیک اولادِ آدم میں سب سے زیادہ عزت یافتہ ہوں گا، لیکن (یہ بطور) فخر نہیں ہے۔

(۴) عن النبی صلی الله علیه وسلم قال اذا کان یوم القیامة کنت امام لنّبییّن و خطیبهم و صاحب شفاعتهم غیر فخر۔

(ترمذی، ص ۵۲۰، ج ۲)

☆۱۔ ترمذی کے جتنے حوالے درج ہیں وہ ترمذی مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ ۱۳۱۶ھ سے منقول ہیں۔

حضور اکرم ﷺ سے روایت ہے کہ جب قیامت کا روز ہوگا تو میں انبیا کا امام اور ان کا خطیب اور شفاعت کرنے والا ہوں گا، لیکن (اس پر مجھے) فخر نہیں ہے۔

(۵) انا سید ولد آدم یوم القیامة ولا فخر وبیدی لواء لحمد و ولا فخر وما ھن نبی یومئذ ادم فمن سواء الا تحت لوائی

میں قیامت کے روز بنی آدمؑ کا سردار ہوں گا اور میرے قبضے میں لواء حمد ہوگا اور اس روز ہر نبی، آدم ہوں یا اور کوئی، ہر ایک میرے جھنڈے کے نیچے ہوگا، لیکن مجھے (اس پر) فخر نہیں ہے۔

(۶) فی حدیث طویل قال النبی صلی اللہ علیه وسلم وانا حبیب اللہ ولا فخر وانا حامل لواء الحمد یوم القیامة ولا فخر وانا اوّل شافع و اوّل مشفع والافخر — وانا اکرم الاولین والاخرین ولا فخر۔ (ترمذی، ص ۵۱۹، ج ۲)

ایک طویل حدیث کے مضمون کے بعض اجزا ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کا حبیب ہوں اور روزِ قیامت لواء حمد کا علم بردار ہوں اور میں پہلا شفاعت کرنے والا ہوں اور پہلا وہ شخص ہوں جس کی سفارش قبول کی جائے گی۔ اور تمام اوّل آخر لوگوں میں سب سے زیادہ بزرگ اور عزت یافتہ ہوں۔ (لیکن فخر نہیں ہے)۔

(۲) احادیث کی دوسری قسم:

دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جن میں صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے متعلق تعریفی جملے بیان کیے ہیں۔ اس میں آپ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ، اوصاف، سیرت اور کردار، رفتار و گفتار، معاشرت، تعلقات اور معاملات آپ کی نشست، برخاست غرض زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے کے متعلق مدحیہ اور نعتیہ جملے نقل ہیں، مثلاً:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث جو امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کی ابتدا ہی میں باب بدء الوحی کے عنوان کے تحت درج کی ہے۔ اس حدیث میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حسبِ ذیل تعریفی جملے آپ کے متعلق کہے ہیں:

(۱) فقالت خدیجة کلا واللہ مایخریک اللہ ابارا. انک تصل الرحم و تحمل الکل و تکسب المدوم و تقوی الضعیف و تعین علیٰ نوائب الحق☆۱

پھر خدیجہؓ نے کہا، ہرگز نہیں، اللہ کی قسم آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ ﷺ صلۂ رحمی کرتے اور بوجھ اُٹھاتے اور محتاج کی مدد فرماتے اور مہمان نوازی فرماتے۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کے اخلاقِ حسنہ اور سراپا کو نقل کرتے ہوئے فرمایا:

وھو خاتم النبیین اجود الناس صدر اصدق الناس ھٰجة والینھم عریکة او اکرمھم عشیرة (شمائل ترمذی، ص:۵۶۸)

اور آپ خاتم النبیین ﷺ، سخاوت میں سب سے زیادہ سخی، گفتگو میں سب ے زیادہ سچے، طبیعت میں سب سے زیادہ نرم اور کنبے اور خاندان کے لحاظ سے شریف ترین تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے گفتگو کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

(۳) (عن عائمة قالت) ماکان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یسود سود کم ھذا ولکنة کان یتکلم بکلام بینه فصل یخفظه من جلس الیه ھذا حدیث حسن صحیح (ترمذی، ابواب المناقب، ص:۵۲۴)

رسول اللہ ﷺ اس طرح جلد جلد گفتگو نہ فرماتے جس طور پر کہ تم کرتے ہو، بلکہ آپ ﷺ کی گفتگو صاف ہوتی اور الفاظ ایک دوسرے سے جدا ہوتے۔ جو بھی آپ ﷺ کے پاس بیٹھتا اسے آپ کا کلام یاد ہو جاتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جو حضور ﷺ کے گفتگو کرنے کی تعریف کی ہے، اسے امام ترمذی نے ابواب المناقب میں درج کیا ہے:

(۴) عن انس بن مالک قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بعید الکلمة ثلاثا لتعقل عنه (ترمذی، ابواب المناقب، ص:۵۲۴)

حضرت انسؓ کا قول ہے کہ حضور ﷺ (گفتگو کرتے وقت) لفظ کو تین تین بار دُہراتے تھے تاکہ آپ ﷺ سے اُسے (اچھی طرح) سمجھ لیا جائے۔

☆۱۔ بخاری باب بدء الوحی، ص:۳، مطبوعہ عثمانیہ مصری ۱۹۳۲ء

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت ہے جسے امام بخاری نے باب بدء الوحی میں ذکر کیا ہے۔ اس طویل حدیث کا نعتیہ مضمون مندرجہ ذیل ہے:

(۵) فلرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود بالخیر من الریح مرسلۃ (باب بدء الوحی بخاری مصری، جلد ۱، ص:۴)

پس حضور اکرم ﷺ نیک کاموں کے کرنے میں جو تیز رو ہوا س سے زیادہ تیز چلنے والے تھے۔

غرض کہ حضور اکرم ﷺ کی تعریف و ثنا میں کثرت سے صحابہؓ سے کوئی نہ کوئی قول یا لفظ منقول ہے۔ اور ہر طبقے کے صحابیوں نے حضور اکرم ﷺ کی تعریف کے سلسلے میں آپ کے اخلاق، آداب، معاشرت، سیرت، کردار، گفتار، رفتار کی تعریف اور توصیف کی ہے۔

یوں تو حدیث کی ہر کتاب میں حضور اکرم ﷺ کی تعریف ہے، لیکن امام ترمذی نے اپنی کتاب سننِ ترمذی میں دوسری کتب حدیث کی طرح ابواب مناقب النبی ﷺ لکھنے کے بعد حضور اکرم ﷺ کے متعلق احادیث کا ایک چھوٹا سا مجموعہ الگ مرتب کیا ہے جسے شمائل النبی ﷺ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کتاب میں ۵۶ عنوانات کے تحت حضور اکرم ﷺ کی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق صحابہؓ کی بیان کردہ تعریف و توصیف نقل کی ہے۔ ان میں سے چند عنوانات نموننۃً دیے جاتے ہیں۔

۱۔ حضور اکرم ﷺ کے سراپا کا بیان (اس میں اخلاقِ حسنہ کا بیان کیا ہے)

۲۔ مہرِ نبوت کا بیان

۳۔ بالوں کا بیان، اور ان میں کنگھی کرنے کا بیان

۴۔ بال سفید ہونے کا ذکر

۵۔ خضاب کا ذکر

۶۔ زرہ، تلوار، لباس کا بیان

۷۔ عمامہ، تہ بند، لباس کا بیان

۸۔ کھانے کا طریقہ، روٹی، سالن کا بیان

۹۔ وضو، بات چیت، میوہ جات کا استعمال، پانی پینے کی کیفیت، عطر، نیند، مذاق، عبادت اور اس کی تفصیل کا بیان

۱۰۔ تواضع، اخلاق، حیا، اسمائے مبارک، بسر اوقات

ان عنوانات میں سے بعض کو ملا کر لکھا گیا ہے لیکن اصل کتاب میں الگ الگ ہیں۔

اس کے علاوہ دیگر احادیث میں اس طور پر بھی آنحضرت ﷺ کی تعریف اور توصیف پائی جاتی ہے:

۱۔ احادیثِ قدسیہ میں حضرت حق جل مجدہ کے کلام سے حضور ﷺ کی تعریف

۲۔ انبیاء سابقین کے کلام سے حضور ﷺ کی توصیف

۳۔ ملائکہ کے کلام سے آنحضرت ﷺ کی ثنا وغیرہ

مخالفین اور مشرکین کی تعریف:

نہ صرف آپ ﷺ کے جاں نثاروں نے ہی آپ ﷺ کی مدح و ثنا کی ہے بلکہ آپ ﷺ کے دشمن بھی آپ ﷺ کی رسالت کی مخالفت کے باوجود آپ ﷺ کی تعریف و توصیف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس قول کی تائید حسبِ ذیل واقعات میں ملتی ہے:

۱۔ حضرت خدیجہؓ سے آپ ﷺ کے نکاح کے وقت حضرت ابو طالب کا خطبہ

۲۔ حجرِ اسود نصب کرتے وقت آپ کو کفارِ مکہ کا حکم بنانا

۳۔ قیصرِ روم کے دربار میں حضرت سفیان کی شہادت وغیرہ وغیرہ

نعتیہ شاعری بحیثیت نوعِ سخن:

ہمارے ادب میں شاعری کی تقسیم زیادہ تر بحر، وزن، قافیہ، ردیف وغیرہ کے لحاظ سے کی گئی ہے اور نتیجتاً اصنافِ شاعری کو قصیدہ، غزل، مثنوی اور اسی قبیل کے دیگر اصناف تک ہی محدود رکھا گیا ہے جس میں مضمون اور معنی کا لحاظ کم سے کم پایا جاتا ہے حالاں کہ شاعری کا یہ پہلو زیادہ توجہ طلب ہے۔ جن محققین نے اس کی تقسیم ادبی حیثیت سے کی ہے، انھوں نے اس کے دیگر اصناف پر بھی روشنی ڈالی ہے جو بحر، وزن، قافیہ، ردیف وغیرہ میں مروّجہ اصناف شاعری سے الگ نہیں ہیں، لیکن معنی کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اس معنوی تقسیم کے لیے ضروری ہے کہ ادب کو مختلف حیثیتوں سے سمجھا جائے اور اس کے متعلق محققین نے جو رائیں پیش کی ہیں انھیں بھی نظر میں رکھا جائے۔

ثعالبی نے ادب کو بارہ شاخوں میں تقسیم کیا ہے جن میں صَرف، نحو، اشتقاق، لغت، قافیہ، عروض، معانی و بیان کو اصول قرار دیا ہے۔ اور علم الخط، انشا، شعر اور تاریخ کو فروع گردانا ہے۔

یہاں ہم ادب کی مختصر لیکن جامع تعریف پر اکتفا کریں گے۔

''روحانی اور ذہنیاتی شخصیت کے استخراج کو حروف کے ذریعے اُجاگر کرنے کو ادبیات اور خصوصاً شاعری یا 'ڈرامائی' ادبیات کہیں گے۔''☆[۱]

اس طرح شاعری کو ادب کی اس صنف سے متعلق کیا جائے گا، جسے فنون لطیفہ کہا جاتا ہے۔ فنونِ لطیفہ انسان کے لیے دماغ، وجدانی اور روحانی غذا فراہم کرتے ہیں۔ فن کار اپنی قلبی واردات کی ایسی جیتی جاگتی کیفیت آمیز اور کیفیت انگیز تصویر پیش کرتا ہے جو احساس کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ انسان کا دل و دماغ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ارسطو نے فنونِ لطیفہ کو فطرت کا محاکات قرار دیا ہے۔ یہ فطری امر ہے کہ جب انسان کسی چیز سے متاثر ہو کر مسرت محسوس کرتا ہے اور ان مسرت کے جذبات کو الفاظ کے جامے میں دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے تو گویا وہ اس طرح فطرت کے نقوش، تأثر کو دوسروں کے دل و دماغ پر منعکس کرکے ان کے محسوسات کو اس داخلی صداقت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہی اس فن کی اصل ہے۔

ادب کو نظم و نثر میں تقسیم کر دینا بھی صرف صوری تقسیم ہوئی معنوی حیثیت سے اب بھی مناسب تقسیم عمل میں نہیں آئی۔ قدیم عرب میں جو شعر کے معنی سمجھے جاتے تھے اس کا بیان ہمارے اس خیال کو اور واضح کرے گا۔ مولانا حالؔی کے الفاظ میں ''جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی مؤثر اور دل کش تقریر کرتا تھا تو اس کو شاعر جانتے تھے۔ جاہلیت کی قدیم شاعری میں زیادہ تر اس قسم کے برجستہ اور دلآویز فقرے اور مثالیں پائی جاتی ہیں جو عرب کی عام بول چال سے فوقیت اور امتیاز رکھتی تھیں۔ یہی سبب تھا، جب قریش نے قرآنِ مجید کی نرالی اور عجیب عبارت سنی تو انھوں نے اس کو کلامِ الٰہی نہ مانا۔ وہ رسولِ خدا ﷺ کو شاعر کہنے لگے، حالاں کہ قرآن شریف میں وزن کا مطلق التزام نہ تھا۔''☆[۲]

ملٹن نے نظم و نثر کے درمیان جوش اور سنجیدگی سے فرق پیدا کیا ہے جو ایک حد تک صحیح ضرور ہے، لیکن کلیتہً اطمینان بخش نہیں ہے۔

ہزلٹ نے شاعری کو تخیل اور جذبات کی زبان قرار دیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ انسان کا قلب مختلف احساسات کی آماج گاہ ہے۔ کبھی وہ خوشی محسوس کرتا ہے اور کبھی غم۔ جب اس کا دل خوشی سے پھولے نہیں سماتا تو زندگی اس کے لیے ہر رنگ میں محبوب بن جاتی ہے۔ اس کے

☆۱۔ ایچ کورسان ان لٹریری اسٹیڈی، ص:۲۴، ملاحظہ ہو، ''روحِ تنقید''، ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ، مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن، ۱۹۹۴ء، ص:۵

☆۲۔ مقدمہ شعر و شاعری، ص:۳۰۔۳۱

لیے ذرّہ ذرّہ کیف آور اور مسرت انگیز ہوتا ہے اور جب وہ دل میں غم کی تنگی محسوس کرنے لگتا ہے تو زندگی اس کے لیے وحشت خیز بن جاتی ہے۔ کبھی وہ خوف کے جذبات سے دوچار ہوتا ہے، کبھی وہ رغبت محسوس کرتا ہے اور کبھی غصہ۔

حقیقت میں شاعری کا میدان انسان کے قلب کی یہی کیفیت ہے، لہٰذا اصنافِ سخن کی تقسیم میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ جذبات کے اختلاف کی مناسبت سے ان کو جدا جدا نام دیا جا سکے۔ چناں چہ مسرت کے جذبات میں جہاں شعرا نے غزل سرائی کی تو غصہ ہجو کی شکل میں نمودار ہوا۔ رغبت نے مدح وشکر کو جگہ دی تو خوف نے اعتزار اور استعطاف کو۔

بعض ادیبوں نے اصولاً شعر کی صرف دو قسمیں بنائی ہیں یعنی مدح و ذم اور دیگر اقسام کو انھی سے متعلق کر دیا ہے، مثلاً وصف، مرثیہ، تشبیب، غزل، تشبیہہ، استعارہ، امثال، زہد، تقویٰ، وعظ و نصیحت وغیرہ کو مدح شمار کیا ہے اور باقی اصناف کو ہجو قرار دیا ہے۔[☆۱]

ہمارا موضوع یعنی ''نعت'' پہلی قسم میں شمار ہوگا جسے ہم تعریف، توصیف، مدح و ثنا سے تعبیر کریں گے۔

عربی میں نعت کا بیشتر حصہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کہا گیا اور اس لحاظ سے اسے مرثیہ سے تعبیر کرنا چاہیے تھا، لیکن یہ صورت نہیں ہے۔ یہی حال فارسی اور اُردو نعت کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور دیگر بزرگانِ دین کے ساتھ یہ خصوصیت رہی کہ ان کی حیاتِ ارضی کے بعد بھی خطاب کا طرز وہی رکھا گیا جو ایک زندہ کے لیے ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کا اصل حیات ہونا صاحبِ ایمان کے نزدیک مسلم ہے اور آپ کی وساطت سے بزرگانِ دین کا حیاتِ جاودانی حاصل کر لینا بھی عقیدت ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ کا مقصد متوفی کے غم میں اظہارِ حزن و ملال ہے۔ اس کے برخلاف یہاں بارگاہِ نبوت میں عقیدت کے پھول پیش کر کے محاسنِ دین اور شمائلِ رسول ﷺ کا اعلان مقصود ہے تاکہ یہ تقربِ الٰہی کا ذریعہ بنے۔ اس لحاظ سے اس قسم کے اشعار کو مدائحِ نبوی میں شمار کریں گے۔ یہ ضرور ہے کہ نعت گو شعرا نے وفات نامے بھی لکھے ہیں، جن میں رسولِ مقبول ﷺ کی وفات کا حال نظم کیا ہے۔ اس قسم کے کلام کو اگر ہم مرثیہ کا نام دیں تو غلط نہیں ہوگا، لیکن یہ تفریق موقوف ہے اس مضمون پر جو شاعر نے نظم کیا ہے۔

☆۱۔ کتاب العمدہ، جلد اوّل، ص: ۷۷، ۷۸

لوازمِ نعت:

یوں نعت گو شعرا کی تعداد بے حد و حساب ہے۔ ہر کس و ناکس نے عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر میلاد خوانوں کے لیے آئے دن اس ادب میں اضافہ ہی کیا۔ ان میں ہم عوام کے نعت گو شعرا بھی کثرت سے پاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ موضوع ایسا نہیں جس پر ہر کس و ناکس تخیل اندازی اور خامہ فرسائی کر سکے۔ اس راستے میں شاعر کو جگہ جگہ رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ایک تو موضوع کا احترام شاعر کو مجبور کرتا ہے کہ وہ نپے تلے الفاظ، حسنِ خطاب اور حسنِ بیان کے ساتھ عقیدے کی تفصیلات اور باریکیوں کو صحت کے ساتھ لے کر چلے اور قدم قدم پر اس کا لحاظ کرے کہ تخیل کی پرواز کہیں ان مقامات تک نہ پہنچا دے جن سے صادق البیانی پر حرف آئے اور نتیجتاً نعت، نعت نہ رہے کیوں کہ جس بارگاہ میں باآوازِ بلند گفتگو بھی سوے ادب قرار پائے اس بارگاہ کے آداب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ میدان وسیع بھی ہے اور تنگ بھی۔ وسیع اس لحاظ سے کہ ممدوح کے فضائل جس قدر بے حد و حساب ہوں گے، شاعر کو اسی قدر موضوع کی وسعت ہاتھ آئے گی اور اس کے تخیل کی بلند پروازی کا سامان ہو سکے گا۔ یہاں شاعر حسن و خوبی پیدا کرنے کے لیے مبالغے کی زحمت سے بھی بچ جاتا ہے اور پھر جہاں منعوت (ممدوح) کے فضائل مبالغے کے حدود سے آگے گزر گئے ہوں وہاں تخیل کی بلند ترین پرواز کو بھی کمالِ ممدوح سے پس ماندہ ہونا پڑتا ہے۔ فضائلِ نبوی ﷺ کے بیان میں شاعر زمین سے پرواز کر کے افلاک کی سیر کرتا ہے۔ وہ ستاروں سے آگے گزر کر مقامِ مصطفائی کا مشاہدہ کرتا ہے یہاں تک کہ تمام افلاک اس کے تخیل کی زد میں آ جاتے ہیں۔ اور اب وہ اپنے ممدوح کو عرش و کرسی پر جلوہ فرما پاتا ہے۔ اس لحاظ سے نعت گو شاعر کو طبع آزمائی کے لیے ایک وسیع میدان ہاتھ آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نقاد کی دسترس سے بھی باہر رہتا ہے اور اپنے معتقدات کو سپر بناتے ہوئے ہر تنقید سے کامیاب گزر جاتا ہے۔ یہ میدان تنگ اس لحاظ سے ہے کہ باوجود اس فضا کی کشادگی اور وسعت کے تخیل کے حوصلوں کو اس بلندی کا ساتھ دینا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے شاعر میں گوناگوں صلاحیتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ فقط عشق و محبت کی داستان نہیں ہے جس کے راگ کو جس نے جیسا چاہا الاپ لیا۔ دراصل یہ ایک ایسے ممدوح کی مدح ہے جس کی بارگاہ میں مبالغہ قربتِ ممدوح کا وسیلہ نہیں بن سکتا ہے اور نہ یہاں اس بیان کو باریابی حاصل ہے جو صادق البیانی کی ترجمانی سے محروم ہے۔ پھر صدق و صفا کی زندگی کو

سمجھنے کے لیے صدق و صفا کی حقیقت اور اس کی کیفیت کو قلب و نظر میں بسائے بغیر بھی کام نہیں چلتا۔ غرض کہ حقیقتِ محمدی ﷺ کو سمجھ کر ان کے مرتبے کا بیان علم، فضل، بصیرت اور شاعرانہ صلاحیت چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان فضائل کا ایک جگہ جمع ہونا آسان نہیں ہے اور انجامِ کار نعت کے موضوع سے عہدہ برآ ہونا بھی مشکل ہے۔

نعتیہ شاعری کے محرکات:

نعتِ رسول اللہ ﷺ مذہبی شاعری کے مقدمات میں شامل ہے جس کا تعلق دینی احساس، صدق، اخلاص اور محبتِ رسول ﷺ سے ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی شاعری کی ابتدا میں نعت کو اوّلیت حاصل ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ نعتیہ شاعری نے اسلامی ادب کے لیے ایک نہایت جلیل القدر اور مہتم بالشان باب فراہم کیا ہے۔ آخر اس کے محرکات کیا رہے ہیں اس کا اجمالی بیان درجِ ذیل ہے:

مومن کے لیے اللہ اور رسول سے محبت کو مذہباً وجوب کا درجہ حاصل ہے۔ چناں چہ احادیث میں جو تاکید اس خصوص میں وارد ہوئی ہے اس سے اس کی کیفیت کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔

> **عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلاث من کن فیه وجد بهن جلاوة الایمان — من کان اللہ ورسوله احب الیه مما سواهما وان یحب المرٔ لا یحبه الا للہ و ان یکره ان یعود فی الکفر بعد ان انقذه اللہ منه کما یکره ان یقذف فی النار۔** [☆۱]

> حضرت انسؓ نے نبیِ کریم ﷺ سے روایت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا، جس میں تین چیزیں ہوں گی وہ ایمان کی مٹھاس پائے گا۔ وہ کہ جسے اللہ اور اس کا رسول ﷺ سب سے زیادہ محبوب ہوں اور وہ کسی شخص سے محبت کرتا ہے تو فقط اللہ کے لیے کرتا ہے اور وہ ناپسند کرتا ہے کفر کی طرف لوٹنے کے بعد اس کے کہ اللہ نے اسے اس سے (کفر سے) نکالا ہوا۔ اسی طرح جس طرح کہ وہ ناپسند کرتا ہے اپنے آپ آگ میں ڈالے جانے کو۔

یہ حدیث اصولِ اسلام میں نہایت اہم اور عظیم القدر شمار کی جاتی ہے، اس لیے کہ حلاوتِ ایمان کی لذت محبت کے بغیر ممکن نہیں اور اطاعت کی طرف رغبت حلاوت کے بغیر محال

☆۱۔ صحیح مسلم، جلد اوّل، ص: ۴۹، مطبوعہ اصح المطابع، لکھنؤ ۱۳۴۹ھ

ہے۔ محبت ہی اللہ اور رسول ﷺ کی رضا جوئی میں ہر ایثار کے لیے تیار کر سکتی ہے، جو اطاعت کی راہ میں ناگزیر ہے۔ اطاعت کے معنی ہی دل کا لگاؤ ہے۔

عشق و محبت کے چند محرکات ہوتے ہیں اور وہ حسن و جمال ہیں۔ پھر حسن و جمال بھی ظاہر اور باطن دو طرح کے ہیں۔ محبوبِ دو عالم ﷺ کی ذات میں محبت کے دونوں اصل اصول جمع ہیں۔ کمالِ خلق جس میں جمال کی ساری صورتیں پائی جاتی ہیں، آپ ﷺ کو بخشا گیا ہے۔ پھر وہ کمال احسان جو دلوں کو موہ لیتا ہے اور میلانِ طبع کو زیادہ بڑھاتا ہے۔ آپ ﷺ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جب حقیقت اور حق شناسی کا شعور اس حد تک بیدار ہو جاتا ہے کہ ایک مومن اس احسان کو ہر سانس کے ساتھ محسوس کرنے لگتا ہے تو محبتِ نبی ﷺ اس کے رگ و پے میں بس جاتی ہے، جس کے صدقے میں صراطِ مستقیم، شفاعت، سعادت اور آخر الامر جہنم کی آگ سے خلاصی اور جنت سے سرفرازی نصیب ہوتی ہے، اس محبت کا ماں باپ، اولاد اور جان و مال کی محبت پر غالب آ جانا ایک فطری امر ہے۔ یہی مطلب ہے اس دوسری حدیث کا کہ:

لایومن احدکم حتی اکون احبُّ الیه من اهله وماله والناس اجمعین (مسلم جلد اوّل، ص:۴۹)

رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا، ''تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان نہ لایا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے اہل و عیال اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان انس بن مالک — قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لا یومن احدکم حتی اکون احب الیه من ولده ووالده واللناس اجمعین (مسلم، جلد اوّل، ص۴۹)

رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا، نہیں ایمان لایا تم میں سے کوئی جب تک میں اس کے بیٹے، والد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اس کے علاوہ نعتیہ ادب کے محرکات میں مندرجہ ذیل حدیث نہایت مہتم بالشان ہے جس نے نثر و نظم، تحریر اور تقریر کے مقدمات میں نعت کو لازم قرار دیا اور اس طرح ادب کے لیے پابندی عائد کر دی۔

کُلُّ امر ذی بال لایبداء فیه بحمداللّٰہ والصوة علیٰ فهوا قطع ابتر

ممحوق من کل برکة. اخرجه

ہر مہتم بالشان کام جو اللہ کی تعریف اور مجھ پر درود کے ساتھ نہ شروع کیا جائے تو وہ ناقص اور ہر برکت سے مٹا ہوا (محروم) ہے۔

الرھاوی فی الاربیعین والدّیلمی فی سند الفردوس، وفی سنده ضعف

اس حدیث کو راوی نے اپنی کتاب اربعین میں اور دیلمی نے کتاب مسند الفردوس میں درج کیا ہے، لیکن اس کی سند کم زور (ضعیف) ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی ادب کی نظم و نثر دونوں میں حمد و نعت کے مضامین لازماً ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم کسی شاعر کو نعت گوشعرا کے زمرے سے خارج نہیں کر سکتے، البتہ باہم یہ فرق ضرور ہے کہ کسی نے نعت رسماً، تبرکاً اور عقیدۃً تمہیدی طور پر کہی ہے اور کسی نے جوشِ عقیدت کے طور پر اکثر یا مستقلاً نعت کہی ہے۔ اس طرح نعت گوشعرا کے تین طبقے ہوگئے۔ ایک تو وہ جن کے کلام میں نعت، حمد کے سامنے تمہیداً ہے۔ دوسرے وہ جن کے کلام میں دیگر مضامین کے ساتھ نعتیہ مضامین کا بھی کافی ذخیرہ ہے۔ تیسرے وہ جن کا کلام اغلب طور پر کلیتہً نعتیہ ہے۔

نعت گوئی کی قسمیں:

نعت کو ہم تین حصوں میں تقسیم کریں گے:

۱۔ ایک وہ نعت جو عقیدۃً، تبرکاً اور رسماً برائے نام لکھی گئی

۲۔ دوسری مقصدی نعت جو شعرا نے مستقلاً لکھیں

۳۔ تیسری قسم کو اصلاحی نعت قرار دیں گے جو دراصل مقصدی نعت ہی کی ایک قسم ہے

(۱) رسمی نعت

اسلامی ادب میں نظم و نثر کی ہر کاوش نے اپنے تمہیدی حصے میں حمد و نعت کو لازماً جگہ دی۔ جس طرح رسولِ کریم ﷺ پر زندگی میں ایک بار درود بھیجنا واجب ہے اسی طرح ہر نثار اور شاعر کے لیے فرض رہا ہے کہ حمد اور نعت کو نثر یا نظم کے ساتھ شامل کرے۔ اس سے پہلے وہ حدیث درج کی جا چکی ہے جس میں ہر مہتم بالشان امر کو حمد اور نعت کے بعد شروع کرنے کا حکم ہے۔ اور بصورتِ دیگر کلام کو برکت سے محروم قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسمی اور اعتقادی طور پر نعت شعرا کے کلام میں لازماً داخل ہوگئی۔ یہاں تک کہ غیر مسلم شعرا نے بھی تقلیداً یہ روش اختیار

کی جس کی مثالیں ہمیں اُردو شاعری میں کثرت سے ملتی ہیں۔

(۲) مقصدی نعت

جب کسی کام کا کوئی مقصد قرار پاتا ہے اور اس کے پیشِ نظر فکر کو حرکت دی جاتی ہے تو اس میں ایک نظم، ضبط، ترتیب، ہم آہنگی، خلوص اور اثر پایا جاتا ہے۔ نفسِ مضمون کے اظہار میں قوت، جوش اور تڑپ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس فن کار کا دماغ جب مقصدی فکر سے خالی ہوتا ہے تو اس کے تخیل کو بمصداق "فی کل واذ هيمون" بھٹکنا پڑتا ہے۔ وہ فقط وقتی طور پر اپنے سریلے نغموں سے لوگوں کے دلوں کو لبھانا جانتا ہے اور یہ کیف، جذب اور مستی کی بے مقصدی اعصاب میں اضمحلال پیدا کر دیتی ہے۔ ایسا کلام احساسات کے لیے پراگندگی کا باعث ہوتا ہے۔

مقصدی شاعری ہی حقیقت میں زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس کا لازوال جذبہ زندگی کو حرکت عطا کرتا ہے۔ اس کا نغمہ دل کی گہرائیوں سے خلوص کو لے کر بلند ہوتا ہے۔ وہ قلوب سے ٹکرا کر آوازِ بازگشت پیدا کرتا ہے اور اپنی کیفیت کے تاثرات چھوڑتا ہوا زندگی کے لیے دائمی بقا کا سامان کرتا ہے۔ حقیقت میں اس کو حق وصداقت کی آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ کلام "ان من البیان السحر ا"، ہی کا نمونہ نہیں ہوتا، بلکہ "ان من البیان لحکمۃ" کا بھی اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

اس طرح جب شعر مقصدی بن جاتا ہے تو وہ اپنی ہر لَے میں کسی نہ کسی طور پر اس تصورِ حیات کی ترجمانی کرتا ہے جو اس کا مقصود ہے۔ وہ زندگی پر نہایت گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ پوشیدہ صلاحیتوں کو حوصلہ بخشتا ہے اور جمالی جذبات کو اُبھار کر انھیں زندگی کی تعمیر میں لگاتا ہے۔ جہاں اس کا ظاہری حسن دلوں کو کھینچتا ہے وہاں وہ روحانی اور اخلاقی معلّم بن کر مقدرات کو بدل دیتا ہے حقیقت میں مقصدی شاعری کی یہی خدمت زندگی کی پراگندگی کو دور کر سکتی ہے۔ آرٹ اور زندگی کے نظریے کو مختلف طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن اس نظریے کے ماننے والوں کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ آرٹ حقیقت میں زندگی کی تفسیر ہے اور اس کی تعبیر ہے۔ لیکن زندگی کیا ہے؟ یہ مسئلہ خود جتنا مہتم بالشان ہے اتنا ہی حیران کن ہے۔ اس عقدہ کشائی پر آرٹ اور زندگی کے نظریے کا حل موقوف ہے۔ زندگی کی قدروں کا تعین، طہارت کا مفہوم، اخبارات کا تصور، عدالت کا معیار، سماجی کی کیفیت وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کے متعلق صحیح فکر و نظر پیدا کیے بغیر زندگی کا راز سمجھ میں نہیں آتا اور نہ اس کی غایت اور اس کا مقصد واضح ہوتا ہے۔ حکیمانہ نظر ان سب کو عقل کے سہارے حل کرنا چاہتی ہے، لیکن ایک تو انسانی فہم کی کوتاہی حقیقتِ حال تک پہنچنے نہیں دیتی۔

دوسری نظری اور عملی صورتوں کے درمیان نا قابلِ عبور خلیج کا پاٹنا انسانی تدابیر کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے پیشِ نظر ایک ایسی زندگی کا نمونہ ہو جو نظری طور پر زندگی کو بے نقاب دکھا کر اسوۂ حسنہ کو پیش کرے اور زبانِ حال سے یہ کہے کہ "عملی لحاظ سے بھی یہ تصورِ حیات اس طرح درست ہے جس طرح نظری حیثیت سے۔"

اگر اس خلقِ عظیم کی ترجمانی ہمارے آرٹ کا مقصد ٹھہرا تو اس کے اظہار کے لیے ایک صحت بخش موضوع ہاتھ آئے گا جس کی ہمہ گیری میں زندگی کی جملہ تفصیلات آ جائیں گی۔ مذہبی، اخلاقی، روحانی، معاشی، معاشرتی، دُنیاوی، اُخروی، جمالی، جلالی غرض کہ زندگی کے ساتھ جتنی بھی صورتیں پیش آ سکتی ہیں سبھی کا بیان اس تفسیرِ حیات میں آ جائے گا۔ آرٹ کا موضوع اگر زندگی ہے تو اسے مکمل زندگی ہونا چاہیے۔ ایسی زندگی کہ جس کے کمال کے آگے عروج کی منزلیں پس ماندہ ہوں اور فکر و نظر کی انتہائی پرواز کو بھی اپنے عجز کا اعتراف کرنا پڑے۔ زندگی کا یہ کمال اپنی تفسیر کے لیے جب شاعری کا موضوع بن جاتا ہے تو شاعری حقیقت میں وہ شاعری نہیں رہتی کہ جس پر بے مقصدی یا آوارہ خیالی کی تہمت لگائی جائے۔ نعت گو شعرا نے جس زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اس کا نمونہ زندگی کے گونا گوں مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ وہ مسائل نظری بھی ہیں، فکری بھی ہیں اور عملی بھی۔ مثال کے طور پر اقبال کی شاعری کو مقصدی شاعری کہا جاتا ہے اور ان کے آرٹ کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ بتایا جاتا ہے۔ دراصل اقبال کی یہ مقصدی شاعری بھی اس ایک حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہے جسے حقیقت محمدی ﷺ کہتے ہیں۔ اقبال کا مردِ خودی، مردِ کامل، مردِ مومن، مردِ قلندر، عشق، عقل، حکمت سب کچھ اس ایک زندگی کا ترجمان ہے۔ اقبال کی شاعری دراصل رسولِ کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی آئینہ دار ہے۔ جو منطقی، حکیمانہ، ادیبانہ اور شعری دل آویزیوں کے ساتھ نغمۂ حیات بن کر زندگی کا پیام پہنچا رہی ہے۔ دراصل نعت گوئی ابتدا میں قطعاً مقصدی رنگ لیے ہوئے تھی۔ دربارِ رسول ﷺ کا پہلا نعت گو شاعر جس نے صداقت اور حقیقت شناس بن کر اپنے آقا کی مدح سرائی کی، وہ دراصل دشمنوں کا جواب تھا۔ اس کی شاعری، خلقِ نبی ﷺ کی آئینہ دار تھی۔ تعلیماتِ نبوی ﷺ کی ترجمان تھی اور جو بھی تھا خلوص اور محبت کی زبان میں تھا۔

حضرت حسانؓ کی زبان نے وہ کام کیا جو خطیبوں کی جادو بیانی سے نہ ہو سکا۔ جہاں ترغیب و تحریص کی ہزاروں تدابیر بے نتیجہ ثابت ہوئیں، وہاں شاعر کی سحر آفرینی کام کر جاتی۔ جہاں مجاہدین کی سرفروشی کارگر نہ ہوتی وہاں شاعرِ خوش فکر کی گرم گفتاری اور شعلہ بیانی سے کام لیا

جاتا۔ حضرت حسانؓ نے اپنی نعتیہ شاعری کے مقصدی ہونے کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

هَجَوت محمد فاَجبت عنه
وعند الله في ذاک جزاء ☆۱

ترجمہ: تو نے ایسے کی ہجو کی جو سرتاپا تعریف میں محمد ﷺ ہے۔ اور میں نے اس کا جواب دیا اور اس کی جزا اللہ کے نزدیک ہے۔

تو یہاں نعت گوئی کا مقصد ناموسِ رسول ﷺ کی حفاظت، تعلیمات، رسول ﷺ کی تبلیغ، اپنے خلوص اور عقیدت اور محبت کا اظہار اور اللہ سے اس کی جزا کی امیدواری قرار پایا۔

(۳) اصلاحی نعت

مقصدی نعت کے ساتھ اصلاحی نعت کی اُردو ادب میں کمی نہیں ہے جو بذاتِ خود ایک طور پر مقصدی ہے۔ کثیر تعداد معراج نامے، وفات نامے، شمائلِ نبوی ﷺ، معجزے ناموں میں ایسا کلام کثرت سے ملتا ہے جس میں اصلاحی روش اختیار کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دکن میں اس ادب کی ابتدا مقصدی اور اصلاحی رنگ سے ہوئی۔ ذکرِ نبی ﷺ کو عام کرنے کے لیے اسوۂ حسنہ کو لوگوں تک پہنچانے کی غرض سے عقائد میں پختگی اور مذہبی معلومات میں وسعت پیدا کرنے کی خاطر شعرا نے سیرتِ نبی ﷺ کے مختلف ابواب کو نظم کیا۔ مولانا باقر آگاہ نے ''ہشت بہشت'' لکھ کر سیرتِ رسول ﷺ کو منظوم اور ضخیم کتاب کی صورت صحتِ روایات کا لحاظ کرتے ہوئے پیش کیا اور جیسا کہ انھوں نے کتاب کے شروع میں تصنیف کے مقصد میں لکھا ہے، اس منظوم سیرت لکھنے کی غرض و غایت یہ تھی کہ ان غلط روایات کا سدِباب کیا جائے جو عام طور پر نعت میں داخل ہوگئی ہیں اور اس طرح لوگوں کے غلط عقائد کی اصلاح ہو۔ اس کے علاوہ میر نوازش علی شیدا کی ''اعجازِ احمدی'' انھی خصوصیات کی حامل ہے۔ جدید اُردو شاعری میں نعتیہ کلام نے ایک نیا رنگ اختیار کیا جو زمانے کے مزاج اور اس کے تقاضے کا آئینہ دار ہے۔ اس کی اصل محرک مسلمانوں کی مذہبی یعنی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی زبوں حالی ہے۔ مولانا حالیؔ اور مولانا شبلیؔ کا دور اُردو شاعری کے لیے اصلاحی دور کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی برکات سے نعتیہ شاعری کیوں کر محروم رہتی۔ ہر دو بزرگوں نے نعتیہ شاعری کی مقصدی مگر غیر حقیقی روش کو چھوڑ کر ایک ایسی راہ نکالی جس نے اصلاحِ قوم کا بڑا سامان کیا۔ مولانا حالیؔ نے ایک نہایت مستند اور اثر میں ڈوبی ہوئی نظم لکھی جو

☆۱۔ دیوانِ حسان بن ثابت، ص:۲

صاف، سادہ اور شگفتہ انداز میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی نعتیہ ادب میں اس رنگ کی نظم مشکل سے ملے گی۔ مولانا شبلی کی نظمیں بھی نہایت مؤثر انداز میں اسوۂ رسول ﷺ کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ چناں چہ اس دور میں نعت گوئی کی ایک نئی طرح ڈالی گئی جس کی تقلید آنے والے نعت گو شعرا نہایت خوش اسلوبی سے کر سکے۔ اب نعتیہ مضامین کو نظم کرنے میں معراج نامے، وفات نامے، شمائلِ نبوی ﷺ، معجزات کو نظم کرنے کے قدیم رُجحانات میں زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ فوق العادت واقعات سے شعرا کی دل چسپی کم ہوگئی۔ اب وہ سیرتِ پاک کے وہ مضامین نظم کرنے کی فکر میں ہیں جن سے ہماری زندگی کے موجودہ مسائل متعلق ہیں۔ مسلمانوں کے زوال اور ان کی نکبت کا سبب شعرا نے اطاعتِ رسول ﷺ کی کوتاہیوں کو بتایا اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہونے کی ترغیب دی۔

اس اصلاحی نعتیہ رنگ کے شعرا میں طباطبائی، ڈاکٹر اقبال، مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ماہر القادری کا نعتیہ کلام بھی انھی اثرات کے تحت اصلاحی رنگ لیے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی

محرکاتِ نعت

اسلامی ادب میں نعت کو ایک معتبر مقام حاصل ہے۔ اس صنف کے ذریعے شاعری کو تقدس کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ شاعر نعت لکھ کر ایک طرف حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ذاتِ بابرکت کے ساتھ اظہارِ عقیدت سے اپنے من کی دُنیا کو روحانی سرور سے نواز رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف مقامِ رسالت کی تشریح و وضاحت کر کے تبلیغِ دین کا فرض بھی نبھاتا ہے۔ نعت گوئی کیوں کی جاتی ہے اور شاعر نعت لکھنے پر کیوں مجبور ہوتا ہے؟ یہ ایک دل چسپ سوال ہے۔ ذیل میں انھی محرکاتِ جذبات پر بحث کی گئی ہے۔

شاعر، خاص طور پر مسلمان شاعر جب رُخِ قلم نعت کی طرف موڑتا ہے تو اس کے سامنے وہ کثیر آیاتِ قرآنِ کریم اور احادیث ہوتی ہیں جن میں حضور سرورِ کائنات کی محبت و اطاعت کی ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں شاعر نعت کے محرک جذبات کو بیان کیا جاتا ہے۔

نعت سنتِ خداوندی

نعت گوئی کا بنیادی اور پہلا محرک جذبہ اصل میں قرآنِ پاک میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا وہ خاص انداز ہے جس میں اس نے اپنے محبوبِ پاک ﷺ کی تعریف کی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے قرآنِ مجید میں نہ صرف خود ذکرِ رسول کیا ہے، بلکہ اہلِ ایمان کو بھی ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ سورۃ الاحزاب میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ **یایھا الذی امنو صلوا علیه وسلموا تسلیما** (احزاب:۵۶) ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبیِ کریم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔''

قرآن پاک کی اس آیتِ مبارکہ سے یہ بات نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف درود (ذکر و نعتِ رسول ﷺ کی ایک صورت) پڑھنے میں خود شامل ہے، بلکہ اس

کے فرشتے بھی اس کی اس سنت کی پیروی کر رہے ہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ نے اسی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اہلِ ایمان کو بھی ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ یوں حضور سرورِ کائنات ﷺ کی نعت قرآنِ کریم کا ایک بڑا موضوع بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جگہ جگہ آپ ﷺ کی صفاتِ پاک کا ذکر کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کو کیا اہمیت حاصل ہے اس سلسلے میں مولانا مفتی احمد یار کے اس نثر پارے کو پڑھنے کی ضرورت ہے، جو انھوں نے اپنی کتاب ''شانِ حبیب الرحمٰن من آیات القرآن'' کے شروع میں ''مقدمہ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے:

> حقیقت یہ ہے کہ اگر قرآنِ کریم کو بنظرِ ایمان دیکھا جائے تو اس میں اوّل سے آخر تک نعتِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام معلوم ہوتی ہے۔ حمدِ الٰہی ہو یا بیانِ عقائد، گزشتہ انبیائے کرام اور ان کی اُمتوں کے واقعات ہوں یا احکام، غرض قرآنِ پاک کا ہر موضوع اپنے لانے والے محبوب ﷺ کے محامد اور اوصاف کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ اخلاص قل ھو اللہ احد کو لیجیے۔ اس میں خدائے قدوس کی صفات کا ذکر ہے اور سورۂ لہب کو دیکھیے کہ اس میں بظاہر ابولہب کافر اور اس کی بیوی کا تذکرہ ہے۔ از اوّل تا آخر، مگر جب غور کریں تو یہ دونوں سورتیں محبوب کی نعتِ پاک سے بھری ہوئی ہیں۔ ''قل ھو اللہ احد'' میں ارشاد ہے کہ اے! محبوب تم کہہ دو کہ اللہ ایک ہے اور وہی بھروسے کے لائق ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے نہ اس کی کوئی اولاد وغیرہ وغیرہ۔ مگر ایک کلمہ ''قل'' نے (''محبوب تم کہہ دو اس ساری صورت میں نعت کو شامل کر دیا ہے کیوں کہ مرضیِ الٰہی یہ ہے کہ اے محبوب ﷺ) کلام تو ہمارا ہو اور زبان تمھاری۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرآنِ پاک میں نویکلے انداز سے نعت کہنے کا یہ رویہ عام شعرا کو بھی نعت کہنے اور سوچنے کی طرف لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان **ورفعنا لک ذکر** کی عملی تفسیر بھی ہوتی ہے۔

عشقِ رسول ﷺ

نعتِ رسول ﷺ کا ایک بنیادی محرکہ جذبۂ عشقِ رسول ﷺ بھی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ بات ہے کہ جب تک انسان اپنے رہنما کو دل کی گہرائیوں سے نہ چاہتا ہو اس وقت تک وہ صحیح

معنوں میں اطاعتِ امیر کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتا۔ عاشقانِ سرورِ کائنات ﷺ کی محبت کو جزوِ ایمان ہی نہیں بلکہ کل ایمان خیال کرتے ہیں۔ کیوں کہ رب کریم نے ''سورۂ توبہ'' میں بڑے مؤثر اور واضح انداز میں اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی ذات سے محبت کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربِ تعالیٰ ہے:

> میرے حبیب فرما دیجیے کہ اے لوگو! تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری عورتیں، تمھارا کنبہ، تمھاری کمائی کے مال اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تمھیں ڈر رہتا ہے اور تمھاری پسند کے مکان، ان میں سے کوئی چیز بھی اگر تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے تو انتظار کرو کہ اللہ اپنا عذاب اُتارے اور اللہ تعالیٰ فاسقوں کو راہ نہیں دیتا۔ (سورۂ توبہ، آیت:۲۴)

> قرآنِ پاک میں ایک اور جگہ پر ارشادِ خداوندی ہے:
> بلاشبہ اہلِ ایمان کے لیے نبی ﷺ ان کی اپنی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔ (سورۂ الاحزاب:۶)

کتبِ حدیث یا تاجدار طیبہ و بطحا علیہ السلام کی ذاتِ والا صفات نے کئی جگہوں پر عشقِ رسول ﷺ سے متعلق بات کی ہے۔ بخاری شریف کی دو احادیث ملاحظہ ہوں۔

ترجمہ: ''تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک میں اس کے نزدیک اس کی ماں باپ، اولاد اور سب آدمیوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ترجمہ: ''جس میں دو خصلتیں ہوں وہ ایمان کی لذت و حلاوت پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس کو تمام ماسوا سے زیادہ پیارے ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ کفر میں لوٹ جانا ایسا برا سمجھے جیسا آگ میں پھینکے جانے کو برا سمجھتا ہے۔

مندرجہ بالا آیاتِ قرآن اور احادیث مبارکہ سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا کہ دین میں نبی کریم ﷺ سے عشق و محبت کو کتنا بلند رُتبہ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے محبت جتنی زیادہ ہوگی عاشق اپنے محبوب کو اتنا ہی زیادہ نام لے گا۔ ''زرقانی علی المواہب'' میں علامہ محاسی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے مولانا محمد شفیع اوکاڑوی نے لکھا ہے:

> محبوں کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کا ذکر کثرت سے دائمی طور پر اس طرح کرتے رہتے ہیں کہ نہ تو کبھی ذکر سے جدا ہوتے ہیں اور نہ ہی

کبھی چھوڑتے ہیں اور نہ ہی کبھی کوتاہی کرتے ہیں اور حکما کا اس پر اجماع ہے کہ محبِّ محبوب کا کثرت سے ذکر کرتا ہے اور محبوب کا ذکر محبوں کے دلوں پر ایسا غالب ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اس کا بدل چاہتے ہیں اور نہ ہی اس سے پھرنا۔ اور ان کے محبوب کا ذکر ان سے جدا ہو جائے تو ان کی زندگی تباہ ہو جائے گی اور وہ کسی چیز میں لذت و حلاوت نہیں پائیں گے۔

علامہ محاسی کے اس ارشاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک سچے نعت گو شاعر کی نعتیہ شاعری کے محرکات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ شاعر اپنے آقا کی تعریف کو سعادت نہ سمجھے تو کیا سمجھے۔ پھر آقا بھی وہ جس کی تعریف میں خود خدا بھی شریک ہو۔

اظہارِ عقیدت

حضور ختمی مرتبت ﷺ نے دُنیا کو جس انقلابِ عظیم سے سرفراز کیا اس کی مثال تاریخِ انسانیت میں کہیں نہیں ملتی۔ آپ ﷺ نے بہت کم عرصے میں جس تدبر و فراست اور حکمت و دانائی سے انسانیت کو گمراہی اور ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر آفتابِ ہدایت کی روشنی عطا کی اس کی مثال ملنا محال ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔ آپ ﷺ کے کارہائے نمایاں کو صرف مسلمانوں نے ہی قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ ان غیر مسلموں نے بھی آپ ﷺ کی تعریف کی جنھوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہیں باندھی ہوئی تھی۔ روس کے مشہور ادیب ٹالسٹائی کا کہنا ہے:

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ محمد ﷺ حقیقت میں بڑے عظیم الشان مصلحین میں سے تھے۔ آپ ﷺ نے نسلِ انسانی کی بہترین خدمت انجام دی۔ یہ آپ ﷺ ہی کو فخر حاصل ہے کہ ایک ملک کو صداقت کی روشنی سے منور کیا۔ تمام عرب کو خانہ جنگیوں سے نکال کر (جن میں وہ مبتلا تھے) امن و آرام کی زندگی بسر کرنا سکھائی۔ آپ نے عربوں کو متقی اور باخدا بنایا اور ان کو (انسانی قربانی) ایک دوسرے کے قتل و غارت کی بری رسوم سے نجات بخشی۔ آپ ﷺ نے دُنیا کے لیے ترقی و تمدن کے دروازے کھول دیے۔ یقیناً اتنا مہتم بالشان کام سوائے اس شخص کے اور کوئی نہیں کر سکتا جس کو خدا کی طرف سے غیر معمولی طاقتیں عطا ہوئی ہوں۔ ایسی شخصیت ہر قسم کی عزت و احترام کی مستحق ہے۔

ڈاکٹر ایڈورڈ مونٹے کتاب ''معجزاتِ اسلام'' میں لکھتے ہیں:

انسانی اخلاق کی جو اصلاح آپ ﷺ نے فرمائی، اجتماعات کے اندر جو انقلاب آپ ﷺ کی تعلیم نے پیدا کیا۔ سوسائٹی کے اعمال کی تطہیر کے لیے جو اسوۂ حسنہ آپ ﷺ نے پیش کیا، وہ آپ ﷺ کو انسانیت کا محسنِ اوّل قرار دیتا ہے۔

انسانیت کے محسنِ اوّل کی سیرت، کردار، افکار اور پیغام کی ہر انسان نے قدر کی ہے اور آپ ﷺ کے انقلاب کو بنظرِ انصاف دیکھتے ہوئے تعریف کی ہے۔ شاعر بھی بلاشبہ اپنے دور کا دانش ور ہوتا ہے۔ وہ بھی انسانیت کی رہنمائی کے لیے ایسے ہی عظیم انسانوں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے جن کی سیرت اور کردار سے متاثر ہو کر لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آئیں اور دکھوں میں گھری اپنی زندگی کو سکون و راحت کی دولت سے مالا مال کر لیں۔ یہی وجہ ہے شاعر کا حضور نبیِ کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ تخلیقِ نعت کا محرک ٹھہرتا ہے اور شاعر اسے انسانیت کے سب سے بڑے اور سچے رہنما کے حضور گلہائے عقیدت پیش کرنے کو سعادت خیال کرتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان شعرا میں وہ غیر مسلم شعرا بھی شامل ہیں، جنھوں نے آقائے نامدار حضور ﷺ کی بے مثال سیرت اور ان کے لائے ہوئے عظیم انقلاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ پنجابی نعت میں بھی ایسے کچھ غیر مسلم شعرا نظر آتے ہیں، لیکن یہاں میں آقا ﷺ کے انقلاب کی بازگشت کے حوالے سے اُردو کے ایک غیر مسلم شاعر پنڈت ہری چند اختر کی نعت کے کچھ اشعار پیش کروں گا جن میں نبیِ کریم ﷺ کے انقلاب کی بڑائی بیان کی گئی ہے:

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا
زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

باقی رہی مسلمان شعرا کی عقیدت، تو ان کے لیے قرآن و حدیث میں بیان کیا گیا۔

آپ ﷺ کا مرتبہ ہی عقیدت کے لیے کم نہ تھا مگر آج کے مادی دور میں جب ہر طرف انسانیت نفسا نفسی کا شکار ہے انھیں بھی ایک ایسے نمونے کی ضرورت ہے جو ہر حوالے سے بے عیب ہو۔ ظاہر ہے دُنیا میں ایسی ایک ہی ذات یعنی حضور نبیِ کریم ﷺ کی ذات ہے جس کی طرف شعرا کو رجوع کرنا ہے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے اپنی ایک نعت میں اس شعر کے ذریعے بڑے نویکلے انداز میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے:

ترجمہ: ''میں نے اپنی شاعری کے ذریعے حضرت محمد ﷺ کی تعریف نہیں کی بلکہ ان کے ذکر سے اپنے کلام کو قابلِ ذکر بنالیا ہے۔''

اطاعتِ رسول ﷺ کا جذبہ

نعت کی تخلیق اور ترویج میں ایک بہت بڑا جذبہ اطاعتِ رسول ﷺ کا بھی ہے جو محبتِ رسول ﷺ کا نتیجہ ہے اور اس کا عملی اظہار بھی۔ قرآنِ مجید کی بہت سی آیات میں جہاں ''اطیع اللہ'' کا حکم آیا ہے وہاں ''اطیعو الرسول ﷺ'' کا حکم بھی آیا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ نے آپ ﷺ کی نافرمانی پر دردناک عذاب کی وعیدیں بھی سنائی ہیں۔ قرآنِ مجید میں اس سلسلے میں جو آیات درج ہیں ان میں سے کچھ یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ ترجمہ: اے نبی لوگوں سے کہہ دو۔ کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اطاعت کرو۔ (آلِ عمران: ۳۱)

۲۔ ترجمہ: جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ (النساء: ۶۹)

۳۔ ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔
(الاحزاب: ۳۳، محمد: ۳۳)

۴۔ ترجمہ: جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا، اللہ اس کو ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو اس طرف سے منہ پھیرے گا اس کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔
(الفتح: ۱۷)

ان آیاتِ مبارکہ کے علاوہ قرآنِ مجید میں اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسول ﷺ کی اہمیت اور بڑائی کو بیان کیا ہے۔ کتبِ احادیث میں ایسی

بہت سی احادیث بھی ملتی ہیں جن میں اس موضوع کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ محبت اس وقت تک اکملیت کے دائرے میں آتی ہی نہیں جب تک محبوب کے احکام کو دل سے قبول کر کے ان کو اپنی زندگی کا رہنما نہ سمجھا جائے۔ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی نے اپنی کتاب ''ذکرِ جمیل'' میں محبت اور اطاعتِ رسول ﷺ کے لطیف فرق کو واضح کرتے ہوئے تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

اس سلسلے میں بعض حضرات کا مسلک تو یہ ہے کہ محبت کا معیار محبوب کی اتباع اور اس کی پیروی ہے۔ کیوں کہ محبّ محبوب کا مطیع اور متبع ہوتا ہے۔

انم المحب لمن یحب مطیع

ارشادِ خداوندی ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعو نی یحببکم اللہ

ترجمہ: میرے محبوب ﷺ آپ فرما دیجیے کہ اے لوگو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو (پھر) اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔

آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ محبت کی شرط اتباع و اطاعت ہے لہٰذا جو گروہ متبعِ سنت اور پابندِ شریعت ہے وہی رسول اللہ ﷺ کا محبّ اور صحیح معنوں میں مومن ہے۔

مولانا آگے چل کر لکھتے ہیں:

اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اتباع و اطاعت جسے معیارِ محبت قرار دیا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ کیا حضور ﷺ کے اقوالِ مبارکہ و اعمالِ مقدسہ کے مطابق مطلقاً عمل کرنے کا نام اتباع اور اطاعت ہے یا اس میں کوئی قید بھی ملحوظ ہے۔ اگر ''مطلق عمل'' یعنی حضور ﷺ کے ان اعمالِ مقدسہ کی صرف نقل کو اتباع و اطاعت قرار دیا جائے جس کی موافقت شرعاً مطلوب ہے تو وہ منافقین اور دشمنانِ دیں حضور ﷺ کے متبع اور اللہ تعالیٰ کے محبوب قرار پائیں گے جو باوجود منافق ہونے اور اپنے دل میں سرکارِ دوعالم ﷺ سے عداوت رکھنے کے نماز، روزہ اور دیگر اعمالِ حسنہ کرتے تھے، بلکہ صحیح احادیث میں یہاں تک وارد ہوا ہے کہ ایک بے دین و گمراہ قوم آخرِ زمانہ میں پیدا ہوگی جو قرآن و حدیث پڑھے گی مگر قرآن و حدیث اس کے حلق سے نیچے نہ اُتریں گے۔ سچے اور خالص مسلمان ان کی نمازوں کے مقابلے

میں اپنی نمازوں کو حقیر جانیں گے۔ ان کی زبانیں شکر سے زیادہ شیریں
ہوں گی اور دل بھیڑیوں کی مثل ہوں گے ان کے پاجامے ٹخنوں سے
اونچے اور سر منڈے ہوئے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

ایسی صورت میں اس ظاہری اتباع و اطاعت اور سنن کریمہ کے نقل کو کیوں کر معیارِ محبت اور دلیلِ ایمان قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ تو نری نقالی ہے جو کسی حال میں بھی محمود و مستحسن نہیں ہو سکتی اس لیے ضروری ہے کہ اتباع و اطاعت کے معنی پر غور کیا جائے اور صحیح معیارِ محبت تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتا دیا کہ اتباعِ رسول ﷺ کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت ہے۔ محبوب کا دشمن کبھی محبوب نہیں ہو سکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے محبوب کا دشمن اللہ تعالیٰ کو محبوب کیوں کر ہو سکتا ہے؟ ثابت ہوا کہ اس آیتِ مبارکہ میں اتباع کے معنی محبتِ رسول ﷺ کے بغیر صرف ان کے سننِ کریمہ کو نقل کرنا نہیں بلکہ ''فاتبعونی'' کے معنی یہ ہیں کہ حبیبِ خدا ﷺ کی محبت سے مجبور ہو کر بتقاضائے الفت و محبت ان کی اداؤں کے سانچے میں ڈھل جاؤ۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کے محبوب و مطلوب ہیں اور جب تم ان کی اتباع و پیروی کر کے ان کی پیاری پیاری اداؤں کے سانچے میں ڈھل جاؤ گے تو تم بھی محبوب و پیارے ہو جاؤ گے۔ یہ اتباع حضور ﷺ کی محبت کی دلیل ہے۔

مولانا نے اطاعتِ رسول ﷺ کے بنیادی نقطے کو محبتِ رسول ﷺ میں تلاش کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب تک محبت مستحکم نہیں ہوگی۔ اطاعتِ حقیقی کا مفہوم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ مسلمانوں کی نجات کا راستہ آپ ﷺ کی اطاعت ہی ہے۔ اسی لیے مسلمانوں نے اپنی عملی زندگی میں آپ ﷺ کی سیرت کو ہی معیار سمجھا ہے اور اپنی حیات کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے معمولی سے معمولی معاملے میں بھی سیرتِ رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا ہے۔

ادبیاتِ اسلامی کی تاریخ پر غور کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ نعت گوئی کی ابتدا بھی اطاعتِ رسول ﷺ کا ہی نتیجہ ہے۔ کیوں کہ نعت کا آغاز آپ ﷺ کے حکم سے ہوا ہے۔ کتبِ سیرت میں اس بات کی یوں وضاحت کی گئی ہے کہ جب حضور سرورِ کائنات ﷺ کی ہجو گوئی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا:

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد اپنے ہتھیاروں سے کی
ہے ان کو کون سی چیز روکتی ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے ان کی مدد نہ کریں۔

کفار کی ہجو گوئی اور بدزبانی کے خلاف مسلمان شعرا کی طرف سے زبان کے ذریعے جہاد نے باقاعدہ حضور ﷺ کی اس خواہش کے نتیجے میں جنم لیا۔ جن مسلمان شعرا نے شاعری

کے ذریعے حضور ﷺ کی تعریف و توصیف اور نعت کو اختیار کیا ان میں بہت سے صحابہ کرامؓ بھی شامل ہیں جن میں حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن زہیر اور عبداللہؓ بن رواحہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حضور نبیِ کریم ﷺ کے اس حکم کی اطاعت صدیوں سے ہو رہی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ بے شک حالات کے تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ نعت کے وہ موضوعات یا ضرورتیں جو رسالت مآب ﷺ کے دور میں بنیادی حیثیت رکھتی تھیں، اب وہ نہیں رہیں لیکن نعت کے بنیادی مقاصد کسی نہ کسی طرح آج بھی ویسے ہی موجود ہیں جیسے پہلے تھے۔ آج بھی شعرا اطاعتِ رسول ﷺ کی ہی ایک صورت سمجھتے ہوئے نعت لکھ رہے ہیں۔

نعت: تبلیغِ دین کا وسیلہ

مسلمان شعرا نے نعت کو دین کی تبلیغ و اشاعت کا وسیلہ سمجھ کر بھی اختیار کیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ تبلیغِ دین فرض کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے ہر مسلمان اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کی اشاعت کی کوشش کرتا ہے۔ علما اپنی تقریروں اور خطابات کے ذریعے اس مقدس کام کی تکمیل کرتے ہیں اور اہلِ قلم قرآن و حدیث میں بیان کی گئی حقیقتوں کو اپنے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق اپنی تحریروں کا موضوع بنا کر لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔ ان ادیبوں میں کوئی فقہی مسائل کو اپنا موضوع بناتا ہے تو کوئی سیرتِ رسول ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر قلم اُٹھاتا ہے۔ الغرض جتنا کسی کے علم میں ہوتا ہے وہ اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ اس بات کو دوسرے لوگوں تک پہنچائے۔ چوں کہ شاعر کا ذریعۂ اظہار شاعری ہے اس لیے وہ ہر وقت مشقِ سخن کرتا ہے کہ غزلیں اور نظمیں وغیرہ لکھتا ہے پھر جب وہ اپنے من کی پٹاری کھول کر سوچتا ہے کہ اس نے اگر خیالی اور دُنیاوی محبوب کی تحسین کی ہے تو کیوں نہ وہ اس سچے محبوب، جو اللہ تعالیٰ کا بھی محبوب ہے کی تعریف کرے، اس کی سیرت بیان کرے، اس کے احوالِ حیات کو ضبطِ تحریر میں لائے تا کہ وہ لوگوں کو دین کی بات بتا سکے تو پھر یہی جذبہ، جذبۂ تبلیغ کے سایے میں جنم لیتا ہے اور شعرا سے حمد و نعت اور مناقب لکھواتا ہے۔

اس جذبے کا جیسے پہلے بیان کیا گیا ہے، احساس رسالت مآب محمد ﷺ کے زمانے میں ہی پیدا ہوگیا تھا اور صحابہ کرامؓ نے اسی خیال کو مدِنظر رکھتے ہوئے بلکہ حکمِ رسول ﷺ کے تحت نعتیہ کلام لکھا اور سیرتِ حضور ﷺ کو بیان کیا اور آپ ﷺ کے محاسن رقم کیے۔ یوں انھوں نے اگر ایک طرف اطاعتِ رسول ﷺ اور محبتِ رسول ﷺ کے جذبے کو پروان چڑھایا تو دوسری طرف دین کی تبلیغ و اشاعت کا سامان بھی کیا۔ یہ جذبہ آج بھی موجود ہے اور شعرا دینی منظومات

خاص طور پر حمد و نعت لکھ رہے ہیں۔

ذکرِ رسول ﷺ کو عام کرنے کی خواہش

نعت گو شعرا کے سامنے نعت گوئی کا ایک محرک ذکرِ رسول ﷺ کو عام کرنا بھی تھا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ذکرِ رسول ﷺ کو عام کرنا اور بلند کرنا سنتِ خداوندی ہے اور بلکہ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ممدوح کا ذکر ہر جگہ ہو اور پھر جب کہ ممدوح بھی وہ ہو جو ذاتِ خداوندی کا بھی ممدوح ہو تو پھر بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ یہ جذبہ بھی نعتیہ شاعری کا ایک اہم محرک ہے۔جس نے نعت کو مقبولیتِ عامہ کی راہ دکھائی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''نعت گوئی کا اوّلین محرک مسلمانوں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ذکر کرنا ان کی شخصیت و سیرت سے عوام الناس کی روشناس کرانا اور ان کی پیروی وتقلید کی ترغیب دینا اور ان کے نام پر درود و سلام بھیجنا کارِ ثواب ہے اور ذریعۂ نجات بھی۔ اس کارِ ثواب اور ذریعۂ نجات کی خاطر تحریر وتقریر دونوں میں ہر شخص نے اپنی بساط کے مطابق سیرتِ رسول ﷺ کو جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے مفکرانہ تقریریں اور عالمانہ خطبات یادگار چھوڑے ہیں۔ بعض نے سیرتِ نبوی ﷺ پر بلند پایہ کتابیں تالیف کر دیں اور بعض نے نذرانۂ عقیدت کے طور پر اعلیٰ درجے کے نعتیہ قصیدے اور دوسری نظمیں کہہ ڈالیں، لیکن ایسے کاموں کے لیے عقیدت ومحبت کے ساتھ ساتھ وسیع مطالعہ اور تخلیقی صلاحیتیں بھی درکار تھیں۔ ظاہر ہے ہر شخص میں یہ صلاحیتیں نہ تھیں۔ اس لیے اس کی آسان صورت یہ تھی کہ جو لوگ تھوڑی بہت قوتِ تحریر رکھتے ہیں وہ سیرت نبوی ﷺ پر چھوٹی موٹی کتابیں لکھ دیں یا نظم ونثر کو ملا کر میلاد شریف کی محفلوں کے لیے کتابچے مرتب کر دیں اور جو لوگ شعر و شاعری سے لگاؤ رکھتے ہیں وہ ایک آدھ نعتیہ غزل کہہ ڈالیں کیوں کہ شعر وسخن کے رسیا ذہنوں اور موزوں طبیعتوں کے لیے سب سے آسان اور دل چسپ یہ آخری صورت تھی۔ اس لیے نعت گوئی ہمارے ہاں چھوٹے بڑے، مرد وعورت اور بوڑھے جوان سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ نتیجتاً معیاری اور غیر معیاری نعتوں کا ایک بڑا ذخیرہ اُردو میں جمع ہوگیا۔ اتنا بڑا ذخیرہ کہ عربی و فارسی میں بھی اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کے اس اقتباس کا آخری حصہ فی الحال ہمارا موضوع نہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ذکرِ رسول ﷺ کو عام کرنے کی خواہش شعرا کے من میں موجود تھی۔ اس کا سبب کیا تھا؟ حصولِ ثواب اور نعت کو وسیلۂ مغفرت سمجھنے کے علاوہ سیرت کے جلسے، میلاد کے جلوس،

معراج کی محفلیں، نعتیہ مشاعرے اور اخبارات اور رسائل کے نعت و سیرت نمبر بھی ہیں جو نعت کے محرک اور فروغ کا باعث بنے۔ ناشروں نے ان کتابوں کو ذکرِ رسول ﷺ کو عام کرنے کے مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شائع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شہر شہر، قصبے قصبے ہی نہیں بلکہ گاؤں گاؤں اور محلے محلے نعتیہ حوالے سے محفلیں اور جلسے ہو رہے ہیں اور اللہ کے فرمان کے مطابق کہ ''اے محبوب ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا ہے۔'' کی تفسیر نظر آ رہی ہے۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے کہ نعت کے فروغ کا باعث حصولِ ثواب بھی سمجھا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے درود و پاک کو فرض کا درجہ دیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ ''اللہ اور اس کے فرشتے حضور نبیِ کریم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجا کرو۔'' ڈاکٹر ریاض مجید درود و پاک کی اہمیت اور اس کی حیثیتِ عبادت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ نے حضور نبیِ کریم ﷺ پر درود و سلام بھیجنے کو اُمتِ مسلمہ کی عبادت کا اہم جزو بنا دیا ہے۔ قرآنِ حکیم کے اس حکم سے جہاں مسلمانوں کی روز مرہ زندگی میں درود شریف اور وظائف کا سلسلہ شروع ہوا وہاں نعت میں بھی آنحضرت ﷺ پر درود و سلام کے مختلف انداز و اسالیب کا رواج ہے۔ اس اسلوبِ نعت کو اس لیے بھی اہمیت ملی کہ حکمِ خداوندی کے ساتھ ساتھ احادیثِ رسولِ اکرم ﷺ میں بھی آپ ﷺ پر درود بھیجنے کو بہت بڑی عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے ان گنت فوائد و برکات کا ذکر کیا گیا ہے۔

درودِ پاک کی اہمیت اور ثواب کے حوالے سے ''انوار الحدیث'' میں سے کچھ احادیث کے ترجمے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ حدیث میں درود کی اہمیت واضح ہو سکے۔

جو آدمی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا خدا اس پر دس بار رحمت نازل کرے گا اور اس کے دس گناہوں کو معاف کر دے گا اور اس کے دس درجے بلند کر دے گا۔ (نسائی)

روزِ قیامت میرے نزدیک وہ آدمی ہوگا جس نے مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجا ہوگا۔ (ترمذی)

مولانا جلال الدین امجدی نے اپنی مرتبہ کتابِ حدیث ''انوار الحدیث'' میں حضرت ابی بن کعبؓ کے حوالے سے یہ حدیث بھی نقل کی ہے:

''حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں آپ پر

کثرت سے درود پڑھنا چاہتا ہوں۔ اب اس کے لیے اپنے اوراد وظائف کے اوقات میں سے کتنا وقت مقرر کروں؟ فرمایا جتنا تم چاہو۔ عرض کیا، کیا چوتھائی؟ فرمایا جتنا تم چاہو، اور اگر زیادہ کرلو تو تمھارے لیے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا نصف؟ فرمایا جتنا تم چاہو، اور اگر اس سے بھی زیادہ کرلو تو تمھارے لیے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا تو پھر سارا وقت درود ہی کے لیے مقرر کرلوں؟ فرمایا ایسا ہوتو وہ تمھارے سارے امور کے لیے کافی ہوگا اور تمھارے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔ (ترمذی)

حضور نبیِ کریم ﷺ کی ذاتِ والا صفات نے جہاں درود کے ثواب بتائے ہیں وہاں درود نہ بھیجنے پر وعیدیں بھی سنائی ہیں۔ ترمذی شریف کی دو احادیث کے ترجمے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ درود کی فرضیت کھل کر سامنے آسکے۔

''حضور علیہ صلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اصل میں کنجوس وہ شخص ہے جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔'' (ترمذی)☆۱

ان احادیث کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عبادت میں درود کی کیا اہمیت ہے۔ نعت گوشعرا نے بھی نعت نگاری کو عموماً اور نعت میں درود وسلام کو خصوصاً عبادت کا درجہ دیا ہے، جس کا بے پناہ ثواب ہے اور اس کا نتیجہ آخرت میں مغفرت اور بخشش کی صورت میں نکلتا ہے۔ یوں نعت شفاعت کا بھی وسیلہ بنتی ہے۔

نعت وسیلۂ برکت

نعت گوشعرا کو ہم دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے صرف نعت کو ہی اپنا وسیلۂ اظہار بنایا اور دوسرے وہ جنھوں نے اپنی شاعری کو برکت اور خیر سے نوازنے کے لیے اپنے دیوان کے شروع میں حمد و نعت اور منقبت کے کچھ اشعار لکھے تاکہ ان کے کام کو اللہ کی رضا اور رسول اللہ ﷺ کی خوش نودی حاصل ہو سکے۔ اس قسم کے شعرا کے پیشِ نظر عام طور پر اربعین نووی کی وہ حدیث ہے:

> ہر وہ عظیم الشان کام جو اللہ کی تعریف اور مجھ (حضور نبیِ کریم ﷺ) پر درود کے ساتھ شروع نہ کیا جائے وہ نامکمل اور ہر قسم کی برکت سے محروم کرتا ہے۔

اس حدیث کی سند بے شک ضعیف ہے، لیکن مسلمان شعرا نے اللہ اور اس کے

☆۱۔ تیری دعا تب تک زمین اور آسمان کے درمیان معلق رہتی ہے اوپر نہیں جاتی جب تک تو اپنے نبی ﷺ پر درود نہ بھیجے۔ (ترمذی)

رسول ﷺ کی محبت کے پیشِ نظر اس کی مستقل پابندی کی ہے اور اس کو ایک روایت کا درجہ دیا ہے۔ نثر نگاروں اور شاعروں نے اپنی کتب کے آغاز میں حمد و نعت کے کچھ اشعار لکھ کر حصولِ برکت کی کوشش کی ہے۔ اُردو اور پنجابی شاعری میں یہ روایت اس قدر مقبول ہوئی کہ مسلمان شعرا کے علاوہ غیر مسلم شعرا نے بھی اس روایت کی پابندی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری کلاسیکل داستانوں اور فقہی کتب کے آغاز میں حمد و نعت پر مشتمل اشعار ملتے ہیں۔

نعتیہ شاعری کی یہ قسم جسے رسمی نعت کہا جاتا ہے بے شک ادبی اور تخلیقی سطح پر کوئی خاص مقام نہیں رکھتی اور نہ ہی شعرا نے اس کا کوئی دعویٰ کیا ہے، مگر نعت کے فروغ کے حوالے سے نعت کا مستقبل روشن ہوا ہے۔ یہ روایت بے شک رسماً اور تبرکاً ہی رہی ہے مگر ہر شاعر کے نعت لکھنے کے لیے محرک ضرور رہی ہے۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ رسمی نعتیں لکھتے لکھتے شعرا نے نعت کو مستقل طور پر اختیار کر لیا۔ یوں اس روایت کی بھی اپنی جگہ اور تاریخِ نعت میں بڑی اہمیت بنتی ہے۔

روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کی خواہش

مدینہ منورہ اور روضۂ رسول ﷺ نعت کا ایک اہم اور بڑا موضوع رہا ہے۔ شاعر خاص طور پر وہ شاعر جو روضۂ رسول ﷺ سے دور زندگی بسر کر رہے ہیں مدینہ منورہ کی حاضری کو مختلف حوالوں سے اپنی نعت کا موضوع بناتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے کم زور معاشی حالات کی وجہ سے زیارتِ روضۂ رسول ﷺ تو نہ کر سکے مگر اس خواہش و تمنا کا ذکر کر کے اپنی آرزوؤں کو پورا کرتے رہے۔ یا پھر موقع ملا تو گنبدِ خضریٰ کے نظارے کیے اور ان کو اپنی عقیدت کے ساتھ شاعری کا روپ دیا۔

سیرت نگاروں نے اپنی کتب سیرت میں مدینہ منورہ کے فضائل و مناقب پر کئی کئی باب رقم کیے ہیں اور ''فضائلِ مدینہ'' کے نام سے باقاعدہ کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ اس حوالے سے مولانا محمد محبوب علی خاں رضوی کی ترتیب دی ہوئی (۳۳) احادیث پاک کی تشریح پر مشتمل کتاب ''فضائلِ مدینہ'' مثال کے لیے پیش کی جا سکتی ہے۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بہت سی احادیث مدینہ منورہ کی فضیلت کے بارے میں ہیں اور دوسری طرف زیارت روضۂ رسول ﷺ کی اہمیت بھی احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ احادیث نبوی ﷺ ہیں کہ:

ا۔ جو آدمی میری قبر کی زیارت کرے گا اس کے لیے میری شفاعت واجب ہے۔

ب۔ جو آدمی زیارت کے لیے آیا اور اس کا میری زیارت کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا

تو روزِ قیامت میں اس کی شفاعت کروں گا۔

ج۔ جس انسان نے حج کیا اور میرے وصال کے بعد میری زیارت کے لیے آیا وہ ایسے ہے جیسے وہ میری زندگی میں میری زیارت سے مشرف ہوا ہو۔

مدینہ منورہ کی اہمیت اور روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کا یہ انعام ہمیشہ سے ہی اس سرزمین سے محبت اور پیار کا سبب رہا ہے۔ حضرت امام مالکؒ کے حوالے سے حضرت قاضی عیاضی کی کتاب ''کتاب الشفا'' میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ:

ایک معزز شخص نے امام مالکؒ کے سامنے مدینہ منورہ کی سرزمین کو ردی اور بے کار کہا تو امام مالکؒ نے اس کو تیس درے مارنے کا فتویٰ دیا اور فرمایا کہ اس شخص کی گردن اُڑا دینا چاہیے کیوں کہ اگر اس شخص نے اس سرزمین کو جہاں سرکارِ کائنات ﷺ آرام فرما رہے ہیں ردی اور بے کار کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس سرزمین کو پاک وطیب اور فائدہ بخش نہیں سمجھا۔

ویسے ﷺ بھی دیکھا جائے تو محبوب کی جہاں شخصیت پیاری ہوتی ہے وہاں محبوب کی ہر چیز سے پیار، عشق کی ابتدائی اصولوں میں شامل ہے۔ مدینہ منورہ جانے کی یہ خواہش اور روضۂ رسول ﷺ کی حاضری ہمارے کثیر نعتیہ ادب کی تخلیق کا محرک ثابت ہوئی ہے۔

نعت کی مقبولیت کے سبب

جیسے کہ اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ نعت کی تخلیق میں عشقِ رسول ﷺ، اطاعتِ رسول ﷺ، سنتِ خداوندی کا تصور، اظہار عقیدت، تبلیغ دین کا افریضہ، ذکرِ رسول ﷺ کو عام کرنے کی خواہش، وسیلہ ثواب اور ذریعہ نجات، وسیلۂ برکت اور مدینہ منورہ کی حاضری کا شوق، ایسے جذبے ہیں جو نعت کی ترقی اور مقبولیت کا سبب بنے۔ ان محرکاتِ نعت نے اسلامی ادب کو اس قدر مضبوط و توانا بنا دیا ہے کہ بعض اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے کہ نعت ہی اسلامی شاعری کا سب سے بڑا اور اہم موضوع ہے اور یہ بات مبالغہ آمیز بھی نہیں ہے۔

ان محرک جذبات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے اسباب وعوامل بھی ہیں جنھوں نے نعت کی ترویج و اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ وہ اسباب ہیں جو پروان تو ابتدائی محرکات کے زیرِ اثر ہی چڑھے مگر اپنی ایک علاحدہ شناخت اور پہچان بھی رکھتے ہیں۔ ان کو ہم اپنی آسانی کے لیے ثانوی یا دوسرے درجے کے محرکات بھی کہہ سکتے ہیں۔ انھی محرکات نے نعت کو ایک مخصوص حلقے سے نکال کر عوامی حلقوں میں متعارف کرایا اور اس کو مجلسی زندگی کی ضرورت بنا دیا جس سے نعت کو بے

پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ذیل میں ہم ان محرکات وعوامل کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

صوفیائے کرام اور فروغِ نعت

تصوف کیا ہے اور صوفی کس کو کہتے ہیں؟ یہ ایسے موضوعات ہیں جن پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں اور رسائل لکھے جا چکے ہیں۔ بعض اہلِ قلم کے نزدیک اسلام میں تصوف کی موجودگی پر اعتراض کیا جاتا ہے اور اس کو بدعت قرار دیا جاتا ہے میں اس وقت اس بحث میں شامل تو نہیں ہونا چاہتا مگر پھر بھی بنیادی بات کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا ہے کہ تصوف کی اصطلاح غیر ضروری ہے اور بدعت ہے۔ اس کا جواب مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان لفظوں میں دیا ہے:

اگر تصوف، صوفی اور دوسری اصطلاحات بدعت کے لغوی مفہوم کے لحاظ سے بدعت میں داخل سمجھی جائیں تو پھر تفسیر، اصولِ تفسیر، فقہ اور اصول فقہ و کلام کے آج جو ماشاء اللہ دفتر کے دفتر موجود ہیں عہدِ رسالت میں یہ کہاں تھے۔ اور سب کو جانے دیجیے، براہِ راست سنتِ رسول ﷺ ہی کو لیجیے۔ آج احادیث کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ پھر اس کی شرحیں ہیں۔ ان کی تسہیل کے لیے مستقل لغات ہیں۔ رجال کا ایک مستقل فن ہے۔ احادیث جانچنے، پرکھنے روایت و درایت کے قانون اور ضابطے ہیں سیکڑوں کی تعداد میں مصطلحاتِ فن ہیں۔ ظاہر ہے کہ عہدِ رسالت مآب ﷺ میں یہ کچھ بھی نہ تھا۔ سرورِ عالم ﷺ کی سادہ اور روزمرہ کی گفتگو حدیث تھی۔ اور آپ ﷺ کا ہر چھوٹا بڑا عمل سنت۔ تو کیا اب کوئی اس بنا پر حضرات محدثین کی ساری کاوشوں اور کوششوں کو بدعت کہہ دینے کی کوشش کرے گا؟

اسی طرح فقہا کی ساری موشگافیاں، قیاس و اجماع کی بحثیں، استقرار اور استنباط کا طریقہ، اجتہاد کے مسائل، عبادات و اشارات قسم کی سیکڑوں اصطلاحیں دورِ نبوی ﷺ میں کہاں تھیں اور کیسے ہوسکتی تھیں۔

تصوف کی عہدِ رسالت میں موجودگی بھی ایک دل چسپ سوال ہے۔ کیا تصوف اس مقدس دور میں موجود تھا یا نہیں؟ کشف المحجوب کے مصنف حضرت علی ہجویریؒ جو داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں، لکھتے ہیں:

”صحابہ اور تابعین کے دور میں تصوف کا نام نہیں تھا مگر اس کی حقیقت ہر شخص میں موجود تھی۔ آج نام موجود ہے مگر حقیقت غائب ہے۔“

اصل بات یہ ہے کہ تصوف، اسلام کی عملی شرح کا نام ہے۔ خدا کو ملنے، پہچاننے اور اس کو دیکھنے کی خواہش رکھنے کا نام تصوف ہے۔ ہر وہ بات جو تصوف میں قرآن و حدیث کے منافی آئی ہے ظاہر ہے وہ غلط ہے۔ وہ تصوف نہیں۔ تصوف تو قرآن و حدیث کو اپنے اندر جذب کر کے عملی شکل میں پیش کرنے کا نام ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی کتاب ''تاریخِ تصوف'' میں غیر مسلم دانش وروں کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی تصوف قرآن و حدیث سے علاحدہ نہیں۔ پروفیسر صاحب کی اس کتاب سے رائے نقل کی جاتی ہے:

''پروفیسر میس نیون نے اسلامی تصوف کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں میں تصوف کی تحریک اس زہد و تقویٰ کا نتیجہ ہے جو قرآن سے ماخوذ ہے اور پیغمبرِ اسلام کی سنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔''

اس طرح جہاں اسلامی تصوف واضح ہوتا ہے وہاں اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مسلمان علما کی علمی موشگافیوں کے ردِعمل میں مسلمان فرقوں میں ہی تقسیم ہوئے ہیں۔ محبت کی جگہ نفرت نے ہی جنم لیا ہے۔ مگر صوفیا نے علم و ادب کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی یوں خدمت کی ہے جس سے فرقہ بندی نہیں، اتحاد کی فضا قائم ہوئی ہے۔

فلسفیوں نے اپنی علمی بصیرت کے ذریعے بہت سے کام کیے ہیں مگر عملی سطح پر کیا ہوا، یہ بھی لوگوں کے سامنے ہے۔ تصوف کی عقلی اور روحانی زندگی میں اہمیت کے بارے میں دورِ حاضر کے مشہور فلسفی اور دانش ور برٹرینڈ رسل نے اپنی کتاب ''تصوف، منطق اور دوسرے مضامین'' میں لکھا ہے:

''دُنیا میں جتنے بھی فلسفی گزرے ہیں ان تمام نے فلسفے کے ساتھ ساتھ تصوف کی ضرورت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ افکار کی دُنیا میں انتہائی اونچا مقام صرف سائنس اور تصوف کے ملاپ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ بہترین انسانی خوبیوں کا اظہار صرف تصوف کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔'' جاننا چاہیے کہ رسل تصوف کا قطعاً حامی نہیں تھا مگر حقیقت، حقیقت ہوتی ہے۔ اس سے سچائی، جو اس کی عمر بھر کی فلسفیانہ ریاضت کا نتیجہ تھی، کے باعث یہ بات سامنے آئی ہے۔

اسلامی علوم و فنون اور خاص طور پر نعت کے فروغ میں صوفیا کا بڑا حصہ ہے۔ عربی نعت کا آغاز انھی صوفیا، جنھیں ہم صحابہ کرامؓ کہتے ہیں، کے ہاتھوں ہوا۔ تصوف کی دُنیا میں فنافی الشیخ اور فنافی رسول ﷺ کی اصطلاحات عام ملتی ہیں۔ تصوف میں زیادہ زور ہی اسوۂ حسنہ پر دیا جاتا ہے اور مجاہدات کے ذریعے ذاتِ رسولِ مقبول ﷺ میں فنا ہونے کو اوّلیت دی جاتی ہے۔

صوفیا کے مختلف طبقوں نے ذکر و فکر کی محفلوں میں اسم محمد و احمد کے ورد کے ساتھ ساتھ

اسمائے نبیِ کریم ﷺ کے ذکر کی بھی ضرورت پر زور دیا ہے تا کہ محبتِ رسول ﷺ زیادہ سے زیادہ جنم لے سکے۔صوفیا کی حضور نبیِ کریم ﷺ سے محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے اورادووظائف میں نعت خوانی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ صوفیا جو شاعر تھے انھوں نے نہ صرف خود نعت لکھی بلکہ نعتیہ محفلیں، جن کو میلاد کی محفلیں بھی کہا جاتا ہے، منعقد کیں۔ان محفلوں کے لیے نثر پر مشتمل میلادنامے اور تولد نامے لکھے اوران کواپنی مجلسوں میں عام لوگوں سے مختلف انداز میں پڑھنے کا اہتمام کیا۔

ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنے مضمون ''نعت کے محرکات'' میں مختلف سلاسلِ طریقت سے وابستہ صوفیا کے موالید (مولود کی جمع) کا ذکر کرتے ہوئے بہت سے اسلامی ممالک کے صوفیا کا ذکر کیا ہے، جن میں اپنے اپنے مولود پڑھے جاتے ہیں۔آخر میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

''واضح ہو کہ جن موالید ومنظومات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ صوفیائے کرام کے مختلف طریقوں اور سلسلوں سے نسبت رکھنے والے سالکین کی خاص مجلسوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ مجلس ''حضرہ'' کہلائیں اور ان میں حضور اکرم ﷺ کے تذکارِ مبارک سے حاضرین کی روحانی تطہیر اور تزکیۂ نفس کا کام لیا جاتا اور یہ مجلس انتظام اور مقاصد کے اعتبار سے ان میلادی مجلسوں سے مختلف ہوتی ہے جو تمام لوگوں کے لیے صوفیا کے اعراس یا دوسرے مواقع پر سرِ عام منعقد ہوتیں ہیں۔

وہ صوفی بزرگ جو شعر بھی کہتے تھے انھوں نے اپنی شاعری میں نعت بھی لکھی۔ بعض نے اپنی کافیوں میں ذکرِ رسول ﷺ کیا۔ کچھ نے اپنی مثنویوں میں بیانِ رسالت مآب ﷺ کیا اور یوں صوفیائے کرام نے عربی، فارسی، اُردو، پنجابی اور دوسری زبانوں میں نعتِ رسول ﷺ کا اتنا بڑا ذخیرہ دیا ہے جس کو ڈھونڈنا بھی ایک بہت بڑا کام ہے۔ وہ شعرا جن کی شاعری تصوف کے زیرِ اثر پروان چڑھی ان میں ابنِ عربی، مولانا روم، جامی، عطار، سنائی، عرفی، خسرو، مست توکلی، غلام سرور لاہور، شاہ حسین، بلھے شاہ، سلطان باہو، سچل سرمست، شہباز قلندر، احمد رضا بریلوی، حسن رضا بریلوی، شاہ نیاز بریلوی، پیر مہر علی شاہ، بیدم وارثی، سیّد دیدار علی شاہ چند خاص نام ہیں۔

قصہ مختصر صوفیائے کرام جو شاعر تھے یا نہیں تھے دونوں نے نعت کی ترویج وترقی میں بڑا حصہ ڈالا ہے۔صوفی شعرا نے نہ صرف خود نعتیں لکھیں، بلکہ ان کی دیکھا دیکھی ان کے مریدوں نے بھی نعت گوئی کو اپنایا۔ یوں بڑے بڑے صوفیا کی نعت اپنا ایک الگ تشخص رکھتی ہیں کیوں کہ ان پر نعت لکھتے ہوئے تصوف کا غلبہ ہوتا تھا جو نعت میں جذب ومستی اور عقیدت وارادت کے نئے نئے زاویے پیش کرتا رہا۔

دینی مجلسیں اور فروغِ نعت

نعت کے فروغ میں جہاں صوفیا علما اور دوسرے طبقوں نے اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے وہاں ان مجلسوں، جلسوں، قوالی کی محفلوں، مختلف درگاہوں پر منعقد ہونے والے عرسوں، میلاد کی محفلوں، معراج شریف اور سیرت کی مجلسوں کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان دینی مجلسوں میں جہاں دوسری اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے کام کیا جاتا تھا وہاں ان کے آغاز میں تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کو پڑھنا بھی ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی و ثقافتی زندگی میں ان مجالس اور تقریبات کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہاں کے لوگ جلسے جلوس اور راگ رنگ کے شوقین تھے۔ انھوں نے اپنی اس خواہش کو دینی حوالہ دے کر پاک بنا لیا۔ ان تقریبات میں بے شک فروغِ نعت کا مقصد تو سامنے نہیں تھا مگر ایسی تقریبات کے ذریعے نعت کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا۔ ان تقریبات نے نعت نگاروں اور عوام الناس کو ایک دوسرے کے بہت نزدیک کر دیا۔ نعت گو شاعر ان مجلسوں میں شریک بھی ہوتے اور اس کے علاوہ ان کے کلام کو خوش الحانی سے گایا بھی جاتا۔ یوں معاشرے میں نعت گو اور نعت خواں طبقے کا تعارف ہوا۔ نعت نے اس طبقے کو شہرت بھی دی اور وسیلۂ رزق بھی بنی۔ یوں نعت نگار اپنے کلیات اور دواوین سے باہر آئے اور عوام میں مقبول ہوئے۔ فروغِ نعت کے ان مجلسی محرکات میں جو اہم ترین محرک ہیں، ذیل میں ان پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

محفلِ میلاد

حضور ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا ذکر کرنا اور اس کو منانا میلاد کہلاتا ہے۔ میلاد النبی ﷺ منانے کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اور اس کا مقصد کیا تھا؟ اس سلسلے میں مختلف حلقوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سیّد سلیمان ندوی کے نزدیک میلاد کی محفلوں کا رواج چوتھی صدی ہجری میں ہوا۔

علامہ جلال الدین سیوطی اپنے رسالے حسن المقصد فی عمل المولد میں لکھتے ہیں کہ میلاد شریف کو مروّجہ اہتمام کے ساتھ منعقد کرنے کا آغاز اربل کے حکمران سلطان مظفر نے کیا۔ جس کا پورا نام ابو سعید کوکبری بن زین العابدین علی بن سبکتگین ہے۔ اس کا شمار عظیم رُتبے والے مسلمان حکمرانوں اور فیاض امرا میں ہوتا ہے۔ اس نے اور بھی بہت سے نیک کام کیے اور یادگاریں وغیرہ تعمیر کرائیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی آگے چل کر حافظ ابنِ کثیر کے حوالہ سے سلطان مظفر کے

بارے میں لکھتے ہیں کہ ''سلطان مظفر ماہِ ربیع الاوّل میں میلاد شریف کا بڑی شان و شوکت کے ساتھ اور تزک و احتشام کے ساتھ اہتمام کرتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ ایک بہت بڑا جشن منعقد کرواتا تھا۔ وہ ایک بڑا ذکی القلب، دلیر، بہادر، زیرک، عالم و فاضل حکمران تھا۔ اللہ اس پر رحمت فرمائے۔ شیخ ابو خطاب بن وحید نے اس کے لیے میلاد شریف پر ایک باقاعدہ کتاب بھی لکھی جس کا نام انھوں نے ''التنویر فی المولد البشیر القدیر'' رکھا۔ اس کتاب پر سلطان نے مصنف کو ایک ہزار دینار کا انعام دیا۔ ۶۳۰ ہجری میں اس کی وفات ہوئی اور وہ اپنی وفات تک حکمران رہا۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنے اسی رسالے میں، جو ایک فتوے کی حیثیت رکھتا ہے، میلاد کی شرعی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے اس کو ایک بدعتِ حسنہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس رسالے میں قرآن و حدیث کے حوالے سے میلادِ رسول ﷺ منانے کی مخالفت میں لکھے گئے شیخ تاج الدین عمر بن علی الغمی خاقانی کے رسالے کا رد کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں میلاد کی محفلیں منانے کا رواج عام ہو چکا تھا اور لوگ اس کو ایک مذہبی فرض سمجھ کر سرانجام دیتے تھے۔ اسلامی دُنیا میں میلاد کی محفلوں کے لیے میلاد نامے لکھے جانے لگے اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ عرب سے باہر عجمی دُنیا میں پھیلتا چلا گیا اور آج بھی مخالفت کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے۔

محافلِ میلاد کے مقاصد پر دُنیائے اسلام میں اتنا بڑا اختلاف تو نہیں مگر اس کی رواج پا جانے والی شکل پر بعض علما کو اعتراض رہا ہے۔ اسی لیے میلاد النبی ﷺ منانے والے علما نے میلاد کے لیے کچھ شرائط بھی بیان کی ہیں۔

عربی، فاسی ادبیات کے زیرِ اثر اُردو اور پنجابی میں میلاد ناموں کی روایت آگے بڑھتی رہی۔ پنجابی نعت میں نور نامے، میلاد نامے، جنگ نامے، ولادت نامے اور حلیہ شریف کے حساب لکھے گئے۔ مولود نامے یا تولد نامے اگر ایک طرف برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے میلاد کے جلسوں کے لیے بڑے ضروری تھے تو دوسری طرف ان کے ذریعے نعت گوئی کا رواج عام ہوا۔ ان تولد ناموں کو محافلِ میلاد میں گایا جاتا تھا۔ اس لیے شعرا ان میں موسیقی اور سروں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان تولد ناموں کے ذریعے شعرا نے اگر ایک طرف حضور ختمی مرتبت کے واقعات تاجدارِ بطحا ﷺ کی سیرت و سوانح، اوصافِ حمیدہ، غزوات، معجزات اور آپ ﷺ کی تعلیم کو بھی دل نشین انداز میں بیان کیا ہے۔

سیرت کے جلسے

میلاد کے بعد نعت گوئی کا ایک بڑا مجلسی محرک سیرت کے جلسے ہیں۔ بریلوی حلقوں میں اگرچہ آج میلادالنبی ﷺ کے منانے کا رواج کم نہیں ہوا مگر میلاد سے اختلاف کرنے والے علما حضور ﷺ کے اذکار کے لیے سیرت کے جلسوں کے انکاری نہیں۔ سیرتِ رسول ﷺ کے جلسے آغازِ قدیم سے منائے جا رہے ہیں۔ ان جلسوں میں تلاوت کے بعد نعت کو انتہائی ضروری خیال کیا گیا ہے۔ ویسے عام مسلمان جو شاعری کے کسی دوسرے پہلو سے واقف نہ بھی ہوں، نعت کے نام اور اس کے اصطلاحی مفہوم سے ضرور آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے بڑے ہر عمر کے لوگ نعت پڑھنے اور سنانے کو ایک مبارک فعل تصور کرتے ہیں۔ اس طرح ان جلسوں کے ذریعے نعت عام ہو رہی ہے۔ سیرت کے یہ جلسے ویسے تو سال بھر ہوتے رہتے ہیں مگر معراج شریف، ربیع الاوّل اور رمضان المبارک میں ان کا زور بڑھ جاتا ہے۔ ان جلسوں میں مسلمان بڑی عقیدت کے ساتھ باوضو ہو کر سیرتِ رسول ﷺ کے بارے میں جہاں علما کے خطاب سنتے ہیں وہاں نعتیہ کلام کو بھی عقیدت و احترام اور شیفتگی کے ساتھ سنتے ہیں۔

عرس اور قوالی

تصوف کیا ہے اور اسلامی دُنیا میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس سلسلے میں کچھ باتیں تو ہو چکی ہیں۔ جہاں تک محافلِ سماع کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں صوفیا میں کچھ اختلاف موجود ہے۔ مگر برصغیر پاک و ہند میں تقریباً تمام سلاسلِ طریقت قوالی کو جائز اور مباح خیال کرتے ہیں۔

مجالسِ سماع صوفیا کے سالانہ عرسوں پر خاص طور پر منعقد ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مجالسِ سماع کو بعض صوفیا نے ذکرِ اشغال میں بھی شامل سمجھا ہے۔ سماع کی ان مجالس میں پڑھا جانے والا کلام عارفانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ بیت، دوہڑوں، کافیوں اور غزلوں میں لکھا جانے والا حمدیہ اور نعتیہ کلام اور بزرگوں کی شان میں لکھی گئیں مناقب سماع کی محافل میں خاص طور پر پڑھی جاتی ہیں۔ صوفیا کے خیال کے مطابق حضور نبیِ کریم ﷺ خدا اور مرشد کے درمیان ایک بہت بڑا وسیلہ ہیں۔ اس لیے فنافی الشیخ کے بعد فنافی الرسول کی باری آتی ہے۔ آخری مقام فنافی اللہ کا بنتا ہے جس سے ایک صوفی کی تکمیل ہوتی ہے۔

سماع کی یہ محافل برصغیر پاک و ہند میں گلی گلی، کوچے کوچے میں منعقد ہوتی ہیں۔

مزاراتِ صوفیا پر ان کی با قاعدہ تربیت اور روحانی مدارج طے کرانے کے لیے اوقاتِ مقرر کیے جاتے ہیں۔ صوفیا کے نزدیک جواز سماع میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے قلبِ انسانی کو رقت اور سوز و گداز حاصل ہوتا ہے جو آغازِ تصوف میں صوفی کے لیے بڑا اہم ہے۔ سالانہ میلے اور عرس صوفیا کے نظامِ تربیت کا با قاعدہ حصہ ہیں۔ اس لیے ان میں سماع کا پروگرام ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ سماع کی ان محافل کا بھی فروغِ نعت میں ایک بڑا حصہ ہے۔ شعرا نے سماع کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے نعتیں لکھیں جو بعد میں نعتیہ قوالیوں اور نعتیہ گلدستوں کے عنوانات سے طبع بھی ہوئیں۔ پنجابی میں ایسی نعتیہ قوالیاں بڑی تعداد میں ملتی ہیں۔ ان میں سہل زبان کے ذریعے عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کو صوفیانہ اسرار و رموز کے حالوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ برصغیر میں عرس اور میلے سال بھر جاری رہتے ہیں۔ یوں قوالی بھی کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی جگہ پر ضرور جاری رہتی ہیں۔ اسی طرح مجلسی سطح پر نعت کے فروغ کے حوالے سے قوالی اور عرس کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ قوالی کی ان مجالس نے نعت کو عام لوگوں تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

ذرائع ابلاغ اور فروغِ نعت

فروغِ نعت کے سلسلے میں ان ابتدائی محرکات کے علاوہ کچھ ثانوی محرکات بھی ہیں، جن کے ذریعے برصغیر پاک و ہند میں خاص طور پر اس دور میں نعت کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

نعت پہلے بھی لکھی جاتی تھی مگر اس دور کی نعت کتبِ شاعری میں باعثِ برکت سمجھ کر شامل کی جاتی تھی۔ جب کہ آج نعت کو ایک فن کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ آج مسلمان شاعر نعت لکھتے وقت شرماتا نہیں کیوں کہ اس نے یہ جان لیا ہے کہ وہ نعت لکھ کر دُنیا کی ایک بہت ہی عظیم ہستی جس نے صدیوں تک انسان کو متاثر کیا ہے اور آج بھی پہلے سے بڑھ کر متاثر کر رہی ہے، کی صفت و ثنا کر رہا ہے۔

آج کا دور بلاشبہ نعت کا دور ہے۔ ذکرِ مصطفیٰ ﷺ جتنا آج شاعری کے ذریعے ہو رہا ہے، اس کی روایت ماضی میں اتنی کثرت سے نہیں ملتی۔ آج جگہ جگہ اور شہر شہر میں فروغِ نعت کے لیے کسی نہ کسی حوالے سے کام ضرور ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں ذرائع ابلاغ کا بڑا حصہ ہے۔ ذیل میں ان کے بارے کچھ بات کی جاتی ہے۔

نعتیہ مشاعرے

مجلسی محرکاتِ نعت میں ایک اہم محرک نعتیہ مشاعروں کا انعقاد بھی ہے۔ پاک و ہند میں مشاعروں کی روایت بڑی پرانی ہے۔ نعتیہ مشاعرے متحدہ ہندوستان میں بھی ہوتے تھے کیوں کہ یہ دھرتی جو ایک خاص نظریے کی پیداوار ہے اس میں اس مقدس نظریے کا پرچار اور سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کا ذکر لامحالہ پھلنا پھولنا تھا۔ پاکستان کے گاؤں گاؤں اور شہر شہر انجمن غلامانِ مصطفیٰ ﷺ، انجمن ثنا خوانِ مصطفیٰ ﷺ، مجلسِ نعت، بزمِ نعت، ادارہ فروغِ نعت، بزمِ حسانؓ اور نعت اکادمی کے نام سے مختلف ادارے نعتیہ مشاعروں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ ادبی حلقے رمضان المبارک اور ربیع الاوّل کے مہینوں میں خاص طور پر شعری نشستوں کو نعتیہ مشاعروں کا روپ دیتے ہیں۔ نعتیہ مشاعروں کے ذریعے ایک تو شاعر کو شعری اظہار کا موقع ملتا ہے اور دوسرے شاعر نعت کو سنتِ خداوندی سمجھ کر اپنے آپ کو شفاعت وثواب کا بھی حق دار سمجھتا ہے۔

اس دور میں ان مشاعروں کے فروغ میں ریڈیو، ٹی وی اور اخبار و رسائل کا بھی بڑا کردار ہے جو ان مشاعروں کی روداد نشر کرتے یا شائع کرتے ہیں جن سے نعت کو فروغ بھی ملتا ہے۔

دورِ حاضر میں نعتیہ مشاعرے مساجد اور تعلیمی اداروں میں بھی منعقد ہونے لگے ہیں۔ مثلاً کالج اور یونی ورسٹی کی سلانہ تقریبات میں نعتیہ مشاعروں کی روایت، مقابلۂ حسنِ قرأت کے بعد عام ہو رہی ہے۔ تعلیمی اداروں کے نعتیہ مشاعرے نہ صرف تعلیماتِ رسول ﷺ کو عام نوجوانوں تک پہنچانے کا وسیلہ بن رہے ہیں بلکہ تعلیمی اداروں میں موجود نئے شاعروں کو نعتِ رسول ﷺ کی طرف متوجہ بھی کر رہے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو دورِ حاضر میں فروغِ نعت کے لیے ان نعتیہ محافل اور مشاعروں کا بھی بہت حصہ ہے۔

اخبارات و رسائل

فروغِ نعت میں اخبارات و رسائل کا کردار بھی اہم ہے۔ آج ہمارے ملک کا ہر اخبار اشاعتِ نعت کا اہتمام کر رہا ہے ان میں اسلامی ایڈیشنوں کے ساتھ ساتھ عام ایڈیشنوں میں بھی نعت عام ملتی ہے جب کہ ربیع الاوّل، رمضان شریف اور دوسرے اسلامی تہواروں پر نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کی اشاعت کے حوالے سے بھی اخبارات کسی سے پیچھے نہیں ان مواقع پر اخبارات کے رسول ﷺ نمبر یا دوسرے عنوانات کے ساتھ شائع کیے گئے بعض شمارے حوالوں کا کام دیتے ہیں۔

دورِ حاضر میں مذہبی رسائل فروغِ نعت میں جو اہم کردار ادا کر رہے ہیں وہ بھی قابلِ ستائش ہے مگر ادبی رسائل فروغِ نعت کے حوالے سے جو کام کر رہے ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں۔ مذہبی اور ادبی رسائل رحمتہ اللعالمین ﷺ نمبر، سیرت نمبر، رسول ﷺ نمبر، میلادِ مصطفیٰ ﷺ نمبر اور اس کے علاوہ دوسرے عنوانات کے ساتھ جہاں حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت پاک اور حیاتِ طیبہ پر مضامین شائع کر رہے ہیں وہاں ان میں منظوم خراجِ عقیدت کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ چند سالوں سے بعض رسائل تو باقاعدہ نعت نمبر بھی شائع کر رہے ہیں۔ جن میں نعت کے علاوہ نعتیہ مضامین بھی شائع ہوتے ہیں، جن میں تاریخِ نعت، حال اور مستقبل کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔ کالج کے رسائل نے بھی بعض بڑے اہم نعت نمبر شائع کیے ہیں۔ لاہور کا ادبی رسالہ ''نقوش'' اب تک رسول ﷺ نمبر کی تیرہ (۱۳) جلدیں شائع کر کے عالمی سطح پر ایک ریکارڈ قائم کر چکا ہے۔

گراموفون ریکارڈ، فلمیں اور کیسٹ

گراموفون کمپنیوں نے ریکارڈ کی صورت میں ہزاروں نعتیں گاؤں گاؤں اور شہر شہر پہنچائیں۔ ان نعتوں کا معیار کیا تھا؟ اس وقت اس پر بحث کی ضرورت نہیں مگر یہ بات ایک حقیقت ہے کہ ریکارڈ کے ذریعے مقبول ہونے والی نعتیں لوگوں کے دلوں میں نقش ہوگئیں۔ پنجابی کی بعض فلموں میں بھی کچھ مقامات پر مصنف نے مشکل اور مصیبت کے وقت سچائی کے کرداروں کو سہارا دینے کے لیے یا فلم میں تبلیغ کے فرض کی ادائیگی کے لیے بعض نعتیہ قوالیاں شامل کی ہیں۔ جو عوام الناس میں بڑی مقبول ہوئیں۔ فلموں میں چوں کہ نعتیہ کلام کو ایک خاص صورتِ حال میں پیش کیا جاتا تھا اور اس کے مثبت اثرات بھی کرداروں کے ذریعے دکھائے جاتے تھے، اس لیے یہ نعتیں لوگوں کو یاد کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

فلمی حوالے سے بات کرتے ہوئے یہ بھی جاننا چاہیے کہ کچھ فلموں کے بعض گانے عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔ شاعروں نے ان فلمی گیتوں کی طرز پر نعتیہ کلام لکھا جو لوگوں میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ معیار کے حوالے سے بے شک یہ کوئی اتنا اونچا کلام تو نہیں تھا مگر نعت کی مقبولیت میں اس کلام کو بڑا عمل دخل رہا ہے۔

دورِ حاضر میں کیسٹ نے بھی نعت کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مقبول فن کاروں او رنعت خوانوں کی آوازوں میں مقبولِ عام نعتیہ کلام کیسٹوں کی شکل میں بازار میں ہر جگہ دستیاب ہے۔ ان کیسٹوں میں ریڈیو اور ٹی وی کے مقبول نعتیہ پروگراموں، نعتیہ مشاعروں اور میلاد کی محافل

میں بھی پڑھی جانے والی نعتوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ نعتیہ کیسٹ کا رواج اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ جمعہ کے خطاب یا عام مذہبی تقریبات سے پہلے عوام کو مسجد میں لانے کے لیے ان سے کام لیا جاتا ہے۔

ریڈیو اور ٹی وی

دورِ حاضر میں پہلے ریڈیو اور بعد میں ٹی وی نے ہماری زندگی میں جو عمل دخل حاصل کیا ہے، اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے مذہبی پروگراموں کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ربیع الاوّل، محرم الحرام اور رمضان المبارک کے مقدس مہینوں میں طویل دورانیے پر مشتمل مذہبی پروگراموں میں نعت کو خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان اداروں نے بھی فروغِ نعت کے حوالے سے بہت کام کیا ہے اور اچھے پروگرام پیش کر کے نہ صرف نعت گوئی کو عوام میں متعارف کروایا ہے، بلکہ بہت سے نعت خوانوں اور نعت گو شاعروں کو بھی مقبولیت سے نوازا ہے جس سے نعت کے نئے امکانات سامنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

اُردو نعت گوئی کے موضوعات

حضرت محمد ﷺ کی توصیف میں سب سے پہلے لفظ ''نعت'' کا استعمال غالباً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یہاں ہوا ہے۔ چناں چہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

من راہ بدھة ومن خالطه احبه یقول ناعته لم ارقبله و لا بعده مثله صلّی اللہ علیه وسلم (شمائل ترمذی)

''جس نے یکایک آپ کو دیکھا وہ ہیبت زدہ ہوگیا اور جو آپ سے ملا وہ آپ کا گرویدہ ہوا۔ آپ کا وصف کرنے والا یہی کہتا ہے کہ آپ سے پہلے نہ آپ جیسا دیکھا اور نہ آپ کے بعد آپ جیسا دیکھوں گا۔

نعت میں دراصل محض پیکرِ نبوت کے صوری محاسن کا بیان یا حضور ﷺ سے رسمی عقیدت کا اظہار نہیں ہوتا، بلکہ ہر وہ شعر نعت کے دائرے میں آجاتا ہے، جس میں حضور ﷺ کی مدح ہو یا آپ ﷺ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ خطاب ہو اور جس کا تأثر ہمیں آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے قریب کردے۔

حضور ﷺ کی نعت کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے جو خود آنحضرت ﷺ پر بصورتِ وحی کم و بیش ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا۔ اسی لیے اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خلقِ محمد کی تعریف میں ''خلقه القران'' کہہ کر ساری کتابِ آسمانی کو نعت کے موضوع سے جوڑ دیا تھا۔

قرآنِ حکیم میں مختلف طریقوں سے آپ ﷺ کی تعریف و توصیف بیان ہوئی ہے جن کے ذریعے آپ ﷺ کی بشریت، عبدیت، رسالت، اسوۂ حسنہ، نورانیت اور فضیلت وغیرہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے۔

قُل اِنَّمَا انا بَشَرٌ مِّثلُکُمۡ یُوحیٰ اِلَیَّ انَّمآ اِلٰھُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ

(سورۃ الکہف:۱۱۰)

اے محمد! کہو کہ میں تو تم جیسا ایک انسان ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔

کہہ کر کبھی تو حضور ﷺ کی بشریت کا اظہار کیا۔ اور

وَرَفعنَا لَکَ ذِکرَکَ (انشراح:۴)

ہم نے تمھارے لیے تمھارا ذکر بلند کیا۔

میں آپ ﷺ کی بزرگی و برتری ثابت کر دی ہے۔ پھر آپ ﷺ کے طریقے کو ہی فلاح کا ضامن قرار دیتے ہوئے فرمایا۔

لَقَدۡ کَانَ لکُم فِیۡ رَسُولِ اللّٰہِ اَسوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب، آیت:۲۱)

بے شک تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کے طریقے میں اچھا نمونہ ہے۔

اور قُلۡ اِنۡ کُنتُمۡ تُحِبُّونَ اللّٰہِ فَاتَّبِعُونِیۡ یُحبِبۡکُمُ اللہ (آل عمران، آیت:۳۱) کہہ کر صاف صاف بتلا دیا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرنے لگے تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تم میرا اتباع کرو۔ کہیں یوں کہا گیا کہ مَن یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدۡ اَطاعَ اللّٰہِ (سورۃ النساء:۸۰) دوسری جگہ فرمایا کہ:

اِنَّا اَرۡسلنکَ بِالحق بَشِیراً وَّ نَذِیرًا (البقرۃ:۱۱۹)

بے شک ہم نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا خوش خبری اور ڈر سنانے والا۔

کبھی آپ ﷺ کو یٰسین و طٰہٰ کہہ کر مخاطب کیا گیا تو کبھی مزمل و مدثر کہہ کر۔ قرآن میں کہیں النبی الامی تو کہیں رحمۃ للعالمین اور کہیں شاہداً و مبشراً جیسی صفات کا بیان ہے۔ کہیں یہ حکم دیا گیا کہ:

ان اللہ و ملائکتہ یصلّون علی النّبی یا ایّھا الذین امنو صلّوا علیہ وسلّموا تسلیما (احزب:۵۶)

تحقیق اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس نبی ﷺ پر اے ایمان والوان پر درود بھیجو۔

پھر اللہ نے اپنی عنایات کی بارش آپ ﷺ پر کی اور حضور ﷺ پر اپنی حجت تمام کر دی۔

الیَومَ اَکمَلتُ دِینکُمۡ وَاَتمَمۡتُ عَلَیۡکُم نعۡتِیۡ وَ رَضِیتُ لکُمۡ

الاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ:۳۰)

اس کے بعد ایک نظر احادیث پر بھی ڈالیں۔ بعض احادیث میں آپ ﷺ نے خود اپنے مرتبے کو بیان فرما دیا ہے، مثلاً انس بن مالک سے مروی ہے کہ:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا اول الناس خروجا اذا بعثوا وانا کطیبهم اذا بعثوا وانا خطیبهم اذا وقدو او انا مبشر هم اذا یلئسو لواء الحمد یومئذبیدی وانا اکرم والد آدم علی ربی ولا فخر (الترمذی، باب المناقب، ص:۲۰۱)

حضور ﷺ نے فرمایا، ''لوگ جب اُٹھائے جائیں گے تو میں پہلا شخص ہوں گا۔ اور جب وفد بنا کر پیش ہوں گے تو میں ان کی ترجمانی کروں گا اور میں ان کو بشارت دوں گا، جب وہ نا اُمید ہوں گے اس دن میرے قبضے میں حمد کا پرچم ہوگا اور میں اپنے پروردگار کے نزدیک اولادِ آدم میں سب سے زیادہ مکرم ہوں گا اور یہ فخر نہیں ہے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے آپ ﷺ کے جو اوصاف بیان کیے ہیں، احادیث کے باب المناقب میں درج ہیں۔ حضرت علیؓ کا جو قول اوپر گزر چکا ہے وہ نعتیہ مضمون کا عمدہ نمونہ ہے۔ مناقب کے باب میں اس طرح کے کئی تعریفی کلمات آپ ﷺ کی شانِ مبارکہ میں بیان ہوئے ہیں۔ ترمذی نے ''شمائل'' کے عنوان سے ایک الگ باب قائم کیا ہے۔ جس میں حضور ﷺ کے سراپا کا بیان ہے اور آپ ﷺ کے تواضع، اخلاق، مذاق، عبادات اور بسر اوقات وغیرہ تمام کیفیات وطریقہ ہائے حیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ عظام کی طرف سے تدوینِ احادیث کے لیے کی جانے والی کاوشیں حضور ﷺ سے محبت و وارفتگی اور جذبۂ عشقِ صادق کا نادر نمونہ ہے۔ آپ ﷺ سے اسی طرح کے قلبی لگاؤ اور محبت و انسیت کی ترجمانی کے لیے بعض حضرات نے شاعری کا سہارا لیا اور عربی میں ''المدائح النبویۃ'' کے عنوان سے ایک نئی صنفِ شاعری کو وجود بخشا جس کا وافر ذخیرہ عربی سرمایے میں اضافے کا باعث ہوا ہے۔ شیخ یوسف بن اسمٰعیل النبہانی نے ۱۳۲۰ھ میں ''المجموعة النبهائية فى المدائح النبوية'' کے نام سے چار جلدوں میں عربی نعتوں کو جمع کیا ہے۔ عربی زبان کے بعد بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی:

فارسی زبان کا قدم اس وادیِ ایمن کی راہ نوردی میں سب سے آگے رہا ہے۔

یہاں ان دونوں زبانوں کی نعتیہ شاعری کی تاریخ سے صرفِ نظر کر کے اُردو نعتیہ شاعری کے موضوعات پر اظہارِ خیال کرنا مقصود ہے۔ اُردو کے نعت گوشعرا نے دوسری اصناف کی طرح اس صنف میں بھی عربی فارسی کے نمونوں کو اپنے پیشِ نظر رکھا، لیکن عام اصناف کی طرح جا بجا عرب و ایران کی روایات سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں لکھی ہیں۔ اُردو کے نعتیہ اثاثے کو مختلف موضوعات کے دائرے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) نعتِ خالص (۲) مولود نامے (۳) نور نامے (۴) معراج نامے (۵) وفات نامے (۶) اسرائیلیات (۷) صنم یات تو غیرہ۔

نعتِ خالص:

نعتِ خالص سے مراد وہ نعتیہ کلام ہے جس میں حضور ﷺ کے صرف اوصاف کا بیان ہو، جو محامد و محاسن اور تعریف کی حد تک ہی محدود ہو۔ اُردو کے ایسے نعتیہ ذخیرے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور کئی کتابیں بھی اس ضمن میں موجود ہیں، لیکن واقعاتِ رسول ﷺ کو نعت کے جن موضوعات کے ذیل میں قلم بند کیا گیا ہے یہاں اسی کا تذکرہ مقصود ہے۔ اس ضمن میں ولادتِ رسول ﷺ کو موضوع بنا کر لکھی گئی نعتیں ''میلاد نامہ'' کے ذیل میں شمار کی جاسکتی ہیں۔

میلاد نامے:

مولود ناموں کی روایت اُردو میں بہت قدیم ہے۔ عربی فارسی سے ہوتی ہوئی یہ روایت اُردو ادب تک پہنچی۔ ذکرِ مولود پر سب سے پہلی کتاب ابوالخطاب عمر بن حسن بن دحیہ کلبی اندلیسی نے لکھی تھی۔ ابن خلکان اس کتاب کا نام "التنویر فی مولد السراج المنیر" بتاتے ہیں، لیکن بعض لوگ اُسے "التنویر فی مولود البشیز والنذیر" کہتے ہیں۔ اربل کے سلطان ابو سعید مظفر نے کتاب کے مصنف کو اس کے صلے میں ایک ہزار اشرفیاں بطورِ انعام دی تھیں۔ ''تاریخِ میلاد'' کے مصنف نے ''انوارِ ساطعہ'' کے حوالے سے ''مولود'' کی چند اہم کتابوں کے نام گنوائے ہیں، جن میں (۱) حافظ شمس الدین دمشقی کی ''مور الصادی فی مولد الھادی'' (۲) محمد بن عثمان لولوی کی ''دالورالمنظم فی مولد النبی ﷺ الاعظم'' ابن جزریؒ کی "عرف التعریف فی مولد الشریف" اور مجد الدین قاموس کی "نفحات العنبریه فی مولد خیر البریه" وغیرہ مشہور ہیں۔

نفسِ ذکر میلاد النبی ﷺ کو بعض علمائے اسلام صرف باعث خیر و ثواب ہی نہیں بلکہ مستحب و سنت قرار دیتے ہیں، غالباً اسی لیے اُردو کے شعری سرمایے میں میلاد ناموں کی کثرت ہے اکثر

شعرا نے خیر و برکت اور ثواب حاصل کرنے کے لیے میلاد نامے لکھے اور مجالس میں پڑھے جن کا احاطہ باعثِ طوالت ہوگا اس لیے صرف مشہور اور پختہ مشق شعرا کی تصانیف کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔

اُردو شاعری میں ''ذکرِ میلاد النبی ﷺ'' کو سلطان محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کسی نے بھی مستقل طور پر منظوم نہیں کیا۔ محی الدین قادری زورؔ مرحوم 'حدیقۃ السلاطین' کے حوالے سے نقل کرتے ہیں:

> محمد قلی قطب شاہ عید میلاد النبی ﷺ کی بزم آرائی اور آئین بندی فضائے دل کشائے میدان دادمحل میں کیا کرتا تھا— عید میلاد النبی ﷺ کی آمد سے بہت قبل ہی صناع، ہنر منداور استادانِ صنعت و حرفت دونوں عمارتوں کے سامنے (چاوڑی خانہ اور کوتوال خانہ) اپنے عجیب و غریب کمالات کی پیش کش میں مشغول ہو جاتے اور آخرکار جب روزِ مولود— آجاتا تو کوسوں، دماموں، نقاروں، نفیریوں اور قرناؤں کی آوازوں سے میدان دادمحل گونج اُٹھتا۔

قلی قطب شاہ ہر یوم میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ایک نظم اسی موضوع پر لکھا کرتا تھا۔ اس کے کلیات میں ہمیں عید میلاد پر چھ نظمیں اور ایک قصیدہ ملتا ہے، جن میں شاعر نے میلاد النبی ﷺ کی عظمت بیان کی ہے۔

فرشتے سرگ ساتو کوں ستاریاں سوں سنوارے ہیں
شہ دُنیا و دیں کے تئیں عرش کرسی سنگارے ہیں
مگر مولود ہے شہ کا عرش اوپر طبل کا جے
مراداں پاؤ نے سارے جگت ہاتاں پسارے ہیں

دوسری نظم میں شاعر نے ''لولاک لما خلقت الافلاک'' کی تصریح کی ہے۔ شاعر کہتا ہے تمام دنوں میں اللہ نے اس دن کو فضیلت بخشی۔ یہ گنہ گاروں کی خلاصی کا دن ہے اور بہشتیوں کو اس دن نور کے لباس پہنائے جاتے ہیں۔ تیسری نظم میں اگرچہ ہندی الفاظ کی بہتات ہے، لیکن شاعر نے صنائع بدائع کا وافر استعمال صرف اسی ایک نظم میں نہایت فراخ دلی سے کیا ہے۔ صنعتِ تجسیم کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

خوش ہو خوشی ہنستی اہے ، ہور عیش متوالا ہوا
عشرت لگیات ناچنے ، آلاب جب گایا، انند

عیش کا متوالا ہونا، عشرت کا ناچنا اور خوشی کی بات پر خوش ہوکر ہنسنا وغیرہ انوکھے اور

نئے خیالات ہیں اور یہ تمام الفاظ مسرت وخوشی کے مظہر ہیں۔ اسی موضوع پر قلی قطب شاہ کا قصیدہ بھی کافی طویل ہے۔ شاعر نے بعثتِ نبوی ﷺ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ (م۱۶۷۲ء) کے مختصر دیوان میں ''مولود شریف'' پر دو نظمیں ملتی ہیں۔ اوّل نظم بہاریہ عنصر لیے ہوئے ہے۔ حضور ﷺ کی ولادتِ باسعادت چوں کہ موسمِ بہار میں ہی تھی اسی مناسبت سے شاعر نے نظم میں ''جھاڑوں کے بوارنے'' غنچوں کے چٹخنے، گلوں کے کھلنے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ چناں چہ شاعر کہتا ہے:

جھلک ہو مولود کا بھی جگ میں آیا
جگت سب اس جھلک تے جگمگایا
منگن کرتے گگن، ہو کر ہر اک جھاڑ
سورج ہور چاند تارے بار لیایا

اسی عہد میں علاقہ بھروچ کے ایک غیر معروف شعر عبدالملک کے مولود نامے کا تعارف زورؔ مرحوم نے وضاحتی فہرست میں کرایا ہے۔ شاعر اپنی تصنیف کے ماخذ و مراجع احادیث نبوی ﷺ کو بتاتا ہے، لیکن بالاستیعاب پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ موضوع احادیث کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی حال فتاحیؔ کی ''مفید الیقین'' کا ہے۔ اس میں حضور ﷺ کی ولادت و بعثت اور معجزات منظوم کیے گئے ہیں۔ شاعر نے ان تمام روایات کو میلاد نامے میں شامل کر لیا ہے جن کا استعمال عموماً میلاد ناموں میں مستحسن قرار دیا جاتا ہے، مثلاً حضرت آمنہؓ کو ایامِ حمل میں خوابوں کا دکھائی دینا اور نو ماہ تک متواتر نو پیغمبروں کی بشارت دینا وغیرہ اغلب ہے کہ یہ عقیدت میں غلو اور اسرائیلی اساطیر کا تتبع ہو۔ بہرکیف فتاحیؔ کی ''مفید الیقین'' عجیب وغریب واقعات سے پُر ہے۔ مولانا شبلیؒ نے سیرت النبی ﷺ میں ایسی تمام موضوع، ضعیف روایات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے وضع وضعف پر سے پردہ ہٹا دیا ہے۔

مولودِ رسول ﷺ پر دکنی شاعر مختارؔ نے بھی ایک رسالہ ترتیب دیا تھا۔ صحت روایات کے اعتبار سے اگر چہ اس میں بھی ضعف ہے، لیکن شعریت سے بھرپور ہے۔ مختارؔ کی یہ مثنوی تقریباً ۱۲۷۰۰ اشعار پر محیط ہے۔ اسے مجلسِ میلاد میں ترنم سے پڑھا جا سکتا ہے۔ معجزات کے بیان میں مختارؔ نے چند بیانات حضور ﷺ سے منسوب کر دیے ہیں، مثلاً حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے مختارؔ نے یہ کہلوا دیا کہ ''میری وجہ سے ابراہیمؑ نے نارِ نمرود سے خلاصی پائی تھی۔'' ''نوحؑ طوفان سے محفوظ رہے تھے۔'' وغیرہ۔ مختارؔ نے ''معجزۂ شق القمر'' شہادت الحجر، — ''انگشتِ مبارک سے

پانی کا نکلنا'' وغیرہ کئی روایات صحیح بھی تفصیلاً نظم کی ہیں۔ شعرائے قدیم میں گودھرا (گجرات) کے شاعر امیؔن کے ''تولد نامے'' میں بھی ولادتِ رسول کا ذکر ہے۔ یہ اڑھائی ہزار اشعار کی مثنوی شاعر کی کہنہ مشقی کا پتا دیتی ہے، لیکن جہاں تک مذہبی حیثیت کا تعلق ہے تو بہ قول ظہیر الدین مدنی اس میں بہت غلط بیانی پائی جاتی ہے۔ اور پروفیسر نجیب اشرف نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

> تولد نامہ اپنے عہد کی اس موضوع کی مثنویوں میں متعدد حیثیت سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ولادت آنحضرت ﷺ کے سلسلے میں اس میں جو واقعات بیان کیے ہیں وہ بڑی حد تک کرشن جی کی ولادت کے حالات کا آئینہ معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کی ابتدائی زندگی اور شادی سے متعلق بھی عجیب وغریب روایتیں بیان کی ہیں۔

دکن کے ایک شاعر غوّاصی نے ''قصص الانبیا'' کے عنوان سے تین دفتروں پر مشتمل ایک طویل مثنوی لکھی ہے، جس میں پیغمبروں کی سیرت اور حالات و کوائف بیان کیے ہیں۔ غوّاصی نے اس مثنوی کے تیسرے دفتر میں حضور ﷺ کی ولادت، بعثت، معجزات وغیرہ کو نہایت تفصیل سے نظم کیا ہے۔ غوّاصی واقعات کو مسلسل اشاعت میں گوندھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس لیے اتنی طویل مثنوی کے تینوں دفتروں میں باہم ربط دکھائی دیتا ہے اور واقعات یکے بعد دیگرے قاری کے سامنے اُبھرتے چلے جاتے ہیں۔

حضور ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ منظوم کرنے میں شعرائے قدیم کے گل سرسبد محمد باقر آگاہ قادری بیجاپوری ثم ایلوری صفِ اوّل میں شمار ہوتے ہیں۔ ''ہشت بہشت'' جو منظوم سیرت پاک ﷺ ہے، تقریباً نو ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کے ایک حصہ ''من موہن'' میں آنحضرت ﷺ کی ولادت کا ذکرِ مبارک ہوا ہے۔ شاعر نے اسلامی روایات کے ساتھ اسرائیلی اساطیر کا بھی سہارا لیا ہے، لیکن ان کے برتنے میں وہ حد درجہ محتاط نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے دیگر شعرائے کرام کی بہ نسبت ان کے یہاں تاریخی حقائق اور احادیث و نصوص کی وافر مقدار نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعض جگہ سہو و تسامح کی مثالیں بھی ملتی ہیں، لیکن شاعر نے عوامی اعتقادات اور غلط مذہبی رُجحانات کے پیشِ نظر ان کو اپنایا ہے، مثلاً استقرارِ حمل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے آگاہ نے ایک مدرج بلکہ موضوع حدیث نقل کی ہے کہ ''اسی شب فرشتوں نے شیطان کو مع اپنے تخت کے دریا میں ڈال دیا اور چالیس روز تک اس پر عذاب مسلط کیا گیا۔ اس کے ساتھیوں کے استفسار پر اس نے کہا کہ آج کی شب آمنہؓ کے شکم میں محمد ﷺ کا حمل قرار پایا ہے۔ جو خاتم المرسلین ہوں

گے اور اوّلین و آخرین میں سب سے بہتر بھی۔ مثنوی میں بعض جگہ تاریخی سقم بھی در آئے ہیں مثلاً:

نو مہینے ہوئے ہیں پورے جب
آمنہؓ کے اوپر بغیر تعب
بارویں کو ربیع کی اے یار
صبح کوں پیر کے بوقت بہار
ہوئے اصحاب فیل سب ویراں
بعد پنجاہ و پنج روز ازاں
چھ سو اوپر ہوئے تھے تیس برس
وقتِ عیسیٰؑ سے جب اے پاک نفس
جانِ جاں و جہاں ہوا پیدا
شاہِ کون و مکاں ہوا پیدا

یہاں آپ ﷺ کی ولادت ۱۲ ربیع الاوّل ۶۳۰ھ واقعہ فیل کے ۵۵ دن بعد بتائی گئی ہے جب کہ مؤرخینِ اسلام آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت عام الفیل کے ۵۰ دن بعد ۵۷۱ھ کو مانتے ہیں اور اسی پر اکثریت کا اتفاق ہے۔ معجزات کے بیان میں باقر آگاہ نے علامہ سیوطیؒ کی ''رسائل مولود'' مولانا جامی کی ''شواہد النبوۃ'' اور عبدالحق دہلوی کی ''معارج النبوۃ'' وغیرہ سے استنباط کیا ہے۔

دکن ہی کے ایک غیر معروف شاعر سیّد حیات کی تصنیف ''کتاب احوال النبی ﷺ'' میں بھی حضرت محمد ﷺ کی ولادت کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں:

جب آمنہؓ حاملہ ہوئی نور سے
گھر ہوا روشن زیادہ سور سے

وقت آیا جب تولد کا قریب
یک تجلّی نور کی ہوئی اے حبیب
صبح دم ظاہر ہوا دو بے نظیر
تھی ربیع الاوّل کی دوسری روز پیر

آخری مصرع پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے ''دو شنبہ'' کا ترجمہ ''دوسری

روز'' کر دیا۔ پھر ردیف اور قافیہ کی مناسبت سے ''پیر'' بھی لکھ دیا۔ جس کی وجہ سے اس مصرع کے معنی مبہم ہوگئے ہیں۔ اس کے مطابق تاریخِ پیدائش ۲ ربیع الاوّل بروز پیر نکلتی ہے جو سراسر غلط ہے۔

ذوقؔ و غالبؔ کے معاصر سیّد عبدالمفتاح اشرفؔ کے دیوان ''اشرف الاشعار'' میں واقعہ میلاد النبی ﷺ پر کئی نظمیں ملتی ہیں۔ شاعر ذکرِ میلاد النبی ﷺ کو شعار اہلِ ایمان گردانتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ادب سے ، آج ہوتا ہے یہاں مولد حضرت ﷺ
سنو اے دوستو! اب داستانِ مولد حضرت ﷺ
دو شنبہ بارھویں ماہ ربیع الاوّلیں کی تھی
طلوعِ آفتاب عزوشانِ مولد حضرت ﷺ
گرے نوشیرواں کے قصر کے چودہ منارے تب
پڑے بت اوندھے مکہ میں زمانِ مولد حضرت ﷺ
جھکا کعبہ طرف گھر آمنہؓ کا بارکوع ہو کر
قیامت تک رہے باقی نشانِ مولد حضرت ﷺ

اشرف نے تیسرے شعر میں تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب آپ ﷺ کی ولادت ہوئی تو قیصرِ روم کے قصر کے کنگورے گر گئے تھے اور کعبۃ اللہ میں نصب بت اوندھے منہ گر گئے تھے۔

امیرؔ مینائی کی ''صبحِ ازل'' ولادت باسعادت حضور مقبول ﷺ کے بیان میں ایک اچھی مثنوی ہے۔ اگر چہ امیرؔ نے فنِ نعت گوئی کو مستقلاً اختیار نہیں کیا، لیکن ان کے کلام میں معتد بہ حصہ نعتیہ مضامین کا ہے۔ بابائے اُردو عبدالحق امیرؔ کی نعتیہ شاعری کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''نعت کا جو طرز ہمارے اکثر شعرا نے اختیار کیا ہے وہ بہت ہی قابلِ اصلاح ہے — بھلا نعت میں زلف و مکر، خط و خال وغیرہ سے کیا تعلق — مانا کہ یہ بھی سہی، مگر یہ کیسی غضب کی بات ہے کہ جو مقصد نعت کا ہے اور جو نعت کی جان ہے وہ بالکل غائب۔ گو بعض اوقات منشی صاحب (امیر مینائی) بھی اس ڈھرے پر چلے ہیں، مگر انھوں نے بہت اعتدال سے کام لیا ہے۔

بہرکیف ''صبحِ ازل'' میں جو مسدس میں لکھی گئی ہے شاعر نے خوشی و شادی کی منظر کشی کی ہے اور ولادتِ رسول ﷺ کے موقعے پر شیاطین کے ماتم کدوں کا نقشہ بھی پیش کیا ہے۔

عقیدت کی ایسی شاعری میں امیرؔ شعری محاسن کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ شاعر نے رسومِ میلاد کو ذہن میں رکھ کر ہی ''صبحِ ازل'' لکھی ہے۔ اس لیے جا بجا ان رسوم کا ذکر اس مثنوی میں ہوا ہے، مثلاً دورانِ ذکر مولود قیام کرنا ایک رسم بن گئی ہے۔ جو فخرِ دو عالم ﷺ کی آمد سے تعظیم کے لیے کھڑے ہونے کے مصداق ہے۔ شاعر کہتا ہے:

لو مومنو اب شاہ کی تعظیم کو اُٹھو
محفل میں حضور ﷺ آتے ہیں تسلیم کو اُٹھو
قربان کرو لا کے زر و سیم کو اُٹھو
دیدارِ رُخِ احمد بے میم کو اُٹھو
پھیلی ہے یہ ضو چار طرف ربِ علیٰ کی
تعظیم محمد ﷺ کی ہے تعظیم خدا کی

شاعر نے اس مثنوی میں آنحضرت ﷺ کے مختلف ''ارہاص'' کا ذکر بھی کیا ہے، جو ولادتِ رسول ﷺ کے وقت ظہور پذیر ہوئے تھے۔

مولودِ مسعود کے ذکر میں الطاف حسین حالیؔ کے مسدس کے چند شعر بھی عقیدت و شعریت کا نہایت اعلیٰ و ارفع نمونہ نظر آتے ہیں۔ حالیؔ نے ذکرِ مولود میں اپنی ایجاز پسندی سے اعجاز پیدا کر دیا ہے، جس کی وجہ سے مسدس کے یہ گنے چنے اشعار مستقل لکھے گئے بڑے بڑے میلاد ناموں پر بھاری ہیں۔ ان میں نہ خلافِ شرع کوئی بات کہی گئی ہے اور نہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ پیرایے میں سادگی لیے ہوئے قرآن و احادیث اور دیگر آسمانی کتب کے حوالوں سے پُر یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت
بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت
چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئے پہلوئے آمنہؓ سے ہویدا
دُعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ

قرآن میں دعائے خلیلی کے الفاظ ''رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ'' (سورۃ البقرۃ:۱۲۹) حضرت عیسیٰؑ کی بشارت یوحنا کی انجیل میں بھی درج ہے اور قرآن کی سورۃ الصف میں

''وَّمبشراً بِرَسُوْلٍ یَّاتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ'' (آیت ۶) کے الفاظ میں وارد ہیں۔ ایک حدیث میں بھی حضور ﷺ کا اشارہ ہے کہ ''میں اپنے دادا ابراہیمؑ کی بشارت ہوں۔''

حالیؔ کے اس مسدس کے بعد ''ذکرِ میلاد النبی ﷺ'' کو موضوعِ سخن بنانے والوں میں سیّد وحید الدین سلیم (م، ۱۹۳۷ء) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے ''مولود بہاریہ'' شعری محاسن کا گویا مرقع ہے۔ اس نظم میں طویل بحر اور ہر مصرع میں ''مستفعلن'' کی آٹھ بار تکرار سے موسیقیت پیدا کی گئی ہے۔ سلیم نے موسم بہار سے تعلق رکھنے والے تمام پھولوں، پودوں اور موسم سے مناسبت رکھنے والی تمام اشیا کا ذکر نہایت خوبی اور روانی کے ساتھ کیا ہے، اس طرح یہ نظم مصوری، شاعری اور موسیقی کا سنگم دکھائی دیتی ہے۔ نظم کا موضوع اگرچہ وہی ہے، لیکن شاعر کے طرزِ بیاں نے اس میں جدت اور نیا آہنگ پیدا کر دیا ہے۔

اے ہم دم شیریں سخن
ہے نور حق پر تو فگن
ہر نخلِ گل کی ہے پھبن
طورِ جمالِ ذوالمنن
بن ٹھن عروسانِ چمن
شیریں ادا شیریں بدن
رنگیں قبا گل پیرہن
ہیں کس طرب سے خندہ زن
سرو ایک پا سے ہے کھڑا
کس درجہ ہے شرم و حیا
خاموش ہے سر کو جھکا
یہ طرز کوئی سمجھے کیا
جب تک چلی بادِ صبا
پتوں نے یہ کھولا پتا
کہتا ہے یہ صلِ علیٰ
اے مرحبا گہرِ زمن

نورِ قدم پیدا ہوا
شاہِ اُمم پیدا ہوا
عرشی خدم پیدا ہوا
والا حشم پیدا ہوا
فرخ شیم پیدا ہوا
بحرِ کرم پیدا ہوا
کوہِ ہمم پیدا ہوا
پیدا ہوا قدسی سخن

''ولادتِ رسول ﷺ'' کے واقعہ کو شاد عظیم آبادی نے بھی نظم کیا ہے۔ شاعر نے البتہ شاعرانہ تخیلات سے زیادہ روایات پر زور دیا ہے۔ جیسا کہ پچھلے شعرا کے میلاد ناموں میں ہم دیکھ چکے ہیں۔

اُردو ادب میں شاعری اور درویشی کا ہمیشہ چولی دامن کا تعلق رہا ہے۔ صوفیوں اور درویشوں نے عوامی لب ولہجہ میں دین کی باتیں لوگوں تک پہنچائیں۔ اس کے لیے کبھی تو انھوں نے قصہ کہانی کا سہارا لیا، کبھی مطقیانہ اور فلسفیانہ طریقوں کو اپنایا اور کبھی عشق کا سہارا لیا کبھی رجز کا لیکن ایسی شاعری سے عورتیں مستفیض نہیں ہوسکتی تھیں، اس لیے ان صوفیوں اور درویشوں نے عوامی گیتوں کا بھی سہارا لیا جو بالخصوص عورتوں میں مروج ہیں، مثلاً چکی نامہ، چرخی نامہ، جھولنا نامہ وغیرہ۔ یوپی کے ایک شاعر نوؔر سہارنپوری کا یہ ''جھولنا نامہ'' ملاحظہ کیجیے جس میں ذکرِ میلاد ہے۔

جھولتے جب نبی مصطفٰے ﷺ جھولنا
جھوم کر کہتا صلِ علیٰ جھولنا
نوری پھولوں سے پھولا ، پھلا جھولنا
جھوم کر کہتا صلِ علیٰ جھولنا

اور امجؔد حیدرآبادی کی نظم ''نبی جی کی لوری'' بھی سنیے:

آمنہ بی بی کے گلشن میں آئی ہے تازہ بہار
پڑھتے ہیں صل اللہ وسلم آج در و دیوار
نبّی جی اللہ ھو لا الہ الاّ ھو

''عید میلاد النبی ﷺ'' کے عنوان سے حفیظ جالندھری (م۱۹۸۲ء) کی نظم بڑی پُر اثر ہے۔ شاعر نے پرانی طرز کو اپناتے ہوئے پہلے دورِ جاہلیت کا نقشہ کھینچا ہے، پھر آپ ﷺ کے

آنے سے جو انقلاب رونما ہوا اس کی عکاسی کی ہے۔ شاعر نے استعارات وتشبیہات کے سہارے اپنے گلستانِ تخیل میں رنگ بھرا ہے۔ اسی طرح احسان دانش کی ''نوائے کارگر''، میں بھی ''ذکرِ میلاد'' کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ عمیق حنفی کی ''صلصلتہ الجرس'' میں حضور ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا بیان اس طرح ہوا ہے:

پردۂ مشرق کے پیچھے ہے فصل ربیع کی صبحِ اُمید
ہے پسِ مطلع حدِ ادب میں منتظر آمد خورشید
خانہ زہرا میں داخل ہونے کو ہے خورشید بہار
دریا ایک قدم کا کیا ہے، میدانِ مریخ ہے پار
نام محمد ﷺ اس کے پہلے کس کو ملا یہ پیارا نام
صل اللہ علیہ وسلم دونوں عالم بھیجیں سلام

ماہر القادری نے ''آتے ہیں'' کے عنوان سے لکھی نظم میں ''میلاد النبی ﷺ'' کا ذکر کیا ہے۔

جیسا کہ ابھی تک کی مثالوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ میلاد ناموں میں ''وقتِ صبح'' کی عکاسی بھی نہایت ماہرانہ انداز میں کی گئی ہے، ایسی ہی صبح کی عکاسی مراثی میں بھی کی گئی ہے، لیکن ان دونوں میں فرق ہے۔ مراثی کی صبح ہول ناک ہے اور یہاں فرحت بخش۔ وہاں صبح کی آمد گرمی کی شدت کا احساس دلاتی ہے، یہاں موسمِ بہار کی نسیم کے جھونکے روح پرور اور کیف آگیں محسوس ہوتے ہیں۔ وہاں آفتاب صبح حدث کی علامت ہے اور یہاں صبح، آفتابِ رحمت لیے آتی ہے۔ یہ صبح خوش گوار ہے اور وہ صبح دہشت ناک۔ یہ صبح درود و سلام سے گونجتی ہے اور وہ صبح نعرۂ تکبیر سے۔ یہ صبح معطر ومطہر ہے اور وہ صبح خون آلود۔ یہ صبح گوہر شبنم کی افشانی کرتی ہے اور وہ صبح آنسوؤں کے موتی کی۔ وہ صبح تلواروں کی جھنکار سے شروع ہوتی ہے اور یہ صبح طیورانِ خوش الحان کی زمزمہ خوانی سے۔ غرض کہ یہ صبح دعوتِ رحمت ہے اور وہ صبح دعوتِ کرب و بلا۔ اس طرح شعرائے اُردو نے حضرت محمد ﷺ کی ولادتِ سعید کے واقعہ کو پیش کرنے میں عقیدت و محبت کے وہ گلستان کھلا دیے ہیں جن کی خوش بو ایمان افروز بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔

نورنامے

حضور ﷺ کی صفتِ نور کو موضوعِ سخن بنا کر عربی، فارسی اور اُردو میں کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ شعرا نے مختلف پیرایے میں نور کی کیفیت بیان کی ہے۔ نعتیہ شاعری میں حضور ﷺ کی مدح

سرائی کے لیے اس موضوع میں ایسی ہی وسعت ہے اور ایسا ہی پھیلاؤ ہے جیسا کہ نور یا تجلّی میں ہوتا ہے۔ نعت گو شعرا نے اس میدان میں اپنی مشاقی کے جوہر کامیابی سے دکھائے ہیں۔ دورِ جاہلیت کا مشہور شاعر ابو کبیر ہذلی حضور ﷺ کی نورانی صفت کا بیان اس طرح کرتا ہے:

واذا نظرت الی اسرة وجهه

برقت کبرق العارض المتهلل

ترجمہ: جب میں نے آپ کے روئے تاباں پر نگاہ ڈالی تو اس کی شانِ رخشندگی ایسی تھی جیسے کہ کسی لکہ ابر میں بجلی کوندرہی ہو۔

حسان بن ثابت الانصاریؓ کا یہ شعر حضور ﷺ کی صفتِ نور کا غماز ہے:

متی یبد فی الدهاجی الیهی جینه

یلح مثل مصباح الدجی المتوقد

ترجمہ: سیارہ رات میں جب آپ کی جبینِ مبارک نظر آتی تو ایک چمک ہوتی جیسے تاریک رات میں کوئی روشن شمع ہو۔''

فخر الدین نظامی اپنی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں حضور ﷺ کے نورِ مجسم کو مشعل سے تشبیہ دیتے ہیں:

محمد جرم آد بنیاد نور
دوے جگ سرے دے پر ساد نور
مثالا اسی کا جو دیسے گھیر
جلے جگ اس تھیں اس دیہہ دھیر

میرانجی شمس العشاق (م ۱۴۹۸ء) حضور ﷺ کے نور کی تخلیق کو مقدم مانتے ہیں:

وہ نبی اوّل نور
بس عالم یہ معمور
نورانی احمد نام
یہ اچھا ذوق آرام

باجن (م ۱۵۰۶ء) نے حضور ﷺ کی ذات کو اس دُنیا کے لیے مبدائے نور سے تعبیر کیا ہے:

باجن تیرا باولا تجہ کارن پتیئے دمھکے
نبی محمد مصطفےٰ ﷺ میں نور جگ میں جھکے
(باجن شیخ بہاء الدین: خزائن رحمت اللہ قلبی ورق)

نبی ﷺ کی ولادت سے ایک جہان روشن ہوگیا اور کفر کا اندھیرا ختم ہوا۔ اس خیال کو سلطان محمد قلی قطب شاہ (م ۱۶۱۱ء) نے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

تجہ مکھ اجت کی جوت تھے عالم دیپارا ہوا
تج دین تھے اسلام لے مومن جگت سارا ہوا
(کلیات محمد قلی قطب شاہ، ص ۹،۱۱)

غواصی کی ''مینا ستونتی'' اور ''طوطی نامہ'' میں بھی حضور ﷺ کے سراپا نور ہونے کی توضیح کی گئی ہے۔ ابنِ نشاطی نے اپنی مشہور مثنوی ''پھول بن'' میں آنحضرت ﷺ کے ''مجسم نور'' ہونے کی وضاحت کی ہے۔

نیشنل میوزیم دہلی میں حسینی کی ایک تصنیف بعنوان ''نور نامہ'' محفوظ ہے۔ اغلب ہے کہ یہ دکن کے معروف بزرگ شاہ حسین حسینی کی ہوگی۔ اس میں شاعر نے سیرتِ نبی ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے وصفِ نور کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فتاحی کی ''مفید الیقین'' میں ''تخلیقِ نورِ احمدی'' کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

خدا نے جویک جھار پیدا کی
اوسے چار ثنا خاں ہویدا کی
بڑا خالق ہے او سو رب المتین
رکھیا جھاڑ کانا تو شجر الیقین
بزاں جلے موتی کے پردے بھیتر
رکھیا نور اور کوئی پیداش کر
دیا مھور کا شکل اس نور کوں
ہوا فلک او جھاڑ اس سور سو

فتاحی کے اشعار میں بعض جگہ غیر ضروری ''حروفِ جار'' کا استعمال اس نظم میں سقم پیدا کر دیتا ہے۔

مختار کے ''مولود نامے'' میں بھی ''آفرینشِ محمد ﷺ'' کے متعلق روایات بیان کی گئی ہیں۔

اسی دور کے ایک غیر معروف شاعر عنایتؔ کا نورنامہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ پہلے یہ نورنامہ فارسی نثر میں تھا، جس کا اس نے دکنی زبان میں ترجمہ کر دیا۔ اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے اس نے ورق نمبر ۵ الف پر امام غزالیؒ کے متعلق یہ روایت درج کی ہے کہ انھوں نے سلطان محمود شاہ کو یہ ''نورنامہ'' تحفتاً پیش کیا تھا، جس کی وجہ سے وہ عرب و عجم میں فتح یاب ہوا، لیکن اس کے بغور مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اس نے فتاحیؔ کی مفید الیقین کے کئی اشعار اپنے نورنامہ میں سرقہ کر لیے ہیں یہ نورنامہ ''مفید الیقین'' کے ۱۶ سال بعد یعنی ۱۶۹۹ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ اس میں فتاحیؔ کی مفید الیقین کے کئی اشعار جوں کے توں شامل کر لیے گئے۔ عنایت کے ''نورنامہ'' میں ہندو اسطو کا رنگ کُھلی طور پر جھلکتا ہے۔ ایک جگہ یہ روایت نقل کی ہے کہ ''تخلیقِ نور محمد'' مکمل ہوتے ہی رب العزت نے تمام ارواح سے اس سراپا نور کو دیکھنے کے لیے کہا۔ روحوں نے حضور ﷺ کے نورانی جسم کے جس حصہ کو دیکھا دُنیا میں آ کر اسی اعتبار سے انھیں بزرگی ملی۔ یعنی اگر روح نے گردن دیکھی تو دُنیا میں وہ آدمی تاجر ہوا۔ بازو دیکھے تو سپاہی وغیرہ۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب ''رگ وید'' میں بھی برہمن، ویش اور شدروں کے پیدائش کے متعلق ایسا ہی خیال پیش کیا گیا ہے۔

ایک اور شاعر احمدؔ کا نور نامہ (۱۱۳۶ھ/۱۷۳۳ء) ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد میں نظر سے گزرا، جس میں شاعر نے حتیٰ الوسع اس بات کی کوشش کی کہ روایاتِ صحیحہ منظوم کرے اور اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

حضور ﷺ کے نور کے متعلق غوثی بیجاپوری نے اپنی تصنیف ''قصص الانبیا'' میں کئی روایتیں منظوم کی ہیں۔ غوثیؔ نے یہ روایات خالصتاً دینی و علمی حیثیت سے پیش کی ہیں جس کی وجہ سے ان میں شعریت کا فقدان ہے اور بلحاظ تاثیر اشعار کم زور ہیں۔ تخلیقِ نورِ محمد ﷺ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

ہزار ایک سال لک پھرتا تھا او نور
ادب سوں تھا طوافِ حق میں معمور
اوّل کرتا ذکر تھا احدیت کا
جو بے چوں بے شبہ کی او صفت کا
ہوا تب حکم اے محبوب کے نور
مرے معشوق اور مرغوب کے نور

تجھے میں قسم کرتا ہوں اتا چار
یو فرما قسم کیتا چار غفار
کیا قسم اوّل سوں عرش پیدا
قلم قسم دوم سنے ہو ہویدا
کرا قسم سیوم سنے او جنت
بہشت اوپر محمد کی ہے منت

حضور ﷺ کے نور کے چوتھے حصے کو اللہ تعالیٰ نے پھر چار حصص میں منقسم کیا۔ پہلا حصہ خود محمد ﷺ کا، دوسرا حصہ عقل وفہم تیسرے سے شرم وحیا اور چوتھے سے معفرت پیدا کی جو مومنوں کے سروں کے اندر رکھی گئی ہے۔

عقیدت اور عقیدے کی شاعری میں شعریت بڑی حد تک مفقود ہوتی ہے۔ یہی عقیدت اگر عملی مسائل کے خول میں رکھ کر شعری پیکر اور شعریت کی چاشنی میں ڈھالی جائے تو شاعر کے کمالِ فن کا عمدہ نمونہ قرار پاتی ہے۔ دکنی شاعر باقر آ گاہ (م۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء) اس سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے ''ہشت بہشت'' کے پہلے رسالے ''من دیپک'' میں حضور ﷺ کے اوصافِ نور قرآن واحادیث کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔ شاعر نے اپنے رسالے کا نام موضوع کی مناسبت سے رکھا ہے۔ دیپک ہندی لفظ نور کا مظہر اور حضور ﷺ کی صفت ''سراج منیر'' کا عکاس ہے۔ رسالے میں آ گاہ اسی تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

جب نیں تھا کچھ ہستی سے نشاں
تھے کنجِ عدم میں سب پنہاں
نا ارض تھی ہور نا افلاک
نا انس نا جن تھی نا املاک
حق کیتا تب احمد کا نور
اس وقت ہوا ہے اوس کا ظہور
کوئی بولا شہ کو اے مرسل
کیا کیتا پیدا حق اوّل
فرمائے محمد میرا نور
ہے سب کے اوّل اوس کا ظہور

نور ناموں میں غلوئے عقیدت کے اتنے حجابات حائل ہوگئے ہیں کہ اصل نور نظر نہیں آتا۔ کبھی تو غلط روایات کا غلبہ اس قدر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پُر عظمت شخصیت نعوذ باللہ کسی اسطور کا مافوق الفطری کردار نظر آتی ہے یا سماوی خالقت کی محیر العقول ہستی۔ تاہم اس راہ میں بھی سنبھل کر قدم رکھنے والے کئی اُردو شعرا ہیں جن میں امیؔر مینائی، بیا میرٹھی اور محسن کاکوروی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ گو بعض جگہ لغزشیں ان سے بھی ہوئی ہے لیکن ایسا صرف عقیدت کی وجہ ہی سے ہوا ہے۔

''نورِ محمدی'' کو اپنی مثنوی ''نورِ تجلّی'' کا موضوع بنا کر امیر مینائی (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) نے تین روایتیں نقل کی ہیں۔ پہلی روایت تو روح البیان میں منقول ایک حدیث کا منظوم ترجمہ ہے مگر باقی دونوں روایات پر اسرائیلی اسطور اور تصوف کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اکثر نور ناموں میں جو بات خصوصیت کے ساتھ برتی گئی ہے وہ یہ ہے کہ پیدائش نور محمد ﷺ ''لولاک لما خلقت الافلاک'' کا بار بار ذکر ہوا ہے۔ درآں حالیکہ اس میں نور سے متعلق کوئی وضاحت نہیں ہے۔ دوسری روایت میں تقسیمِ نور کا ذکر ہے۔ جسے ہم غوثؔی کے یہاں دیکھ چکے ہیں۔ تیسری روایت البتہ خالص متصوفانہ لب ولہجہ لیے ہوئے ہے۔ اس میں شاعر نے ''حجابات'' کے رموز و اسرار بیان کیے ہیں۔ نور محمد اللہ نے بارہ حجابات کے اندر رکھا تھا۔ ہر حجاب کا ایک نام بھی شاعر نے بتایا ہے، مثلاً حجابِ عظمت، حجابِ قدرت، حجابِ ہدایت اور حجابِ نبوت وغیرہ۔ ان حجابات میں نورِ محمدی ہزاروں برس رہا۔ جب تمام پردے ہٹ گئے تو وہ نور شفاعت، رحمت، نصیحت، صبر وشکر، جود وسخا، امانت، یقین، علم، قناعت اور محبت وغیرہ کے بحور میں غوطہ زن رہا۔ اس کے بعد سات مقامات کو طے کرنے کے بعد نور ''مقامِ محبت'' پر پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات سے آگاہ کر دیا اور ذکر وشغل کی تاکید کی۔ اذکار واشغال میں نورِ محمدی کا استغراق دیکھ کر ہی اللہ تعالیٰ نے پانچوں نمازیں آپ پر اور آپ ﷺ کی اُمت پر فرض کر دیں۔

مثنوی ''نورِ تجلّی'' عقیدت میں ڈوبی ہوئی شعری کاوش ہے۔ گو شعریت کا فقدان بعض جگہ کھٹکتا ہے، لیکن پھر بھی ایسے خشک موضوع کو شاعر نے مؤثر بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہمارے شعری سرمایۂ ادب کو جہاں نعتِ رسول ﷺ کے ایک پہلو ''نور'' نے بلحاظ موضوع وسعت بخشی وہاں فنی لحاظ سے بھی اسے مختلف جہتوں سے روشناس کرایا۔ ''نور'' کی تشبیہات واستعارات کی قوسِ قزح کے رنگوں سے شعری فضا رنگین ہوگئی اور صنائع لفظی کا گلشن کھل اُٹھا۔ نور کی معنوی وسعت میں مبالغہ، حسنِ تعلیل اور ایہام وغیرہ کا بے ساختہ اور برجستہ استعمال شعرا کے لیے سہل ہوگیا اور ''نور'' کے نورانی تخیل کو انھوں نے کبھی میدانِ مثنوی کی سمت موڑا، کبھی

مسدس و مخمس کی راہ کھلائی، کبھی بیت و رُباعی پر اکتفا کیا تو کبھی غزل کی فضا میں اسے پرواز بخشی۔ غرض یہ کہ ''نور'' کی علامت کے مختلف النوع تجزیے کیے گئے۔ جس کی وجہ سے اشعار کے لعل و جواہر نور کی تاب نا کی سے خزینۂ ادب جگمگانے لگے۔ محمد محسن کاکوروی (م ۱۹۰۵ء) ''نور'' کا استعمال اپنے اشعار میں کس کس انداز سے کرتے ہیں:

سایہ زیبا ہی نہ تھا آپ کی قامت کے لیے
روشنائی تھی یہی مہرِ نبوت کے لیے
جسمِ محبوبِ خدا نور کا اک پتلا ہے
سایہ حق وہ شہ منزلت طٰہٰ ہے
لاکھ عاشق ہوں مگر لطف دو محبوب نہیں
ظلِ حق ہو تو ہو پر ظلِ نبی خوب نہیں

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے نور کی مناسبت سے سایہ، روشنائی اور ظل وغیر متضاد الفاظ استعمال کیا ہے جو مناسبت لفظی اور نور کے بالمقابل صنعت تضاد کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کے علاوہ سرورؔ جہاں آبادی، حالیؔ، اکبرؔ، شادؔ عظیم آبادی، اصغرؔ، اقبال سہیلؔ، ظفر علی خاں اور جگر مراد آبادی وغیرہ کے کلام میں بھی نورِ محمدی سے متعلق ابیات پائے جاتے ہیں جو صنعتِ لفظی و معنوی کا بہترین نمونہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔

حفیظ جالندھری نے ''شاہنامۂ اسلام'' جلد اوّل میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت عبداللہ میں علاماتِ نورِ محمدی پا کر انھیں بارہا ہلاک کرنے کا قصد کیا مگر ہمیشہ ناکام رہے۔ حفیظ جالندھری نے اس طرح کا ایک اور واقعہ بھی نقل کیا ہے، جس کا ماخذ دلائل ابی نعیم، طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری ہیں، لیکن اکثر اربابِ نظر کے نزدیک یہ واقعہ ضعف سے خالی نہیں۔ تاہم بعض کے نزدیک روایات کا تواتر اسے حسن لغیرہ کے زمرے میں کر دیتا ہے۔ یہاں واقعہ کی صحتِ ضعف سے بحث نہیں، دکھانا یہ ہے کہ شعرا نے حضور ﷺ کی صفت نورانی کے بیان میں اس کو نہایت اہتمام سے منظوم کیا ہے۔ بعض شعرا نے محتاط انداز میں صرف آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ ہی کو بنیاد بنا کر ''نور نامے'' لکھے ہیں اور بعض نے ''نور محمدی'' کو تشبیہات، استعارات اور کنایات وغیرہ کے طور پر اپنے اشعار میں برتا ہے۔ بعض نے نور کو بطورِ علامت بھی استعمال کیا ہے اور اس کے ذریعے اپنے اشعار میں کئی معانی و مفاہیم پیدا کیے، مثلاً ''صلصلۃ الجرس'' کے شاعر عمیق حنفی نے آپ ﷺ کے نور کی مناسبت سے آپ ﷺ کو ''مشعلِ کائنات''،

''شمعِ بزمِ حیات'' وغیرہ القاب دے کر آپ ﷺ کے نور کو بطورِ علامت کے استعمال کیا ہے۔

معراج نامے

اُردو کے معراج ناموں سے ایک طرف عقیدتِ رسول ﷺ کا اظہار ہوا ہے اور دوسری طرف اس کی وجہ سے سماوی سفر پر مشتمل ادب وجود میں آیا ہے۔ اس قسم کے ادب کا سراغ سب سے پہلے ہومر کی ''اوڈیسی'' میں ملتا ہے۔ یہ ایک یونانی ڈراما ہے جس میں جنت، دوزخ اور عرفات کے سفر اور وہاں کے آثار و مشاہدات کا خیالی بیان ہے۔ ڈانٹے (م۱۳۲۱ء) نے ''ڈیوائن کامیڈی'' (طربیۂ خداوندی) میں اسی قسم کے سفر کو منظوم کیا تھا۔ عربی میں ابن شہید الاندلسی (م۱۰۳۲ء/۴۲۶ھ) کے ''رسالۃ والزوابع'' اور ابوالعلاء المعری (م۱۰۵۵ء/۴۴۹ھ) کے ''رسالۃ الغفران'' میں بھی سفرِ فلک الافلاک کا بیان ہے۔ محی الدین ابن العربی (م۱۲۴۰ء) کی ''فتوحات مکیہ'' میں بھی سیرِ فلک کا ذکر ہے۔ فارسی مثنوی ''نُہ سپہر'' میں حضرت امیر خسروؔ نے نہایت ہی شاعرانہ انداز میں سماوی سفر کی روداد پیش کی ہے۔ فارسی مثنوی ''بوستانِ خیال'' میں بھی آسمانی سفر کا بیان ہوا ہے اور دورِ جدید کے مشہور شاعر علامہ سر شیخ محمد اقبالؔ کے ''جاوید نامہ'' کو تو سماوی ادب پر مشتمل سفرناموں میں بلند درجہ حاصل ہے۔ غرض کہ سیرِ سماوی کو موضوعِ سخن بنانے کی روایت بہت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ سعید احمد اکبر آبادی نے ڈاکٹر لویس عوض کی رائے نقل کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے:

> اس طرح کے ادب پارے مستقل بالذات ہیں۔ ان میں اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ یونانی اثرات بھی پائے جاتے ہیں — ڈانٹے کے زمانے میں واقعۂ معراج پر اسپانوی، لاطینی اور فرانسیسی زبان میں تراجم موجود تھے۔

معراج تاریخِ اسلام کا عظیم الشان واقع ہے۔ یہ واقعہ نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ البتہ علمائے کرام کے ایک طبقے کے نزدیک یہ ایک روحانی سفر تھا اور دوسرے کے خیال میں ''جسدی سفر''۔ اس بحث سے قطعِ نظر اس تاریخی واقعہ نے ادب پر بڑی گہری چھاپ چھوڑی ہے جس کی وجہ سے شاعری کو ایک نیا موضوع ملا اور نئی علامات، تشبیہات اور استعارات و اصطلاحات بھی وجود میں آئیں۔

اُردو شعرا نے مثنویوں میں نعت کے ذیل میں واقعۂ معراج کو بالواسطہ بھی نقل کیا ہے اور بلاواسطہ خالص معراج نامے بھی ترتیب دیے ہیں۔ ملا وجہیؔ اور نصرتیؔ نے علاحدہ معراج نامے

ترتیب نہیں دیے لیکن واقعۂ معراج کو اپنی مثنویوں میں نعتِ رسول ﷺ کے ضمن میں تفصیل سے بیان کیا ہے جس کی وجہ سے انھیں مستقل معراج ناموں کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

دکن میں واقعۂ معراج کو موضوع بنا کر خالصتاً ''معراج نامہ'' ترتیب دینے کی روایت نثر میں خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (م ۱۴۲۱ء/ ۸۲۵ھ) کے یہاں پائی جاتی ہے اور نظم میں بلاقی کے یہاں۔ بلاقی کے معراج نامہ (م ۱۶۴۵ء/ ۱۰۵۶ھ) میں یہ مذہبی موضوع تصوف کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے، لیکن بے بنیاد روایات کو جوڑنے کی وجہ سے ان کا معراج نامہ بس ایک دل چسپ واقعہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ بلاقی نے فارسی معراج ناموں سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے یہاں اثنائے عشری عقائد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے آسمانی سفر کی منظر کشی کرنے میں شاعر نے وسعتِ نظر سے کام لیا ہے۔ جنت و دوزخ کے مناظر، پانچویں فلک کے ہیبت ناک فرشتے اور براق کی تصویر کشی میں اس نے اپنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

بلاقی نے سات سو ابیات میں یہ معراج نامہ قلم بند کیا ہے جو اسی کے بقول ''خلق میں عجیب وغریب یہ قصہ ہے۔'' اس مثنوی میں شاعر نے جگہ جگہ علمِ نجوم کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، جو اس کے علم نجوم سے واقفیت کی دلیل ہیں۔

بلاقی کے بعد دوسرا معراج نامہ معظم نے ۱۶۶۹ء/ ۱۰۸۰ھ میں ترتیب دیا تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر عنوان ایک شعر سے شروع ہوتا ہے اور عنوان کے سب اشعار ایک ہی بحر اور ردیف و قافیہ میں لکھے گئے ہیں۔ ان سب اشعار کو اگر یک جا کر دیا جائے تو ایک الگ نظم بن جاتی ہے، جس میں سارے معراج نامے کا خلاصہ آجاتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے سالار جنگ کتب خانہ کے مخطوطات کی فہرست میں فتاحؔی کے معراج نامے کا ذکر کیا ہے، لیکن اس دور کا سب سے بہترین معراج نامہ جو شعری خوبیوں سے مالا مال ہے، مختاؔر کا ہے۔ اس نے معراجِ نبوی ﷺ کی پانچ وجہیں بیان کی ہیں جو اگرچہ نصوص و احادیث سے ثابت نہیں ہیں مگر ان میں شریعت پوری طرح موجود ہے۔

پہلی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مشقت دیکھ کر اللہ رب العزت نے سورۂ طٰہٰ نازل فرمائی اور اپنے محبوب کو اپنے پاس بلایا۔ دوسرا سبب یہ بتایا ہے کہ قیامت کے دن جب ہر ایک کو اپنی ہی فکر ہوگی اس وقت محمد ﷺ کو اپنی اُمت کی فکر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے اذن سے آپ ﷺ اپنی اُمت کی شفاعت کریں گے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرش پر بلا کر محشر

کے حالات سے آگاہ کر دیا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی اوّلیت کا شرف آپ ﷺ کو حاصل ہو جائے۔ چوتھا سبب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اپنا حبیبِ مکرم بنایا ہے اور آپ ﷺ کے تصرف میں زمین و آسمان کے خزانے دے دیے اور تمام گنج ہائے ارض اللہ رب العزت نے معراج کے موقع پر آپ ﷺ پر ظاہر کر دیے۔ پانچواں سبب شاعر کا اپنا نتیجۂ فکر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں زمین و آسمان کا مکالمہ نظم کیا ہے، جس میں وہ اپنی اپنی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ اس سے شاعر کی قادر الکلامی اور علومِ ہیئت و نجوم پر گہری نظر کا پتا چلتا ہے۔

اپنی بڑائی اور برتری بیان کرتے ہوئے زمین آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے کہتی ہے کہ محمد ﷺ کے قدمِ مبارک مجھ پر ہیں، اس لیے تجھ سے افضل ہوں۔ آسمان یہ دلیل سن کر خاموش ہو جاتا ہے اور اللہ رب العزت کی بارگاہ عالی میں گڑگڑا کر دُعا کرتا ہے جو قبول ہو جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو معراج میں آسمان پر بلایا۔

مختار نے سدرۃ المنتہیٰ، عرشِ اعظم اور جنت و دوزخ وغیرہ کی منظر کشی عمدہ پیرایے میں کی ہے اور شعری محاسن کا خیال بھی رکھا ہے۔

عادل شاہی دور کے مشہور شاعر میراں ہاشمی (م ۱۶۹۷ء/ ۱۱۰۹ھ) کے معراج نامے کا ذکر بھی تاریخ کی کتب میں آیا ہے۔ باوجود نابینا ہونے کے ہاشمی معراج کے واقعے کی تمام جزئیات کو بالتفصیل بیان کرتا ہے۔ اس کے معراج نامے میں وہ تمام عناصر دکھائی دیتے ہیں جن کا استعمال اس کے پیش رووں نے کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دل کے نور سے تخیل کی آنکھیں روشن کر لی تھیں اور عقیدت کی روشنی میں جنت، دوزخ، حور و ملائک سبھی کے دیدار سے مشرف ہوا تھا جو دیدہ وروں کو بھی مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔

گجرات کے شاعر امین نے بھی واقعۂ معراج کو اپنا موضوعِ سخن بنایا تھا۔ اس کے ''مولود نامے'' میں آنحضرت ﷺ کی ولادت، معراج اور وفات کا ذکر ہے۔

واقعۂ معراج کو الگ سے موضوع بنا کر لکھے گئے معراج ناموں میں بارھویں صدی ہجری کے ربع آخر میں ابوالحسن قربی اور شاہ کمال الدین کمال کے معراج نامے دکن کے مذہبی ادب میں شان دار اضافہ کرتے ہیں۔ قربی نے اپنے معراج نامے کے لیے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مشہور فارسی تصنیف ''معارج النبوۃ'' کو بنیاد بنایا ہے۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی سماوی سیر کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ قربی کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس نے معراج کے تمام واقعات اس طرح پیش کیے ہیں گویا خود رسول اللہ ﷺ بیان کر رہے ہوں۔ کمال نے بھی اپنا معراج نامہ مروّجہ

طریقوں ہی پر ترتیب دیا ہے۔ اس نے بلاقی کے معراج نامے کے نقائص بھی بیان کر دیے ہیں۔ اس نے اپنی تصنیف کو ایک عربی معراج نامے کا ترجمہ بتایا ہے جو اس نے بیت اللہ شریف سے منگوایا تھا۔ کمال نے بعض اشعار میں عربی کے جملے جوں کے توں رکھ دیے ہیں۔

دکن کی طرح معراج ناموں کی روایت شمالی ہند میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہماری تحقیق میں شمالی ہند میں اُردو کا پہلا منظوم معراج نامہ ۱۷۸۹ء/۱۲۰۴ھ کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ اسے ایک غیر معروف شاعر قاسم نے ترتیب دیا تھا۔ ریختہ میں لکھے گئے اس معراج نامے میں بقول شاعر ۱۳۲۷ ابیات ہیں۔ معراج کے جزوی واقعات کی تفصیل میں شاعر نے تسلسل قائم رکھا ہے اور روایات کو نقل کرنے میں اس نے احتیاط سے کام لیا ہے، مثلاً جزوی سرخی ''ظاہر ہونا دودھ اور شہد کے دو پیالوں کا'' کے تحت اس نے ترمذی کی ایک مشہور حدیث کو منظوم کیا ہے۔

قاسمؔ کے متعلق معلومات نہیں مل سکیں۔ معراج نامے سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ شمالی ہند سے ان کا تعلق تھا اور وہ حضرت نظام الدینؒ سے عقیدت رکھتا تھا۔ درگاہِ نظام الدینؒ ہی کی مسجد میں ان کے دوست نے واقعۂ معراج کو ریختہ میں نظم کرنے کو کہا تھا۔ قاسمؔ نے بالآخر دو ماہ دو دن میں معراج نامہ نظم کرلیا اور اس کا نام ''زبدۃ الاخبار'' رکھا۔

ڈاکٹر صلاح الدین نے ''دہلی کے اُردو مخطوطات'' میں عبداللطیف خاں کی مثنوی ''جلوۂ طور'' کا تعارف کرایا ہے، جس میں معراج کے واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔

قاسمؔ کے بعد شمالی ہند میں ضمیرؔ لکھنوی نے ''ریحان معراج'' کے عنوان سے ایک معراج نامہ ۱۸۳۰ء/۱۲۴۷ھ ترتیب دیا تھا، جس کا تعارف اسپرنگر کے ترتیب دیے ہوئے کیٹلاگ میں ہے۔ اس کا ایک نسخہ مجھے سالار جنگ کے قلمی مخطوطات میں ملا ہے۔ ضمیر کا معراج نامہ اثنا عشری عقائد پر مبنی ہے۔ اس نے معراج نامے کی ابتدا ساقی نامہ سے کی ہے اور ہر واقعے کے لیے ایک سرخی فارسی میں قائم کی۔ اس نے آنحضرت ﷺ کے اسی سماوی سفر کا حال بیان کرنے کے بعد منکرِ معراج یہودی کا مشہور واقعہ بھی بیان کیا ہے۔

دکنیات کے سلسلے میں باقرؔ آگاہ اور لچھمی نرائن شفیقؔ کے معراج نامے بھی قابلِ ذکر ہیں مگر ان سے شعری روایت آگے نہیں بڑھی ہے۔ رشید حسن خان صاحب کے خیال میں امام بخش ناسخؔ کا غیر مطبوعہ ''معراج نامہ'' اس وقت ترتیب دیا گیا جب وہ سنی المذہب تھے، بعد میں اثنا عشری مذہب قبول کر لینے کی وجہ سے انھوں نے اس کی اشاعت پسند نہیں کی (رسالہ اُردو کراچی جولائی ۱۹۶۸ء)۔

منیرؔ شکوہ آبادی (م۱۸۸۱ء) کی مثنوی ''معراج المضامین'' میں بھی واقعۂ معراج کا بیان ہے، لیکن ان کے یہاں اختصار بہت ہے۔

اُردو کی نعتیہ شاعری میں محسنؔ کاکوروی کا نام بہت ممتاز ہے۔ قدیم موضوعات کو انھوں نے نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی عقیدت سے معمور شاعری میں شعریت اپنے عروج پر قائم رہتی ہے، بلکہ روحانیت کی پاکیزہ روشنی سے وہ اور زیادہ منور ہو جاتی ہے۔ ''چراغِ کعبہ'' محسنؔ کا نعتیہ قصیدہ ہے جو بلحاظ موضوع واقعۂ معراج کا ترجمان ہے۔ شاعر نے تشبیب، گریز اور پھر معراج کے واقعات میں مدح کا پہلو نکالا ہے۔ ''آغازِ روایت'' کے عنوان سے تشبیب شروع ہوتی ہے۔

بھیگی ہوئی رات آبرو سے
داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیِ گل اندام
شبنم کی رِدا بقصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال
جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

معراج چوں کہ رات میں ہوئی تھی اس لیے شاعر نے وقت کی مناسبت سے تشبیب کے اشعار لکھے ہیں۔ احرام کی مناسبت سے شبنمی ردا، رات کی مناسبت سے لیلیٰ کی صنف تجسیم وغیرہ مناسبت لفظی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ گریز کے بعد اصل واقعہ شروع ہوتا ہے۔ اسی درمیان محسنؔ جبرائیلؑ اور براق کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ بیت المعمور پہنچنے کے بعد جبرائیلؑ بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو حضور ﷺ کی کیفیت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ احادیث میں تفصیل سے اس کا ذکر ہے۔ محسنؔ نے بھی بڑے دل آویز انداز میں آپ ﷺ کی اس وقت کی نفسانی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ قصیدے کا خاتمہ روایتی انداز میں دُعائیہ کلمات کے بجائے مناجاتی انداز میں ہوا ہے۔

دورِ جدید کے شعرا میں سیماب اکبرآبادی نے واقعۂ معراج کے ذریعہ بنی نوع انسان کو اخلاقی درس دیا ہے اور انھیں جھنجھوڑا ہے کہ ''ایک وقت وہ تھا کہ انسان کی پرواز بامِ ثریا سے بلند ہو کر عرشِ معلی تک تھی مگر اب اس پر ذلت ونکبت کی نحوست منڈلا رہی ہے۔''

اقبال احمد سہیلؔ اعظمی کا معراج نامہ احادیث ونصوص کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں صحیح واقعات بڑے دل کش اور دل نشین انداز میں نظم کیے گئے ہیں۔ سہیلؔ کے یہاں عقیدت کے ساتھ ہی معنوی وادبی محاسن بھی پوری طرح موجود ہیں۔ ان کی عقیدت پر مبنی جذبات و کیفیات

اور احوال و خیالات حسن و لطافت سے اس طرح آراستہ ہیں کہ ان کی ساری نعتیں نگار خانۂ شعر و ادب معلوم ہوتی ہیں۔ صحیح واقعات کی ترجمانی، پاکیزگی اور ان میں تسلسل ذوقِ سلیم کو گرما دیتے ہیں۔

دوسری زبانوں کے مقابلے میں اُردو معراج ناموں کی بدولت سیرِ سماوی پر مشتمل جو ادب پارے وجود میں آئے وہ نہ افسانوی رنگ میں ہیں اور نہ صرف تخیل کی پرواز کا نتیجہ ہیں بلکہ ان میں تاریخی شواہد کے باوجود عقیدت کی فراوانی بھی ہے۔

''ڈیوائن کامیڈی'' اور ''اوڈیسی'' جیسی بین الاقوامی شہرت کے حامل علوی سفر پر مشتمل ادب پاروں کے مقابلے میں اُردو ادب کے صرف ''معراج نامے'' ہی رکھے جاسکتے ہیں جو اس اعتبار سے ان سے بڑھ کر ہیں کہ ان میں عقیدت کے ساتھ ہی تاریخی حقیقت بھی ہے جب کہ اوّل الذکر میں حقیقت و عقیدت دونوں کا فقدان ہے۔

وفات نامے

نعتیہ شاعری میں جہاں شعرا نے اوصافِ محمد ﷺ کے بیان میں اپنے تخیلات کی پرواز کو بلند سے بلند تر کرنے کی سعی کی ہے، وہاں آپ ﷺ کے حالاتِ زندگی کو بھی موضوعِ شاعری بنایا ہے اور واقعۂ ولادت، بعثت، معراج اور وفات کو قلم بند کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات مسلمانوں کے لیے عظیم سانحہ تھی۔ چناں چہ اس موقعے پر جذبات کا بے قابو ہو جانا ناگزیر تھا، جس کی وجہ سے چند تاریخی واقعات وجود میں آگئے جو آپ ﷺ کی وفات کے واقعہ کے ساتھ اس طرح منسلک ہوگئے، جنھیں الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ان مشہور واقعات میں سے ایک واقعے کے تعلق حضرت عمرؓ کی ذات سے ہے۔ انھوں نے وفورِ غم میں نہ صرف آنحضرت ﷺ کی وفات کا انکار کر دیا تھا، بلکہ تلوار نیام سے نکال کر صاف کہہ دیا تھا کہ حضور ﷺ کی وفات کا لفظ زبان پر لانے والے کا سر قلم کر دوں گا۔ اس کی تفصیل کتبِ سیر و تاریخ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

سورۃ المائدہ کی آیت ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي'' (آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے) کے متعلق مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ گویا حضور ﷺ کے وصال کا اعلان تھی۔ شعرا نے اسی کو بنیاد بنا کر آپ ﷺ کی وفات کا حال نظم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے واقعۂ وصال کو منظوم کرنے کی روایت اُردو شاعری میں پرانی

ہے۔شمالی ہند کے شاعر شیخ محبوب عالم ساکن جھجھر کے ''دردنامہ'' میں آپ ﷺ کی سیرت کے ساتھ ہی آپ کی وفات کا تفصیلی بیان منظوم کیا گیا ہے۔

ایک غیر معروف شاعر عبداللطیف کے ''وفات نامہ'' کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب تاریخِ ادب اُردو میں کیا ہے۔ جس میں آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر سن کر شدتِ غم سے نڈھال ہوئے، صحابہ کرامؓ کے جذبات کی عکاسی شاعر نے نہایت مؤثر انداز میں کی ہے۔

''وفات نامۂ رسول ﷺ'' گجرات کے شاعر پیرو عالم نے نظم کیا ہے، مگر ان کے یہاں اس دور کی تصانیف کے مقابلے میں ادبیت کا فقدان ہے۔ ان کے بعد گجرات میں وفات ناموں کی روایت کو امینؔ گجراتی نے آگے بڑھایا ہے۔ ان کی تصنیف ''تولدنامہ'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ میلادنامہ، معراج نامہ اور وفات نامہ۔ امینؔ نے سورۃ المائدہ کی مذکورہ آیت کو بنیاد بنا کر وفات نامہ ترتیب دیا ہے۔

دکن کے ایک غیر معروف شاعر دریاؔ کے ''وفات نامہ'' میں بھی یہی روایت منظوم کی گئی ہے۔ ''وفات نامہ سرورِ کائنات ﷺ'' کے عنوان سے لکھی ہوئی امامیؔ کی مثنوی ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد میں موجود ہے۔ شاعر نے وصالِ رسول ﷺ کو بڑے غم ناک انداز میں منظوم کیا ہے۔

ولیؔ ویلوری کی تصنیف ''وفات نامہ نبی ﷺ'' میں حضرت عمرؓ کے وفورِ غم میں بے قابو ہو جانے کے واقعے کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے عقیدت سے مملو شاعری میں بھی شعری محاسن کا قابلِ لحاظ حد تک پاس رکھا ہے۔ تشبیہات، استعارات کے علاوہ تجنیس کا بھی برجستہ استعمال ولیؔ کی اس مثنوی میں ہوا ہے، جس کی وجہ سے باوجود زبان کے قدیم ہونے کے اثر انگیزی میں فرق نہیں آتا۔

ولیؔ ویلوری کے بعد محمد باقر آگاہ بیجاپوری کی ''بہشت'' کے چوتھے رسالے ''جگ سوہن'' میں حضور ﷺ کی رحلت کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی نعت گو شعرا نے اس میدان میں جولانی دکھائی ہے اور گلشنِ عقیدت کو اپنی نعتیہ تصانیف کے گلوں سے سجایا ہے۔

اسرائیلیات

اسرائیلیات سے مراد وہ روایات اساطیر موضوعات ہیں جن کا تعلق خالصتاً یہودی مذہب سے ہے اور وہ روایات بھی اسی ذیل میں آتی ہیں جو نعوذ باللہ آپ کو بدنام کرنے کے لیے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت حضور ﷺ کی ذات سے جوڑ دی گئی تھیں اور علمائے کرام نے وقت

گزرنے کے بعد بلاتحقیق انھیں اسلامی لٹریچر کا جزو بنا لیا تھا۔ یہاں ان تمام اسرائیلی روایات کا احاطہ ممکن نہیں، صرف چند پر اکتفا کیا جائے گا۔ تفصیل کے لیے سیرۃ النبی ﷺ جلد سوم ملاحظہ ہو۔ جس میں مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ شعرا نے بھی تحقیق کے بغیر بعض اسرائیلی موضوعات سیرتِ رسول ﷺ سے جوڑ دیے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس کا بڑا قلق تھا۔ فرماتے ہیں:

''ملّا معین الدین ہروی — جو فی الحقیقۃ و حکایت طرازی و اقتباس روایات ضعیفہ و موضوعہ و تاویلات و اقتباس رکیکہ، قرآن و سنت و عبور و رسوخِ اسرائیلیات و روایات یہود میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ شاید بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ آج اُردو زبان میں جس قدر مولود لکھے گئے ہیں اور رائج ہیں وہ سب کے سب بے واسطہ یا بالواسطہ اسی ملّا معین ہروی کی کتابوں معارج النبوۃ، تفسیر سورۂ یوسف موسوم بہ تقرہ کار، قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موسوم بہ اعجاز موسوی وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔
(الہلال ۲۲ فروری ۱۹۱۳ء مشمولہ معارف اعظم گڑھ نومبر ۸۵ء ص:۳۵۱)

رسالہ ''برہان'' دہلی کے سابق ایڈیٹر مولانا سعید اکبر آبادی مرحوم نے بھی لکھا تھا، ''معراج سے متعلق احادیثِ صحیحہ میں بھی ضعف پایا جاتا ہے۔''

اُردو شعرا نے جن اسرائیلی موضوعات کو نعتِ رسول ﷺ کا جزو بنایا ہے، ان میں ایک مشہور قصہ جو بالعموم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اسے حضور ﷺ کی حیات طیبہ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اُردو کے ایک غیر معروف شاعر طالب اور ایک نامعلوم شاعر نے ایک واقعہ ''معجزۂ باز و فاختہ'' کے عنوان سے نقل کیا کہ ایک بار دو پرندے باز اور فاختہ اُڑتے ہوئے حضور ﷺ کے پاس آئے۔ باز، فاختہ کا پیچھا کر رہا تھا۔ فاختہ نے حضور ﷺ سے پناہ چاہی اور آپ ﷺ نے بہ طیبِ خاطر فاختہ کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اس پر باز نے کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے میری غذا ہے اور آپ ﷺ نے اسے پناہ میں لے کر مجھ پر ظلم کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بدلے تم جو چاہو میں دے دوں گا۔ باز نے اس پر کہا، مجھے آپ ﷺ کے رخسار کا گوشت چاہیے۔ یہ سن کر سارے صحابہ ششدر رہ گئے اور سبھی نے اپنا گوشت حضور ﷺ کے بدلے میں دینے کا اقرار کیا مگر باز نہیں مانا۔ بالآخر حضور ﷺ نے چھری رخسار کی طرف پھیری ہی تھی کہ باز اور فاختہ اپنی اصل شکل میں آ گئے اور حضور ﷺ کو اس اقدام کو روکا۔ باز حضرت

جبرئیل علیہ السلام تھے اور فاختہ عزرائیل، دونوں نے بہ یک زبان کہا کہ اللہ نے آپ ﷺ کے ایثار و قربانی کا امتحان لینے کے لیے ہمیں بھیجا تھا۔ بے شک یارسول اللہ ﷺ روئے زمین پر آپ ﷺ سے زیادہ ایثار والا کوئی نہیں۔

یہ قصہ ہو بہ ہو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت میں بھی کتبِ سیر میں ملا ہے۔ غواصیؔ نے اپنی مثنوی ''طوطی نامہ'' میں یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی سے منسوب کیا ہے۔ بدھ مذہب کے اساطیر میں راجا شیبی سے بھی یہ قصہ منسوب ہے۔ راقم کے مضمون ''ایک روایت تین مذاہب'' مطبوعہ ''دورِ بھ نامہ'' ناگ پور میں اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ طالبؔ کی مثنوی ''معجزۂ بازو فاختہ'' مطبع کریمی بمبئی سے ۱۳۳۹ھ میں چھپ چکی ہے۔ ایک نامعلوم شاعر کی تصنیف ''بازو فاختہ'' کا ذکر زورؔ مرحوم نے ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد کی وضاحتی فہرست کی جلد اوّل ص ۱۸۱ پر کیا ہے۔

دوسری اسرائیلی روایت بلاقیؔ اور ضمیرؔ کے معراج ناموں میں درج ہوئی ہے۔ پچھلے صفحات میں منکرِ معراج یہودی کا جو قصہ گزرا ہے، بلاقیؔ اور ضمیرؔ کے معراج ناموں میں یہ فارسی سے داخل ہوا ہے۔ ایران میں مذہبی ادبیات اکثر غریب و ضعیف روایات کا مرقع ہے۔ شعرا و ادبا غلوئے عقیدت میں اکثر روایات کو اپنے ادب پاروں میں پیش کرتے چلے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے واقعات کو سیرتِ نبوی ﷺ سے جوڑ دیا گیا ہے جن پر اسرائیلی اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں، لیکن یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔

عبدالعزیز خالدؔ کی ''فارقلیط'' شیوۂ رسودہ ابنائے زمن'' کے بالمقابل ''شوقِ تجدید سے صحرا کو گلستاں'' کرنے کا پہلا قدم ہے۔ خالد نے اس عظیم انسان ﷺ کی مدح سرائی کے لیے مروّجہ فرسودہ اسلوب سے ہٹ کر نعت کو نیا اسلوب دیا ہے، لیکن ان سے جہاں ایک طرف نعت کے نئے راستے کھلے ہیں وہاں اسلوب کی اساطیری اور اسرائیلی فضائیں اس ''خلقِ عظیم'' کے تقدس و عظمت کو داغ دار کر دیتی ہیں۔

اسرائیلی روایات میں پیغمبرانِ اسرائیل پر جنسی لذت کوشی کا بہتان باندھا گیا ہے۔ خالدؔ نے اس کی جسارت تو نہیں کی ہے، لیکن وہ اسرائیلیات سے دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعۂ نعت ''منحمنا'' بھی اسی قبیل کا ہے۔ اس میں شاعر نے تصنیفِ قدیم بالخصوص تلمود، زبور وغیرہ عہد نامہ عتیق کی بے شمار تلمیحات اور مثالیں پیش کی ہیں اور ان ہی کے ہالے میں نعتِ رسول ﷺ کا چاند سنوارنے کی سعی کی ہے۔

عمیق حنفی کی ''صلصلۃ الجرس'' نام کے اعتبار سے تو حدیثِ حسن صحیح کا ٹکڑا ہے، لیکن اس میں بھی بعض اسرائیلی روایات در آئی ہیں۔ یہی حال 'ہفت کشور'' کے شاعر جعفر طاہر کا بھی ہے۔ غرض کہ ہمارے نعت گو شعرا نے عقیدت کے اندھے پن میں اسرائیلی روایات کے سم قاتل کو بلا سوچے سمجھے نعت کے شہدِ شیریں میں ملا دیا ہے۔

صنمیات

ہندوستان میں مسلمان اگرچہ فاتح قوم بن کر آئے تھے، لیکن یہاں کے تہذیب و تمدن نے انھیں منتوح بنا ڈالا۔ چناں چہ دو قوموں کے ارتباط سے سبحہ و زنار کے رشتے مضبوط ہوتے گئے۔ اذانِ ناقوس کی دل خوش کن آوازیں فضاؤں کو مسحور کرنے لگیں اور عود و کافور کی مہک ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ چراغِ دیر اور شمعِ حرم میں تجلّیِ وحدت کے خواہاں رام و رحیم کے فرق کو مٹانے کے لیے ''اوم'' و ''الا اللہ'' کے ذکر سے رطب اللسان رہنے لگے۔ اس طرح دونوں قوموں کا اتحاد دونوں کے عقائد پر اس حد تک اثر انداز ہوتا رہا کہ ''محمد رسول اللہ'' یعنی کلمۂ طیبہ کے جزِ دوم کو جزوِ اوّل یعنی ''لا الا الہ اللہ'' میں جذب کرنے کی فکر کی گئی جیسا کہ ہندو مذہب میں پیغمبروں کے متعلق یہ تصور عام ہے کہ وہ انسانی شکل میں ''ایشور'' ہیں۔

ہمارے نعت گو شعرا نے ان تصورات کو بڑی حد تک قبول کیا ہے اور اسی کے مطابق عقائدِ اسلامیہ کو بالائے طاق رکھ کر نعتِ نبی ﷺ کو جزوِ ایمان سمجھ لیا ہے۔ افسوس کہ علما و فضلا بھی اس بدعتِ قبیحہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چناں چہ محسنؔ کاکوروی رب اور مربوب کا فرق ''عرب'' کا عین ہٹا کر دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح احد و احمد میں حرف ''میم'' کا جواز انھیں کھٹکتا ہے۔ دیکھیے انھوں نے کتنی جسارت اور دلیری دکھائی ہے:

عینیت غیر رب کو رب سے
غیریت عین کو عرب سے
ذاتِ احمد ﷺ تھی یا خدا تھا
سایہ کیا میم تک جدا تھا

دیوتاؤں اور اوتاروں کے مضامین میں ''اکثر جامۂ بشری میں خدا'' کا تصور پایا جاتا ہے، جیسا کہ ''رام'' اور ''کرشن'' کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ شکلِ انسانی میں معبود تھے۔ اب ایک نعت گو توحید کے متوالے شاعر کی جراُتِ رندانہ نہیں بلکہ مشرکانہ ملاحظہ ہو جس کے شعر کے لفظ

لفظ نے وحدانیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے:

وہی جو مستویِ عرش ہے خدا ہو کر
اُتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ﷺ ہو کر

اس سے بڑھ کر قادرِ مطلق سے روگردانی اور اس کی شانِ ارفع و اعلیٰ میں گستاخی کی مثال بھی ملاحظہ ہو کہ لکھتے وقت بھی خوفِ خدا سے قلم لرز جائے۔

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمد ﷺ سے

استغفراللہ! اوتاروں کی شان میں لکھے گئے بھجن بھی اس کفریہ کلام کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ عبدو معبود اور رب و مرعوب میں فرقِ مراتب کا لحاظ نہ رکھ کر لکھی گئی نعتیں یقیناً ایمان سوز ہیں۔ ثنائے محمدی ﷺ کو ''حمد'' کی شکل میں پیش کرنے کا فن کس قدر مذموم اور ناروا ہے، لیکن اُردو کی نعتیہ شاعری کی بڑی مقدار میں یہی اصنامی تصور چھایا ہوا ہے۔ یہی نہیں اُردو شعرا نے نعت جیسی مقدس صنف میں نسائی انداز اپنا کر انتہائی درجہ کے سفلہ پن کا ثبوت دیا ہے۔ چناں چہ شائق عشقِ نبی ﷺ میں فراق کی کیفیت کو نسائی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

طیبہ کے رنگیلے نا کے میاں موہے چاند سا مکھڑا دکھا جانا
میں برہا دیوانی ترپت ہوں ذرا آ جانا ذرا آ جانا
دکھ درد کے مارے ترپت ہوں مانت نہیں دل فرقت میں تیرے
اے کملی والے سائیں میں روٹھے کو ذرا منوا جانا

اور مولانا عبدالقدیر حسرتؔ کے یہ حسرت بھرے اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

بھولی بھالی میں ہوں ناری
پیت گلے کا ہار
موری نیّا منج دھار
تیرے دوارے آن پڑی ہوں
چھوڑ کے سب گھر بار
موری نیّا منجدھار
کالی کملی والے بھیّا

آداب سرکار

موری نیّا منجدھار

صوفیانہ رنگ ڈھنگ میں حضرت امجدؔ بھی ''مدینہ کی جوگن'' بن کر نکل کھڑے ہوئے:

نکلی ہے گھر سے جوگن کفنی گلے میں ڈالے
پاؤں میں پڑ گئے ہیں اب چلتے چلتے چھالے
گرنے کو ہوں زمیں پر ہے کون جو سنبھالے
یثرب نگر کے راجا او کالی کملی والے
کرپا کی ایک نظر ہو دکھیا پہ اپنی پیارے
بھولی نہیں میں تم کو تم کیوں مجھے بسارے

حضور ﷺ نے مدینہ کو یثرب کہنے سے منع فرمایا ہے، پھر بھی امجدؔ مدینہ طیبہ کو بحر و قوافی نبھانے کے لیے یثرب کہہ رہے ہیں۔

اس قسم کی روایت کو حفیظ جالندھری اور خالدؔ (عبدالعزیز) نے آگے بڑھایا ہے۔ خالد کے ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب نثر نگار رس کا مرقع نظر آتی ہے:

کٹیں تارے گن گن کے برہن کی راتیں
پلنگ اس کا ناگن سا لہرا رہا ہے
بچھاؤں تری سیج چن چن کے کلیاں
تو صاحب ہے میرا تو میرا للاّ ہے
پیا کی اٹاری چڑھوں گی میں چھم چھم
انور اگ نے مجھ کو بے کل کیا ہے

نعت گوئی کے یہ چند موضوعات تھے۔ ان پر قصرِ نعت تعمیر کر کے اُردو کے نعت گو شعرا سمجھ رہے ہیں گویا انھوں نے جنت میں اپنے گھر تعمیر کرا لیے ہیں۔ جو کچھ بعید بھی نہیں کہ اللہ ان کی اسی سرشارانہ عقیدتِ رسول ﷺ سے خوش ہو جائے اور یہی نعتیں ان کے لیے حدائقِ بخشش بن جائیں۔

مراجع

☆۱۔ بحوالہ ''محسنِ انسانیت'' دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۸۶۲

☆۲۔ بحوالہ ''عربی میں نعتیہ کلام''، ص: ۶۹

☆۳۔ فخر الدین نظامی: (مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی) ''کدم راؤ پدم راؤ''، دہلی ۱۹۷۹ء، ص: ۶۹

☆۴۔ میرا نجی شمس العشاق: ''شہادت التحقیق''، بحوالہ مغز مرغوب (مرتبہ: محمد ہاشم علی)، ص: ۶۴

☆۵۔ محمد رفعتی فلاحیؔ مفید الیقین (قلمی) ادارۂ ادبیات ورق ۲ ب

☆۶۔ غوثی بیجاپوری: قصص الانبیا (قلمی) ادارۂ ادبیات ورق ۴ ب

☆۷۔ باقر آگاہؔ، ''ہشت بہشت'' (من دیپک قلمی) ادارہ ادبیات ورق ۲۴ الف

☆۸۔ محمد محسن کاکوروی: ''کلیاتِ محسن''، ص: ۶۶۔۶۵

☆۹۔ محسن کاکوروی: ''کلیاتِ محسنؔ''، ص ۱۸۶

☆۱۰۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی: سیماب کی نظمیہ شاعری، بمبئی ۱۹۷۸ء، ص ۱۰۶

☆۱۱۔ محسن کاکوروی: ''کلیاتِ محسن''، ص: ۲۳۲

☆۱۲۔ میر اعظم علی خان شائق: ''کلیاتِ شائق'' حیدرآباد، ص: ۳۳۰

☆۱۳۔ مولانا عبدالقدیر حسرت زفرات الاشواق۔ ۱۳۵۳ھ، ص: ۲۸۔۱۹

☆۱۴۔ امجدؔ حیدرآبادی، ریاض امجد حیدرآباد حصہ اوّل، ص ۱۲

☆۱۵۔ عبدالعزیز خالد: ''فارقلیط''، ص ۱۰۲

ظہیر غازی پوری

نعتیہ شاعری کے لوازمات

اس عالمِ آب وگل میں محمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل ہی عربی زبان دُنیا کی بڑی زبانوں میں شمار کی جانے لگی تھی اور عربی شاعری نے بھی اعلیٰ وارفع مقام حاصل کرلیا تھا۔ عربی لغات میں ایک لفظ ''نعت'' بھی صدیوں پہلے سے موجود تھا، جس کے لغوی معنی تعریف و توصیف کرنے، ستائش کرنے یا صفات بیان کرنے کے ہیں مگر اس لفظ کا استعمال اتنا کم تھا کہ عربی کی مدحیہ شاعری میں بھی عام طور پر نظر نہیں آتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس زمانے میں مناجات، منقبت اور مدح نہیں لکھی جارہی ہوگی لیکن ایک اجمالی سبقت حاصل تھی۔ حضرت موسیٰ کی پیغمبرانہ زندگی کے سو سال کے ایک ایک گوشے کو کھنگالا جائے۔ ان کی پیروی کرنے والی سب سے بڑی جمعیت کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو ہمیں ''نعتِ موسیٰ'' کے دس بیس نمونے بھی ہاتھ نہیں آئیں گے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کی ۳۳ سالہ زندگی کے آخری تین سال میں کشف و کرامات اور مواعظ ومعجزات کی ثنا خوانی تو ملتی ہے مگر ''نعتِ عیسیٰ'' لکھنے لکھانے یا سننے سنانے کا ماجرا یکسر مفقود ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے حبیب محمد ﷺ کی ولادت باسعادت کے فوراً بعد جو تعریفی کلمات ان کی والدہ ماجدہ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوئے وہ ''نعتِ احمد ﷺ'' قرار پائے اور اسی وقت یہ لفظ ''نعت'' صرف سرور عالمِ حبیب اکرم ﷺ کی تعریف، توصیف اور ستائش کے لیے مختص ہوگیا اور بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> دُنیا کی ان ساری زبانوں میں جنھیں مسلمان بولتے ہیں نعت گوئی کا عام رواج ہے۔

نعت گوئی کی ابتدا عربی زبان میں ہوئی مگر اس صنفِ سخن کو فنی اور فکری معراج ایران میں فارسی زبان میں حاصل ہوئی اور وہاں سے سفر کرتی ہوئی یہ ہندوستان پہنچی جہاں اسے پذیرائی

حاصل ہوئی کہ بہ قول ناوک حمزہ پوری:

اُردو کا غالباً ایک بھی شاعر خواہ مسلمان ہو، ہندو ہو، سکھ ہو، عیسائی یا کسی اور عقیدے کا ایسا نہ ملے جس نے نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں۔ یہ اُردو کے اپنے مزاج اور تہذیب کی دین ہے۔

نثر میں حضور اکرم ﷺ کی تعریف نہ صرف مسلمان بلکہ دُنیا بھر کے مفکرین مثلاً برنارڈ شا، نپولین بونا پارٹ، ٹالسٹائی، لیونارڈ، لامارٹن، آرنلڈ، برٹرینڈ رسل، کارلائل، ڈیکارٹ، بی اسمتھ اور ای ڈرمنگھم وغیرہ نے بھی کی ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ سارے عالم کے لیے رحمت بن کر آئے اور ساری دُنیا کے دانش وروں نے ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے اور ان کی مدحت سرائی کی ہے۔ کسی نے کہا، ''میں ہندو ہوں، مگر ایمان رکھتا ہوں محمد پر'' تو کسی نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ: ''صرف مسلم کا محمد ﷺ پہ اجارہ تو نہیں''۔ اس سچائی کا شاید ہی کوئی منکر ہو کہ رحمۃ اللعالمین ﷺ کے شیدائیوں سے یہ دُنیا خالی نہیں ہے اور ان پر درود و سلام بھیجنے، ان کی شان میں قصائد لکھنے اور شعر میں ان کے اوصاف بیان کرنے کا سلسلہ کم و بیش بارھویں صدی سے ہندوستان جنت نشان میں متواتر جاری ہے اور اس کا وافر سرمایہ موجود ہے۔ ادھر تقریباً دو دہائیوں میں حمد و نعت کی طرف محققین و شعرائے کرام نے خصوصی توجہ دی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ شعری ادب کی ایک گراں مایہ صنف کے طور پر اسے قبول کر لیا گیا ہے اور بیش تر ادبی رسائل میں اس کی اشاعت کا اہتمام کیا جانے لگا ہے۔ اسے نصابی کتب میں داخل کرنے کی جدوجہد بھی کی جا رہی ہے۔

نظم اور نثر وہ اسالیبِ ادب ہیں جو تمام زبانوں میں رائج ہیں۔ مدت دراز تک اُردو نثر میں بھی حضور اکرم ﷺ کی توصیف میں تحریر کردہ بیانات کو نعت کے زمرے میں رکھا جاتا رہا ہے مگر اب صرف نظم کی شکل میں لکھی جانے والی تخلیقات ہی نعت یا نعتیہ شاعری کی صف میں جگہ پاتی ہیں۔ نظم کی بے شمار اقسام ہیں جو مختلف ہیئت و ساخت سے زینتِ قرطاس بنتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جو علاحدہ صنف کا درجہ پا چکی ہیں۔ مثال کے طور پر قصیدہ، مثنوی، غزل، رُباعی، مسدس، مربع، قطعہ اور مثلث وغیرہ مقبولِ عام شعری اصناف ہیں۔ ادھر کئی ہندی، انگریزی اور جاپانی وغیرہ اصناف کو بھی اُردو شاعری میں ایک خاص مقام حاصل ہوگیا۔ ابتدا میں قصیدہ اور مثنوی کی شعری اصناف میں زیادہ سے زیادہ نعتیہ شاعری تخلیق ہوئی مگر وقت کے ساتھ زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں اور بیش تر اصنافِ سخن میں نعتیہ شاعری کا رواج عام ہوگیا۔ فی زمانہ تو نعت دوہے، ہائیکو

اور رُباعیات بھی کثرت سے لکھی جانے لگی ہے، بعض ایسی تخلیقات بھی سامنے آئی ہیں جو بہ یک وقت نعت بھی ہیں اور حمد بھی۔

اربابِ ادب سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ شاعری پوری دُنیا میں بلند وقار، بلند مقام اور بلند معیارِ فن ہے۔ پوری دُنیا کے تنقیدی ادب میں صنفِ شاعری پر سب سے زیادہ مضامین و کتب لکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے لیے عہد بہ عہد وضع کردہ فنی التزامات کی پابندی ہر دور میں لازمی قرار پائی ہے۔ نعتیہ شاعری بھی اُردو ادب و تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اس لیے اس صنفِ سخن کے لیے بھی تمام تر فنی اور فکری اصول اور اظہار و اسلوب کے طور طریقوں کی پابندی لازمی ہے۔ زبان کا شاعرانہ تخلیقی استعمال، محاورے کی صحت، عروض و قواعد کی مسلمہ قدروں کا پاس اور ایک خاص حد تک استعارہ ساز وژن کی نمود بھی نعتیہ شاعری کے لیے لازمی ہے۔ ابہام بھی شاعری کی وصف ہے، جو نثر میں نہیں، نظم ہی میں فروغ پاتا ہے۔ توصیفی شاعری خصوصاً نعتیہ شاعری میں ابہام کے لیے برائے نام ہی گنجائش نکل سکتی ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

> عقیدت کی شاعری میں عموماً شعریت کا فقدان ہوتا ہے۔
>
> (''ایوانِ ادب'' دہلی، شمارہ نمبر۴)

مولانا جلال الدین عمری نے اس سلسلے میں ایک شرط عائد کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

> نعت گوئی عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے اظہار کا ایک مؤثر ذریعہ ہے، سرورِ کائنات سے بے پناہ عشق کے نتیجے ہی میں نعت ممکن ہے، یہ ضروری نہیں کہ ایک باکمال شاعر اچھا نعت گو بھی ہو۔
>
> (ماہنامہ ''پیش رفت'' دہلی، ماہِ ستمبر ۲۰۰۰ء)

عشقِ رسول ﷺ یا حبِ نبی ﷺ یا بے پناہ عقیدت کی باتیں بے شمار علمائے دین و ادب نے کہی ہیں مگر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہزار ہا نعتیہ نظم و شعر غیر مسلم شعرا نے بھی تخلیق کیے ہیں جو موضوع، معنی، اسلوب اور شعری اوصاف کے آئینہ دار ہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ نورِ نبی ﷺ دُنیا کے ہر انسان میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے اور بے شک بانیِ اسلام ساری دُنیا اور تمام انسانوں کے لیے رحمت ہیں۔ ایک مسیحی شاعر مخلص بدایونی کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

اگر تم دیکھنا چاہو خدا کو
کرو راضی محمد مصطفیٰ ﷺ کو

میں نے سطورِ بالا میں عرض کیا کہ ابہام اچھی، بڑی اور معیاری شاعری کا ایک وصفِ خاص ہے۔ بہت سے اشعار میں خود کو نشانہ بنا کر دوسروں پر طنز کرنے یا انھیں ان کی غلطیوں کا احساس دلانے کی سعی بھی کی جاتی ہے۔ ایسے اشعار بعض اوقات صدیوں بعد طنز و تشنیع کا نشانہ بنتے ہیں، جب اصل واقعہ پر غبارِ وقت کی دبیز تہہ جم چکی ہوتی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین نے میرؔ کی شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> غزل کے مقطع میں میرؔ بغیر تہ داری کے اپنے دین و مذہب کی تفصیل بتا دیتے ہیں:
>
> میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے ہو، ان نے تو
> قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا!
>
> میرؔ نے ایک طرح سے یہ بڑی جرأت مندانہ بات کہی، جو وہ مسلسل آخر وقت تک کہتے رہے۔ غالبؔ اس بات میں ان کے شریک غالبؔ ہیں۔ شریعت ناک بھوں چڑھاتی رہ جاتی ہے، لیکن فن کار کا کچھ نہیں علیؓ کا نام ایک پیغمبر کے ساتھ لیا اور دونوں کو برابر کا مقام دیا ہے۔
>
> (ماہنامہ ''شاعر'' اقبال نمبر۔ص ۱۰۱)

کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ داستانِ حرم بھلا ''غریب'' اور ''رنگین'' کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں الفاظ اپنی لجاجت کا اظہار کر رہے ہیں اور بے جواز بھی ہیں۔ تذکرہ علامہ اقبال کا چھڑ گیا اور میں ''نعتیہ شاعری کے فنی لوازمات'' پر گفتگو کر رہا ہوں تو فن سے متعلق علامہ اقبال کی رائے پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے اظہارِ خیال کیا ہے کہ:

> اقبال نے فن کو عبادت کا درجہ دے دیا ہے:
>
> ہے یہی مری نماز، ہے یہی مرا وضو
> میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
>
> اور جب فن ہی عبادت ٹھہرے تو فن کار کے خلوصِ نیت اور اس کے فن کی برگزیدگی اور تقدس پر کون ایمان نہیں لائے گا۔
>
> (''شاعر'' اقبال نمبر، ص:۹۰)

نعتیہ شاعری کے فکری اور فنی پہلوؤں پر مدت دراز سے دانش ور ناقدین و علما اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں۔ بعض آرا کی روشنی میں ان کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرنا میں بہرحال ضروری

متصور کرتا ہوں۔ بہ قول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> نعت کا موضوع اس امر کا متقاضی تھا کہ جدید ہیئتوں میں زیادہ سے زیادہ برتا جاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور ہمارے شعرا عموماً قدیم ہیئتوں خصوصاً غزل کی ہیئت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اس مسئلے پر بہ طورِ خاص غور کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ خطرہ یہ ہے کہ اُردو نعت گوئی کی صنف غزل کی ہیئت میں بند ہو کر محض جلسے جلوس میں ترنم سے پڑھنے اور محفلوں میں گانے کا سرمایہ بن کر نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نے جدید ہیئتوں میں نعتیہ شعر کہنے پر پورا زور صرف کیا ہے اور بہ طرزِ احسن غزل کے فارم میں لکھی جانے والی نعتیہ شاعری پر اظہار ناپسندیدگی کیا ہے۔ غزل بہ ذاتِ خود کبھی اتنی پست معیار نہیں ہوئی کہ صرف جلسہ جلوس اور قوالیوں کی محفلوں میں ترنم سے گانے کی چیز بن جائے۔ ہاں اس طرح کی محفلوں کے لیے شاعر نہیں، ''سخن ساز'' ایسی سطحی یا عریاں غزلیں لکھتے ہیں جو کوٹھوں اور اکثر قوالیوں میں گائی جاتی ہیں۔ بعض شہرت کے بھوکے اچھے شعرا نے بھی ضرورتاً ایسی غزلیں لکھی ہیں، لیکن اس سے غزلیہ شاعری کے معیار پر کوئی خراب اثر نہیں پڑا۔ نعتیہ شاعری طویل مدت تک جلسے جلوسوں میں ہی گائی اور سنائی جاتی رہی ہے۔ اس کے لیے ویسے ہی پلیٹ فارم یا رسائل کے چند صفحات ہی مختص ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نعتیہ شاعری کا معیار بلند کرنے کا مشورہ دیتے تو یقیناً ان کی بات زیادہ توجہ طلب ہوتی۔ میں مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں کہ عہدِ حاضر میں نئی نئی ہیئتوں میں نعت گوئی کا سلسلہ جاری ہے۔ بعض اہلِ فن کا خیال ہے کہ غزل کے فارم میں نعت گوئی کو زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے۔ یہاں صرف دو حضرات کی آرا اختصار کے ساتھ مندرج ہیں:

> میری نگاہ میں ارادۃً اور عقیدۃً لکھی گئی وہ نعتیں جو فارسی اور اُردو میں غزل کی ہیئت میں تحریر کی گئیں، لائقِ تحسین و آفرین ہیں۔
>
> (ناوک حمزہ پوری)

> نعت کا لہجہ اور اسلوب، غزل کے لہجے اور اسلوب سے مختلف نہیں۔ دونوں کا ایک ہی طرز و اسلوب ہے اور بڑی توانائی فکر کا متحمل ہے۔
>
> (شارق جمال)

عام طور علمائے فکر و فن نے نعت گوئی کو بے حد مشکل فن قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث

صدیقی کا خیال ہے کہ: ''نعت کے موضوع سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں، اس کی فضا جتنی وسیع ہے اتنی اس میں پرواز مشکل ہے۔'' ڈاکٹر اے ڈی نسیم کے لفظوں میں: ''نعت گوئی کا راستہ پل صراط سے زیادہ کٹھن ہے۔'' احمد ندیم قاسمی نے قدرے مختلف انداز میں اپنی بات کہی ہے کہ: ''نعت، عشقِ رسول ﷺ کے بغیر کہی ہی نہیں جاسکتی۔ رسماً کہی جائے گی تو اس کا کھوکھلا پن جلد ہی کھل جائے گا۔'' محمد عبداللہ قریشی نے اظہارِ خیال کیا کہ: ''نعت گو جب تک عشقِ رسول ﷺ میں ڈوب کر توحید و رسالت اور عبودیت کے نازک رشتوں میں کامل ہم آہنگی پیدا نہ کرے، جذباتِ عالیہ، سوز و گداز، رفعتِ بیاں اور حسنِ ذوق سے آشنا نہ ہو، اس وقت تک وہ نعت گوئی کے منصب سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔'' میرا ذاتی خیال ہے کہ شعور پختہ ہو، مطالعہ وسیع ہو، نظر باریک بیں ہو اور زبان و اظہار پر خلاقانہ قدرت حاصل ہو تو شاعر کے لیے کوئی صنفِ شاعری اتنی مشکل نہیں ہو سکتی جتنی اکابرین نے (بغیر جواز) ثابت کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ بے شمار ادب پسند اور مذہب پرست محققین اور اہلِ رائے نے نعت نگاری کی راہ میں ہونے والی دینی اور شرعی لغزشوں کی جانب بھی اشارے کیے ہیں۔ چند مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> اس میں (نعت گوئی) تلوار کی دھار پر چلنا ہے، اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے۔
>
> (احمد رضا خاں بریلوی)
>
> حقیقت یہ ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ کی تعریف میں ذرا سی لغزش نعت گو کو حدودِ کفر میں داخل کرسکتی ہے۔ ذرا سی کوتاہی مدح کو قدح میں بدل سکتی ہے، ذرا سا شاعرانہ غلو ضلالت کے زمرے میں لاسکتا ہے، ذرا سا عجزِ بیان اہانت کا باعث ہوسکتا ہے۔
>
> (مجید امجد)
>
> سرکارِ اقدس ﷺ کی شانِ اقدس میں ذرا سی بے احتیاطی اور ادنیٰ سی لغزش، خیال و الفاظ اور ایمان و عمل کو غارت کردیتی ہے۔
>
> (عبدالکریم قمر)
>
> اس (نعت گوئی) کی راہ میں سب سے بڑی لغزش الوہیت اور نبوت کے حدود کو سمجھنے میں ہوتی ہے۔ اکثر شعرا نبوت کے ڈانڈے الوہیت سے ملا دیتے ہیں۔ مثلاً:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اُتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

یہ شعر توحید کے منافی اور نبوت کی حقیقت کے خلاف ہے۔

(شاہ معین الدین احمد ندوی)

مندرجہ بالا اربابِ دانش کے علاوہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے فرمایا ہے کہ ''نعت کا جو طرز ہمارے شعرا نے اختیار کیا ہے، وہ بہت قابلِ اصلاح ہے۔'' والی آسی نے اپنا تجربہ بیان کیا ہے کہ ''ہماری نعت کا دامن ایک حد تک بے ادبی سے آلودہ ہے۔ اکثر شعرا نے اس طرح تخاطب کیا ہے جو کسی قیمت پر روا نہیں اور قابلِ گردن زدنی ہے۔'' نازؔ انصاری نے غور طلب مگر چونکا دینے والی بات لکھی کہ ''عشقِ رسول اور جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر آپ نعت گوئی کے لیے قلم اُٹھائیں تو آپ دیوانہ وار قلم برداشتہ نہیں لکھیں گے۔ آپ اس مقام تک جا سکتے ہیں جو کفر و اسلام اور شرک و توحید کی سرحد ہے۔'' پروفیسر محمد اقبال جاوید نے کئی نکات پر سخت تنقید کی ہے۔ ان کے خیال میں ''اکثر نعتیں، غزل کا چربہ ہیں اور غزل مبالغہ آرائیوں کا دوسرا نام ہے۔ بعض شعرا نے نعت کو بے کیف، بے سوز اور محض بیت بازی بنا کر رکھ دیا ہے۔ دل میں منافقت کے بت چھپا کر نعت نہیں کہی جا سکتی۔ آج اکثر نعتیں علیل جذبوں، اپاہج عقیدوں اور وقتی مصلحتوں کی ترجمان ہیں اور اکثر نعتیں ایسی ہیں کہ حضور ﷺ کے سراپا کے بغیر اُنھیں پڑھا جائے تو وہ حمد لگتی ہیں۔'' اس قسم کے اعتراضات کئی دہائیوں سے اربابِ فن اور عاشقانِ رسول اکرم ﷺ کرتے آ رہے ہیں مگر اہلِ قلم حضرات بہ طور حوالہ اشعار پیش نہیں کرتے۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ پیشہ ور علمائے دین سے وہ ڈرتے ہیں کہ ان کے خلاف نہ صرف کوئی فتویٰ صادر ہوگا بلکہ معاشرے میں ان کا جینا مشکل ہو جائے گا کیوں کہ اس قسم کے نام نہاد اکابرینِ دین و مذہب کے ساتھ ایک بڑی فوج یا جمعیت ہوتی ہے جو بہر حال ان کی حمایت کرتی ہے اور بعض اوقات شور و ہنگامہ بھی برپا کرتی ہے، دوسری یہ کہ ناقد خود تشکیک کا شکار ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کے اعتراضات غلط نہ قرار دیے جائیں۔ دُنیائے ادب میں تو تنقید کی تنقید لکھنے اور نقاد کے نظریۂ فکر سے اختلاف کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ مگر شرعی اور مذہبی معاملات میں تاویلات کے ذریعے غلط سے غلط بات کو بھی صحیح قرار دینے کا رواج عام ہے اور شاید اسی وجہ سے مسلمان مختلف جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم ہوئے ہیں اور مسلک و عقائد کی بدعتوں نے نہ صرف انتشار پیدا کیا ہے بلکہ مذہب اور قوم کا چہرہ مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

اسلام کی بنیاد اتحاد ہے اور یہ اجتماعیت کا مذہب ہے۔ خدا اور رسول کے ذریعے عائد کردہ فرائض اس کے گواہ ہیں۔ نماز شہری پیمانے پر تمام مسلمانوں کو جوڑتی ہے تو حج عالمی سطح پر ایک رسّی میں بندھے ہونے کا عملی طور پر عرفان کراتا ہے۔ مسلک و عقائد اور ذات برادری کی خلیجیں علمائے دین کی پیدا کردہ ہیں اور خواہ مخواہ ہیں۔ پیشے سے ذات برادری نہیں بنتی۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات قرآن شریف میں موجود ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان حدیثوں میں مرقوم ہیں۔ ان کے بعد کے مسائل، مسلمان کو خود ذاتی طور پر حل کرنے ہیں اور ان پر عمل کرنا ہے۔ ایسے معاملات میں علما کی مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں بار بار فرمایا ہے کہ اپنے ذہنِ رسا اور عقلِ سلیم سے کام لو۔ ایسے میں علما کا کسی کو شیطان، ملعون اور منافق وغیرہ قرار دینا سخت اذیت کا باعث ہے کیوں کہ ہر مسلمان کا عمل ہی اس کے کام آئے گا لہٰذا حدیث کی روشنی میں علم کے حصول کی تلقین بہر حال کی جانی چاہیے مگر تفریق پیدا کرنے والا ہر لفظ بجائے خود کفر کا ارتکاب کراتا ہے۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر اگر نعتیہ شاعری کے فنی لوازمات، اسقام و مصائب، فکری رویے، موضوع و اظہار اور تعین قدر پر بے باکانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا جائے تو اس سے نہ تو شریعت و مذہب پر کوئی آنچ آئے گی اور نہ اہانتِ رسول ﷺ کا کوئی پہلو نکلے گا۔ میرے خیال میں ایسے مضامین بہر حال نعت گویوں کے لیے مشعلِ راہ ہوں گے۔

میں سطورِ بالا میں مندرج اکابرین و مفکرین کی آرا کی روشنی میں مفصل بات کروں گا مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ اس لیے اختصار کے ساتھ مدلل گفتگو کرنے کی سعی کروں گا۔

امام احمد رضؔا خاں صاحب نے قریب قریب وہی بات کہی ہے جو شاہ معین الدین احمد ندوی پہلے یا بعد میں کہہ چکے ہیں۔ احمد رضؔا صاحب مذہبی اعتبار سے بھی امام ہیں اور شاعر کی حیثیت سے بھی۔ ان کی شخصیت ہر دو اعتبار سے قابلِ احترام ہے۔ انھیں عربی، فارسی اور اُردو کی شعری زبان پر اور الفاظ کے تخلیقی استعمالات پر جو قدرت حاصل تھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے فن اور شخصیت پر ماہنامہ ''قاری'' (دہلی) نے اپریل ۱۹۸۹ء میں ایک ضخیم نمبر شائع کیا تھا اور جناب سراج بستوی نے ان پر قابلِ قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کے شعر و فن پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرؔر مصباحی نے ''حدائقِ بخشش کا فنی و عروضی جائزہ'' کے زیرِ عنوان بڑی تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے مگر ''حدائقِ بخشش'' میں اس طرح کے اشعار تمام تر انتخاب و تصحیح کے باوجود موجود ہیں:

تمھاری شرم سے شانِ جلالِ حق ٹپکتی ہے
خمِ گردن ہلالِ آسمانِ ذوالجلالی ہے
رضا منزل تو جیسی ہے وہ اک میں کیا سبھی کو ہے
تم اس کو روتے ہو یہ تو کہو یاں ہاتھ خالی ہے

ان دونوں اشعار میں اجتماعِ ردیفین کا عیب موجود ہیں، چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:

سب نے صفِ محشر میں ، للکار دیا ہم کو
اے بے کسوں کے آقا! اب تیری دہائی ہے

زائر گئے بھی کب کے دن ڈھلنے پہ ہے پیارے
اُٹھ میرے اکیلے چل کیا دیر لگائی ہے

ہم دل جلے ہیں کس کے ، ہٹ فتنوں کے پرکالے
کیوں پھونک دوں اک اف سے کیا آگ لگائی ہے

یہ پوری نعت ''مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن'' (بحر ہزج مثمن اخرب) کے وزن میں کہی گئی ہے۔ پہلے شعر کا مصرع اولیٰ اسی وزن میں ہے مگر مصرع ثانی خارج از بحر ہے (یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مصرع کا پہلا ٹکڑا دوسری بحر مفعول فاعلاتن میں جا پڑا ہے)، دوسرے شعر کا مصرع اولیٰ خارج الوزن ہے (اس کا پہلا ٹکڑا دوسری بحر میں ہے)، تیسرے شعر کا بھی پہلا مصرع بے وزن ہے۔ معنوی اعتبار سے بھی ''اُٹھ میرے اکیلے چل'' اور ''ہم دل جلے ہیں کس کے'' وغیرہ قابلِ گرفت ہے۔ یہ تو ہوئی فنی سقم کی بات۔ اب ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محبّ میں نہیں میرا تیرا

اس شعر کے مصرع ثانی میں لفظ ''یعنی'' کی ''ی'' کا سقوط جائز نہیں ہے۔ معنوی اور فکری اعتبار سے بھی یہ شعر حصارِ نقد میں آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لاشریک بھی ہے اور رب پیکر بھی۔ اس نے اپنی قدرت سے بے شمار مخلوقات، اشیا اور بحر و بر کو خلق کیا ہے، جن کا خمیر مختلف ہے۔ اپنے نور سے بھی اس نے ایک پیکر تراشا جو اس کے لیے محبوب ترین تھا۔ وہ نور یکتا پیشانیِ آدمؑ میں محفوظ ہوا اور محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچا۔ اللہ رب العزت چوں کہ بے جسم، بے پیکر اور بے بدن

ہے اس لیے دُنیاوی محبوب و محبّ کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی محبوب کے مالک کا درجہ عطا کرنے کا سیدھا اور صاف مطلب ہوا کہ رسول کو خدا کہا یا تسلیم کیا اور یہی وہ مقام ہے جہاں بہ قول حضرت احمد رضؔا خاں صاحب ''اگر بڑھتا ہے تو الوہیت تک پہنچ جاتا ہے'' اور کشف و کیف کے عالم میں محبِّ رسول اگر اس منزل تک پہنچتا ہے تو ادبی اور مذہبی نقطۂ نظر سے یہ کیف قابلِ گرفت ہے مگر اللہ بڑا مہربان اور غفور الرحیم بھی تو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا خالق و مالک ہے اور رسول ﷺ ہادی:

خدا خالق ہے ہادی مصطفیٰ اوّل سے آخر تک
یہی قرآں میں ہے لکھا ہوا اوّل سے آخر تک

جناب مجید امجد کی رائے پر نظر مرکوز کیجیے تو تخلیقِ نعت میں کئی ایسی منزلیں سامنے آتی ہیں جب نعت نگار حدودِ کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی ''مدح''، قدح میں بدل جاتی ہے۔ شاعرانہ غلو، ضلالت اور عجزِ بیان، اہانتِ نبی ﷺ کی حدود میں لے جاتا ہے۔ نعتیہ شاعری کا ایک سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو ایسے بے شمار اشعار پر نظر رُکتی ہے۔ بہت سے اشعار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ خدا اور رسول آخر الزماں میں کوئی فرق نہیں۔ بہ فرضِ محال اگر ہے تو بس کہیں ''میم'' اور کہیں ''پیکرِ جسم'' دونوں کے درمیان حائل ہے۔ ناوکؔ حمزہ پوری نے اپنے مضمون بہ عنوان ''نعتیہ شاعری'' میں سراج اورنگ آبادی کا یہ شعر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

تو احد ہے نام تیرا احمد بے میم ہے
زیب پانا تجھ صفت سیں ہر ورق قرآں کا

حالاں کہ یہ وہی عقیدہ ہے جس نے آگے چل کر توحید کے قلعے پر شب خون مارا ہے اور شعرا سے یہاں تک کہوا دیا کہ اللہ ہی محمد ﷺ کے روپ میں مدینے میں زندگی بسر کر چکا ہے۔ نعوذ باللہ من شرو انفسنا۔ غور کا مقام ہے کہ اوتار کے ہندو نظریے اور اسلام میں کیا فرق رہ گیا۔ (دو ماہی ''گلبن''، نعت نمبر ۱۹۹۹ء)

اس نوع کے بعض اشعار نموتاً پیش خدمت ہیں:

ذاتِ احمد تھی یا خدا تھا
سایہ کیا میم تک جدا تھا

———

کہاں اب جبہ سائی کیجیے کچھ بن نہیں پڑتا
احد کو کیجیے یا احمدِ بے میم کو سجدہ

ظاہر ہے کہ لفظِ احد و احمدِ بے میم
بے میم ہوئے عینِ خدا احمدِ مختار

طور پر جلوہ تھا جلوہ آپ ﷺ کا
لن ترانی تھی صدائے مصطفیٰ

محمد ﷺ نے خدائی کی خدا نے مصطفائی کی
کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے

عشق کی ابتدا بھی تم حسن کی انتہا بھی تم
رہنے دو راز کھل گیا بندے بھی تم خدا بھی تم

عقل کہتی ہے مثلنا کہیے
عشق بے تاب ہے خدا کہیے

نعتیہ شاعری میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں ''ذرا سی لغزش''، ''ذرا سا غلوٗ''، ''ذرا سا عجز'' ہی نہیں عمداً اور قصداً ایسا جارحانہ طرز اختیار کیا گیا ہے جسے میں ''کفر و ضلالت'' سے تعبیر بھی نہیں کروں تو گستاخانہ اندازِ بیان اور سخت قابلِ اعتراض تخاطب میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بعض اشعار سے میری بات کی توثیق ہو جائے گی:

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمد ﷺ سے

اس شعر میں خدا کی قدرت و عظمت سے انکار اور رسول سے زبردستی، جو چاہیں اسے لے لینے کی بات ادب، تہذیب، وحدانیت اور شعریت کے سراسر خلاف ہے۔ قرآنِ پاک میں جگہ جگہ **ان اللہ علٰی کل شئ قدیر، ما رزقنکم و شکر اللہ، واللہ سریع الحساب** وغیرہ ہے۔ انسان کو زندگی بخشنے والا اور موت کا ذائقہ چکھانے والا بھی رب العالمین ہے اور زمین تا عرش

خلا میں تیرنے والے کروڑوں کرۂ ارض کا خالق، ناظم اور حاکم بھی وہی خدائے واحد ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اللہ قادر مطلق کے پلّے میں محض ''وحدت'' ہے (اور کچھ نہیں) اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شاعر یا تو حقائق سے لاعلم ہے یا بیمار ذہنیت کا شکار ہے، اک ذرا اس شعر پر بھی نظر ڈالیے:

ہے خدا کو جس قدر اپنی خدائی پر گھمنڈ
مصطفیٰ کو اس قدر ہے مصطفائی پر گھمنڈ

خالقِ کونین نے کائنات کی تشکیل کی اور پھر خاک سے انسان کی تخلیق کی اور اسے ملائک واجنا پر فوقیت دی۔ ساری مخلوقات میں اسے افضل واشرف ہونے کے درجات سے نوازا۔ اتنا ہی نہیں انسان کو اس نے وہ عقلِ سلیم اور ذہنِ رسا عطا کیا جو اس کائنات میں پوشیدہ اسرار و رموز سے پردہ اُٹھا سکے۔ رب العزت نے پوری کائنات انسان کے حوالے کر دی اور اسے ہر حال میں رزق پہنچانے کا نظم بھی کر دیا اور رسولِ اکرم ﷺ کونین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے اس کے باوجود ''شاعر ناآشنائے حق'' کو خدائی اور مصطفائی کا گھمنڈ نظر آتا ہے تو اس کی فکر ونظر پر اظہار تاسف بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی ذہنی حالت پر شک بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب ذرا نعت کے ذیل میں شعر ملاحظہ فرمایئے:

خدائے پاک کوئی اب نئی زمیں ڈھونڈے
کہ اس محیط پہ جنت نشاں حجاز ہوا

یہ شعر نعتیہ ہوتے ہوئے بھی شاعر کی خبط الحواسی، اندھی عقیدت مندی اور کج فہمی کا غماز ہے۔ خدائے بزرگ و برتر خالقِ کونین ہے، مالکِ کل ہے، اور سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اسے مشورہ دینا کہ اب وہ کوئی اور زمین تلاش کرے کہ حجاز (مکہ، مدینہ وغیرہ) پر اس کی اجارہ داری نہیں رہی، شاعر کو قعرِ مزلت تک لے جاتا ہے۔ خدا نے نہ صرف دُنیا کے گوشے گوشے میں نبی اور رسول بھیجے ہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کرۂ ارض بھی بنائے ہیں اور پھر اس کا مسکن تو سرِ عرش ہے۔ اس کے باوجود وہ لامکاں ہے، لاریب ہے اور لاکلام ہے، وہ ہر جگہ ہے، ہر انسان کے ذہن و دل میں موجود ہے اس لیے اسے کسی خطۂ زمیں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس شعر میں فنی عیب بھی موجود ہے۔ مصرع اولیٰ کا لفظ ''کوئی'' لفظ ''اب'' کے بعد لکھنے کا محل تھا۔ ''خدائے پاک کوئی'' لکھنے سے کسی اور خدا کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ ''اب کوئی نئی زمین'' بامعنی ہوتا مگر ''کوئی اب نئی زمین'' مہمل ہے یا اس میں تعقید لفظی کا عیب ہے۔

جناب عبدالکریم قمر نے قابلِ قدر سچی بات کہی کہ حضور ﷺ کی شان میں ذرا سی

بے احتیاطی اور ادنیٰ سی لغزش ایمان و عمل کو غارت کر دیتی ہے۔ بے احتیاطی یا لغزش عموماً نادانستہ طور پر کم علمی کے باعث سرزد ہوتی ہے۔ کبھی کبھی شاعر کی سوچ مغالطے پیدا کرتی ہے اور کبھی کبھی مفہوم نہ سمجھنے کے باعث بھی شدید اعتراضات کے پہلو نکل آتے ہیں مگر بہت سے شعرا نے دانستہ طور پر ایسے اشعار لکھے ہیں جو بہ قول قمر صاحب ایمان و عمل کو غارت کرنے والے ہیں۔ چند اشعار جو بہرحال بیش تر اہلِ فن کو قابلِ اعتراض اور لائقِ مذمت معلوم ہوتے ہیں، میں مندرج کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

غلاموں کو غلامی کا شرف کافی بہت کافی
طبیعت پر گراں سا ہو کرم ایسا بھی ہوتا ہے

نبی کریم ﷺ نے غلام کو آزاد کرایا۔ اس بدعت کو ختم کیا لہٰذا غلامی کا شرف اور کرم کا گراں گزرنا دونوں ہی باتیں اتہام کے ذیل میں آتی ہیں۔

حضور ﷺ پاک شاہی کو مٹانے کے لیے آئے
ملے اذنِ تخاطب تو کہوں میں کس طرح شاہا

شاعر نے اذنِ تخاطب حاصل بھی کیا اور ایک صریحاً اعتراض کیا اور حقائق سے چشم پوشی کی۔

یہ قلبِ سلیم اس کا پڑھتا ہے کلمہ
جیسے الیلیے افعی نے اس کو ڈسا ہو

کلمہ پڑھنے سے تسکینِ قلب اور روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ کارِ ثواب بھی ہے۔ اگر شاعر اس عمل کو سانپ کے ڈسنے سے تعبیر کرتا ہے تو اس کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ مصرعِ ثانی ناموزوں ہے۔

ہمیں کیوں یا نبی کہنے سے آخر منع کرتے ہو
نبی ﷺ سے تم کہو وہ چھوڑ دیں چارہ گری اپنی

نبی ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں اور سراپا رحمت بن کر آتے ہیں۔ بھلا ان سے چارہ گری چھوڑ دینے کے لیے کون کہہ سکتا ہے؟ اور پھر کسی کو یا نبی کہنے سے بھلا کون اور کس طرح روک سکتا ہے۔ یہ شعر نہیں مجذوب کی بڑ ہے۔

میں پھیل جاؤں تیری طرح ان فضاؤں میں
یوں مجھ کو رنگ و نور کی صورت اچھال دے

''تیری طرح'' گویا نبی کریم ﷺ کی طرح پھیل جانے کی تمنا ان کی ہم سری کے

مصداق ہے جو غارت گر ایمان تو ہے ہی!

نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم
کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم

حضور اکرم ﷺ کو ''بے چارگی'' میں اپنے جیسا کہنا یقیناً گستاخی ہے، ایسا اظہار قابلِ مذمت ہے۔ (ایک طرف شعرا نے خدا بنا دیا دوسری طرف اپنے جیسا بے چارہ بندہ— خدا کی پناہ!)

جناب شاہ معین الدین ندوی نے فرمایا کہ ''شعرا سے نعت گوئی کی راہ میں سب سے بڑی غلطی الوہیت اور نبوت کے حدود کو سمجھنے میں ہوتی ہے۔'' میں سطورِ بالا میں ایسے دلائل پیش کر چکا ہوں کہ بعض انتہا پسند یا نام نہاد مذہبی شخصیتوں نے محمد ﷺ کو خدا کہنے اور خدا تسلیم کرانے کی شعوری کوشش کی ہے اور اس قسم کی نعتیں کہی اور کہلوائی ہیں جو محض نبوت کے ڈانڈے الوہیت سے نہیں ملاتیں بلکہ یہ عرفان کرانا چاہتی ہیں کہ محمد ﷺ کی شکل میں خدا یا خدا بن کر محمد ﷺ اس دُنیا میں تشریف لائے۔ دو ماہی ''گلبن'' کا نعت نمبر شائع ہوا تو بے شمار لوگوں نے مشمولات پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جناب رام پرکاش (ورگ) نے ناوکؔ صاحب کے اور میرے مضمون پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے مراسلے میں لکھا کہ:

اس سلسلے میں مجھے اپنے بچپن میں سنی ایک نعت یاد آرہی ہے، جو ہمارے علاقے (ضلع ہزارہ صوبہ سرحد حال پاکستان) میں بہت پاپولر تھی اور اکثر زیارتوں، خانقاہوں میں بہ طور قوالی گائی جاتی تھی۔ اس کا ایک شعر مجھے یاد ہے:

شریعت کا ڈر ہے اگر سچ بتا دوں
محمد ﷺ جہاں میں خدا بن کے آیا

(دو ماہی ''گلبن'' احمد آباد، جولائی۔ اگست ۱۹۹۹ء)

چند دنوں قبل ڈاکٹر خورشید جہاں (صدر شعبۂ اردو، ونو بھاوے یونی ورسٹی۔ ہزاری باغ) سے حضرت آسیؔ غازی پوری کے محولہ شعر کے معنوی پہلو پر میں بات کر رہا تھا تو انھوں نے بھی اس شعر کے وہی معنی بتائے جو آسیؔ صاحب کے شعر سے برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس قسم کے اشعار تو بہت زیادہ کہے گئے ہیں۔ انھوں نے کسی نعت کا ایک مصرع بھی سنایا جسے انھوں نے اپنے بچپن کے زمانے میں سنا تھا بلکہ اس کا ریکارڈ ابھی تک ان کے آبائی وطن کے مکان میں موجود بھی ہے۔

محمد ﷺ خدا ہیں، خدا ہیں محمد

حضرت آسیؔ کے شعر پر ان کی زندگی پر ان کی زندگی میں بھی اعتراضات ہوئے تھے اور اب تک اس شعر کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ خدا جو مستوی عرش ہے (یا تھا) وہی مدینے میں مصطفیٰ ﷺ بن کر اُتر پڑا ہے۔ یہ شعر سہ ماہی ''الکوثر'' میں زیرِ بحث آیا تو ''ایک شعر کی تفہیم'' کے زیرِ عنوان ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی نے اس کی تشریح وتعبیر تاویل کے ساتھ پیش کی:

> وہ (خدا) تو اب بھی مستوی علی العرش ہے۔ مدینے میں اُترنا نزولِ صفات کے اعتبار سے ہے، جیسے آفتاب آئینے میں اُترتا ہے یعنی جیسے آفتاب اپنے مستقر میں ہوتا ہے لیکن انوار وتجلیات کے اعتبار سے آئینے میں منعکس ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ ذاتِ بے نیاز تو آج بھی مستوی علی العرش ہے، لیکن اس نے اپنی صفات وتجلیات کا مظہرِ اتم بنا کر جناب مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے جو طیبہ میں جلوہ ریز ہیں۔

حضرت آسیؔ غازی پوری نے اس شعر کے متعلق فرمایا تھا کہ ''جہلا اس پر اعتراض کریں گے مگر ان کے اعتراض کا جواب مصرع اولیٰ میں موجود ہے۔'' معلوم نہیں جہلا سے ان کی کیا مراد تھی؟ بڑے اور بزرگ شاعر کے شعر پر کوئی باریک بیں، نکتہ رس اور صاحبِ نظر دانش ور ہی اعتراض کر سکتا ہے۔ ہمیشہ بلند و بالا شخصیات اور اہم و معیاری تخلیقات و کتب ہی زیرِ بحث آتی ہیں کیوں کہ:

اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بزرگی اور شاعری دو الگ چیزیں ہیں۔ شعری، فنی اور فکری التزامات پر بات ہو تو بزرگی کو کبھی ڈھال بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ زیرِ بحث شعر کے مصرع اولیٰ میں لفظ ''وہی''، ''مستوی عرش'' اور ''ہوکر'' قابلِ غور ہیں۔ ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی صاحب نے لفظ ''وہی اور ''ہوکر'' کے معنوی در و بست کو اپنی تشریح میں نظرانداز کر دیا ہے۔ وہی اُتر پڑا کے معنی قطعی یہ نہیں لیے جا سکتے کہ مدینے میں اُترنا نزولِ صفات کے اعتبار سے ہے یا انوار وتجلیات کے اعتبار سے ہے۔ جو آئینے میں منعکس ہو جاتا ہے۔ دراصل شعر میں معنوی عیب ردیف ''ہوکر'' نے پیدا کیا ہے۔ ''ہوکر'' کے محلِ استعمال سے ہم سب واقف ہیں۔ یہ لفظ ایسے شخص وشخصیت کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو اس سے قبل اس مقام یا عہدے پر فائز نہ رہی ہو۔ جیسے یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر فاروق صاحب یو جی سی کے چیئرمین ''ہوکر'' جا رہے ہیں، چلے گئے یا کسی جگہ سکونت پذیر ہو گئے۔ کبھی کبھی یہ لفظ اس کے برعکس بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فلاں صاحب نے عقل مند ''ہوکر'' بھی ناعقلی کا ثبوت دیا وغیرہ۔ سچی بات یہ ہے کہ مصرع اولیٰ

میں ردیف ''ہوکر'' چسپاں ہی نہیں ہوئی۔ ''وہی جو مستوی عرش ہے'' لکھنے سے بات پوری ہو جاتی ہے۔ ''ہوکر'' نہ صرف زائد ہے بلکہ خدا کے مرتبے اور شان کے خلاف بھی ہے۔ ''اُتر پڑنا'' کے معنی کسی اونچی جگہ سے نیچے (دفعتاً) آ جانے کے ہیں۔ یہ عمل ہمیشہ مجسم ہوتا ہے۔ اس لیے تاویل کے ساتھ پیش کردہ ڈاکٹر فاروق صاحب کا آخری جملہ بھی قابلِ قبول تو کیا قرینِ قیاس بھی نہیں ہے۔ آئینے میں آفتاب کے اُترنے کی مثال بھی عجیب وغریب ہے۔ آئینہ روشنی یا شعاع کو کبھی جذب نہیں کرتا، ہمیشہ اسے Reflect کر دیتا ہے۔ صداقت یہ ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ بہ ذاتِ خود نور خداوندی کا جزو تھے اور اس سے معمور تھے لہٰذا دوبارہ انوار و تجلیات کا اُترنا تشکیک بھی پیدا کرتا ہے اور غور و خوض کی دعوت بھی دیتا ہے کیوں کہ سرورِ کائنات تمام تر اوصاف وتجلیات سے حصولِ نبوت سے قبل ہی متصف ہو چکے تھے۔ ان پر صرف وحی کا نزول ہوا کرتا تھا۔ (نور پیکر اور تجلّی افروز تو وہ خود تھے) میں ایک ادنیٰ ''گنہ گار ادیب'' ہوں۔ حضرت آسیؔ جیسی برگزیدہ ہستی کے فکر و خیال کو حیطۂ اعتراض میں لانے کی بجائے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان کا شعر ''المعنی فی بطن الشاعر'' کے مصداق ہے۔

دُنیائے شعر میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ نعت میں غیر محسوس طریقہ پر غزل کے اشعار داخل ہو جاتے ہیں اور غزل میں ایسے شعر وارد ہو جاتے ہیں جن کا رُخ موڑ دیا جائے تو وہ خالصتاً نعت کے شعر قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے:

> حضرت احسان دانشؔ کی وفات سے دس بارہ دن پہلے ان سے بڑی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ میرے ساتھ میری بیوی، ان کی بہن فہیم فریدی اور ہماری عزیزہ، اکادمی ادبیات پاکستان کی نسیم خواجہ بھی تھیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اس ملاقات کو نہیں بھولے گا۔ حضرت احسان دانشؔ نے شعر سنایا:
>
> ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
> ترے نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے کو
>
> میں نے کہا چچا! یہ نعت کا بہت خوب صورت شعر ہے۔ مرحوم نے فرمایا نہیں! میں نے نعت میں یہ شعر نہیں کہا۔ گفتگو کا سلسلہ کسی اور طرف مڑ گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد احسان دانشؔ مرحوم نے کہا، ''تم نے سچ کہا، یہ نعت ہی کا شعر ہے۔''

(ادبی جائزہ ۱۹۹۷ء، ماہنامہ ''صریر'' کراچی، مئی ۱۹۹۹ء، ص:۷۰)

میں غالب کا یہ شعر بار ہا نعتیہ شعر کے ذیل میں سنتا آیا تھا:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

جناب ناوکؔ حمزہ پوری نے لکھا ہے کہ ''اے کاش غالبؔ نے یہ شعر بہ ارادۂ نعت کہہ کر اپنی عاقبت سنوار لی ہوتی۔ حال یہ ہے کہ غالبؔ نے یہ شعر تجمل حسین خاں کے لیے چند ٹکے کی اُمید میں کہا تھا۔'' اب بعض نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں جو رُخ موڑنے پر بھی غزل ہی کے شعر معلوم ہوتے ہیں:

طبیعت میں وہ قدرتی شرم جیسے
کہ پردہ نشیں کوئی ناکت خدا ہے
دید گل اور بھی کرتی ہے قیامت دل پر
ہم صفیرو ہمیں پھر سوئے قفس جانے دو
ایک دن آواز بدلیں گے یہ ساز
چچہا کہرام ہو ہی جائے گا

اُردو میں بلند پایہ نعتیہ شاعری کی کمی نہیں ہے۔ حفیظؔ جالندھری کی شاہنامۂ اسلام تا قیامت زر افشانی کرتا رہے گا۔ امام احمد رضاؔ خاں کا اُردو اور فارسی نعتیہ کلام فنی اور معنوی دونوں اعتبار سے دُنیا بھر میں پسند کیا گیا ہے۔ حمیدؔ صدیقی نے نعت گوئی کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ ان سب کے یہاں اعتدال پسندی ہے۔ ماضی بعید میں طویل طویل مثنویاں لکھی گئیں۔ معراج کے موضوع پر سیّد بلاقیؔ، مختارؔ نامی ایک شاعر، نصرتیؔ اور قربیؔ ویلوری نے کئی کئی سو بلکہ کئی کئی ہزار اشعار پر مشتمل مثنویاں قلم بند کیں۔ باقر آگاہ نے رسولِ اکرم ﷺ کے حالات و معجزات پر نو ہزار اشعار کہے اور شاہ عبدالحی احقرؔ نے سیرتِ طیبہ کو موضوعِ سخن بنا کر تقریباً بیس ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی لکھی جسے مولانا رومؒ کی مثنوی کا بدل قرار دیا گیا ہے۔ فی زمانہ ایسی شاہکار طویل منظومات تو نہیں لکھی جا رہی ہیں مگر ہر مکتبۂ فکر کے شعرا صنفِ نعت کو ادبی معیار کے مطابق فروغ دینے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر انور سدید:

> کثرت ایسے شعرا کی ہے جو غزل کہتے ہیں تو غزل کی فضا کو قبول کر لیتے ہیں، لیکن جب نعت کی کیفیت ان پر طاری ہوتی ہے تو لاشعور غیرِ ارضی فضا میں پرواز کرتا ہے اور نغمۂ نعت اس کے قلم کو پُر افشاں کر دیتا ہے۔

(ماہنامہ ''صریر'' کراچی۔ ماہ مئی ۱۹۹۹ء)

اس رائے سے بھی یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ غزل کے فارم میں فنِ نعت گوئی ارتقا پذیر ہے اور بہ کمال، بالغ نظر اور اقدارِ نو پر نظر رکھنے والے غزل گو شعرا فنی اور ادبی لحاظ سے زیادہ معیاری نعت تخلیق کر رہے ہیں۔ اس تناظر میں غور کریں تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مولانا جلال الدین عمری کے فرمودات نظرِ ثانی کے ملتجی ہیں۔ بلاشبہ اچھا غزل گو شاعر نعت کہتے وقت بھی فن کارانہ اندازِ اظہار برقرار رکھتا ہے اور وہ نعت کے ذریعے عقائد و مسلک کی تبلیغ کا مرتکب نہیں ہوتا۔

موجودہ عہد میں مسلک و عقائد اور بدعتوں کو کچھ اس قدر فروغ حاصل ہوا ہے کہ نعتیہ شاعری کا چہرہ بھی بڑی حد تک مسخ ہوگیا ہے۔ متقدمین اور متاخرین دونوں نے اس مقدس فن کو نقصان پہنچایا ہے۔ ایک طبقے نے خدا کو محمد ﷺ اور محمد ﷺ کو خدا بنا کر پیش کرنے کی قابلِ نفریں کوشش کی ہے تو دوسرے نے مبالغہ کی انتہا کر دی ہے۔ ایک حلقے نے تحقیر آمیز لب و لہجہ میں ان کی شان میں گستاخی بھی کی ہے۔ ایسے تمام اقدامات جارحیت کے غماز ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اپنے کو غلو سے بچاؤ۔ غلو ہی نے تم سے پہلے والوں کو ہلاک کیا ہے۔'' خود اپنے بارے میں بھی مبالغہ آمیز باتیں نبی کریم ﷺ کو سخت ناپسند تھیں اور وہ اپنے مصاحبین و شعرائے کرام کو اس سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک بار معروف شاعر حضرت کعب بن زہیرؓ نے اپنا بلند معیار ادبی نوعیت کا قصیدہ بہ عنوان ''بانت سعاد'' آپ کی خدمت میں پڑھا، جس میں رسول ﷺ کی تعریف میں یہ معرکۃ الآرا حاصلِ قصیدہ شعر بھی تھا:

ان الرسول لنور یستضاء بہ

و صارم من سیوف الھند سلول

رسول اللہ نے قصیدہ سن کر نہ صرف اس کی تعریف کی بلکہ اپنا پیراہن مبارک حضرت کعب بن زہیرؓ کو عنایت فرمایا اور اس شعر میں ''من سیوف الھند'' کی جگہ ''من سیوف اللہ'' لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس اصلاح سے شعر کی معنویت میں اضافہ ہوگیا اور شعر فنی و فکری لحاظ سے قابلِ قدر ہوگیا۔ اسی طرح ایک بار کعبؓ بن مالک نے اپنے چند اشعار آپ ﷺ کو سنائے۔ یہ شعر حبیبِ خدا کی تعریف میں تھا:

مجالدذا عن جذمنا کل فخمتہ

مذریۃ فیھا القوانس تلمع

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، ''عن جذمنا'' کی بجائے ''عن دیننا'' لکھو۔ یہ اصلاح حضرت کعب بن مالک کو بے حد پسند آئی اور انھوں نے شعر میں ترمیم کر لی۔ ان دو مثالوں پر غور

کیجیے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ بہ ذات خود شاعری کی رموز وفن سے بہ خوبی واقف تھے اور وزن و بحر پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ ''سیوف الہند'' اور ''سیوف اللہ'' ہم وزن ہیں اور مفاعیلان کے وزن میں ہیں۔ اسی طرح ''جذمنا'' اور ''دیتنا'' (فاعلن) ہم وزن ہیں۔

ہمارے رسول اللہ ﷺ بہ شوق شعر سنتے بھی تھے اور اچھے اشعار یا منظومات کی تعریف بھی کرتے تھے۔ شعر و ادب پر ان کی گہری نظر تھی اور انھوں نے عربی شعر و ادب کا بالاستیعاب مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس کی توثیق مندرجہ ذیل اقتباس سے یقیناً ہو جائے گی:

> حضور ﷺ نے امراء القیس کے متعلق جو اسلام سے چالیس سال پہلے ہوا ہے، ارشاد فرمایا، ''**ھو الشعر الشعراء قائدھم الی النار**'' یعنی وہ شاعروں میں سب سے بڑا شاعر ہے، لیکن انھیں جہنم کی طرف لے جانے والا لیڈر بھی ہے۔ اس ارشاد سے ظاہر ہے حضور ﷺ اعلیٰ درجے کی شاعری کے مرتبہ شناس بھی تھے اور امراء القیس کی شاعری کے موضوع کو ناپسند کرنے کے باوجود اس کے ''کمال شاعرانہ'' کا اعتراف فرماتے ہیں۔ (عبدالمجید سالک، ''ذکرِ اقبال'' ص:۸۸)

شاعری ایک بڑا فن ہے اور اعلیٰ درجے کی شاعری کے ساتھ ساتھ پست معیار شاعری بھی ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ نعتیہ شاعری مشکل، مقدس اور قدرِ اوّل کی شاعری ہے مگر ہر دور میں محفلوں اور جلسوں میں ایسی شاعری سننے کو ملتی رہی ہے جو فنی اور علمی دونوں لحاظ سے کم تر درجہ کی اور سطحی ہوتی ہے۔ اس میں نہ صرف عام فنی خامیاں ہوتی ہیں بلکہ زبان، محاورہ اور وزن و بحر کی فاش غلطیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ اس کا انداز پیش کش بھی اکثر لچر اور سوقیانہ ہوتا ہے۔ اس لیے نعتیہ شاعری کو فنی اور فکری دونوں لحاظ سے زیادہ معیاری، زیادہ بلیغ اور زیادہ بامعنی بنانے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کا بہ راہِ راست تعلق اس ذاتِ اقدس سے ہے جو کونین میں عالی مرتبت ہے اور منبعِ فضل وکمال ہے۔ جس کے تعلق نے شعر کے فنی محاسن کا بھی ادراک کرایا ہے اور شاعری کو بھی اعتبار بخشا ہے۔ بے شک وہ حبیب اللہ بھی ہیں اور رحمۃ للعالمین ﷺ بھی اور مخزن شعر و ادب بھی۔ انھوں نے اپنے بارے میں خود ارشاد فرمایا ہے:

''انما بعثت معلما''

حافظ محمد افضل فقیر

نعت کا مثالی اسلوبِ نظم

اللہ رب العزت نے جناب رسالت مآب ﷺ کو رحمتِ عالم بنا کر بھیجا۔ عالم اَن گنت ہیں ہر نوع خلق کا عالم جدا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قطعۂ ارض پر آباد دس افراد دس مختلف عالموں کے مکیں ہوں۔ پھر ہر لمحہ ایک عالم وجود میں آتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس طرح عوالم کے ایجاد و اعدام کا ایک سلسلہ جاری ہے، نظریات و خیالات کا بھی عالم ہے اور ایسے عالم بھی ہیں، جو ہنوز ورائے ادراک ہیں۔ بہر حال ہم جس عالم کا بھی تصور کر سکتے ہیں، جناب ختمی مرتبت ﷺ کی رحمت اس کے لیے پہلے سے موجود ہے۔ پھر انتہائے عنایت ربانی دیکھیے کہ ہنوز عالم کا وجود متصور نہیں، مگر حضور فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رحمت اسے نوازنے کے لیے جلوہ فرما ہے۔ عالمِ اسلام پر جب بھی دور ابتلا آیا، آپ کی رحمت نے افرادِ اُمت کے دیدہ و دل کی تسکین فرمائی۔ بالفاظ دیگر آپ کی ردائے رحمت ہم ستم زدگان گردشِ ایام پر برابر تنی رہتی ہے اور یہ سلسلہ ابد الآباد تک جاری رہے گا۔ زمان و مکاں ختم ہو جائیں گے، مگر رحمتِ عالم کی فیض رسانی جاری رہے گی کہ حشر و نشر بھی تو عالم ہی کے تحت آتے ہیں۔ جب رحمت کی کرن آفت رسیدہ گان روزگار پر پڑتی ہے اور غبار کلفت ڈھل جاتا ہے تو وہ لطیف ارواح، جن کی قوت مدرکہ پاکیزہ ہوتی ہے، کسی حد تک اس رحمت کا ادراک کر لیتی ہیں اور بہ طورِ سپاس جناب رسالت مآب ﷺ کے حضور مدحت سرا ہو جاتی ہیں۔ قلوب آپ کی محبت، تعظیم اور اطاعت سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ خوش نصیب افراد اُن کے اسوۂ مبارکہ کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں اور یوں سیرتِ نبوی ﷺ پر نظم و نثر کے تاب ناک شہ پارے وجود میں آتے ہیں۔ انفرادی و اجتماعی طور پر نعت کے محرکات یہی ہیں۔

نعت کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن اور انھیں فروغ دینے والے نفوس کا تجزیہ لابدی ہے کہ نعت اور نعت گو حضرات کی امتیازی و انفرادی حیثیت مبرہن ہو سکے۔ اس بحث کے تحت درجِ ذیل

حقائق آئینۂ ادراک میں متشکل ہوتے ہیں:

ا۔ شاعر کی شخصیت اور کلام ہر دو عظیم ہوتے ہیں۔

ب۔ سخن ور کا کردار غیر معیاری ہوتا ہے، مگر کلام اعلیٰ اور وقیع ہوتا ہے، گویا شاعر کی شخصیت اس کے کلام سے منفک ہوتی ہے۔

ج۔ شاعر کی شخصیت قابلِ احترام ہوتی ہے۔ مگر اشعار میں کہیں کہیں ابتذال در آتا ہے۔

د۔ شعر و شاعر ہر دو سبک ہوتے ہیں۔

پہلی شق فطرت کے عین مطابق ہے کہ اس میں شخصیت و کلام لازم و ملزوم ہیں، ان کے پس منظر میں پاکیزگی کردار اور صفائے باطن کا عنصر کارفرما نظر آتا ہے اور یہ کیفیت اہلِ اللہ کے مقامات کا مظہر ہے۔

دوسری صورت قدرے وضاحت طلب ہے کہ اس میں شاعر اپنی شخصیت کے معائب سے یکسوئی خیال کے ذریعے نکلتا ہے اور بالآخر اس روحانی فضا تک جا پہنچتا ہے، جس پر زمین کے منفی متعلقات اثر انداز نہیں یہ ارتقائے فکر کے ثمرات ہیں اور فطرت الٰہیہ نے سارے عالمِ انسانیت کو یکساں طور پر ان کمالات سے نوازا ہے بایں ہمہ ہر دو صورتوں میں ایک حدِ فاصل بھی متعین ہے، جو نص قرآنی سے مستنبط ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ان فی خلق السموات والارض و اختلاف اللیل والنھار لایت لاولی الالباب، الذین یذکرون اللّٰہ قیاما وقعو داو علی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السمٰوت و الارض

ترجمہ: بے شک زمین آسمانوں کی تخلیق اور شب و روز کے اختلاف میں اربابِ دانش کے لیے نشانیاں ہیں، جو اُٹھتے بیٹھتے اور پہلوؤں پر لیٹے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے اور زمین اور آسمان کی تخلیق میں فکر کرتے ہیں۔

آیہ مذکورہ ایک عظیم حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہے وہ یہ کہ مسلمات حقائق کے عالم تک رسائی صرف ان اربابِ دانش ہی کو میسر آ سکتی ہے، جو ذکرِ الٰہی کی کیفیات سے بہرہ ور ہونے کے بعد انفس و آفاق میں فکر کرتے ہیں۔ نتیجۃً انھیں گہرہائے معنی تک دسترس نصیب ہو جاتی ہے۔

پہلی صورت میں ذکر کی کیفیت اور فکر کی لطافت کا امتزاج ہے، جس کی تائید منصوص ہے، جب کہ دوسری صورت میں فکر کی رسائی تو موجود ہے، مگر ذکرِ ربانی کی تائید کا فقدان ہے۔ تیسری صورت، جس میں کلام ایک شاعر کی شخصیت کی کامل عکاسی نہیں کرتا، اس میں شعر کے

مستغیانہ طرزِ فکر اور بے پروا خرامی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ فنِ شعر کے آداب اور مقتضیات سے صرفِ نظر کرتا ہے۔ بالالفاظِ دیگر ذائقے کی تبدیلی کا باعث سہواً یا قصداً اس کے کلام میں گاہے گاہے سوقیانہ پن رونما ہوتا ہے۔ چوتھی کیفیت عامیانہ ہونے کے سبب خارج از بحث ہے۔

ان تمام امور کا تذکرہ اس لیے ضروری تھا کہ صنفِ نعت اور نعت گو حضرات کے امتیازی مقام کو واضح کیا جائے اور ان کی جداگانہ ہیئت متعین ہو۔ دیگر اصنافِ سخن کی طرح نعت اور نعت گو کے باہمی ربط کا تجزیہ بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ شاعر کے کردار کی پاکیزگی صفائے باطن اور اخلاصِ عمل کی تاثیرات اس کے پیکرِ نعت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ایک صاحبِ ذوق عارف کسی صنفِ سخن میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کرے، متصوفانہ نظریات سے اس کا کلام لبریز نظر آئے گا۔ پھر صنفِ نعت تو باطنی ارادت کی عظیم ترین ترجمان ہے۔ ایک مرتبہ مولانا غلام قادر گرامی نے علامہ اقبال علیہ الرحمہ کو لکھا کہ حضرت شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہ کی زمین میں شعر لکھنے کے لیے ان کا وجدان اور تقویٰ کہاں سے لاؤں؟ معلوم ہوا کہ عظمت تقویٰ اور بلندیِ کردار شہ پارہ نظم پر اس طرح متجلّی ہوتے ہیں کہ پھر اس کی تقلید بھی از قبیل محالات ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عمومی طور پر دیگر نعت گو حضرات بھی ہیں' ان کی کاوش بھی قابلِ ہزار تحسین ہے کہ ان کے سینوں میں اقرارِ توحید و رسالت موجود ہے، جو معارفِ نعت کا مخزن ہے، پھر اس کے ساتھ احساسِ گناہ گاری بھی ہے جو توبہ و انابت کی اصل ہے اور احساسِ ندامت ایک ایسا لامعہ نیاز ہے، جس کی سرحدیں الطافِ ذاتِ لم یزل کو مماس ہیں۔ ویسے بھی ہر کلمہ گو پر واجب ہے کہ اپنے ولیِ نعت کا سپاس گزار رہے۔ ہر وہ اُمتی، جس کی زبان یا قلم سے کوئی مدحیہ کلام بہ صورتِ نظم و نثر صادر ہو، ایک سپاس گزار ناعت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے کرم فرما ڈاکٹر ریاض مجید کو ہمیشہ خرم و خوش دل رکھے، موصوف سے فیصل آباد میں ملاقات ہوئی تو فقیر نے انھیں اس نظریے کا کہ کلام منظوم ہو یا منثور، نعت حضور سرکارِ کائنات ﷺ ہے، سب سے پہلا موئید پایا۔ سبحان اللہ! کیا اندازِ ارادت اور کیسی بلند خیالی ہے۔ ان کے اس موقف کی اساس مجھے شمائل ترمذی میں نظر آئی۔ سیّدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے جناب رسالت مآب ﷺ کا حلیہ مبارک تفصیل سے بیان کرنے کے بعد آخر میں یوں فرمایا: **یقول ناعته لم ارقبله ولا بعده مثله** یہاں لفظ ناعت محلِ تعمیم میں داخل ہے اور کسی منظوم کلام لکھنے والے پر اس کا حصر نہیں۔

مداحان حضور ختمی مرتبت ﷺ کا شرف و امتیاز اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ کلامِ الٰہی

میں جس زمرہ شعرا پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا، وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ سورۂ شعرا کی آخری آیات، جن میں اہلِ سخن کی مذمت اور استثنا مذکور ہے، کا متن اس طریق پر ہے:

والشعراء یتبعهم الغاوون، الم ترانهم فی کل وادیهیمون، وانهم یقولون مالا یفعلون، الا الذین امنو اوعملوا الصلحت و ذکر و الله کثیر اوانتصرو لمن یعلما ظلمو او سیعلم الذین ظلموآ ای منقلب ینقلبونO

ترجمہ: اور گمراہ لوگ شاعروں کی پیروی کرتے ہیں۔ اے مخاطب! کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ (خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں، مگر جو لوگ ایمان لائے، اچھے کام کیے اور انھوں نے (اپنے اشعار میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا پھر بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا اس کا بدلہ لیا اور عنقریب وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا، جان لیں گے انھیں کس جگہ لوٹ کر جانا ہے۔

صاحب روح المعانی علامہ آلوسی بغدادی ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہم بارگاہِ نبوی ﷺ میں باچشم نم ناک حاضر ہوکر گویا ہوئے: ''حق تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا اور وہ جانتا ہے کہ ہم شعرا ہیں، ہم تو ہلاک ہوگئے۔' پھر اللہ تعالیٰ نے آیت استثنا اُتاری تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انھیں بلایا اور اس آیت کو ان پر تلاوت فرمایا۔''

اس سے آگے آیت استثنا کی تفصیل مزید صاحب روح المعانی ہی کے الفاظ سے ملاحظہ فرمائیں:

(اس آیت میں) نیک اہلِ ایمان شعرا کی استثنا ہے، جو خداوند بزرگ و برتر کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں، ان کے اکثر اشعار توحید اور حمد باری تعالیٰ میں ہوتے ہیں۔ ان میں اطاعت، حکمت، موعظت اور دینوی امور سے احتراز کی ترغیب ہوتی ہے۔ دُنیا کے فانی فوائد میں ابتلا، اس کے مزخرفات پر فریفتگی اور اس کی وابستگی سے ڈرایا جاتا ہے اور جو اجور اللہ تعالیٰ کے ہاں (باقی رہنے والے) ہیں، ان کا شوق دلایا جاتا ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کے محاسن و محامد اور آپ کے معجزات کا ذکر ہوتا ہے تاکہ سامعین کے سویدائے قلب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت موج زن ہو اور ان کا ولولہ و جوش آپ کے اتباع، اہلِ بیت عظامؓ، صحابہ کرامؓ اور صلحائے

اُمت کی توصیف و ثنا کے بیان میں افروز ہو۔

اُردو اور فارسی کے کلاسیکی شعرا نے اس امر کا التزام کیا تھا کہ اپنے دواوین کا آغاز حمد و نعت سے کرتے اور اس کے بعد غزلیات لکھتے، مثنوی نگاری میں بھی یہی اہتمام تھا کہ حمد و نعت کے بعد متعلقات موضوع پر اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ شعرائے اُردو نے صنفِ نعت کے ابتدائی دور اتقا میں صلوٰۃ و سلام پر مبنی اشعار لکھے، جو محافلِ نعت اور مجلسِ میلاد النبی ﷺ کی زینت و تنویر کا موجب بنے، یوں عامۃ المسلمین اور متوسط درجہ کے خواندہ طبقہ کی ایمان افروزی اور جلائے قلبی کا سامان مہیا ہوا۔ غلام امام شہید کا نام اس ضمن میں سرِفہرست ہے ظاہر ہے، قصیدہ، مثنوی، طویل منظومات اور بلند پایہ مضامینِ سیرت، جو خاصی حد تک عام ذہن سے بالاتر ہیں، جداگانہ مقام و محل کے متقاضی تھے۔ امیر مینائی اور محسنؔ کاکوروی دونوں بزرگ اس میدان میں سابق بالخیرات ہیں۔ مولانا کفایت علی کافی، مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی اور ان کے معاصرین نے گل زارِ نعت کو علم و آگہی اور عشق و شیفتگی کے گل ہائے رنگ رنگ سے آراستہ کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس لکھ کر اس روش کو درخشندہ تر کیا، اس نے اہلِ اسلام کے سینوں میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی اور افرادِ اُمت میں اسلامی شان و شوکت کی بازیابی کے لیے ایک تحریک پیدا کی۔ مسدس کے اشعار کا پس منظر قرآنی آیات، احادیث مبارکہ، حقائقِ کائنات اور شواہدِ تاریخ سے تاب ناک ہے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی شاعری کا منبع و مصدر بھی سنتِ نبوی کا اتباع، زندگی کو سیرتِ رسول ﷺ کے سانچے میں ڈھالنے کا عزمِ صمیم، اسلامی اقدار کا احیا اور مسلسل جدوجہد ہے۔ ظفر علی خان مرحوم کا نعتیہ کلام رسولِ پاک ﷺ سے ارادتِ قلبی اور دردمندی باطن کا حسین و جمیل مرقع ہے۔ اس کلام کے علاوہ دوسری منظومات، جن کا موضوع تحفظِ ناموسِ ختمِ نبوت ہے، اُردو ادب کے زندہ جاوید شاہکار ہیں۔ حفیظ جالندھری کا شاہنامہ تاریخِ اسلام کے واقعات اور عہدِ نبوی کے غزوات کو اس طرح روشن کرتا ہے کہ اس کی شان و شوکت قاری کے نہاں خانۂ قلب میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ یہ سب تجلیاتِ نعت ہیں، جو محامدِ مصطفویہ کے انوار سے مستفاد ہیں۔

جناب رسالت مآب ﷺ پیغمبرِ انسانیت بن کر عالمِ امکاں میں تشریف لائے، قرآنِ حکیم کے کلماتِ قدسیہ: **قل یاایها الناس انی رسول او الیکم جمیعا** اس حقیقت کے ترجمان ہیں۔ مذکورہ بالا ارشادِ ربانی سے یہ مفہوم روزِ روشن کی طرح اُبھرتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ اطہر میں عالمِ انسانیت کو پیش آنے والے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ عصرِ حاضر میں مادّے کے تجربات اپنے عروج پر ہیں، جن کے باعث انسانیت کے سر پر ہلاکت انگیزیوں کے

بادل منڈلا رہے ہیں۔ ہر سخن ور، صاحبِ طرزِ ادیب اور صحافی اس للکار کا مقابلہ کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔ حیاتِ بشر کی بقا، اقدارِ انسانی کی نگہ داشت اور خیر خواہی اولادِ آدم دورِ حاضر کے دل گداز اور جاں گسل مسائل ہیں۔ شاعر جب قلم اُٹھاتا ہے تو اس کا لاشعور اسے ان گتھیوں کو سلجھانے کی دعوت دیتا ہے۔ جناب سرور کائنات ﷺ محسنِ انسانیت ہیں اور حضور کی ذاتِ اقدس و اطہر میں انسانیت نوازی کے تمام جواہر پوری شان کے ساتھ جلوہ ریز ہیں لہٰذا دورِ حاضر کا نعت گو انسانیت کی دم توڑتی اقدار کے لیے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے زندگی کی بھیک مانگتا ہے اور شکستگیِ خاطر کی مداوا طلبی کرتا ہے۔ یہ امر اہم ہونے کے ساتھ نازک تر بھی ہے اور بے حد احتیاط کا متقاضی بھی۔ اس بات کا اندیشہ ہر وقت لاحق رہتا ہے کہ نعت گو شاعر انسانیت کی اور امن و آتشی کی علم برداری میں کہیں عزم و ہمت کو بے دست و پا نہ کر دے اور قوم کو تعطل کی طرف نہ لے جائے، جس سے اسلام کی مجاہدانہ روح مجروح ہو جائے کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل منصوص ہے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے کیسی عمدگی سے اس مقام کی نوعیت کو واضح فرمایا ہے:

دل بری ہے قاہری جادو گریست
دل بری با قاہری پیغمبر یست

ارضِ پاک کا یہ دور نعت کا دور ہے۔ انفرادی و اجتماعی طور پر دفعِ ابتلا کی خاطر ہر لمحہ بہ وساطتِ نعت تگ و تاز جاری ہے، کم و بیش تمام ملکی رسائل و جرائد نعتیہ کلام کے انوار سے تاب ناک ہیں اور صنفِ نعت ادبی حیثیت سے ارتقا کے اس بلند مقام تک جا پہنچی ہے کہ ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی، ہم اسے از روئے ایمان التفات جناب فخرِ موجودات سمجھتے ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقاماتِ سیرت اور مکارمِ اخلاق کا احاطہ ناممکن ہے۔ اُمتِ مسلمہ اگر تاقیامت آپ کی شمائل و محامد تحریر کرتی رہے تو پھر بھی وہ اپنے عجزِ بیان کی معترف رہے گی۔ چوں کہ صنفِ نعت کی پیش رفت کا سلسلہ جاری ہے، لہٰذا اس ضمن میں چند مسلمات کا ذکر ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ مسلمات ہیں جو روحِ ارادت اور مقتضیاتِ صنفِ نعت ہیں:

ا۔ نعت گو کے لیے ضروری ہے کہ وہ نعت کا آغاز دیگر اصنافِ سخن کی طرح عام انداز اور روایتی ڈگر سے نہ کرے۔ مطلع میں متعلقاتِ نعت سے کوئی مضمون باندھے یا اس میں کسی قسم کا ایسا اشارہ موجود ہو، جو نعت پر دلالت کرے، بالفاظِ دیگر نعتیہ کلام کا مطلع نعت کے علاوہ کسی دوسری صنفِ سخن پر چسپاں نہ ہو سکے۔

ب۔ اگر نعت کا آغاز صیغہ غائب سے ہو تو آخر تک اس تسلسل کو برقرار رکھا جائے۔ اگر آغازِ

صیغہ حاضر سے ہے تو اس التزام میں انقطاع رونما نہ ہو کہ بارگاہِ نبوی میں مدحت سرا کا حضور پر جس انداز کا متقاضی ہے، عالمِ غیاب میں اشتیاقِ حضوری کا آہنگ بلاشبہ اس سے مختلف ہونا چاہیے۔

ج۔ نعتیہ اشعار میں صیغہ واحد غائب، جمع غائب اور صیغہ واحد حاضر، حاضر کا استعمال اکابر شعرائے نعت کے ہاں بہ کثرت ہے، اسے سُوے ادب پر محمول کرنا درست نہیں کہ نظم کے مقتضیات بہرحال نثر سے متفاوت ہیں۔ البتہ نثر میں جناب رسالت مآب ﷺ کے لیے آپ کا استعمال لازمہ ادب و احترام ہے۔ جن لوگوں نے اپنے منظوم کلام میں ان صیغوں کو جگہ دی ہے، وہ سرشارِ عشقِ رسول ﷺ تھے اور ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ انھوں نے آپ کی شانِ اقدس میں کسی قسم کی بے ادبی کو روا سمجھا ہو۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے بانگِ درا میں اپنی نظم صدیق رضی اللہ عنہ کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

بولے حضور ﷺ چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار
اے تجھ سے دیدہ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

مرزا غالب نے کہا ہے:

اس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

ظفر علی خاں مرحوم کی وہ نعت، جس کی ردیف صیغہ جمع حاضر ہے، زبان زدِ خلائق ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

دل جس سے زندہ ہے، وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دُنیا تمھیں تو ہو

د۔ مدینہ مسکن جنابِ فخرِ موجودات علیہ افضل التحیات و اکمل التسلیمات ہے۔ اس شہرِ رحمت کا سابقہ نام یثرب تھا، جس کی اصل کا مفہوم ملامت کرنا اور گناہ پر عار دلانا ہے۔ لسان العرب میں ہے: **وردی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ نھی ان یقال للمدینہ یثرب و سماھا طیبہ کانہ کرہ الثرب لانہ فساد فی کلا العرب** حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخِ مدینہ میں اس کی مبسوط او

رجا مع تحقیق فرمائی ہے، ہم اس کی عبارت من وعن درج کیے دیتے ہیں:

> امام بخاریؒ کی تاریخ میں ایک حدیث آئی ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ یثرب کہے تو اس کو لازم ہے کہ اس کی تلافی اور تدراک میں دس مرتبہ مدینہ کہے اور امام احمد ابویعلی نے روایت کیا ہے کہ اگر کوئی شخص مدینہ کو یثرب کہے تو چاہیے کہ جنابِ باری تعالیٰ میں استغفار کرے، اس کا نام طابہ ہے انھی روایات کی مثل دوسری بھی آئی ہے۔ لفظ یثرب سے کراہت کی وجہ اس کا مشتق ہونا ثرب کی وجہ سے ہے تثریب سے، جس کے معنی مؤاخذ اور عذاب کے ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ یثرب ایک کافر کا نام بھی ہے۔ لہٰذا اس کے نام پر اس مقام شریف کا نام رکھنا، جس کی عزت غبار شرک اور کفر سے پاک و بری ہو، کسی طرح مناسب نہیں ہے اور جو کہ قرآنِ مجید میں آیا ہے: **یااھل یثرب لامقام لکم** بعض منافقوں کی زبان سے ہے کہ مدینہ منورہ کا نام اس نام سے رکھ کر دادِ نفاق دیتے تھے اور بعض احادیث میں بھی مدینہ منورہ کا نام یثرب آیا ہے۔ اس کے لیے علما کہتے ہیں کہ یہ ممانعت سے پیش تر کا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی تحقیق نہایت گراں بہا اور وقیع ہے۔ اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ فارسی و اُردو کے اکثر اساتذۂ سخن جنھوں نے اپنے کلام میں یثرب استعمال کیا ہے اس معاملے میں سہو واقع ہوا ہے۔ ہمیں ان کی نیت پر ادنیٰ درجے کا اشتباہ بھی نہیں، ان کی مراد مدینۃ الرسول ہی تھی۔ بہر حال اس لفظ کے استعمال سے احتراز واجب ہے اور جدید نسل کے نعت گو شعرا اس سلسلے میں حزم واحتیاط لازم ہے۔

و۔ بعض نعت گو حضرات اپنے کلام میں اس قسم کا مضمون بھی باندھتے ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ہم آفت زدگانِ عالم کی مسیحائی کریں یا آپ سے میرے مسیحا کے انداز میں التجا کرتے ہیں۔ یہ مضمون بندی اور ترکیب سازی لاعلمی کی غماز اور سوئے ادب پر منتج ہے۔ معانی و بیانی کا ادنیٰ ذوق رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے کہ مشبہ بہ کو مشبہ سے ارفع و اعلیٰ ہونا چاہیے اور جناب رسالت مآب ﷺ تمام انبیائے سلف علیہم السلام کے پیشوا مقتدا ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ التماس کرنا کہ آپ ہماری

مسیحائی کریں، آپ کے مقام و مرتبہ کو شانِ عیسوی کے مترادف قرار دینے کو مستلزم ہے اور یہ آپ کی عظمت و شان کے منافی ہے۔

عصرِ حاضر میں نعتیہ قصائد کی جانب بھی طبائع کا رُجحان ہے، یہ واقعی بڑی سعادت مندی ہے کہ نعت گو اپنے تسلسل کو ارادتِ باطن سے ہم آہنگ کرتے ہوئے سیرتِ نبوی کے مضامین بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ یوں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات سے محبت اور آپ کی اتباع کے پاکیزہ جذبات مربوط فکر کے تحت اُبھرتے اور افکار و اعمال کی کشت زار کو سیراب کرتے ہیں، فارسی و اُردو ادب میں قصیدہ غزل کا توام ہے۔ شعرا نے غزل لکھی تو قصائد بھی کہے، غزل لالہ و گل کی داستان ہے تو قصیدہ گلستان کا سراپا ہے۔ قصیدہ ایک بھرپور مجموعی تأثر کا حامل ہے اور اس کی روایت نے اسے تشبیب، گریز، مدح اور دُعائیہ حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ متقدمین و متاخرین اس روایت کے انحراف سے اکثر ادبا کرتے ہیں۔ قصیدے کے آغاز میں متغزلانہ مضامین کا رطب و یابس شاعر کو ناگزیر محسوس ہوتا ہے، جس کے بعد وہ ممدوح کی شان میں اظہارِ خیال کے لیے سرگرم سخن ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اکابرِ فن نے تشبیب کو پابندیِ روایت کے طور پر اختیار کیا اور متوسلین نے اس کا سہارا لے کر قصیدہ نگاری کی تو بے جا نہ ہوگا، اکثر اساتذۂ سخن نے اس روایت پر ضرب کاری لگاتے ہوئے اسے توڑا بھی ہے متنبّی کا ایک قصیدہ ہے، جو سیف الدولہ کی مدح میں ہے، تشبیب پر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

اذا کان محد فالنسیب القمدم

اکل فسیح قال شعرا متیم

فارسی شاعری میں حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی عظمتِ کردار اور قادر الکلامی مسلم ہے۔ انھوں نے اتابکان فارس کی شان میں قصائد لکھے ہیں، لیکن اکثر و بیش تر قصائد کے آغاز میں مدح سے پہلے بے ثباتیِ عالم، کسبِ خیر، غم خواری خلق کے مضامین کے ساتھ متصوفانہ خیالات کو نظم کیا اور ممدوح کی ثنا معدودے چند اشعار سے متجاوز نہیں۔ یہی انداز عرفی شیرازی کا ہے، اس کا معرکۃ الآرا قصیدہ عبدالرحیم خان خاناں کی مدح میں ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

ز خود گریدہ بربندی چہ گویم کام جاں بینی
ہماں کز اشتیاق دیدنش زادی ، ہماری بینی

یہ قصیدہ معارف ربانیہ کا بحر ذخّار ہے۔ سبحان اللہ! کیا لطافتِ آفرینی اور کیا نادر کاری ہے، اس قصیدے کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ پروردگارِ عالم نے انسانی فکر کو کس قدر رفعتوں اور

عظمتوں سے نوازا ہے، متاخرین قصیدہ نگاروں میں مرزا غالب کا روایت سے اعتصام خاصا شدید ہے۔ یہ ادب کے ان شہ پاروں کا ذکر ہے، جو شاہانِ عالم کی شان میں مرقوم ہے، نعتیہ قصائد کا آہنگ ان کی ہیئت اور مجموعی حیثیت اس سے پاکیزہ تر اسلوب اور لطیف تر انداز کی متقاضی ہے۔

محسن کاکوروی نے متعدد نعتیہ قصائد لکھے ہیں، اس نے نعتیہ مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ اس کی صداقت جذبہ، محاسنِ سخن پر دسترس اور اخلاص مندی مسلم ہے۔ نعت میں اس کا ''قصیدہ لامیہ'' خاصا معروف ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب میں کاشی و متھرا، گنگا جمنا، سری کرشن، گوپی اور ہندوانہ رسوم کا بیان ہے۔ محامدِ نبویہ کے آغاز میں یہ تذکرہ طاغوت موضوعِ تنقید رہا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اُردو کی نعتیہ شاعری کے مقدمے میں اس موضوع پر وقیع خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس ضمن میں امیر احمد مینائی کا تبصرہ درج کیا ہے۔ یہ اقتباس اُردو کی نعتیہ شاعری سے بلاکم و کاست نقل کیا جاتا ہے۔

''بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ قصیدۂ نعت میں متھرا، گوکل و کنہیا کا ذکر بے محل ہے، لہٰذا دفع دخل کیا جاتا ہے کہ قصیدۂ نعت میں تشبیب کے معنی ہیں ذکرِ ایامِ شباب کرنا اور اصطلاحِ شعر میں مضامینِ عشقیہ کا بیان کرنا۔ اساتذہ نے تخصیصِ مضامین عاشقانہ کی قید بھی نہیں رکھی۔ کوئی شکایتِ زمانہ کرتا ہے۔ کوئی متفرق مضامین کی غزل لکھتا ہے۔ کوئی غزل میں کس طرح کا خاص تلازم ملحوظ رکھتا ہے۔ الغرض متبعان کلام اساتذہ حقیقت شناساں تشبیب و قصیدہ پر پوشیدہ نہیں کہ مضامین تشبیب کے محور نہیں ہے اور نہ کچھ مناسبت کی قید ہے کہ حمد و نعت و منقبت میں قصیدہ و تشبیب میں بھی اس کی رعایت ہے میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی نے منقبت میں قصیدہ لکھا، جس کا مطلع ہے:

صبح کہ در ہوائے پرستاری وثن
جنبد کلید جمکدہ در دست برہمن

اور اس قصیدے کی تشبیب میں بھی ایسے ہی مضامین لکھے ہیں۔ عمدہ تر سند اس کے جواز کی یہ ہے کہ حضرت سرورِ کائنات خواجہ ہر دو عالم ﷺ نے زبانِ مبارک سے اس کی تحسین فرمائی۔

اگر نعتیہ قصائد میں شاعر کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنے ماحول کے روابط، نظریاتی مزعومات اور تہذیبی روایات کو آغازِ سخن میں بے دریغ استعمال کرے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مارو تھل کا نعت گو سسی پنوں کی داستانِ معاشقہ اور اس کے متعلقات کو تشبیب میں جگہ دے گا، سوہنی مہیوال کے خطے سے مانوس شاعر تلاطمِ دریا اور شب ہائے تیرہ و تار کا ذکر نعتیہ قصائد کی تشبیب میں لابدی سمجھے گا، یوں شاعر اور اس کے علاقائی مناسبات کی نمایاں حیثیت مضامین نعت

کے ساتھ بہ رنگ ایطا مشہود ہوگئی، جب کہ نعت کی عظمت و توقیر کا تقاضا تو یہ ہے کہ انتفائے متفرقات سے وحدت خیال کا اثبات رونما ہوا اور مضمون و اسلوب کا چشمہ حجازی فکر سے پھوٹے۔
علامہ یوسف نبہانی نے المجموعہ النبہانیہ فی المدائح النبویہ کے دیباچے میں نعتیہ قصائد کی تشبیب پر اس طرح اظہارِ خیال فرمایا ہے:

یستحسن لمن یمدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یشبب بذکر الدیار الحجازیہ ومعالمها وحب سکانها والشوق الیهم والبکاء ووصف النیاق والسیر والمنهل ووصف السحاب والبرق والریح التی تجی من نحو دهم و الدعاء بالسلامه ولدیارهم بالعمران والسقیا وما اشبیه ذلک.

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ثناگر کے لیے یہی مستحسن ہے کہ وہ تشبیبِ قصیدہ میں دیارِ حجاز، اس کے مقامات، ساکنانِ حجاز کی محبت، اس سے اشتیاقِ ملاقات کا ذکر باچشمِ نم کرے۔ سواریوں، سیر اور چشموں کی تعریف کرے، ابر و برق اور سرزمینِ حجاز سے آنے والے جھونکوں کو سراہے۔ ان کے برقرار رہنے کی دُعا مانگے، دیارِ مقدس کی آبادی و شادابی کا خواست گار رہے اور اس قسم کے دوسرے امور کا تذکرہ چھیڑے۔

کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کا قصیدہ ''بانت سعاد'' انسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ چونتیس اشعار میں سعاد کی جدائی، اس کی عہد شکنی، اونٹنی کے قدوقامت، اس کی نسل، تیز رفتاری اور صحرا پیائی کا بھرپور تذکرہ ہے۔ اس کے بعد روئے سخن گریز کی طرف اور چالیس ویں شعر میں حضوریِ بارگاہِ رسالت کا انداز اس نہج پر ہے۔

فقد اتیت رسول اللہ معتذرا
والعذر عند رسول اللہ مقبول

پس میں خود بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں معذرت خواہ کی حیثیت سے حاضر ہوگیا اور معذرت تو آپ کے ہاں (ہمیشہ) مقبول رہی ہے۔

اس قصیدے کی تشبیب پر علامہ نبہانی علیہ الرحمۃ کا تبصرہ قابلِ ہزار تحسین و آفرین ہے:

اما قصیدة بانت سعاد التی انخذها دلیلا بعض من سلک المسلک واستحسنه وهو فی نفسه غیر حسن فهی لا نصلح دلیلا لذالک لان ناظمها کعب بن زهیر رضی اللہ عنه کل قبل

اسلامه شاعرا جاهليتا فنظمها على طريقتهم قبل ان اجتمع بالنبى صلى الله عليه وسلم على يديه ويعرف اداب السلام......
ويدل على ماقلته انه وضے رآ وعنه لم يحصل منه مثل هذا التشبيب بعد اسلامه ولا من احد من شعراء النبى صلى الله عليه وسلم كحسان وعبدالله بن رواحة كوعب بن ملك و غيرهم من شعراء الصحابه رضى الله عنهم فى مقدمه شعر مدحوابه النبى صلى الله عليه وسلم الا مع قرب عدهم فى الجاهليته وعوائدها اما بعد ذالك فلم يروعن احدمنهم شيى من هذا القبيل و كيف يكون وهم او فر الناس عقولا واعظم الناس دبامع الله ورسوله۔

ترجمہ: لیکن جو حضرات اس مسلک (جوازِ تشبیب) پر چلے اور اسے پسند کیا، (درآں حالاں کہ) وہ فی نفسہٖ پسندیدہ نہیں، انھوں نے قصیدہ بانت سعاد سے استدلال کیا۔ ان کی یہ دلیل اس اعتبار سے نادرست ہے کہ اس قصیدے کے ناظم حضرت کعبؓ بن زہیر اسلام لانے سے پہلے دورِ جاہلیت کے شاعر تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے قصیدے کو بارگاہِ اقدس میں حاضری قبولِ اسلام اور آگاہی آدابِ اسلام سے پیش تر اسی دور کے شعرا کی نہج پر نظم کیا— اور یہ امر میرے قول پر دال ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کے ہاں اس قسم کی کوئی تشبیب نہیں ملتی۔ شعرائے عہد نبوی مثلاً حسانؓ بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ، کعبؓ بن مالک اور دیگر شعرا صحابہؓ نے جو قصائد آپ کی شانِ اقدس میں لکھے ہیں، ان کے آغاز میں بھی اس قبیل کی کوئی چیز مروی نہیں باوصف یہ کہ ان کا عہد جاہلیت اور اس کے اطوار کے قریب تھا اور ایسا ہوتا بھی کیوں کر کہ وہ لوگوں سے بڑھ کر دانش مند تھے اور خدا و رسول کے آداب کی بجا آوری میں دوسرے انسانوں کی نسبت عظیم تر تھے۔

ان اشکالات کو رفع کرنے کے بعد ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے علامہ نبہانی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ مجھے ان شعرا کے قصائد کو، جن کے آغاز میں مضامینِ تشبیب تھے، اپنے مجموعے میں شامل کرنا بے حد ناگوار محسوس ہوا، دراصل میں اس مقامِ ملامت میں ان کا شریک و سہیم بننا نہیں چاہتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ ان پر شاعرانہ صنعت گری کا غلبہ ہوا، اس میں ان کا سوئے ارادہ اور فسادِ نیت شامل نہیں۔ لہٰذا میں نے ارادۂ سابقہ سے رجوع کیا اور ان کے کلام کو شاملِ مجموعہ کر

لیا۔ اس شمول میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نبہانی کی ارادت باطن اور اخلاص مندی ملاحظہ فرمائیں:

و ادخلتها فی هذه المجموعته کغیرها راجیا من الله تعالیٰ ثم من النبی صلی الله علیه وسلم العفو عنی وعنهم والقبول منی ومنهم.

ترجمہ: اور میں نے حامل تشبیہ قصائد کو بھی دوسرے قصائد کی طرح اس مجموعے میں شامل کر دیا، اللہ تعالیٰ کی جناب اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ سے اپنے اور ان کے لیے عفو و قبول کا امیدوار ہوں۔

بہر حال شعرا پر اس امر کا التزام واجب ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت و شان، بارگاہِ نبوی کے آداب اور نعت کے مثالی مقتضیات کو ہر آن پیشِ نظر رکھیں۔ ہر اس قسم کے تذکرے سے احتراز کریں، جو شارع علیہ السلام کے پسندِ خاطر نہ ہو، فرضی محبوب کے خد و خال، رخسار و گیسو، ناز و انداز، شراب و شاہد و مینا و ساغر اور خمریات کو منظوم نہ کرے کہ ان مضامین کے جامع اظہار کے لیے غزل ایک علیحدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے موجود ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کی بارگاہِ اقدس و لازوال مرکزِ عنایات ہے، جس سے حسن دل ربائی کا طلب گار ہے، عشق فدا کاری کا خواست گار ہے اور خرد گویائی کی خیرات مانگتی ہے۔ جہان نیاز سرفراز ہے، وارفتگی دم بہ خود ہے اور جنون ساکت و مدہوش ہے۔ اب خدا لگتی کہیے کیا مشرکانہ رسوم کا ذکر گوپیوں کے اطوار کا تذکرہ اور سلسلہ طاغوت کا طومار، محامدِ نبویہ کے بیان میں حضورِ ختمی مرتبت ﷺ کی خوش نودی و رضا کا موجب ہو سکتا ہے یا اس سے مقاماتِ سیرت نبوی کے ابلاغ کا کوئی پہلو نکلتا ہے۔ اکابرینِ سخن نے شعور اور لاشعوری طور پر بہ پاسِ آدابِ نبویہ اس قسم کے ترہات سے اجتناب کیا ہے فارسی کے مشہور شاعر خاقانی کے نعتیہ قصائد کے آغاز میں معارفِ ربانیہ منظوم ہیں، جن کے بعد نعتیہ مضامین کا سلسلہ بے پناہ عقیدت و ارادت سے لبریز ہے اور لوامع اسوۂ مبارکہ ایمان افروزی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے ایک قصیدے کا مطلع ہے:

اے پنج نوبہ کوفتہ در وار ملک لا
لا در چہار بالش وحدت کشد ترا

پھر نعتیہ مضامین کی شان دیکھیے:

چوں نوبت نوبت اورد عرب زوند
از جودی واحد صلوات آمدش صدا

اے ہستہاز ہستی ذات تو عاریت
خاقانی از عطائے تو ہست آیت ثنا

ذکرِ شبِ معراج اس طرح ہے:

روحانیاں مثلث عطری بسو مخند
وز عطر ہا مسدس عالم شدہ ملا

خلفائے راشدین علیہم الرضوان کا ذکرِ پاک نبوت و ولایت کے لطیف رابطے کے ساتھ کس نورانیتِ باطن سے کیا ہے، رحمتِ باری سے بعید نہیں کہ وہ شاعر کو اس شعر کے طفیل سندِ مغفرت عطا کر دے:

ہر چار ، چار حد بنائے پیمبری
ہر چار ، چار عنصر ارواح اولیا

اسی طرح عرفی شیرازی کا شینیہ نعتیہ قصائد میں امتیازی مقام کا حامل ہے، اس کا ابتدائیہ بھی اکثر و بیش تر متصوفانہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے کے دو شعر تبرکاً ہدیۂ قارئین ہیں:

شہنشا ہے کہ فراشان بزم او بہ صد منت
بہ فرق عرش می ریز ند خاک فرش ایوانش
شہنشا ہے کہ ہست از غایت درویشی و ہمت
وجود خود فراموش و غم عالم فرادنش

معارف نگاری او رلطافت آفرینی میں میرزا بیدل کا کوئی حریف نہیں، وہ اس میدان میں یکتا ہے۔ حقائقِ مسلماتِ عالم اس کے آئینۂ قلب پر جلوہ ریز ہیں۔ نعت میں اس کا رائیہ اوّل سے آخر تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس کی والہانہ وابستگی اور لازوال عقیدت کا عظیم شاہکار ہے، کوئی شعر اور کوئی ترکیب آدابِ نبویہ سے معارض نہیں۔ نعت میں یہی مثالِ اسلوبِ نظم ہے، جو قابلِ تقلید ہے اور نونہالانِ نسلِ جدید سے اس کی اقتدا کا التماس ہے۔

پروفیسر انوار احمد زئی

نعت ــــ تفہیمِ کائنات کا استعارہ

شاعری قدرت کی بے کراں نعمتوں کا استحسان ہے تو نعت بجائے خود شعری نعمت کا استحسان ــــ گویا نعت فکرِ انسانی کی حدِ رسا کا پیمانہ ہے اور یوں نعت استعارہ ہے تفہیمِ کائنات کے مقدور بھر میزانیے کا۔ جس طرح بامقصد اور بامراد شاعری زندگی کو مربوط، مضبوط، منظّم، آراستہ، مرصع، شائستہ اور مہذب بنانے کا وسیلہ اور واسطہ ہے، اسی طرح اس کی مقصدیت میں تخلیقِ کائنات اور وجہِ تخلیقِ کائنات کے آداب و انداز کی آدرش و آگہی نعت کے توسل و توسط کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے نعت، جواب باقاعدہ صنفِ سخن کی صورت ادبِ عالیہ میں اپنا درجۂ شایانِ شان رکھتی ہے، متقاضی ہے خود اپنی تفہیم کی۔ بظاہر یہ منزل، اسرار و رموز اور تشریح و تفسیر کا تقاضا کرتی ہے مگر جن کے دلوں میں سرور کے ساتھ سرودِ سرمدی نے فضائے عطر و عنبر بیز سجالی ہو ان کے لیے یہ سمجھنا کہاں مشکل ہے کہ زندگی کی ظاہر ظہوری، زیبائش، سجاوٹ، شاعری سے ہے اور اندرون کی جلا، بقا اور منور و روشن فضا، نعت سے مشروط ہے۔ سو نعت گدازِ ذات کا اشارہ ہے اور مدحتِ ختمی مرتبت ﷺ کا حوالہ ہے۔

بات حوالے کی آئی ہے تو اس اصطلاح کی شانِ نزول اور اس صنف کا ورود و ظہور، سرمدی سفر ہی کی طرف گام زن لگتا ہے۔ ن۔ع۔ت، عربی زبان کا مادّہ ہے۔ لغت میں اس کے معنی ہیں، ''اچھی اور قابلِ تعریف صفات کا کسی شخص میں پایا جانا اور ان صفات کا بیان کرنا۔'' لغت کے اعتبار سے جب اس لفظ کو استعمال کیا جاتا تو کہا جاتا کہ ''نَعَتَ الرَّجُلُ''، یعنی اس آدمی میں اخلاق و طبیعت کی بہترین خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص دوسروں سے ممیّز و ممتاز ہوتا تو کہا جاتا ''ھُو نَعْتَۃٌ'' یعنی وہ خوبی میں بہترین ہے۔

عربی زبان میں تعریف و توصیف کے لیے اور بھی بہت سے مصادر مستعمل ہیں، مثلاً حمد، ثنا، مدح وغیرہ، لیکن جب سے اہلِ نظر نے حمد کو خداوندِ قدوس کی تعریف اور نعت کو رسولِ اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا کے لیے مخصوص کیا، یہ دونوں اصطلاحات مدح سے الگ اور قصیدے سے جدا ہوگئیں اور اب نعت، نسبتِ حضورِ والا ﷺ سے متصف ہو کر کاملتاً آپ ہی کے پیکرِ جمال اور اوصافِ جمیل سے مملو ہے، اسی لیے عُرفی نے کمالِ ہنرمندی سے ان اصطلاحوں کی تشریح کر دی ہے:

عرفی شتاب ایں رہِ نعتست نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را
ہُشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

نعت کی تفہیم کے لیے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اس کے لیے صرف شعری پیمانہ لازم نہیں آتا۔ اکابر عشاقانِ رسول ختمی مرتبت ﷺ نے نثر میں بھی نعت کی قندیلیں روشن کی ہیں اور وہ بھی اس جذب و ایقان کے ساتھ کہ معمورۂ فکر و نظر رشکِ ماہتاب و آفتاب ہو ہو گیا۔ علامہ شبلی نعمانی کی ظہورِ قدسی اور سید سلیمان ندوی کے خطبات، نثری نعت کے عرفانی اور غیر فانی حوالے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مدحتِ رسول ﷺ اشارے کنایے، استعارے یا اظہاریے میں بھی ہو تو نعت ہی کہلائے گی۔

اسی طرح شعری نعت گوئی کے لیے بھی واضح پیمانے اور غیر مبہم اصول موجود ہیں۔ صنفِ نعت کے پارکھوں اور شارحین کے نزدیک وہ شعر جس میں ثنائے رسول، صفتِ پیمبر، وصفِ نبی اور مدحتِ افضل البشر موجود ہے، وہ شعر، مجرد نعت ہے اس میں حضور ﷺ کا حلیہ، چہرہ، بشرہ، قد و قامت، نشست و برخاست، آدابِ گفتگو، اندازِ تکلم، پرتوِ تبسم، رفتار و تجمل، ارشاد و ہدایت، پسند و توجہ، افکار و نصائح، قیادت و رسالت، امامت و امانت، دیانت و صداقت، شجاعت و قناعت، گویا جملہ اوصافِ حمیدہ اور کردارِ طیبہ کے آئینے خانے، بہ توفیقِ بیان و اظہار سامنے آئیں یا آتے رہیں تو نعت ہوتی ہے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ نعت کے سرنامے کے تحت اگر درجِ بالا انداز ہائے عاشقانہ کے ساتھ خود اپنے جذبات بہ طرزِ مجنونانہ اور وارفتگانہ آجائیں تو انھیں اشعارِ نعت خفی ہی سمجھیے، نعت جلی اور خفی میں شیفتگی کی کمی نہیں، بلکہ موضوع کی امتیازی صوت و صورت ہے۔

مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ

اس کیفیت کا نام ہے جسے نعت سے نسبت تو ہے مگر یہ مجرد نعت نہیں جب کہ "توئی سلطانِ عالم یا محمد" نعت اور سراسر نعت ہے، زینت یاسیں توئی و زیبائش طٰہٰ توئی...... نعت کی تعریف کے شارح ہیں۔ اسی طرح "کوئی مثل مصطفیٰ کا کبھی تھا، نہ ہے، نہ ہوگا" از کراں تا کراں نعت ہے— گویا

مجرد و نعت جلی اور کیفیات و حکایات و مناجات و واردات کے اشعار کو نعت کے سرنامے کے تحت نعت خفی کے اشارے سمجھیے۔

اس حوالے کو اور گہرائی اور گیرائی میں دیکھنے، سمجھنے اور روح میں اتارنے کی تمنا یا خواہش ہو تو نزول و تنزیل کے اعتبار سے قرآن مجید کی پہلی سورہ کی پہلی آیۂ مبارکہ کے پہلے لفظ ''اقراء'' کی جانب آئیں تو تفہیمِ ذاتِ احد کے ساتھ تفہیمِ نعت کے بھی بے شمار در کھلتے محسوس ہوتے ہیں۔ اقرا کا مطلب ہے، لکھا ہوا پڑھنا اور ایسا کرنے والے کو قاری کہتے ہیں۔ گویا قاری کے لئے متن کا ہونا ضروری ہے۔ مقرر کا متن نہیں ہوتا، مقرر کی تقریر متن بن جاتی ہے۔ اس لیے جب حضرت جبرائیلؑ نے آپ ﷺ سے اقرا کی ادائی چاہی تو حضورِ اکرم ﷺ نے امین و صادق ہونے کے عظیم ترین منصب پر متمکن ہوتے ہوئے اقرا کی ادائی میں تردّد فرمایا، سبب یہ کہ اس ارضِ عارضی پر آپ ﷺ نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا اور ایسا ہوتا بھی کیسے؟ استاد کا درجہ بڑا ہوتا ہے اور آپ ﷺ کا مقام بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ہے۔ مگر پھر کیا ہوا۔ آپ ﷺ نے اقرا پڑھ دیا نہیں — گویا یہ اسرارِ سرمدی سے پردہ اٹھائے جانے کی پہلی دلیل ہے کہ آپ جو معلمِ انسانیت بنا کر بھیجے گئے وہ یہاں کسی سے نہیں پڑھے تھے، مگر خداوندِ قدوس نے انھیں اس وصف سے خود بہرہ مند فرمایا تھا — یہی شانِ نزول ہے کہ آپ ﷺ کے اس وصف کے اظہار ہی سے کلامِ الٰہی شروع ہوتا ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ اقرا کا لفظ بجائے خود حضور ﷺ کے ایک وصف کا اعلان ہے اور اس نسبت سے یہ لفظ نعت ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا حکم دینے والا ربِّ کائنات ہے — نعت کا جب یہ منصب و مقام ہو تو پھر اس کے تقاضے بھی سوا ہو جاتے ہیں۔

اس تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ جو موزوں طبع ہو اور شعر گوئی کی نعمت سے بہرہ مند ہو، وہ کتنا ہی بڑا سخن ور اور سخن داں ہو جائے مگر نعت کہنے کا متحمل تب ہی ہوگا جب وہ اپنے اس وصف کے اظہار سے قبل منزلِ عشق و سرمستی سے گزر جائے۔ عقیدت، محبت، مطالعہ اور پھر وارفتگی کے ساتھ بساطِ علم و آگہی پر وجد و بے قراری غالب نہ آئے تو حقِ نعت گوئی ادا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے نعت کی صنف، دیگر اصنافِ سخن سے بڑی ہے سو اس کا مطالبہ بھی بڑا ہے، نازک ہے اور حسبِ توفیق عطا مقامِ رسا کا آئینہ دار ہے۔

نعت فہمی کی اس پوری کیفیت کا مطالعہ کرنے کے بعد گرہِ فہم و ادراک کھل جائے تو نعت کے نئے معانی اور نادر مقامات کا پتا چلتا ہے، اس لیے اس سوال کے جواب میں کہ نعت کیا ہے، جویانِ ادب کے سامنے دفتر ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں اور سرگوشی کر رہے ہوتے

ہیں کہ نعت فرد اور یکتائی میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ اس لیے سنو، سنو، نعت کیا ہے؟ نعت ہے— آبِ مدحت کے کٹوروں کی تلاش ،آیتوں کی اک صدائے باز گشت،آپ ﷺ کے در پر قلم کی حاضری،اک تہی دامن کا سامانِ سفر،ایک اللہ کی عبادت کا شعور، نورِ احمد مجتبیٰ کا ظہور، گنبدِ خضریٰ کے دامن کی ہوا، تختیِ دل پر سخن کی روشنی،طاقِ ایماں پر چراغِ آ گہی— اسی طرح چلتے چلتے جب منزلِ تحیر و تسکینِ قلب ونظر آجائے تو خود بخود یہ خیال آتا ہے کہ:

کتنا خوش قسمت وہ قلم ہے جس کی آنکھ سے ٹپکے ہیں
حمدِ خدائے پاک کے گوہر، نعتِ رسولِ پاک کے موتی

تاریخ

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

اردو میں نعت گوئی کا ارتقا

اُردو میں نعت گوئی کا فن عربی و فارسی کے زیرِ اثر آگے بڑھا ہے۔ نعت گوئی کی ابتدا یوں تو عربی زبان سے ہوئی ہے۔ عربی زبان نے اپنی دوسری خوبیوں کے ساتھ فارسی شاعری کو نعت گوئی کا فن بھی عطا کیا۔ فارسی زبان نعت گوئی اور مدحِ رسول (ﷺ) میں سب سے زیادہ خوش نصیب اور سرمایہ دار ہے۔ اس موضوع پر جتنا پُرسوز و مؤثر، زندہ و تابندہ، نرم و شیریں اور والہانہ انداز کا کلام فارسی زبان میں ملتا ہے، اتنا کسی اور زبان میں نہیں ملتا، ہاں اس کے بعد اُردو زبان کا نمبر آتا ہے۔ جو خود فارسی ادب کی خوشہ چیں بلکہ ایک لحاظ سے اس کی پیداوار ہے۔

تاریخی حیثیت سے اُردو میں نعت گوئی کی روایت نئی نہیں، بہت پرانی ہے، اتنی ہی پرانی جتنی کہ خود اُردو شاعری۔ قدیم دکنی شعرا سے لے کر آج تک اُردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے خاص شغف اور لگاؤ کے ساتھ کہے ہیں۔ کسی نے محض تکلّفات سے کام لیا ہے، کسی نے تواتر و اہتمام سے اس کام کو انجام دیا ہے اور کسی نے گاہے گاہے طبع آزمائی کی ہے، کسی نے طویل نعتیہ قصیدے اور مثنویاں لکھی ہیں، کسی نے مختصر نعتیہ غزلیں اور رُباعیات کہی ہیں، کسی نے نعتیہ شاعری کے پورے پورے دیوان یادگار چھوڑے ہیں اور کسی کے ہاں اِکاّ دُکاّ نعتیہ غزلیں نظر آتی ہیں۔ کچھ نے اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں اور کچھ اوسط و ادنیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکے، لیکن دو چار شعر قریب قریب ہر ایک نے کہے ہیں۔ مسلسل نہ سہی، متفرق اشعار کی صورت میں سہی۔ اُردو شاعری کی چار سو سالہ تاریخ میں نعتوں کا کتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہوگا، اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہوگا جس نے اُردو شاعری کا تسلسل سے مطالعہ کیا ہے۔ گرچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس ذخیرے کا زیادہ تر حصہ بعض دوسرے موضوعات کی شاعری کی طرح معمولی درجے کا ہے، لیکن ایک حصہ ضرور ایسا ہے جو فکر و فن کے معیار پر پورا

اُترتا ہے اور بلند پایہ شاعری کے زمرے میں آتا ہے۔

اُردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کے ساتھ ہی نعت گوئی کا بھی آغاز ہوا۔ لہٰذا ہر دور کے شعری نمونوں میں نعتیہ اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں بہ قول ڈاکٹر طلحہ رضوی برق:

> اُردو کو دیگر زبانوں کے درمیان یہ اعزاز و افتخار حاصل ہے کہ اپنی پیدائش کے وقت سے ہی یہ مومنہ اور کلمہ گو رہی ہے۔ صوفیائے کرام اور مبلغینِ اسلام کے ہاتھوں دینِ متین کی ترویج و اشاعت کے لیے یہ پروان چڑھی اور شروع سے ہی اس کی توتلی زبان پر حمد و ثنا اور نعتِ رسول مقبول (ﷺ) جاری ہوگئی۔☆[۱]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (م ۸۲۵ھ) کے کچھ اشعار کو اُردو نعت کا اوّلین نمونہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے فخر الدین نظامی کی مثنوی ''کدم راوٗ پدم راوٗ'' (جسے ۸۲۵ھ تا ۸۳۸ھ کی تصنیف تسلیم کیا گیا ہے) میں حمد کے بعد نعتیہ اشعار کو اُردو کا پہلا مستند نمونہ قرار دیا ہے۔☆[۲]

عصرِ حاضر کے ایک محقق اور ناقد ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری نے اپنی کتاب ''اُردو شاعری میں نعت'' (جلد اوّل) نعتیہ شاعری کا تسلسل کے ساتھ تحقیقی مطالعہ پیش کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے:

> اُردو کی سب سے پہلی تصنیف ملاّ داوٗد کی مثنوی ''چندائن'' ہے، جو اُردو زبان کا اوّلین لسانی و ادبی نمونہ ہے۔ ملاّ داوٗد نہ صرف یہ کہ اُردو کے پہلے شاعر ہیں بلکہ وہ اُردو کے پہلے نعت گو بھی ہیں۔ مثنوی چندائن میں شامل نعت کو اُردو کی پہلی نعت ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ملاّ داوٗد نے چندائن ۷۸۱ھ میں بہ عہدِ فیروز شاہ تغلق تصنیف کی تھی۔''☆[۳]

یوں تو نویں صدی ہجری کے مختلف صوفی شعرا کے یہاں نعتیہ اشعار ملتے ہیں جن میں موسیقیت کے ساتھ محبت کی حلاوت اور جذبے کی گرمی بھی ہے۔ اس دور میں خوب محمد چشتی کی مثنوی ''خوب ترنگ'' (تصنیف ۹۸۶ھ میں بھی کچھ نعت کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ اس میں بہ قول ڈاکٹر ریاض مجید، اُردو زبان کی روایت کا نیا رُجحان ملتا ہے۔ یہ رُجحان ہندی پر عربی فارسی

☆۱۔ اُردو کی نعتیہ شاعری، از ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، صفحہ ۵

☆۲۔ اُردو نعت از پروفیسر حفیظ تائب، مطبوعہ نقوش، لاہور، رسول نمبر، جلد دہم، صفحہ ۱۸۴

☆۳۔ اُردو شاعری میں نعت (جلد اوّل) از ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد، صفحہ ۴۱

زبان کے اثرات کا ہے۔☆[۱] نمونہ ملاحظہ ہو:

جو ساری آرسی و حدت جاں
جسم محمد ﷺ اسے پہچان
ایک عکس ماں جو ہوئے
قلب محمد ﷺ کا ہے سونے
ایک عکس پھر ایک عکس جو پائے
یہی ابو الارواح کہلائے
مثل محمد ﷺ ہوئے نہ کوئے
سب اس کی تفصیل سے ہوئے

واقعہ یہ ہے یہ گیارہویں صدی ہجری سے اُردو کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے اور اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ (م ۱۰۲۰ھ) نے نعت کی مستقل حیثیت متعین کی۔ محمد قلی شاہ کو رسالت مآب ﷺ سے والہانہ عقیدت تھی۔ اور اس کے عہد میں ہر سال جشنِ میلاد النبی منایا جاتا تھا، خود قلی قطب شاہ کا نعت سے شغف کا یہ عالم تھا کہ بیشتر غزلوں کے مقطع بھی نعتیہ ملتے ہیں اور پانچ باقاعدہ نعتیہ غزلیں بھی ہیں، ایک غزل کا مطلع دیکھیے:

چاند سورج روشنی پایا تمھارے نور تھے
آبِ کوثر کو شرف ٹھڈی کے پانی پور تھے

اس صدی میں زیادہ تر مثنوی میں نعتیہ اشعار لکھنے کا رُجحان بڑھتا گیا، ملاّ وجہی کی مثنوی ''قلب مشتری'' (۱۰۱۸ھ) غواصی کی دو مثنویاں ''سیف الملوک'' (۱۰۳۵ھ) اور ''طوطی نامہ'' (۱۰۴۹ھ)، ابنِ نشاطی کی مثنوی ''پھول بند'' (۱۰۷۶ھ) اور نصرتی کی مثنوی ''علی نامہ'' (۱۰۷۶ھ) اور ''گلشنِ عشق'' میں نعتیہ اشعار ملتے ہیں۔ اسی دور میں ان نعتیہ مثنویوں کے علاوہ مولود نامے، معراج نامے اور وفات نامے کے ساتھ ساتھ منظوم سیرت نگاری کا بھی سلسلہ جاری ہوا۔ اس تمام نعتیہ کلام میں اسی دور کی فنی خوبیوں اور شاعرانہ حسن کے ساتھ جذب و شوق اور والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

بارہویں صدی ہجری اُردو شاعری کے امام ولؔی دکنی (م ۱۱۱۹ھ) سے شروع ہوتی ہے۔ جس طرح ولؔی نے اُردو کے نئے شعری روایات کی بنیاد رکھی، اس طرح ولؔی کے نعتیہ اشعار بھی اُردو

☆۱۔ اُردو نعت، از ڈاکٹر ریاض مجیب، صفحہ ۱۳۵

نعت کے ارتقائی سفر میں نئی منزل اور نئے رنگ و آہنگ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ولؔی کا نعتیہ سرمایہ ان کی غزلوں اور قصیدوں سے لے کر رباعیوں، مخمس، مستزاد پر مشتمل ہے۔ جو ان کے مخصوص رنگ ریختہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ ولؔی کے دیوان میں ایک قصیدہ نعتِ رسول ﷺ پر ہے۔ نعتیہ قصیدے کے ابتدائی رنگ جاننے کے لیے ولؔی کے اس نعتیہ قصیدے کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عشق میں لازم ہے اوّل ذات کوں فانی کرے
ہو فنا فی اللہ دائم یادِ یزدانی کرے

یا محمد ﷺ دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں
خلق کوں لازم ہے جی کوں تجھ پہ قربانی کرے

جس مکاں میں ہے تمھاری فکرِ روشن جلوہ گر
عقلِ اوّل آکے واں اقرارِ نادانی کرے

عارفاں بولیں گے جان و دل سوں لاکھوں آفریں
جب ولؔی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

آخری کے دو شعر کتنے پھڑکتے ہوئے ہیں اور ان میں نعت کا حسن، رسول ﷺ کے فکرِ روشن کے ساتھ جلوہ گر ہے اور ولؔی کی اس نعتیہ گوہر افشانی سے ہر عارف عاشقِ رسول کے دل سے آفریں کی صدا نکل رہی ہے۔

ولؔی کے دور میں قاضی محمود بحری (م ۱۱۳۰ھ)، سیّد محمد فراقی (م ۱۱۴۴ھ) جیسے شعرا بھی ملتے ہیں جو تادمِ آخر نعت لکھتے رہے اور ان کے نعتیہ اشعار بھی اپنا معیارِ فکر و فن رکھتے ہیں۔

اسی بارہویں صدی میں مرزا محمد رفیع سوؔدا (م ۱۱۹۵ھ) کا نام آتا ہے، جو شمالی ہند کے شاعروں میں پہلا ممتاز شاعر ہے۔ ولؔی سے سوؔدا تک کا فاصلہ اُردو شاہراہِ ادب پر نشانِ منزل کا حکم رکھتا ہے، اس شعری و ادبی فاصلے کے درمیان زبان و بیان کی جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا اظہار مجموعی طور پر سوؔدا کے نعتیہ قصیدے میں بہ درجۂ اتم نمایاں ہیں اور بہ قول ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ:

"اس کے قصیدے کو شمالی ہند میں اُردو کی باضابطہ نعتیہ شاعری کا ابتدائی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔"[☆۱]

قصیدے کی تشبیب کو اخلاقی مضامین سے سنوار کر نعت کی تمہید کو مدح سے ہم آہنگ کر کے گریز کی صورت بھی نہایت خوب ہے یعنی اس میں مجازی سے بیزاری کا اظہار ہے اور اس کفر کو دل سے نکال کر دینِ محمدی میں داخل ہونے کی تلقین ہے:

☆۱۔ اُردو کی نعتیہ شاعری، از ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، صفحہ ۳۴

نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیفِ مسلمانی

اس کے بعد دینِ محمدی کی تعریف کے ساتھ نعت کا خصوصی مضمون شروع ہو جاتا ہے۔☆۱

رہے دین محمد ﷺ پیروی میں اس کی جو ہووے
رہے خاکِ قدم سے اس کی چشمِ عرشِ نورانی
ملک سجدہ نہ کرتے عالمِ خاکی کو گر اس کی
امانت دار نور احمدی ہوتی نہ پیشانی

اُردو شاعری کا مرکز، تیرھویں صدی ہجری میں شمالی ہند میں بن چکا تھا۔ اس دور میں مشاہیر شعرا میں سے قریب قریب سبھی نے نعت کہنے کی سعادت حاصل کی۔ میر تقی میر (م ۱۲۲۵ھ) جیسے غزل گو شاعر نے بھی حصولِ برکت کی خاطر نعت کہی جو غزل کی ہیئت میں ہے دو شعر ملاحظہ ہوں:

جلوہ نہیں ہے نظم میں حسنِ قبول کا
دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسول ﷺ کا
دھو منہ ہزار پانی سے سو بار پڑھ درود
تب نام لے تو اس چمنستاں کے پھول کا

ویسے اس صدی کے وسط تک کسی شاعر نے بھی باضابطہ نعت گوئی کو اپنا شعار نہیں بنایا لیکن اِکاّ دُکاّ نعتیہ اشعار ہر کسی نے کہے ہیں، میر کے علاوہ اسمٰعیل شہید دہلوی (م ۱۲۴۶ھ) کی مثنوی ''سلک نور''، کرامت علی شہیدیؔ (م ۱۲۵۶ھ) کا ''قصیدہ عزا'' اور مومن دہلوی (م ۱۲۸۶ھ) نے قصیدے میں نعتیہ اشعار لکھے ہیں۔ کرامت علی شہیدی کے قصیدے کا ایک شعر ہے:

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

شہیدی کی یہ تمنا پوری ہوئی اور حج بیت اللہ کے بعد مدینہ طیبہ کی حاضری کے لیے راستے میں بیمار ہوئے اور جب روضۂ رسول ﷺ سامنے نظر آنے لگا تو جان، جان آفریں کے سپرد کر دیں۔ شہیدی کا یہ قصیدہ بے حد مقبول ہوا۔ اسی طرح مومنؔ کے قصیدے میں علمی شان اور تخیل کی بلندی کے ساتھ ساتھ روحِ عصر بھی پائی جاتی ہے:

☆۱۔ اُردو میں نعتیہ شاعری، از ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق، صفحہ ۸۳

چمن میں نغمہ بلبل ہے جو طرب مانوس
کہ جیسے صبح شب ہجرِ نالاں ہائے خروس
جو شمع بزم کہوں اس کے روئے تاباں کو
کناں و ماہ بنے نورِ شعلہ و فانوس
وہ کون؟ احمد مرسل شفیع ہر دوسرا
جو خلق کا سبب اور باعث معاد نفوس
جہاں متاع شہنشاہ آفتاب نشاں
فلک سریر ، قمر طلعت ، ملک ناموس

اس دور میں نعتیہ شعر کہنے کی رسم غالبؔ (م ۱۲۸۵ھ) جیسے رند قدح خوار نے بھی نبھائی:

منظور تھی یہ شکل ، تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ، ترے قد و رُخ سے ظہور کی
اس اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کچھ کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبد بے در کھلا

تیرہویں صدی کے ان تمام شعرا کے یہاں گو نعت باضابطہ فن کی صورت نہ اختیار کر سکی تھی لیکن ان کے نعتیہ اشعار خواہ وہ کسی ہیئت میں ہوں، اپنی فنی قدر و قیمت میں کسی طرح کم نہیں، لیکن رفتہ رفتہ تیرہویں صدی کے اواخر میں اُردو نعت نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی اور اس کو باضابطہ فن بنانے میں مولانا کفایت علی کافیؔ اور مولانا غلام امام شہیدؔ کا نام نمایاں ہے۔ مولانا کفایت علی کافیؔ مراد آباد کے برگزیدہ علما میں تھے، ان کی تمام تر شاعری نعت و منقبت کے لیے وقف رہی۔ آپ نے تحریکِ آزادیِ ہند میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا اور اس کی پاداش میں گرفتار ہوئے، پھانسی کا حکم ہوا، قتل گاہ کی طرف جاتے ہوئے یہ نعتیہ اشعار ان کی زبان پر تھے:

کوئی گل باقی رہے گا ، نہ چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اُڑ جائیں گی ، سونا چمن رہ جائے گا
سب فنا ہو جائیں گے کافیؔ ولیکن حشر تک
نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

مولانا کافی کی شہادت ۱۲۷۴ھ میں ہوئی اور آپ کا لہو نعت کی روایت کو رنگین بنا گیا۔

اسی دور میں مولانا غلام امام شہید (م ۱۲۹۶ھ) نے اپنی تمام شاعرانہ تخلیقی قوتوں کو نعت گوئی کے لیے وقف کر دیا، بہ قول ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق ایک عرصے کی رسمی شاعری کے بعد ہم پہلی مرتبہ ایک نعت گو شاعر کو اس اجتہادی اور انفرادی رنگ کے ساتھ بزمِ سخن میں جلوہ گر پاتے ہیں، جس نے نعتِ رسول ﷺ کی لے ہی بدل دی اور آنے والوں کے لیے ایسا نمونہ چھوڑا کہ جس کی تقلید میں اُردو نعتیہ ادب نئے مضامین اور دل آویز طرزِ بیان سے مالا مال ہوگیا۔ مولانا شہید کے نعتیہ کلام میں قصیدہ، مثنوی، غزل سبھی اصناف ملتی ہیں، ایک نعتیہ غزل کے چند اشعار بہ طورِ نمونہ درج ہیں:

مداح ہوں جناب رسالت پناہ کا
عرشِ بریں پہ گوشہ ہے میری کلاہ کا
بے اس کے حکم کے نہ چلے لوح پر قلم
مالک ہے وہ تمام سپید و سیاہ کا
در پیش ہے عدم کا سفر سب کو دوستو
جو نعت کا کلام ہے توشہ ہے راہ کا
پیغمبروں کا شاہد عادل ہے وہ شہیدؔ
کیا مرتبہ ہے نام خدا اس گواہ کا

حافظ لطف علی خاں لطفؔ بریلوی (م ۱۲۹۸ھ) غزل میں نعت گوئی کی روایت کے سب سے بڑے شاعر ہیں، بہ قول حفیظ تائب: ''انھوں نے غزل کو نعت کے لیے مخصوص کر کے نعت گوئی کے وسیع امکانات دریافت کیے اور اپنے فکر وفن کو نعتیہ غزل کے لیے وقف رکھا۔'' لطفؔ بریلوی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے مسلسل تخلیقی عمل سے شغفِ نعت کا اظہار کیا ہے، ان کا یہ رویہ نعت کو مستقل فن بنانے کی پہلی شعوری کوشش رہی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وصف لکھتا ہوں نبی ﷺ کے حسن عالم گیر کا
کیوں نہ شہروں شہروں شہرہ ہو میری تحریر کا

اے لطفؔ نعت گوئی میں یہ مرتبہ ہوا
مجھ کو حصولِ عشقِ حبیبِ خدا ہوا

لطفؔ الطاف خدا خدا ہے جس شاعر پر
بہ خدا ہے وہی مداح پیمبر ﷺ ہوتا

ہم سر نہ آستانِ نبی سے اُٹھائیں گے
سو گردشیں ہوں چرخ کی لاکھ انقلاب ہو

کافیؔ، شہیدؔ اور لطف نے اُردو نعت کو جہاں ایک مستقل فن کی صورت دی وہاں ان کی شاعرانہ بصیرت اور حسنِ ادا نے نعتِ رسول مقبول ﷺ کا انداز ہی بدل دیا اور اس طرح اُردو کی نعتیہ شاعری اپنے فکرِ تازہ اور حسنِ بیان سے مالا مال ہو کر عروجِ کمال تک پہنچی۔

نعت گوئی کے دورِ تشکیل کی یہی روایت امیر مینائیؔ اور محسن کاکورویؔ تک پہنچ کر تکمیلِ فن کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ امیر مینائیؔ نے نعت کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن میں بھی شاعری کی مگر محسن کاکورویؔ تمام تر نعت گوئی سے وابستہ رہے، اس طرح نعت گوئی نے اپنے کمالِ فن کے ساتھ اُردو شاعری میں اپنا نیا معیار و وقار بنایا۔

امیر مینائیؔ (م ۱۳۱۸ھ) ایک مذہبی صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، نعت گوئی سے ان کو فطری مناسبت تھی اور سازگار طبیعت پائی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب ہنگامے سے متاثر ہو کر جب وہ کاکوروی میں پناہ گزیں ہوئے تو ان کی ملاقات محسن کاکوروی سے ہوئی ان کی صحبت کا امیر مینائی کی شاعری پر خاصا اثر پڑا، خصوصاً نعت گوئی کے رُجحان میں اضافہ ہوا اور نعت سے متعلق کئی تصنیفات منظرِ عام پر آئیں۔ امیر مینائی نے اپنی نعتیہ غزلوں میں تغزل کے باوجود شریعت کا پاس ولحاظ اور دریائے عشق کے تموج میں ادب واحترام کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

موت ہے سر پر کھڑی یا رحمۃ للعالمین
ہے مصیبت کی گھڑی یا رحمۃ للعالمین
خلق تڑپی جاتی ہے کھیتی ہوئی جاتی ہے خشک
ابرِ رحمت کی جھڑی یا رحمۃ للعالمین

محسن کاکورویؔ (م ۱۳۲۲ھ) وہ شاعر ہیں جن کی سعیِ دل پذیر کی بہ دولت اُردو نعت کو ادبِ عالیہ میں شمار کیا گیا۔ بچپن ہی سے شعر وسخن کا شوق تھا اور عشقِ رسول ﷺ غالب تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نو سال کی عمر میں خواب میں زیارتِ رسول ﷺ سے مشرف ہوئے۔ اور اسی خواب سے محسن کی نعتیہ شاعری کا آغاز ہوا، ''کلیاتِ محسن'' جو تمام تر نعتوں پر مشتمل قصیدے، مثنویاں،

مسدس، رُباعیات اور غزلیں تمام ہی ہئیتوں میں نعتیں کہی ہیں۔ محسن کاکوروی کا مشہور قصیدہ لامیہ ''مدیح خیر المرسلین ﷺ'' کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس بے مثال قصیدے کے چند اشعار بہ طورِ نمونہ درج ہیں:

گلِ خوش رنگ رسول مدنی و عربی
زیب دامانِ ابد ، طرہ و ستار ازل
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہم سر نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مماثل ، نہ مقابل ، نہ بدل
اوج رفعت کا قمر ، نخل دو عالم کا ثمر
بحر وحدت کا گہر ، چشمِ کثرت کا کنول
مہر توحید کی ضو ، اوجِ شرف کا مہِ نو
شمعِ ایجاد کی لو ، بزمِ رسالت کا کنول

اُردو شاعری میں نعت گوئی کی قدر و قیمت کا اندازہ محسن کاکوروی کے اس قصیدے اور دوسرے نعتیہ کلام سے ہوتا ہے۔ ان کے قصیدے کی شان و شوکت اور مثنویوں میں تقدس و پاکیزگی کی فضا اُردو کی نعتیہ شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، محسن کا شاعرانہ اور فن کارانہ کمال، ان کی نعتیہ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کا شعری کمال فنِ نعت گوئی میں اس طرح نمایاں ہے کہ وہ اُردو نعت کی پوری روایت میں تنہا نظر آتے ہیں، محسن کا یہ شعر حقیقتِ حال ہے:

سخن کو رُتبہ ملا ہے مری زباں کے لیے
زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لیے

محسن کاکوروی پر اُردو نعت کے ایک دور کا اختتام ہوتا ہے۔ اس دور میں نعت زیادہ تر حصولِ سعادت اور تسکینِ دل کا ذریعہ سمجھی گئی، اس لیے ان میں والہانہ اور عاشقانہ وارفتگی پائی جاتی ہے۔

دورِ جدید میں نعت گوئی کی داغ بیل ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد پڑی، اس دور میں ملتِ اسلامیہ میں فکری انقلاب کی نئی لہر اُٹھیں، جس سے نعت میں ایک نیا طرزِ احساس پیدا ہوا اجتماعی شعور اور افکارِ تازہ کی لے بڑھی، اُس دور کو جدید اُردو شاعری کا دور کہا جا سکتا ہے جس کے امام مولانا حالی تھے۔ حالی کی لے کے ساتھ مولانا شبلی، نظم طباطبائی، مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال کی آواز نے اُردو شاعری میں ایک نئی گونج پیدا کی، ان بزرگ شعرا کے افکار کی روشنی سے نعت گوئی کے فن میں مزید تابانی آئی اور اس فن میں وسعت و ارتقا کے کچھ نئے امکانات

اُجاگر ہوئے اور پرانی روش و انداز سے ہٹ کر نعت گوئی میں ذکرِ رسول ﷺ اور حبِ رسول ﷺ کے ذریعے اتباعِ رسول ﷺ کے جذبے کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی۔ حضور ﷺ کی زندگی اور تعلیمات سے انسانی زندگی کی اعلیٰ اقدار کا تعین کیا جانے لگا اور اس کی روشنی میں اسلامی اقدار کی تائید و فروغ کا رُجحان پیدا ہوا، حضورِ اکرم ﷺ کی مثالی سیرت مینارۂ نور بن کے سامنے آئی، زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی بکھیرنے کا نعت گوئی ایک ذریعہ بنی۔ عشقِ ذات کے ساتھ شعورِ صفات نعت کی خصوصیت بنی اور پھر اقبال نے تو اُردو شاعری میں نعت گوئی کے ذریعے، جہانِ معانی کے نئے نئے امکانات روشن کیے جن کی کوئی حد نہیں رہی۔

حالؔی کی مسدس ''مدو جزرِ اسلام'' یا ''عرضِ حال بہ جناب سرورِ کائنات ﷺ'' دونوں ہی نظموں کے نعتیہ اشعار میں جذباتِ عقیدت و محبت میں مقصدیت کا حسین امتزاج اور بارگاہِ رسالت ﷺ کے آداب کا پاس و لحاظ ہر کہیں نظر آتا ہے۔ مولانا شبلیؔ نے سیرت النبی ﷺ کے واقعات و حالات کو سادگی و پُرکاری کے ساتھ نہایت مؤثر انداز میں شعر کے جامہ میں ڈھالا ہے جن کی دل کشی و دل آویزی ہمارے قلب و ذہن پر ایک ایسا نقش چھوڑتی ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ شبلیؔ کا یہی وہ شاعرانہ کمال ہے جو ان کی اسلامی تاریخی شاعری اور نعتیہ کلام میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح نظم طباطبائی نے بھی تاریخِ اسلام کے واقعات کو قصیدوں میں سمونے کی ایک نئے طرز و انداز سے کوشش کی، ان کے قصائد، ذکرِ بعثت و فتحِ مکہ، قصیدۂ معراج، ہجرت، غزوۂ بدر، قصیدۂ احزاب، خیبر اور حنین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں نے اپنی جولانیِ طبع، دردِ دین و ملت اور قدرتِ کلام کی بہ دولت اُردو نعت کو وہ شوکت و رعنائی بخشی، جس نے اس فن کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ انھوں نے پہلے پہل جب یہ نعت لکھی:

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

تو اس کی دھوم سارے ملک میں مچ گئی اور یہ مصرع زبانِ زد خاص و عام ہوگیا۔ ظفر علی خان خود جذبۂ سر فروشی سے سرشار تھے اور انھوں نے اپنی نعتوں کو اُمتِ محمدی کے اندر جذبہ سرفروشی پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جس میں وہ بے حد کامیاب رہے، اس طرح انھوں نے نعت کے فن کو ایک نئی قدر و قیمت بخشی۔

اُردو شاعری کے عہدِ جدید میں نعت گوئی کے فن کو اقبال نے ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی بخشی اور اس راہ میں مرحلۂ شوق کی کوئی حد باقی نہیں رکھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال نے جو کہ نظم نگاری میں جدید انداز و اسلوب کے موجد و خاتم دونوں ہی ہیں، اور جس طرح وہ اُردو شاعری میں ایک

سنگِ میل بنے ہوئے ہیں، اسی طرح نعت گوئی کے فن کو بھی وہ تب و تاب بخشی ہے جو اپنے اندر ''ذوق و شوق'' کی ایک داستان سمیٹے ہوئے ہے ''ارمغانِ حجاز'' جو فارسی میں ان کا آخری نعتیہ مجموعۂ کلام ہے۔ ایک ایسا پیامِ محبت ہے جس سے دلوں میں سرور و شوق پیدا ہوتا ہے، اقبال نے اپنے اس والہانہ ذوق وشوق کا اظہار اس طرح کیا ہے:

کافر ہندی ہوں میں دیکھ میرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود ، لب پہ صلوٰۃ و درود

اقبال کی نعتیہ نظم ''ذوق و شوق'' جو اظہار و ابلاغ کی ندرت اور زبان کی قدرت کے اعتبار سے بے نظیر و شاہکار ہے، اپنے اسلوب و انداز میں قافلۂ حجاز کی ایک ایسی داستان ہے جس میں مناظرِ فطرت وقدرت کا بیان ہے اور اس میں عربوں کی سادہ و دل کش زندگی بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے بیان کی گئی ہے، پھر سوز و ساز، ذوق وشوق، عقل وعشق، مومن کا جمال و جلال اور عشق کی سوزش و سرمستی کے ساتھ وصل وفراق کی کیفیتوں کا موازنہ، سب کچھ موجود ہے۔ اس پوری نظم کا انداز و اسلوب ایسا ڈرامائی ہے جس سے حالات و واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور قال، حال اور خبر ونظر بن گئی ہے۔ اقبالؔ نے اپنے نعتیہ کلام میں عجمی حسنِ طبیعت اور عربی سوز دروں کے حسین امتزاج سے فکر وفن کا جو چراغ جلایا ہے، وہ اُردو نعت کا نقطۂ عروج ہے، جس حد تک اردو کا کوئی دوسرا شاعر ہنوز نہیں پہنچ سکا ہے۔ نعت کے عظیم مستقبل کے امکانات اقبال کے اسی نقشِ شاعری سے روشن ہیں۔

اُردو نعتیہ شاعری کے دورِ جدید میں ایک نام مولانا احمد رضؔا خاں بریلوی (م ۱۳۴۰ھ) کا بھی آتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک انجمن ہیں اور ان کی ذات ایک منفرد اور مقبول دبستانِ نعت کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے یہاں پر علاحدہ سے ان کا ذکر ضروری ہے۔ انھوں نے نعت کے فروغ و ارتقا میں تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے اور فنِ نعت پر ان کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔ ان کا دیوانِ نعت ''حدائقِ بخشش'' تین جلدں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی نعتیہ شاعری کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''تبحرِ علی، زورِ بیان اور وابستگی وعقیدت کے عناصر ان کی نعت میں یوں گھل مل اور رچ بس گئے ہیں کہ اُردو نعت میں ایسا خوش گوار امتزاج کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔''[☆۱]

☆۱۔ اُردو نعت، از ڈاکٹر مجید، صفحہ ۲۷۹

اس دبستانِ نعت سے متعلق اُردو کے دوسرے بہت سے شعرا بھی ہیں، ان سب کا احاطہ اس موقع پر ممکن نہیں، لیکن ان سب نے اُردو کی نعتیہ شاعری کو پروان چڑھانے میں بھرپور حصہ لیا ہے جن سے نعت کی فنی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔

اُردو شاعری کا دوسرا دورِ جدید ۱۹۴۷ء تقسیم ہند سے پہلے کا ہے، برِصغیر ہند میں نعت گوئی کا یہ دور اپنا ایک علاحدہ مقام رکھتا ہے۔ ان میں بعض ایسے شعرا پیدا ہوئے، جنھوں نے نعت کو اپنا خاص موضوع بنایا اور اس فن کو اپنے نعتیہ کلام سے بامِ عروج تک پہنچایا، ان میں خاص طور پر اقبال سہیلؔ جن کا نعتیہ کلام ''ارمغانِ حرم''، سیماب اکبرآبادی کا نعتیہ مجموعہ ''ساز حجاز''، امجد حیدر آبادی کی نعتیہ رُباعیات، بہزادؔ لکھنوی کے نعتیہ مجموعے ''نغمہ نور''، ''کیف و سرور''، ''چراغِ نور''، ''نعت حضور ﷺ'' اور ''ثنائے حبیب''، حمید صدیقی لکھنوی جو سراپا عاشقِ رسول ہیں ان کا مجموعۂ کلام ''گل بانگ حرم''، ''بستانِ حرم''، ضیاء القادری کی ''تجلیاتِ نعت''، ماہر القادری کے مجموعۂ کلام ''ذکرِ جمیل''، ''نغماتِ ماہرؔ'' اور ''فردوس'' میں شامل نعتیں، شفیق جونپوری کے مجموعۂ کلام ''سفینہ''، ''فانوس'' اور ''حرمین'' میں شریک نعتیہ کلام اور حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا نے نعت کے فن کو اپنی شاعرانہ صلاحیت اور ذاتِ رسول ﷺ سے والہانہ شغف و محبت کے ذریعے جلا بخشی اور رنگ و نور سے بھر دیا۔ ان شعرا کو اپنے فن اور نعت گوئی میں جو کمال حاصل ہے۔ اس نے اس فن کو اُردو شاعری میں بڑی اہمیت بخشی ہے اور اس کے فنی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی نعتیہ شاعری پر علاحدہ علاحدہ قلم اُٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ اُردو میں نعتیہ شاعری کی حقیقی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ ہو سکے، بہرحال ان حضرات نے اُردو شاعری میں یک سوئی کے ساتھ اس فن کو پروان چڑھایا۔ ان کے مجموعۂ کلام میں ان کے فن اور عشق کی بجلیاں بھری پڑی ہیں اور ذاتِ رسول کی تجلیاں روشن ہیں۔ ان باقاعدہ نعت نگاروں کے علاوہ بیدمؔ شاہ وارثی، سیماب اکبرآبادی اختر شیرانی، احسان دانشؔ، شورشؔ کاشمیری، مولانا عبدالباری معینی اجمیری نے عہدِ آفریں اور معرکہ آرا نعتیہ نظمیں لکھیں ہیں۔ ان کی نعتیہ منظومات بہت مقبول رہی ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ہندو پاک کے شعرا میں نعت نگاری کا عام رُجحان پیدا ہوا اور شاید ہی اُردو کا کوئی بدنصیب شاعر ہو جس نے اس میں طبع آزمائی کی سعادت نہ حاصل کی ہو۔ ہندوستان کے جن شعرا نے خاص طور پر نعت کو اپنا موضوع بنایا، ان میں نشور واحدی، عامرؔ عثمانی، عروجؔ قادری، حفیظ بنارسی، عمیق حنفی، کلیم عاجز، حفیظ میرٹھی، بیکلؔ اتساہی، ساجد صدیقی، والی آسی،

طفیؔل احمد مدنی، ادیب حسن ادیبؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے باضابطہ نعتیں کہیں ہیں اور جن کے نعتیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی آزاد ہندستان میں نعت گوئی کا رُجحان اور میلان بڑھ رہا ہے۔ اُردو کا کوئی رسالہ اور اخبار ایسا نہیں ہے جس میں دو چار نعتیں نہ شائع ہوتی ہوں اور ان کی فہرست طویل ہے، پھر بھی خاص طور پر ابوالمجاہد زاہد، عرفان صدیقی، زیب غوری، عزیزؔ بگھروی، طلحہ رضوی برقؔ، رؤف خیر، مسعود جاویدؔ ہاشمی، جوہر بلیاوی اور اسعد بدایونی قیصر الجعفری، علیم صبا نویدی، عنبر بہراچی، فیاض ٹانڈوی، ابرار کرت پوری، محمد علی اثر نمایاں نعت گو شعرا ہیں۔ جنھوں نے بڑی عقیدت و محبت سے نعتیں کہیں ہیں اور کہہ رہے ہیں، جن سے مستقبل میں نعتیہ شاعری کے روشن امکانات ہیں۔ نعت گوئی نے جس عاشقانہ جذبے اور فن کارانہ اسلوب سے اُردو شاعری میں جگہ بنائی ہے، اس سے اُردو شاعری میں نعت کی اہمیت اور قدر و قیمت سمجھی جاسکتی ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد آزاد ہندوستان میں اُردو نعت کے اس مختصر اجمالی جائزے کے بعد پاکستان میں اُردو نعت کے ارتقا اور وہاں اس فن میں جو کوششیں اور تخلیقی کاوشیں کی گئی ہیں، ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا ضروری ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اُردو نعت کا مقام کیا ہے اور پاکستان میں اس فن پر کتنا کچھ کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں جناب پروفیسر حفیظ تائب نے اپنے مقالہ ’’اُردو نعت‘‘ میں بڑی جامعیت اور اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ میں اپنے اس مقالے کو انھیں کے درجِ ذیل اقتباس پر ختم کرتا ہوں:

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو نعت نے حیرت انگیز ترقی کی ہے، اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی اس نظریاتی مملکت میں ذکرِ رسول ﷺ کا چرچا ہونا قدرتی اور فطری عمل ہے۔ ابلاغِ عامہ کے قومی اور نجی ذرائع کی طرف سے کی گئی حوصلہ افزائی کی بہ دولت نعت گوئی کی رفتار تیز تر ہو رہی ہے، اس کا کینوس، اس کے موضوعات اور فنی تجربات پھیل رہے ہیں۔ نعت میں اس انقلاب کی بازگشت صاف سنائی دینے لگی ہے، جسے برپا کرنے کے لیے حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تھے۔ وہ روحانی تمدنی اور اخلاقی آشوب بہ طورِ خاص نعت کا موضوع بنا ہے، جس سے اُمتِ مسلمہ اور عہدِ حاضر کا انسان دو چار ہے۔ اس دور کے نعت نگار اپنے ذاتی اور کائناتی دکھوں کا مداوا حضور پُرنور ﷺ کی سیرتِ اطہر میں تلاش کرتے ہیں اور حضور اکرم ﷺ کے منشورِ حیات اور تعلیمات کو نعت میں سمویا جا رہا ہے، یوں نعت زندگی سے ہم آہنگ ہو کر عہدِ حاضر کا سب سے مقبول اور محبوب موضوعِ سخن ٹھہری ہے اور ورفعنالک ذکرک کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچا ہے۔

تمام اصنافِ شعر میں نعت لکھی جا رہی ہے۔ قصیدہ بغیر کسی ظاہر تحسین کے مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ اور اس کی بہت سی نئی جہات سامنے آئی ہیں۔ پاکستانی دور کے قصیدہ نگاروں میں عبدالعزیز خالدؔ، جعفر طاہر حافظ مظہر الدین، خالد احمد، عبداللہ خاور، حافظ محمد افضل فقیر، حافظ لدھیانوی، قمر انبالوی، غلام رسول ازہر، علیم ناصری، سرور سہارنپوری، خالد بزمی اور نظیر لدھیانوی کے نام شامل ہیں۔ مثنویاں سیّد منیر علی جعفر، ملک منظور حسین منظورؔ اور سیّد یزدانی جالندھری نے لکھی ہیں۔ مسدس میں جوشؔ کے بعد محشرؔ رسول نگری، احسان دانشؔ، صہبا اختر، سیف زلفی، قیصر بارہوی، انور مسعود، رحمان کیانی اور آسی ضیائی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

گیت کے پیرایے میں نعتیہ منظومات لکھنے کا امتیاز مظفر وارثی کو حاصل ہوا ہے مختصر پابند نظمیں لکھنے میں عاصی کرنالی حافظ مظہر الدین کرم حیدری، جلیل عالی اور کئی دوسرے شعرا پیش پیش ہیں۔ منظومِ سیرت کے نئے امکانات راجہ عبداللہ خاں نیاز سید منیر علی جعفری، راجا رشید محمود اور خورشید ناظر نے دریافت کیے ہیں۔ تضمین میں منور بدایونی، اختر الحامدی، عبدالمجید سالک، شورش کاشمیری، ناصر کاظمی، بشیر حسین ناظم، حنیف اسعدی، ہلال جعفری، حافظ عبدالغفار حافظ اور ناصر زیدی نے خوب صورت اضافے کیے ہیں۔ نظم آزاد میں نعتیہ تجربے کرنے والوں میں مختار صدیقی، عبدالعزیز خالد، عارف عبدالمتین، جیلانی کامران، ادا جعفری، نعیم صدیقی، ظہور نظر، قیوم نظر، امین راحت چغتائی، اطہر نفیس، محسن احسان، امجد اسلام امجد، قمر ہاشمی، رشید، قیصرانی، پروین شاکر، صائمہ خیری، ناہید قاسمی، تحسین فراقی، جعفر بلوچ اور الطاف قریشی سرشار صدیقی، شبنم رومانی صبیح رومانی کے نام شامل ہیں۔ نثری نظم میں تجربہ کرنے والوں میں احمد کا نام سرفہرست ہے۔

غزل کی روایت میں نعت کہنے والوں میں ہر چھوٹا بڑا شاعر شامل ہے۔ جنھوں نے غزل کی روایت میں اس موضوعِ سخن کے لامحدود امکانات سمجھائے ہیں۔ نوجوان شعرا کی نعتیہ غزلوں میں جذبے کی فراوانی اور بیان کی حسن کاری نعت کے عظیم تر مستقبل کی نشان دہی کرتی ہے۔

ڈاکٹر مظفر حسن عالی

اُردو کی نعتیہ شاعری کا تاریخی و تہذیبی مطالعہ

> شاعری ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے جس کا کام میں لانا نہ لانا امرِ اختیاری ہے۔ اس فطری جذبے میں علم و ادراک، غور و فکر، تحقیق و تحلیل، ایجاد و اختراع اور نظر و نقد سے ایک قسم کی نئی صنف پیدا ہو جاتی ہے اور شاعر کا الہام انسانوں کی سماعت کے لیے ایک ایسا دل کش گیت بن جاتا ہے جس کا کیف و سرور کبھی کم نہیں ہوتا اور جس کے سازِ مترنم پر دل وجد کرتا ہے اور رُوح رقص کرتی ہے۔☆[۱]

تاہم—

> ایک شاعر کے لیے پہلی منزل، منزلِ احساس، دوسری منزل، منزلِ تأثر اور تیسری منزل، منزلِ فکر ہوتی ہے۔ ان منازل سے گزر جانے کے بعد وہ جو کچھ کہتا ہے وہ اتنا مؤثر اور دل دوز ہوتا ہے کہ کائنات اس کے استقبال کے لیے دل بہ دست نظر آتی ہے۔☆[۲]

مذکورہ بیانات سے ظاہر ہوا کہ شاعر کے لیے صاحبِ فکر و شعور ہونا لازمی ہے۔ گویا شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو، دل و دماغ پر حالات اور ماحول کے زیرِ اثر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں انھیں بہترین اسلوبِ بیان کے ساتھ اور موزوں الفاظ کے ذریعے ظاہر کرنے کا نام شاعری ہے۔ تاہم وہ شاعری جو دین و شریعت کے منافی ہو وہ ایک مذموم صفت کے مترادف سمجھی جائے

☆۱۔ فکرِ امروز، سیماب اکبر آبادی: شاعر، اپریل ۲۰۰۱ء

☆۲۔ کلیم عجم، صفحہ ۲۴، بحوالہ شاعر، مئی ۲۰۰۱ء

گی۔قرآنِ کریم میں اس جانب واضح اشارہ ملتا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: اور شاعروں کی پیروی گم راہ کرتے ہیں، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر نالے میں سرگرداں پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو وہ نہیں کرتے۔

(کنز الایمان سورۃ الشعرا، آیت ۲۲۴ تا ۲۲۶، پارہ ۱۹)

یہ آیتِ کریمہ ان شعرائے عرب کے حق میں نازل ہوئی تھی جو سرکارِ دو عالم ﷺ کی شان کے خلاف اور ان کی ہجو میں اشعار کہتے تھے۔ان کا یہ دعویٰ تھا کہ محمد ﷺ جیسا تو ہم بھی کہہ لیتے ہیں اور ان اشعار کو ان کے قبیلے اور قوم کے گم راہ لوگ نقل کر لیا کرتے تھے۔خداوند قدوس نے ان ہی لوگوں کی مذکورہ آیت میں مذمت کی ہے۔

جب ان آیات کا نزول ہوا تو حسان بن ثابت، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم روتے ہوئے دربارِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ’’یا رسول اللہ (ﷺ) ہم شاعر ہیں، ہم تو بے موت مارے گئے۔ ہماری نجات کی کوئی سبیل نہیں؟‘‘ اس وقت سورۂ شعرا کی آخری آیات نازل ہوئیں جن میں فرمایا گیا:

بجز اُن (شعرا) کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور وہ کثرت سے اللہ (تبارک و تعالیٰ) کو یاد کرتے ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح اور صاف ہوگئی کہ جو شعرا صاحبِ ایمان ہیں، نیکی اور عملِ صالح پر قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد کثرت سے کیا کرتے ہیں، ان کی پیروی گم راہ کن نہیں۔

جس طرح قرآنِ کریم میں خداوند قدوس نے بری شاعری کو مردود اور مقہور فعل قرار دیا ہے وہیں حضورِ اقدس ﷺ نے ایسی شاعری کی کھل کر مخالفت و مذمت کی ہے۔ بہت ساری حدیثیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بخاری شریف کی ایک حدیث ہے جو حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا:

’’فی کل لغو یخوضون‘‘ ترجمہ: شاعر ہر لغو (فضول) بات میں مغز کھپائی کرتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ نے ایسی شاعری کو بھی ناپسند قرار دیا ہے جو انسان کے فکر و شعور پر غالب آ جائے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرماں برداری سے روک دے۔ چناں چہ بخاری شریف میں ایک جگہ ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: وہ شاعری ناپسندیدہ ہے جو انسان پر غالب آ جائے۔ یہاں تک کہ اللہ کی یاد، دینی علوم اور قرآنِ کریم سے روک دے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جہاں بری شاعری کو مردود و مقہور فعل گردانا ہے وہیں اچھی شاعری کی تعریف و توصیف بھی کی ہے۔ چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: مگر وہ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور بہ کثرت (لوگ) اللہ کی یاد کی اور بدلہ لیا، بعد اس کے کہ اُن پر ظلم ہوا اور اب جاننا چاہتے ہیں ظالم، کہ کس کروٹ پر پلٹا کھائیں گے۔ (کنز ایمان)

نبی اکرم ﷺ کے صحابۂ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین) میں بھی جلیل القدر اور عظیم المرتبت شعرا کرام موجود تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ استیعاب میں عبدالبر نے حدیث نقل کی ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا "یارسول اللہ! شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی۔

سرکارِ دو عالم ﷺ خود بھی اچھی شاعری کو پسند فرماتے تھے چناں چہ ارشادِ نبوی ہے:

ترجمہ: شعر کلام ہے، پس اچھا شعر اچھا کلام ہے اور برا شعر برا کلام۔ (بخاری)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: بے شک حکمت ہے اور بیان جادو ہے۔ (بخاری)

ایک جگہ اور یوں ارشاد فرمایا گیا:

ترجمہ: بے شک بعض بیان جادو ہے اور بعض بیان جادو نہیں ہے۔ (بخاری)

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشادِ گرامی ہے:

ترجمہ: بے شک بعض بیان جادو کی مانند اور بعض علم جہالت اور بعض شعر مبنی بر حکمت اور بعض قول وبالِ جان ہوتے ہیں۔ (بخاری)

حضورِ اقدس ﷺ نے اچھے شعر کو پسند فرمایا ہے اور اچھے شعر کی تعریف کی ہے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ: شعر کلام ہے، بعض اچھا ہوتا ہے، بعض برا، اچھے کو لو، برے کو چھوڑ دو۔ (ترمذی)

مولانا شاہ محمد تبریزی لکھتے ہیں:

"آنحضرت ﷺ نے شاعری میں جس چیز کو سب سے زیادہ پسند فرمایا، کفار کی ہجو تھی۔ ہجو بھی وہ جو اخلاقیات سے گری ہوئی نہ ہو۔ مغلظات

سے خالی ہو اور صرف مذمت کی حد تک ہو۔ حضور ﷺ نے نہ صرف ہجو کہنے اور اس کے پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے بلکہ ہجو لکھنے اور پڑھنے والے شاعر کے ساتھ مل کر دُعا بھی فرمائی ہے اور انعام و اکرام سے بھی نوازا ہے۔[☆۱]

تاریخ شاہد ہے کہ نبی اکرم ﷺ، شعرائے اسلام کو دل و جان سے عزیز رکھتے، ان کی دل جوئی فرماتے اور ان کی ہر ممکن اعانت کرتے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے شعرا کو ان کے اچھے اور خوب صورت اشعار پر اعزاز و اکرام سے بھی نوازا اور القاب و خطابات بھی عطا کیے۔ حتیٰ کہ نعمت و خلعت اور القابات کے علاوہ ''ایک ایک وقت میں سو سو اونٹ عطا کر دیے۔''[☆۲]

مسجدِ نبوی ﷺ میں حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو اشعار سنانے کے لیے منبر بچھایا جاتا تھا جس پر وہ کھڑے ہو کر رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی نعت پاک جھوم جھوم کر بیان فرماتے تھے اور حضور کی شان میں کفار و مشرکینِ مکہ کی بدکلامیوں کو دنداں شکن جواب دیا کرتے اور سیّد عالم ﷺ خوش ہو کر ان کے حق میں دعائے خیر فرمایا کرتے تھے۔ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے دو اشعار نموناً درج کیے جاتے ہیں:

وَاَجۡمَلَ مِنۡکَ لَمۡ تَرَقَطُّ عَیۡنِیۡ — وَاَکۡمَلَ مِنۡکَ لَمۡ تَلِدِ النِّسآءُ

خُلِقۡتَ مُبَرّاً مِّنۡ کُلِّ عَیۡبٍ — کَاَنَّکَ قَدۡ خُلِقۡتَ کَمَا تَشَاءُ

''یعنی اے حسن و جمال کے آقا آپ سے بڑھ کر حسین و جمیل میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ سے بڑا صاحبِ کمال دُنیا جہان کی عورتوں کی آغوش میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ آپ ہر عیب سے پاک پیدا ہوئے۔ گویا آپ کی تخلیق آپ ہی کی مرضی کے مطابق ہوئی۔''[☆۳]

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ جن صحابۂ کرام نے حضور کی عقیدت و محبت اور شان میں اشعار کہے ان میں حضرت عبداللہ روم، حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت کعب بن مالک انصاری، حضرت کعب بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین بہ طورِ خاص ہیں۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''تقریباً تمام ہی صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اپنی اپنی محبت

☆۱۔ نعت رنگ ۳، صفحہ ۱۳۹

☆۲۔ ایضاً

☆۳۔ بہ حوالہ امام شعر و ادب، حق اکادمی مبارک پور اعظم گڑھ، صفحہ ۱۷

اور حبِ مصطفیٰ ﷺ کے پیشِ نظر نعت کہنے، لکھنے، پڑھنے اور سنانے کی سعادت حاصل کی ہے اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی شعر کہتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان میں سب سے زیادہ شعر کہنے والے تھے۔''☆۱

اگر یہ کہا جائے کہ ''شاعری عطیۂ رحمٰن اور شاعر تلمیذ الرحمٰن'' ہے تو بے جا نہ ہوگا جیسا کہ آیاتِ قرآن اور احادیثِ نبوی ﷺ کے معانی و مطالب سے واضح ہے۔ میرے خیال میں وہ شاعر جو ایمان کو تازگی، روح کو بالیدگی اور قلب کو روشنی عطا کرے، دراصل وہی شاعری ہے اور یہ معیار و منہاج نعت کے علاوہ کسی اور صنفِ سخن کو حاصل نہیں۔

''نعت'' عربی زبان کا سہ حرفی لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی مدح اور تعریف و توصیف کے ہیں۔ یہ لفظ شاعری میں خصوصیت سے آقائے نامدار مدنی تاجدار مختار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعریف و توصیف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ شاعر نعت کے پیرایے میں حضور اقدس ﷺ کی ذاتِ گرامی اور حیاتِ طیبہ کی جملہ خصوصیات کا اظہار و بیان بہ حسن و عقیدت اور خالص ادب و احترام کے جذبے کے ساتھ کرتا ہے۔

اُردو کی جملہ اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ لطیف و نازک صنف نعت ہے۔ نعت پاک سرورِ کائنات ﷺ کے فضائل و خصائل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ لفظ نعت کا استعمال حضور ﷺ کی شانِ رسالت اور تعریف و توصیف میں سب سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یہاں ہوا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

من راه بداهة هابه ومن خالطه احبه بقول فاعته لم او قبله ولا بعدهٗ مثله صلی اللہ علیه وسلم (شمائل ترمذی)

ترجمہ: جس نے یکا یک آپ کو دیکھا وہ ہیبت زدہ ہوگیا اور جو آپ سے ملا وہ آپ کا گرویدہ ہوا۔ آپ کا وصف کرنے والا یہی کہتا ہے کہ آپ سے پہلے نہ آپ جیسا دیکھا اور نہ آپ کے بعد آپ جیسا دیکھوں گا۔''☆۲

قرآنِ حکیم جہاں خالقِ کائنات کا ''حمد نامہ'' ہے وہیں رسولِ کریم ﷺ کا قصیدہ بھی ہے۔ قرآنِ حکیم حضور ﷺ کی نعت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ مختلف طریقوں سے اللہ پاک نے قرآن مجید میں آپ کی تعریف و توصیف بیان فرمائی ہے۔ رشید وارثی حضورِ اکرم ﷺ کی

☆۱۔ بہ حوالہ نعت رنگ ۳، صفحہ ۱۴۰

☆۲۔ بہ حوالہ نعت رنگ ۵، صفحہ ۲۴

عظمت و شان کے حوالے سے خاص طور پر اہمیت کی حامل اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے اسمائے حسنیٰ میں کم و بیش ۱۸۸ اسمائے مبارکہ سے اپنے محبوبِ پاک علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو متصف فرمایا ہے۔ جن کی تفصیل بیروت کے معروف محقق علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الاسمیٰ'' کے مقدمے میں بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ موصوف نے اپنی کتاب ''احسن الوسائل فی اسمآء النبی الکامل'' میں جناب رسالت مآب ﷺ کے تقریباً آٹھ سو بیس اسمائے طیبہ کی صراحت فرمائی ہے۔''☆[۱]

سرکارِ دو عالم ﷺ کی تعریف و توصیف کا سب سے اہم اور بنیادی سرچشمہ قرآنِ عظیم ہے۔ ربِّ ذوالجلال نے جہاں اپنے محبوب کی جگہ جگہ نعت فرمائی اور درود و سلام بھیجا ہے وہیں اپنے بندوں کو آپ کی اطاعت اور فرماں برداری کا سبق بھی دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِی، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا صَلُّوْ عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

ترجمہ: بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتانے والے (نبی) پر اے ایمان والو! ان پر درود اور خوب سلام بھیجو۔ (سورۂ الاحزاب، پارہ ۲۲، آیت ۵۶، کنزالایمان، صفحہ ۶۱۷)

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ

ترجمہ: اور اللہ و رسول کے فرماں بردار رہو۔ (سورۂ آل عمران پارہ ۴، ع ۴، آیت ۱۳۲، کنز الایمان، ص ۹۸)

مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہ

ترجمہ: جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ کا حکم مانا۔ (سورۃ النساء، پارہ ۴، ع ۷، آیت ۸۰، کنزالایمان صفحہ ۱۳۲)

آپ کی بزرگی و برتری کا اعلان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ

ترجمہ: ہم نے تمھارے لیے تمھارا ذکر بلند کر دیا۔ (پارہ ۳۰، سورۃ الانشراح، ع ۱۸، آیت ۴، کنزالایمان، صفحہ ۸۶۹)

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہُ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ

ترجمہ: بے شک تمھیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے۔ (پارہ ۲۲، سورۃ الاحزاب، ع ۱۹، آیت ۲۱، کنزالایمان، صفحہ ۶۰۹)

☆۱۔ نعت رنگ ۱۰، صفحہ ۱۳

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہ

ترجمہ: اے محبوب تم فرما دو کہ لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہوتو میرے فرماں بردار ہو جاؤ اللہ تمھیں دوست رکھے گا۔ (پارہ۳، سورۂ آل عمران، ع۲۱، آیت ۳۱)

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْن

ترجمہ: اور ہم نے تمھیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔ (پارہ۱۷، سورۃ الانبیا، ع۷، آیت ۱۰۷، کنزالایمان، صفحہ ۴۷۹)

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا

ترجمہ: بے شک ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بھیجا خوش خبری دیتا اور ڈر سناتا۔ (پارہ۲۲، سورۃ الاحزاب، ع۳، آیت ۴۵، کنزالایمان، صفحہ۶۱۴)

اور حدیث قدسی ہے:

لَوْلَاکَ لِمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاک

ترجمہ: (اے محبوب) اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو ہی پیدا نہ کرتا۔[☆۱]

سرکارِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں:

"اوّل ماخلق اللہ نوری و کل خلائق المن نوری و آنا من نور اللہ"

ترجمہ: سب سے پہلے خداوندِ قدوس نے میرے نور کو پیدا فرمایا پھر اس نور سے پوری کائنات کو وجود بخشا— گویا کہ آپ اصل کائنات ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہٗ العزیز ''معارف لدنیہ'' میں رقم طراز ہیں:

''کسی چیز کا ظہور بغیر تعین اور امتیاز ہونے کے ناممکن ہے۔ لہٰذا ذات کی تجلی اور ظہور (ہوالظاہر) تعین ہی کے ساتھ ہوسکتا ہے اور یہ تعین اوّل ہی ہے جو تمام تعینات میں سب سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتا ہے۔ اس کو ''وحدت'' کہتے ہیں اور وہ اسم جو آنحضرت ﷺ کا مبدا تعین ہے۔ وہ یہی ''وحدت'' ہے۔ لہٰذا حقیقتِ محمدیہ ﷺ کُل ہوگی اور باقی تمام موجودات کے حقائق اس کے اجزا ہوں گے۔''[☆۲]

حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث شریف ہے: ''کُنْتُ نَبِیاً وَ آدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ

☆۱۔ تفسیر روح المعانی بحوالہ امام ماوردیؒ

☆۲۔ نعت رنگ ۱۰، صفحہ ۱۲

وَالطِّین،، میں اس وقت نبی تھا جب جناب آدم علیہ السلام کا قالب بھی تیار نہیں ہوا تھا۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ اپنی مشہور کتاب ''بوستاں،، میں اس طرح خامہ فرسا ہیں:

خدایت ثنا گفت و تجیل کرد زمیں بوس قدر تو جبریل کرد

بلند آسماں پیش قدرت خجل تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل

تو اصل وجود آمدی از نخست وگر ہرچہ موجود شد فرع تست

ترجمہ: خدا نے آپ کی تعریف کی، آپ کو بزرگی دی، آپ کی آستانہ بوسی کے لیے جبریلِ امین سا حاملِ وحی فرشتہ بھیجا، آسمان باوجود یہ کہ اتنا بلند ہے مگر آپ کے رُتبے کی بلندی کو دیکھ کر شرمندہ ہے۔ آپ کا نور اس وقت خدا نے خلق فرمایا جب کہ ابوالبشر جناب حضرت آدم کا پتلا بھی نہیں بنا تھا۔ آپ باعثِ ایجادِ خلق ہیں۔ اسی وجہ سے آپ اصل ہیں اور جتنی چیزیں پیدا ہوئیں وہ سب آپ کی شاخیں ہیں۔

شیخ سعدی آگے فرماتے ہیں:

ندانم کدا میں سخن گویمت کہ والا تری زانچہ من گویمت

تراعز لولاک وتمکیں بست ست ثنائے توطٰہٰ و یٰسیں بس ست

نہیں جانتا ہوں کہ کون سی بات آپ کو کہوں، اس واسطے کہ آپ اس سے برتر ہیں جو کچھ آپ کو کہوں۔ آپ کے واسطے لولاک کی عزت اور وقعت کافی ہے۔ آپ کی تعریف طٰہٰ اور یٰسین بہت ہے۔

اور جب واضح طور پر یہ بات قرآنِ مجید سے ثابت ہوگئی کہ:

۱۔رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ (سورۃ النساء، آیت ۸۰)

۲۔رسول اللہ ﷺ کی محبت واطاعت اللہ تعالیٰ کی محبت واطاعت ہے۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۳۱)

۳۔رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے۔ (سورۃ الحجرات، آیت ۱)

۴۔حضور ﷺ کی عطا اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ (سورۃ التوبہ، آیت ۵۹)

۵۔حضور اکرم ﷺ کا فضل اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ (سورۃ التوبہ، آیت ۷۴)

۶۔حضور ﷺ کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ (سورۃ التوبہ، آیت ۶۲)

۷۔حضور ﷺ کی مخالفت اللہ تعالیٰ کی مخالفت ہے۔ (سورۂ التوبہ، آیت ۶۲)

۸۔حضور ﷺ کا انکار اللہ تعالیٰ کا انکار ہے۔ (سورۃ التوبہ، آیت ۵۴)

۹۔حضورِ اکرم ﷺ کی حرام کردہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز ہے۔ (سورۂ التوبہ، آیت ۲۹)

۱۰۔ نبی کریم ﷺ کو اذیت دینا اللہ تعالیٰ کو اذیت دینا ہے۔ (سورۃ الاحزاب، آیت ۵۷)
۱۱۔ نبی کریم ﷺ کا حکم اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ (سورۃ الاحزاب، آیت ۳٦)
۱۲۔ حضور اکرم ﷺ کا دستِ مبارک اللہ تعالیٰ کا دستِ مبارک ہے۔ (سورۃ الفتح، آیت ۱۰)
۱۳۔ حضور اکرم ﷺ کی بیعت اللہ تعالیٰ کی بیعت ہے۔ (سورۃ الفتح، آیت ۱۰)
۱۴۔ حضور ﷺ کا عمل اللہ تعالیٰ کا عمل ہے۔ (سورۃ الانفال، آیت ۱۷)
۱۵۔ حضور اکرم ﷺ کا کسی کو بلانا اللہ کا بلانا ہے۔ (سورۃ الانفال، آیت ۲۴)

تو پھر ہماری عقلِ سلیم، فکر و خیال کی تہذیب اور ہمارے قلوب ان حیات افزا کلمات کی حرارت سے فیض یاب کیوں نہ ہوں! خالقِ کائنات نے اپنے نبی کی عظمت و رفعت اور شان وشوکت کا ذکر فرما کر اپنے بندوں کو ایسا سبق دیا ہے کہ اگر آپ ﷺ کی شان میں بال برابر بھی کسی نے گستاخی کی تو گویا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لیا۔ پروردگار نے (اپنے بندوں کو) ایسا نسخۂ کیمیا عطا کر دیا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنی زندگی کو کندن بنا سکتے ہیں۔

حضور کی محبت، تعظیم وتکریم اور ادب و احترام ہی دراصل نعتِ رسول کی پہلی منزل اور پہلا پڑاؤ ہے جس کے بغیر نعت گوئی کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر سرکارِ دو عالم ﷺ کے ادب و احترام اور تعظیم و توقیر کا حکم آیا ہے۔ تاہم یہ تعظیم و توقیر اور ادب و احترام کا سچا اور راسخ جذبہ اس وقت ممکن ہے جب دل میں محبوبِ کبریا کی عقیدت و محبت ہوگی۔ چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ترجمہ: (اے حبیب) آپ (مسلمانوں سے) فرما دیجیے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں گھاٹے کا تم اندیشہ کرتے ہو اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) لے آئے اور اللہ تعالیٰ اس قوم کو ہدایت نہیں دیتا جو نافرمان ہیں۔ (سورۂ توبہ: آیت ۹)

یہ ہدایت فرماں بردار بندوں کے لیے جہاں نسخۂ کیمیا ہے وہیں نافرمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ بھی ہے کہ خدا ایسوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ پروردگارِ عالم نے اپنی اور اپنے محبوب کی محبت کو تمام دُنیاوی محبتوں پر مقدم رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔

ایک مرتبہ بارگاہِ نبوی میں کسی معاملے پر باہمی تکرار کے سبب حضرت ابوبکر اور حضرت

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی آوازیں حضور پُرنور ﷺ کے آگے بلند ہوگئیں۔ معاملہ کسی اور کا نہیں، بارگاہِ محبوبِ کبریا کا ہے جس کے متعلق حدیثِ قدسی میں آچکا ہے۔ "لولاک لما خلقت الا فلاک" تو پھر خدا کو یہ کب گوارا ہوتا کہ میرے محبوب کے سامنے کوئی بلند آواز میں بات کرے اور پھر ان بات کرنے والوں کو بھی دیکھیے کہ مقدس و مکرم ہستیاں جو حضور فخرِ موجودات ﷺ کی رفاقتِ سرمدی کے اعزاز سے بہرہ مند اور اس عالم رنگ و بو میں آپ کی نیابت کی سزاوار ہیں۔ بارگاہِ رسالت میں ان کی صرف بلند آواز میں گفتگو پر اللہ تعالیٰ نے اس قدر اظہارِ ناپسندیدگی فرمایا کہ اس حوالے سے قرآنِ حکیم میں تمام مسلمانوں کو ادبِ رسالت کی خصوصی تلقین فرمائی کہ: "اے ایمان والو! اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اس غیب بتانے والے (نبی) کی آواز سے اور اس کے حضور بات چلا کر نہ کہو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے چلاتے ہو کہ کہیں تمھارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمھیں خبر نہ ہو۔" (سورۃ الحجرات، پارہ ۲۶، ع ۱، آیت ۲)

خالقِ کائنات نے جہاں حضور ﷺ کی بارگاہ میں بلند آواز سے گفتگو پر تنبیہ فرمائی اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ: "اے مسلمانو! رسول کو اس طرح نہ پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔" (سورۂ نور، آیت ۶۳)

ایک آیتِ کریمہ کے ذریعے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ پکارنے یا ندا کرنے میں ادب کا پورا لحاظ رکھا جائے جیسے آپس میں ایک دوسرے کو نام لے کر پکارتے ہیں اس طرح نہیں پکارنا چاہیے بلکہ تعظیم و تکریم اور القاب و عظمت کے ساتھ عرض کرو جو عرض کرنا ہے۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی قبرِ انور کے پاس بھی بلند آواز سے بولنا مکروہ ہے جیسے آپ کی حیات (ظاہری) میں مکروہ تھا۔

شاعری کی جملہ اصناف کے مقابلے میں "نعت پاک" کو انتہائی مشکل فن قرار دیا گیا ہے۔ اس تعلق سے مختلف بیانات سامنے آئے ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں:

> نعت شریف لکھنا نہایت مشکل فن ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں۔ اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے۔ البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے غرض حمد میں ایک جانب اصلاً کوئی حد نہیں اور نعت شریف میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے۔[☆۱]

☆۱۔ الملفوظ حصہ دوم مولانا مصطفیٰ خاں مفتی اعظم ہند

محمد ہدایت اللہ سابق نائب صدر جمہوریۂ ہند، نعت کی نزاکت کے تعلق سے احتیاط، ہوش مندی اور فرزانگی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

شعر وسخن کی اصناف میں درحقیقت سب سے زیادہ نازک صنف نعت گوئی ہے۔ وہ ذاتِ مقدس جس پر خود خالقِ کائنات درود و سلام بھیجے اور اس کے پاس فرشتے جس کی توصیف کریں، جس کے لیے کائنات تخلیق کی گئی ہو، آسمانوں کو بلندی، دریاؤں کی وسعت اور مہر و ماہ و نجوم کو تابانی بخشی گئی ہو اس کے حضور کچھ عرض کرنے کی جرأت کے لیے بھی احتیاط، ہوش مندی اور فرزانگی کی ضرورت ہے۔

عزت بخاری کا شعر ہے:

ادب گاہیت زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

بارگاہِ رسالت مآب میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے چشمِ طلب کی تھوڑی سی لغزش بھی ''جرمِ وفا'' کے برابر ہے۔ یہاں سجدۂ شوق کی اجازت ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کا اظہار صرف نگاہوں سے کیا جائے۔ جنوں کی کتنی بھی شورش ہو، مگر جیب و گریباں تار تار نہ ہوں۔ شریعت کا اتباعِ کامل اور مقامِ نبوت کی عظمت کا عرفان حاصل ہونے کے بعد ہی نعت گوئی کی منزل طے ہوتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے اگر بے پایاں عشق نہیں ہے، سینے میں جذبۂ ایمانی اور دل میں نورِ محمدی نہیں تو نعت گوئی کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ اقبال کا شعر ہے:

عشق کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

اس لیے نعت کو اس کے معیار اور اس کے مقام کے مطابق کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس منزل میں وہی بامراد ہو سکتا ہے جو اس مقام تک پہنچ جائے:

چلوں میں جان حزیں کو نثار کر ڈالوں
نہ دیں جو اہلِ شریعت جبیں کو اذن سجود[☆۱]

عرفی شیرازی کے نزدیک تو نعت کہنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بردم تیغ ست و قدم را

یعنی کہ ''اے عرفی جلدی مت کر نہ تیز چل کہ یہ نعت پاک کا راستہ ہے۔ جنگل بیاباں نہیں ہے جو تو قدم بڑھانے لگا۔ ذرا آہستہ چل کہ تیرے پاؤں تلوار کی تیز دھار پر پڑ رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ پاؤں تلوار سے کٹ جائیں۔''

عرفی ہی کا شعر ہے:

ہشدار کہ نتواں بہ یک آہنگ سرو دن
نعت شہہِ کونین و مدیح کے وجم را

یہاں 'کے وجم'' سے مراد شہنشاہ ''کیکاؤس'' اور ''جمشید'' ہیں۔ یعنی شہنشاہ کونین ﷺ کی مدح سرائی اور ان دونوں ''کیکاؤس اور جمشید'' جیسے دُنیاوی بادشاہوں کی مدح گستری ایک ہی لہجہ میں نہیں کی جاسکتی۔ وہ شہنشاہِ کونین کی مدح سرائی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

ظہیر احمد صدیقی نے اس پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> نعت گوئی اُردو اصنافِ سخن کا ایک اہم اور زرخیز میدان ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میدان تک پہنچنے کے لیے جن سنگ خاروں اور پتھریلے راستوں سے گزرنا پڑتا ہے، ان صعوبتوں کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ دوسری اصنافِ سخن اور نعت گوئی میں بنیادی فرق یہی ہے کہ دوسری اصنافِ سخن تک فنِ شعر اور قادر الکلامی کے سہارے بھی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے، مگر نعت گوئی کی منزل بغیر خلوص و عقیدت کے طے نہیں ہوسکتی۔''[☆۲]

حقیقت یہ ہے کہ اس فن میں مکمل دسترس ہونے کے باوجود بھی قدم قدم پر خطرات کا سامنا ہے۔

☆۱۔ ماہنامہ ''نیا دور'' مارچ۔ اپریل ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۱

☆۲۔ ماہنامہ ''نیا دور'' مارچ۔ اپریل ۱۹۸۷ء، صفحہ ۸۷

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''نعت گوئی کی فضا جتنی وسیع ہے اتنی ہی اس میں پرواز مشکل ہے۔ پرواز سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ فضا سازگار بھی ملے گی یا نہیں۔ اگر ہمتِ پرواز مشکل مقام پر پہنچا دے تو اُڑنے والے کا یہ کمال ہونا چاہیے کہ وہ اور کامیابی کے ساتھ وہاں سے گزر جائے۔''☆[۱]

اور ملک زادہ منظور اپنے خیالات ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں:

میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں نعت گوئی مشکل ترین صنفِ سخن رہی ہے۔ ہماری عقیدت اور رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جب ہم کسی کی مدح کریں تو جذبات کو مکمل طور پر آزاد چھوڑ دیں، مگر شریعت جذبات کے اس غیر جانب دار اُڑان کو پسند نہیں کرتی اور اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ ہر شے کو اس کے مناسب اور متعین شدہ حد میں رکھا جائے۔

ڈاکٹر رفیع الدین قادری ماہنامہ ''المیزان کے امام احمد رضا نمبر میں نعت کے موضوع، عقیدے کی تفصیلات اور پروازِ تخیل پر اپنے خیالات اس طرح پیش کرتے ہیں:

''موضوع کا احترام شاعر کو مجبور کرتا ہے کہ وہ نپے تلے الفاظ، حسنِ خطاب اور حسنِ بیان کے ساتھ عقیدے کی تفصیلات اور باریکیوں کو صحت کے ساتھ لے کر چلے اور قدم قدم پر اس کا لحاظ کرے کہ تخیل کی پرواز ان مقامات تک نہ پہنچا دے جن سے صادق البیانی پر حرف آئے اور نتیجتاً نعت، نعت نہ رہے۔''☆[۲]

صنفِ نعت کے عروج و ارتقا میں عربی زبان کو اوّلیت حاصل رہی ہے۔ نعت گوئی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ تاریخ اسلام، اس کا تعلق بہ راہِ راست عہدِ رسالت ﷺ سے ہے۔ عربی زبان کا پہلا نعت گو شاعر غالباً اعشیٰ ابوبصیر میمون بن قیس ہے جیسا کہ ''بہار میں اُردو کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ'' صفحہ ۴۳ میں استاد احمد حسن زیاد کی کتاب ''تاریخِ ادب عربی'' صفحہ ۴۵ کے حوالے سے یہ بات کہی گئی ہے: ''وہ دورِ جہالت کا ایک کامیاب ترین شاعر تھا۔ آنحضرت ﷺ

☆۱۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، صفحہ ۴۹۷

☆۲۔ ماہنامہ ''المیزان''، بمبئی، امام احمد رضا نمبر، صفحہ ۴۷۹

کی رسالت کی جب خبر سنی تو ان کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ کہہ ڈالا اور حجاز پہنچ کر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ قریش کو اس کے مسلمان ہو جانے کے ارادے پر بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ ابوسفیان نے کہا خدا کی قسم اگر یہ محمد (ﷺ) کے پاس چلا گیا تو اپنی شاعری سے عرب کی آگ کو بھڑکا دے گا۔ چناں چہ سب نے چندہ کرکے سو اونٹ اس کی مدد کے لیے جمع کیے۔ اعشیٰ نے وہ اونٹ قبول کر لیے اور واپس گھر کی راہ لی۔ راستے میں یمامہ کے قریب وہ اونٹنی سے گرا اور اونٹنی نے اس کی گردن کچل دی۔''

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کے خیال سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:
''رسول مقبول کی شانِ اقدس میں پہلا قصیدہ عربی شاعر میمون بن قیس سے منسوب ہے۔ اس طرح نعت گوئی میں اوّلیت کا سہرا میمون کے سر رہا۔''[☆۱]

مدحیہ قصیدے کے چند اشعار اس طرح ہیں جو حضور اقدس کی شان میں اعشیٰ نے کہے تھے:

فآلیت لا رائی لھا ممن کلاتہ — ولا من وجیٌ حتی تزور محمَداً
متی ماتناخی عند باب ابن ھاشم — تراحی و تلقی من فواضلہ ندیٰ
نبی یری مالا یرون و ذکرہٗ — آغار لعمری فی البلاد وانجداً[☆۲]

سیّد ابراہیم ندوی کے خیال میں: ''سب سے پہلے حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت ابوطالب نے اس فن کو ایجاد کیا۔''[☆۳] حضرت ابوطالب کے دو اشعار نعت اقدس میں اس طرح ہیں:

وَاَبْیَضُ یُسْتَقَیُ الْغَمَامُ بِوَجْھِہٖ — ثِمَالُ الْیَتٰمیٰ عِصْمَۃٌ لِلْاَرَامِلِ
تَلُوذُبِہٖ الْھلَاکُ مِنْ آلِ ھَاشم — فَھُمْ عِنْدَہٗ فِی نِعْمَۃٍ وَفَوَاضِلِ

وہ گورے گورے رنگ والے کہ ان کے منہ کے صدقے میں ابر کا پانی مانگا جاتا ہے، یتیموں کی جائے پناہ، بیواؤں کے نگہبان بنی ہاشم جیسے غیور لوگ تباہی کے وقت ان کی جائے پناہ میں آتے ہیں۔ ان کے پاس ان کی نعمت و فضل میں بسر کرتے ہیں۔[☆۴]

ان اشعار میں جو شاعرانہ اپروچ اور علامتی زبان استعمال کی گئی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔
بنی نجار کی بچیوں کے اُن نعتیہ اشعار پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں جس میں بھرپور

☆۱۔ اُردو کی نعتیہ شاعری، صفحہ ۷
☆۲۔ بحوالہ تاریخ ادبِ عربی از استاد احمد حسن زیاد، مرتب ڈاکٹر سیّد طفیل احمد مدنی، صفحہ ۴۶
☆۳۔ نعت رنگ ۵، صفحہ ۱۵۵
☆۴۔ بحوالہ امامِ شعر و ادب از محمد وارث جمال، صفحہ ۱۶

استعاراتی زبان استعمال کی گئی ہے:

طلع البدر علینا — من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا — ما دُعا للہ داع

''ہم پر وداعی ٹیلوں کے پیچھے سے چاند طلوع ہوگیا۔ اللہ کے لیے پکارنے والے کی دعوت پر ہمارے لیے شکرادا کرنا ضروری ہے۔''☆۱

خود سرکار دو عالم ﷺ کے خانوادہ میں شعر وسخن کا ستھرا مذاق اور شاعری کے چرچے عام تھے۔ آپ کے چچا حضرت ابوطالب ابن عبدالمطلب کے علاوہ حضرت حمزہ اور حضرت عباس بن عبدالمطلب کے بھی نعتیہ اشعار ملتے ہیں اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے شانہ بہ شانہ عبداللہ بن رواحہ، کعب بن زہیر، جعفر طیار، لبید، زہیر عباس بن مرداس، متمم بن نویرہ اور ابن زبعری جیسے عظیم المرتبت السَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن شعرا اپنی متاعِ عقیدت کے لیے سرکار کے حضور حاضر نظر آتے ہیں۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے انتہائی جاں نثاروں میں تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ شاہی شاعر، زمانۂ نبوت میں شاعرِ رسالت مآب اور اسلام میں یمنیوں کے شاعر تھے۔ اسلامی مؤرخین نے انھیں ''شاعرِ دربارِ نبوی'' کے خطاب سے سرفراز فرمایا ہے۔ آپ کا یہ مشہور قصیدہ عربی قصائد میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ ابتدائی دو اشعار اس طرح ہیں:

اَلصُّبْحُ بَدَا مِنْ طَلْعَتِہٖ — وَالَّیْلُ دُجَا مِنْ وَّفْرَتِہٖ
ان کے چہرۂ انور سے صبح ظاہر ہوئی — اور زلفِ مبارک سے رات سیہ پوش ہوئی
فاق الرسلا فضلا وعلا — وھدی السلا بدلالتہٖ
تمام انبیا پر فضل و بلندی میں سبق لے گئے — اپنی رہنمائی میں راہِ حق کی ہدایت کی

عربی قصیدہ نگاروں میں حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کا نام بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا مشہورِ عالم قصیدہ ''بانت سعاد'' لامیہ قصیدہ ہے جو عربی ادب کا شاہکار تسلیم کیا جا چکا ہے۔ یہ وہ قصیدہ ہے جس نے بارگاہِ نبوت کے واجب القتل گستاخ کعب کو کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ بنا دیا۔ حضور ﷺ نے انھیں معاف فرما کر اپنی رحمت و نور سے شرابور ایک مقدس چادر شریف بہ طورِ انعام مرحمت فرمائی۔ اس قصیدہ کے دو اشعار اس طرح ہیں:

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِیْ اَلْیَوم مَبْقُوْلُ — مُتِمٌ اَثْرُھَا لَمْ یَفِدْ مَکْبُوْلُ
اَنَّ النَّبِیَّ لَنُوْرٌ یُسْتَضَاۗءُ بِہٖ — مُھَنَّدُ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ مَسْلُوْلُ

☆۱۔ بہ حوالہ نعت رنگ ۵، صفحہ ۱۵۶

خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضور پرنور ﷺ کے ان جاں نثاروں میں تھے جن کی مثال ہی نہیں۔ یہ اسلام کے عظیم محافظین میں تھے۔ آپ ﷺ کے والہ و شیدا اور سچے مداح تھے۔ جب آپ ﷺ پردہ فرما گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے فرقتِ غم، اضطراب اور بے قراری کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:

علیٰ خیر خندف عند البلا

ءِ امسیٰ یغیبُ فی الملحدِ

خندف کے بہترین فرزند پر آنسو بہا جو غم والم کے ہجوم میں سرِشام گوشۂ قبر میں چھپا دیا گیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی آپ کے غم میں یوں آنسو بہاتے نظر آتے ہیں:

یا عَیۡنُ فابکی و لا تسامِیُ　　　وحق البکاء علی السیدِ

تو اے میری آنکھ آنسو بہا اور نہ تھک　　　اپنے سردار پر آنسو بہانا تو لازم آچکا

(مذکورہ شعر کا انتساب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے غلط ہے۔ یہ شعر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جسے ابنِ سعد نے روایت کیا ہے۔ صبیح رحمانی)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے نعتیہ اشعار میں اپنی عقیدت و محبت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

و کان لفا کالحصن دون اھلہٖ　　　لہٗ معقلٌ حرزٌ حریز من الرویٰ

رسول ہمارے لیے مضبوط قلعہ تھے کہ ہر دشمن سے پناہ اور حفاظت حاصل ہوتی تھی۔

و کنا بمر آہ نرا النور و الھدیٰ　　　صباحاً مساءً راحض فینا اوا عتدیٰ

جب ہم ان کو دیکھتے تو سراپا نور و ہدایت کو دیکھتے صبح بھی اور شام بھی۔ جب وہ ہم میں چلتے پھرتے یا صبح کو گھر سے نکلتے۔

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ اور خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہما بھی سرکار کی مدح سرائی اور نعت خوانی میں صحابۂ کرام سے پیچھے نہیں۔ انھوں نے بھی آپ کی شانِ اقدس میں جو کلام پیش کیے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

متی یدفی الدجیٰ البیھم جَبِیۡنہٖ　　　نظام الحق و او نکل لملحدِ

اندھیری رات میں ان کی پیشانی نظر آتی ہے تو اس طرح چمکتی ہے جیسے روشن چراغ۔

فمن کان او من قد یکون کاحمد　　　الایشم مدالزمان غالیا

احمد مجتبیٰ کے جیسا کون تھا اور کون ہوگا حق کا نظام قائم کرنے والا اور ملحدوں کو سراپا عبرت بنانے والا۔

اور خاتونِ جنت کا یہ انداز دیکھیے:

ماذا علیٰ من شم تربۃ احمد الا یشم مدالزمان غوالیا

جس نے ایک مرتبہ بھی خاکِ پائے احمد مجتبیٰ سونگھ لی تعجب کیا ہے وہ اگر ساری عمر کوئی اور خوش بو نہ سونگھے۔

صبت علیٰ مصائب لو انھا صبت علیٰ الایام عدن لیا لیا

حضور کی جدائی میں وہ مصیبتیں مجھ پر ٹوٹی ہیں کہ اگر یہ مصیبتیں دنوں پر ٹوٹتیں تو وہ راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی مشہور نعت اس طرح شروع ہوتی ہے:

رُوْجی الُفِدٰ لمن اخلاقِہٖ شُدِثُ بانہ خَیُر مَوجُوُدِ مِّنَ البَشَرُ

میری جان اس پر قربان جس کے اخلاق گواہ ہیں کہ وہ سارے انسانوں میں افضل ہیں[☆۱]

آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک جن شعرا کے اسمائے گرامی کتابوں میں ملتے ہیں ان میں ابن بناتہ مصری، امام اعظم ابوحنیفہ کوفی (م:۷۶۷ء)، ابن حجۃ الحموی (م: ۸۳۹ء)، ابوالعتاہیہ (م: ۸۲۶ء)، ابوعلی بن المستنبر (م: ۸۲۱ء)، ہمزیۃ البوصیری (م: ۱۲۹۶ء)، شیخ جمال الدین الصرصری اور ابن العربی ابوبکر محی الدین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ کوفی علیہ الرحمہ بارگاہِ رسالت میں نذرانۂ عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں:

یَا سَیِّد السَّادَات جئتک قاصداً ارجو ارضاک واحتمی بحماک

اے سرداروں کے سردار میں آپ کے حضور آیا ہوں۔ آپ کی خوش نودی کا امیدوار آپ کی پناہ کا طلب گار۔

واللہ یاخیر الخلائق اِنَّ لی قلباً مشوقا لایروم سواک

اللہ کی قسم اے بہترین خلائق میرا دل صرف آپ کی محبت سے لبریز ہے۔ وہ آپ کے سوا کسی کا طالب نہیں۔

انست الذی لولاک ماخلق امرءٌ کلا ولا خلق الوریٰ لولاک

☆۱۔ بہ حوالہ اُردو کی نعتیہ شاعری، طلحہ رضوی برق، صفحہ ۸

آپ اگر نہ ہوتے تو پھر کوئی شخص ہرگز پیدا نہ کیا جاتا اور اگر آپ مقصود نہ ہوتے تو یہ مخلوقات پیدا نہ ہوتیں۔

ابوالعتاہیہ نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے میں عشق واردات کے پھول اس طرح نچھاور کیے ہیں:

علی رسول اللہ منی السّلام ما کان إلا رحمۃ للانام

احیا بہ اللہ قلوبا کما احیا موات الارض صوب الغمام

اکرم بہ للخلق من مبلغ دھاد و للناس بہ من امام

ترجمہ: (۱) رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام ہو۔ آپ سارے جہان کے لیے سرتاپا رحمت تھے۔

(۲) اللہ نے آپ کے ذریعہ انسانوں کے مردہ قلوب کو اس طرح زندہ کر دیا جس طرح تیز بارش کے بعد خشک (مردہ) زمین زندہ (ہری بھری) ہو جاتی ہے۔

(۳) خلقِ خدا کے لیے کتنے عظیم المرتبت دعوتِ حق کے پہچانے والے ہیں اور لوگوں کے لیے کتنے بڑے رہنما ہیں۔ (یعنی آپ کی قدر و منزلت کی کوئی انتہا نہیں ہے)

مذکورہ تیرھویں صدی عیسوی کے اہم شعرا میں ہمزیۃ البوصیر علیہ الرحمٰن (المتوفی ۱۲۹۶ء) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مصنف ''امامِ شعر و ادب نے دیباچہ ''شمیم الوردہ شرح قصیدہ بردہ'' کے حوالے سے یہ عبارت نقل کی ہے:

> ''مداحِ رسول امام بوصیری کے قصیدہ بردہ شریف اور اس کے محاسن شعری پر آج بھی عربی ادب کو ناز ہے۔ درد و کرب، اضطراب و بے چینی، عشق و محبت، فصاحت و بلاغت، حلاوت و ملاحت اور حسنِ بیان کے اعتبار سے تو قصیدہ بردہ خود اپنی مثال ہے۔ عجمی تو دُور رہے عربی بھی آج تک کوئی قصیدہ ایسا نہیں لکھ سکا جو معانی اور حسنِ بیان میں اس کے مقابل لایا جا سکتا ہے کہ حضرت ملا علی قاری، علامہ تفتازانی، جلال الدین محلی شافعی صاحبِ جلالین، امام قسطلانی شارح بخاری، مفسر بیضاوی فاضل زرکشی، امام احمد خفا جی جیسی عظیم ترین شخصیتیں اس قصیدہ کے شارحین کے صفِ اوّل میں نظر آ رہی ہیں۔''☆

قصیدے کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

☆۱۔ بحوالہ امامِ شعر و ادب، صفحہ ۱۸۔۱۹، حق اکادمی مبارک پور اعظم گڑھ

اَمِنْ تَذَکُّرِ جِیْرَانٍ بِذِیْ سَلَمٖ
مَزَجْتَ دَمْعاً جَریٰ مِن مُقْلَۃٍ بِدَمٖ

''کیا ذی سلم کے پڑوسی یاد آ گئے جن کی یاد میں تمھاری آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی ہیں۔''

ذی سلم مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک مقام کا نام اور پڑوسی سے مراد حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ فصل اوّل عشقِ رسول کے ذکر میں بارہ اشعار پر مشتمل ہے جو سوز و اضطراب، درد و کرب، آرزوئے شوق اور والہانہ جذبات کا بہترین مرقع ہے۔ زبان و بیان کی قدرت، حسنِ اسلوب اور سوزِ دروں کی تاثیر سے مزین اس تخلیقی شاہکار کے چند اشعار پیش ہیں:

مُحَمَّد سیّدِ الکونین وَالثَّقلین وَالْفَرِیْقَیْنِ مِن عَربٍ و من عجمٖ
هو الحبیب الذی ترجی شفاعۃ لکل هول من الاهوال مقتحمٖ
مُنَزَّہٌ عَنْ شَرِیکٍ فی مَحَاسِنِہٖ فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِیْہِ غَیْرُ مُنْقَسِمٖ

محمد ﷺ دونوں جہاں، جن و انس، عرب و عجم کے سردار ہیں۔ آپ اللہ کے ایسے حبیب ہیں جن سے خوف و دہشت کے ہر موقع پر سفارش کی امید کی جاتی ہے۔ آپ اپنی ذاتی و صفاتی خوبیوں میں وحدہٗ لاشریک ہیں اور سرکار کا جوہرِ حسن ایسا لطیف ہے جو تقسیم ہو ہی نہیں سکتا۔

شیخ جمال الدین الصرصری (م: ۱۲۵۸ء) بارگاہِ نبوی ﷺ میں درود و سلام کا نذرانہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

یا نبی الهدیٰ علیک السّلام کما عاقب الضیاء الطلام

اے پیغمبرِ ہدایت! آپ پر سلام ہو، جب جب تاریکی کا تعاقب روشنی کرے (یعنی رات دن ہمیشہ ہمیشہ)

زادک اللہ رفعہ جلالاً وبهاءً و عزۃ الترامُ

بڑھاتا ہے اللہ آپ کی بلندی، عظمت، شکوہ اور اس عزت کو جس کو کوئی چھو نہ سکے۔

چودھویں صدی عیسوی کے نعت گو شعرا میں شیخ عبدالرحیم البرعی اور عبدالرحمٰن ابن خلدون بہ طورِ خاص ہیں۔ شیخ عبدالرحیم البرعی (م: ۱۴۰۰ء) بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں یوں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں:

اذا انسبو المکار و المعانی فانست لها تمام و ابتداء

جب سیرت اور کردار کی بلندیوں اور خاندانی شرافت کا ذکر ہوگا تو اس کی ابتدا اور تکمیل دونوں آپ کی ذات سے منسوب ہوں گی۔

اذا الفخر انتهیٰ شرفاً فحاشا وکلاما لفخر کم افتها

اگر دُنیا کا سرمایہ ختم ہو جائے پھر بھی آپ کے لیے فخر کی باتیں ہیں وحاشا وکلا کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔

پندرھویں صدی عیسوی کے کامیاب نعت گو شعرا میں علامہ ابن حجر (م: ۱۴۴۸ء) کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، ان کے نعتیہ قصیدے کے چند اشعار اس طرح ہیں:

کریم بالحیا من واحتیہ یجود فی المحیا بالحیاء

وہ ایسے سخی ہیں کہ آپ کے دونوں ہاتھوں بخشش و عطا کا مینہ بس رہا ہے اور چہرۂ انور پر حیا اور شرم نمایاں رہتی ہے (یعنی سخاوت کر کے آپ کے اندر نعوذ باللہ کبر نہیں پیدا ہوتا بلکہ جس طرح لینے والی نگاہیں شرم سے جھکی رہتی ہیں اسی طرح دے کر اور بخشش فرما کر حیا آپ کے چہرۂ انوار سے ظاہر ہوتی ہے۔)

نبی اللہ یا خیر البرایا بجاھک اُتقی فصل القضاء

اے رسولِ خدا! اے سب سے برگزیدہ انسان، آپ کے طفیل اللہ سے حشر کے دن کی رسوائی سے پناہ مانگتا ہوں۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے دو اہم شعرا میں علامہ آزاد بلگرامی اور شاہ ولی اللہ کو بھی نعت نگاروں میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔ عربی زبان میں ان حضرات کی نعتوں کا مرتبہ زبان و بیان کے اعتبار سے کسی طرح کم نہیں۔ علامہ آزاد بلگرامی (م: ۱۷۸۶ء) کے یہ اشعار حضور ﷺ کی شان میں اس طرح ہیں:

شھب السمآء باسرھا مصنوعة من نور ھذا الکوکب المتوقد

آسمان کے سب تارے اس روشن ستارے کے نور سے بنے ہوئے ہیں۔

آزادؔ یرجو من جنابک نظرة انجع مرام السائل المتوصد

آزاد آپ کے درِ دولت پر کھڑا ہوا نگاہِ کرم کا منتظر ہے۔ اس سائل کے مقاصد کو برلایئے جو آپ کی عنایت کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہے۔

انیس ویں صدی عیسوی کے اہم شعرا میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی (م: ۱۸۶۱ء) اور شیخ حسین وجانی کو نعت گوئی میں کمال حاصل رہا ہے۔ علامہ فضلِ حق خیر آبادی اپنی عقیدت و محبت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ان الرسول لقد فاق و عترتہ سفینہ مسواھا الجود لا لجودی

بلاشبہ رسولِ اکرم سب سے بڑھ گئے اور ان کی عزت ایک کشتی ہے جس کا مقام جود ہے، جودی نہیں۔

انشدتک فاقبل مدحتی کرماً   حتی افوز بانشادی بمنشودی

میں نے آپ کے حضور یہ مدح پیش کی ہے، اپنی کرم گستری سے قبول فرمایئے تا کہ میں اس شعر خوانی کے ذریعے دامنِ مقصود بھر پاؤں۔

مذکورہ نعت گو شعرا کے علاوہ حضرت زین العابدین (م: ۷۱۲ء)، حضرت ابوسفیان (م: ۶۴۱ء)، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، شیخ عبدالغنی النابلسی (م: ۱۷۳۰ء)، شیخ عبداللہ شبراوی (م: ۱۷۵۸ء)، مولانا شاہ رفیع الدین (م: ۱۸۱۸ء)، مولانا شاہ عبدالعزیز (م:۱۸۲۴ء)، کعب بن مالک محمد جاء اللہ السمبودی اور شہاب الدین محمود الحلبی کے اسمائے گرامی بھی عربی نعت گوئی میں محتاجِ تعارف نہیں۔[☆۱]

''عہدِ صحابہ فرزدق اور عباسی دور میں متنبی اپنی نعتیہ شاعری کے لیے بہت ہی ممتاز رہے ہیں۔''[☆۲]

غرض کہ مذہبِ اسلام کے ساتھ نعت گوئی کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا گیا۔ اور جب اسلام کی ضیا پاشی نے عجم کو منور و مسخر کیا تو عجمی شاعری حجازی لے سے اس طرح ہم آہنگ ہوئی کہ عشق و ایمان کو اور بھی تر و تازہ کر گئی۔ فارسی شعرا کی فہرست میں علامہ جامی، قدسی، شوقی، خاقانی، نظیری، انوری، حافظ، ظہوری اور سعدی شیرازی جیسے شہرۂ آفاق شعرا اپنے تمام تر شعری سرمایے کے ساتھ اپنی آفاقی حیثیت کی علم برداری کرتے ہوئے بارگاہِ نبوت میں والہانہ نیاز مندی اور عقیدت کے ساتھ نظر آرہے ہیں۔ شیخ سعدی کا یہ عربی قصیدہ اہلِ عرب سے بھی خراجِ تحسین لیتا رہا ہے:

بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ   کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ   صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

اور حضرت عبدالرحمٰن جامی نے بارگاہِ رسول میں یوں عرض کیا:

یَاصَاحِبَ الْجَمَالُ وِیَا سَیِّدَ الْبَشَرُ   مِنْ وَجُھِکَ الْمُنِیْرِ لَقَدْ نَوَّرَ الْقَمَرُ

لَایُمْکِنِ الثَّنَآءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ   بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

اے سراپا حسن و جمال اور اے بشریت کے تاجدارِ اعظم چاند کی چمک دمک آپ ہی کے روئے انور سے ہے۔ کما حقہٗ تو آپ کی ثنا و تعریف ممکن ہی نہیں۔ بس مختصر بات یہ ہے کہ خدا کے بعد شرف و بزرگی میں آپ ہی کا مرتبہ ہے۔

اس طرح عربی کی نعتیہ شاعری عرب سے ایران ہوتی ہوئی جب ہندوستان میں قدم

☆۱۔ بہ حوالہ بہار میں اُردو کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ، صفحہ ۶۰

☆۲۔ اُردو کی نعتیہ شاعری، از ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، صفحہ ۹

رکھتی ہے تو اپنے وقت کے مجددِ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی بارگاہِ رسالت میں یوں گویا ہوتے ہیں:

رَسُوْلُ اللّٰہ اَنْتَ الْمُسْتَجَارُ　　فَلا اَخْشی الْاَعَادِی کَیْفَ جَارُ

بِفَضْلِکَ اَنْ تَجِیءَ عَنْ قَرِیْبٍ　　تُمَزِّقُ کَیْدَھُمْ وَالْقَوْمُ بَارُ

اے اللہ کے رسول آپ پناہ گاہ ہیں۔ لہٰذا میں دشمنوں سے ذرا بھی خائف نہیں کہ وہ کس طرح ظلم وستم ڈھائیں؟ مجھے آپ کے لطف وکرم سے توقع ہے کہ آپ جلد ہی دشمنوں کے مکر وفریب کے دام کو چاک فرما دیں گے اور دشمنوں کا گروہ ہلاک ہو جائے گا۔[☆۱]

تذکرہ نویسوں کے مطابق فارسی کے اوّلین شعرا میں ابوحفص سعدی اور عباس مروی کا نام آتا ہے۔ طاہر دور (۲۰۵-۲۵۹ھ) کے شعرا میں حنظلہ باوغیسی صاحبِ دیوان اور فیروز مشرقی، صفاری دور (۲۴۵-۲۹۰ھ) کے شعرا میں ابوسلیک گرگانی اور محمد بن وصیف اور سامانی دور (۲۶۱-۳۸۹ھ) کے مشہور ومقبول شعرا میں حکیم کسائی مروزی اور اُردو کا شمار ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا فارسی گوشعرا کے یہاں صنفِ نعت کا سراغ نہیں ملتا تاہم آخرالذکر کے یہاں اخلاقی پند ونصائح، دینی قصائد اور حکیمانہ اشعار ضرور ملتے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کا غزنوی دور اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور میں فردوسی جیسا شاعر منظرِ عام پر آیا جس نے شاہنامہ لکھ کر فارسی شاعری کو وقار بخشا، اس نے اپنے شاہنامہ کے آغاز میں ''گفتار اندر ستائش پیغمبر'' کے عنوان سے جو اشعار قلم بند کیے ہیں ان میں رسالت مآب ﷺ کے ذکر کے ساتھ دیگر پیغمبروں کے تذکرے بھی ملتے ہیں تاہم انھیں نعت گوئی کی ترقی یافتہ شکل نہ مان کر صنفِ نعت کے ابتدائی نقوش ہی تسلیم کر لیے جائیں تو فارسی کی تاریخ میں نعت گوئی کی اوّلیت کا سہرا فردوسی کے سر جاتا ہے۔ فردوسی کے چند اشعار بہ طورِ نمونہ اس طرح ہیں:

نبی آفتاب و صحاباں چوں ماہ　　بہم بستۂ یک دیگر راست راہ

صنم بندۂ اہلِ بیتِ نبی　　ستایندۂ جان پاک وصی

حکیم ایں جہاں راچوں دریا نہاد　　برانگیختہ موج از و تندباد

جوں ہفتاد کشتی برو ساختہ　　ہمہ بادِ بادِ نہا بر افراختہ

یکی پہن کشتی بسانِ عروس　　بیا راستہ ہچوں چشم فروش

محمد بدو اندروں با علی　　ہمہ اہل بیتِ نبی و ولی

☆۱۔ بہ حوالہ حدائق بخشش حصہ ۳، صفحہ ۹۳

سلجوقی دور کے اہم شعرا میں حکیم سناؔئی، شیخ فرید الدین عطاؔر، فخر الدیؔن گرگانی، انورؔی، خاقانی اور نظاؔمی فارسی شاعری کے اہم ستون شمار کیے جاتے ہیں۔ ان حضرات کو بھی اپنی شاعری کو نعتیہ اشعار سے آراستہ کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ حکیم سناؔئی اپنے نعتیہ اشعار میں، جو مثنوی کے فارم میں ہیں، بارگاہِ نبوت میں والہانہ نیازمندی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

صد ہزاروں درود و باد و سلام — برگزارند گانِ حق پیغام
خاصہ بر فخر دورہٗ آدم — اصل کونین و سیّد عالم
زبدہٗ کائنات و حاصلِ کل — سرورِ انبیا و ختمِ رُسل
پیش از آدم حبیب حق و نبی — جان جانہا محمد عربی
ہم چنیں فیض حق و رضوانش — باد بر اہلِ بیتِ و یارانش

شیخ فرید الدین عطار کا شمار صوفی شاعروں میں ہوتا ہے۔ قصیدہ نگاری میں انھیں ممتاز مقام حاصل ہے، تاہم کسی کی بے جا مدح سرائی سے خود کو دور رکھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

بعمر خویش مدح کس نگفتم

موصوف کے چند نعتیہ اشعار پیش ہیں جو مثنوی کے فارم میں ہیں:

محمد کو سر افراز عرب بود — وجودش ور دریائی طلب بود
سراجے کآفتاب از روئے اُوتافت — مہ نوا زخم ابروی او تافت
ملک برخاک پایش بوسہ دادہ — فلک بر آستانش سرِ نہادہ
شبِ معراج از آنجا برگزشتہ — کہ عقل از وصف آں مدہوش گشتہ

فخر الدین گرگانی (۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء) بہ حضور سرورِ کونین ﷺ اپنی عقیدت کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں:

کنوں گویم ثنائے پیمبر — کہ مارا سوئے یزدانست رہبر
چوں گمراہی ز گیتی سر برآورد — شب بے دانستی سایہ بگسترد
بفضلِ خویش یزداں رحمت آورد — ز رحمت نور در گیتی بگسترد
برآمد آفتاب راست گویاں — خجستہ رہنمائے راہ جویان
چراغِ دین ابو القاسم محمد — رسولِ خاتم و یٰسین و احمد

اور نظامی گنجوی بارگاہِ رسالت میں درود و سلام کا نذرانہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

محمد کافرینش ہست خاکش — ہزاران آفریں ہر جان پاکش

چراغ افروز چشمِ اہل بینش طراز کار گاہ آفرینش
سرد سرخیل میدانِ وفا را سپہ سالار جمع انبیا را

مغلیہ اور تیموری دور کے معروف نعت گو شعرا شیخ سعدی، رومیؔ، امیر خسروؔ، حافظؔ شیرازی اور جامیؔ بہ طورِ خاص ہیں۔ شیخ سعدیؔ کو غزل گوئی اور مثنوی نگاری میں اہم مقام حاصل ہے۔ نعت کے چند اشعار جو بوستاں سے ماخوذ ہیں۔ اس طرح ہیں:

کریم السجایا جمیل الشیم نبی البرایا شفیع الامم
امام رسل پیشوائے سبیل امینِ خدا مہبط جبرئیل
شفیع الوریٰ خواجۂ بعث و نشر امام الہدیٰ صدر دیوانِ حشر
کلیمی کہ چرخِ فلک طور اوست ہمہ نورہا پرتوِ نور اوست

''مثنوی معنوی'' مولانا جلال الدین رومیؔ کی اہم ترین تصنیف ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ:

''ہست قرآں در زبانِ پہلوی''

رومیؔ کا شمار فارسی شاعری میں محتاجِ تعارف نہیں۔ مثنوی نگاری میں ان کا ایک اہم مقام و مرتبہ ہے۔ سرکار ﷺ کا ذکر اور اپنی عقیدت و محبت کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں:

بود در انجیل نام مصطفیٰ آں سر پیغمبراں بحر صفا
بوسہ دادندی برآں نامِ شریف رونہا دندی بداں وصفِ لطیف
نام احمد ایں چنیں یارے کند تا کہ نوش چوں نگہدار کند
نام احمد چوں حصاری شد حصین تاچہ باشد ذات آں روح الامین

اور رومیؔ کے پیر و مرشد، شمس تبریزی کے نعتیہ اشعار اس طرح ہیں:

یارسول اللہ حبیبِ خالقِ یکتا توئی برگزیدہ ذوالجلال پاک بے ہمتا توئی
شمس تبریزی چہ داند نعت تو پیغمبرا مصطفیٰ و مجتبیٰ و سیّد اعلیٰ توئی

حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ کی نعت کا ایک شعر اس طرح ہے:

درجاں چوکرد منزل جاناں ما محمد صد در کشاد در دل از جان ما محمد

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی دہلوی علیہ الرحمہ کے نعتیہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ ایک شعر اس طرح ہے:

صبا بہ سوئے مدینہ روکن ازیں دُعا گو سلام برخواں
بگرد شاہِ مدینہ گردد بصد تضرع پیام برخواں

حضرت امیر خسرو کو اپنے پیش روؤں میں اہم اور امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار جو غزل کے فارم میں ہیں۔ لاجواب ہیں۔ چند اشعار دیکھیے :

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم ... بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم

پری پیکر نگارے سرو قدے لالہ رخسارے ... سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود ، اندر لامکاں خسروؔ ... محمد شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

اور حضرت جامیؔ کے یہ نعتیہ اشعار جن پر فارسی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے ''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید'' ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

نسیما جانبِ بطحا نظر کن ... ز احوالم محمد را خبر کن

بہ شوقت جاں بلب آمد تمامی ... فقم قم یا حبیبی کم تنامی

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب ... ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

برہر کہ تافت پرتوِ انوارِ مہر تو ... شد سرخروی در ہمہ آفاق چوں شفق

جامیؔ کجاست نعت تو اما بکلکِ شوق ... برلوح صدق ز در قمے کیف ماتفق

صفوی اور قاچاری دور ادبی تاریخ کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔

صفویوں اور قاچاریوں نے تقریباً (۹۰۵ھ-۱۳۴۳ء) چار سو سال ایران پر حکومت کی، ان ادوار میں ادب کے ساتھ نعت گوئی کو بھی کافی عروج ملا۔ اس دور کے اہم شعرا میں عرفیؔ شیرازی، حضرت محمد جان قدسیؔ، بابا فغانی، ہلالیؔ چغتائی، فیضیؔ، عبدالقادر بیدلؔ اور قاآنیؔ کے نام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا کو نعت گوئی میں اہم مقام حاصل ہے۔ بالخصوص عرفیؔ شیرازی نے بارگاہِ بے کس پناہ میں جو عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے ہیں ان سے اس کے عشقِ رسول اور اس کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے:

دوراں کہ بود تا کند آرایش مسند ... مداح شہنشاہ عرب را و عجم را

آرایش ایوان نبوت کہ ز تعظیم ... خاک در او تاج شرف داد قسم را

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن ... نعت شہ کونین و مدیح کے وجم را

عرفیؔ مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست ... آہستہ کہ رہ بردم تیغ ست قدم را

(قصائد عرفی، صفحہ ۴-۵)

اور محمد جان قدسیؔ (م: ۱۰۵۶ء) کی مشہور نعت ''مرحبا سیّد مکی العربی'' کا شمار فارسی کی شاہکار نعتوں میں ہوتا ہے:

مرحبا سیّد مکی مدنی العربی دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

من بے دل بجمال تو عجب حیرانم اللہ اللہ چہ جمال ست بدیں بوالعجبی

فیضیؔ (م: ۱۰۰۴ء) کو دربارِ اکبری سے ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ قصیدہ نگاری اور غزل گوئی میں جہاں ان کو خاص مقام حاصل ہے۔ وہیں ان کی نعتیہ اشعار بھی عشق و ایمان کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں:

چابک قدم بساط افلاک والا گہر محیط ''لولاک''

قدرش بزمانہ ماہ اکلیل نورش بفلک چراغ و قندیل

مرزا عبدالقادر بیدلؔ (م: ۱۱۳۳ء) نے ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کہے ہیں جن میں شاعری کی مروّجہ تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ نعت گوئی میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ چند اشعار بہ طورِ نمونہ:

محمد شہِ محفل قدس ذات محیط خم ہستی کائنات

شب کاں سہ کشور بے خلل قدم زد معراج فیض ازل

ز لفظ محمد گر آگہ شوی ادا فہم الحمد لِلّٰہ شوی

قاآنیؔ، صائبؔ کے بعد صفوی اور قاچاری دور کے اہم ایرانی شاعر ہیں۔ اُن کو قصیدہ نگاری میں کمال حاصل تھا۔ ان کے نعتیہ اشعار میں سلاست و روانی اور تشبیہات و استعارات کی فراوانی کے ساتھ عجز و انکساری اور خلوص و عقیدت بدرجۂ اتم موجود ہے:

ذات تو سرفراز بہ تمجید ذو المنن نفس تو بے نیاز، ز تقدیس اصفیا

از گوہرِ تو عالم ایجاد را شرف از ہستیِ تو دوحۂ ابداع را نما

اخلاف راشدین تو گنجینۂ شرف اسلاف ماجدین تو آئینۂ صفا

غمگیں شود بہر چہ تو غمگیں شوی جہاں شاداں شود بہر چہ تو شاداں شوی خدا

غیر منقسم ہندوستان میں نعتیہ شاعری کی ابتدا بہ قول محمد وارث جمال حضرت سلطان شہاب الدین التمش کے عہد سے ہوئی۔ اس دور کے ایک شاعر حضرت شہاب الدین مہمرہ بدایونی (م: ۷۰۱ھ) کے اشعار اس کے ثبوت میں ملتے ہیں:

شہ تخت کن محمد کہ سرادق شرف زد بسوئے در مبین ز سرائے امہانی

بشرے ملک لطافت فلکی زمیں توازع چوں فلک بہ پاک جسمے چوں ملک بہ پاک جانی

شکریں زباں رسولے کہ بود نجاتِ اُمت به عقیدۂ زبانش ز عقیلۂ زبانی[۲۱]

غالبؔ، اقبالؔ اور اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کی فارسی نعتیہ شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان تینوں شعرا کی شاعرانہ حیثیت مستند و مسلم ہے۔ غالبؔ (م:۱۸۶۹ء) رسالت مآب ﷺ کے سچے عاشق اور مداح تھے۔ یہاں چند اشعار بہ طورِ نمونہ پیش ہیں:

حق جلوہ گر ز طرز بیانِ محمد ست آرے کلام حق بہ زبانِ محمد ست

آئنہ دار پرتو مہرست ماہتاب شانِ حق آشکار ز شانِ محمد ست

دانی اگر بہ معنی لولاک دارسی خود ہرچہ از حقست از آنِ محمد ست

اور غالبؔ کا یہ مقطع:

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمد ست

عشق وعرفان سے بھرپور ہے۔

غالبؔ اور اقبالؔ کے طرزِ بیان اور اندازِ فکر میں نمایاں فرق ہے۔ تاہم جذبۂ عشق محمد ﷺ میں کوئی ایک دوسرے سے کم نہیں۔ غالبؔ کی طرح اقبالؔ کے یہاں بھی جذبے کی شدت اور خلوص کی گہرائی کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ مگر کچھ اور انداز میں۔ اقبالؔ کا یہ شعر دیکھیے:

اے ظہور تو شباب زندگی جلوہ ات تعبیر خواب زندگی

اے زمیں از بارگاہیت ارجمند آسماں از بوسۂ بامت بلند

شش جہت روشن ز تاب روئے تو ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو

در جہاں شمع حیات افروختی بندگاں را خواجگی آموختی

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی کو اُردو، فارسی اور عربی، ہر سہ زبان کی نعتیہ شاعری میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کو عاشقِ صادق اور نعت گوئی کا امام بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی امتیازی خصوصیت عشقِ رسول ہے:

بکارِ خویش حیرانم اغثنی یا رسول اللہ پریشانم پریشانم اغثنی یا رسول اللہ

شہا بے کس نوازی کن طبیبا چارہ سازی کن مریضِ دردِ عصیانم اغثنی یا رسول اللہ

رضاؔ یت سائل بے پر توئی سلطان لاتنہر شہا بہر ازیں خوانم اغثنی یا رسول اللہ

اس مختصر سے مضمون میں عربی و فارسی کے نعتیہ اشعار احاطۂ تحریر میں لانے کا صرف یہ مقصد تھا اور ہمیں یہ دکھانا مقصود تھا کہ نعتیہ شاعری غزل یا دیگر اصناف کی طرح نئی نہیں بلکہ اس کی جڑیں ظہورِ اسلام کے زمانے سے وابستہ و پیوستہ ہیں نیز یہ کہ فنِ نعت گوئی کی تدریجی ارتقا میں عربی و فارسی

کے شعرا کی کیا خدمات رہیں اور یہ فن ارتقائی منزل سے گزرتا ہوا کس طرح اُردو زبان تک پہنچا ہے۔

اب ہم آئندہ صفحات میں اُردو کی نعتیہ شاعری کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ نعتِ پاک اُردو زبان میں ڈھل کر کس طرح دلوں کو مسخر کرتی ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں نعتیہ شاعری کا آغاز عہد بہ عہد جن حالات کے زیرِ اثر ہوا اور نعت و منقبت مختلف منازل و مراحل سے گزرتی ہوئی ارتقا پذیری کے حدود میں جس شانِ امتیازی کے ساتھ داخل ہوئی، انھیں احاطۂ تحریر میں لانے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ تاہم اس حقیقت کا اعتراف یقینی طور پر کیا جا سکتا ہے کہ نعت گوئی کی نشوونما اُردو زبان ہی کی طرح صوفیائے کرام کے روحانی فیوض و برکات کے زیرِ سایہ ہوئی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ دکن میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ اُردو زبان میں آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوا۔ مختلف اصنافِ سخن کی طرح نعت و منقبت نے بھی لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس ضمن میں فیروز شاہ بہمنی دور کے ایک صوفی بزرگ و شاعر حضرت بندہ نواز گیسو دراز کا نام آتا ہے جو نصیر الدین چراغ دہلوی کے مرید اور جانشین تھے۔ ''معراج العاشقین''، ''ہدایت نامہ''، ''شکار نامہ'' اور ''تلاوت الوجود'' آپ کی اہم تصانیف ہیں۔ نعت و منقبت میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ رسالت مآب ﷺ کی شان میں رقم طراز ہیں:

اے محمد ہجلو جم جم جلوہ تیرا ذات تجلی ہوئیگی سیس سہیو رنہ سیرا
واحد اپنی آپ تھا اپیں آپ نبھایا
پرکۂ جلوے کار نے الف میم ہو آیا
عشقوں جلوہ دینے کر کاف نور بسایا

آپ کے فرزندِ ارجمند سیّد محمد اکبر حسین (المتوفی ۸۲۳ھ) کا ایک نعتیہ شعر اس طرح ہے:

بعد از ثنائے خدا کی بھیجوں درود نبی پر بھئ آل پر اس کے اصحاب پر

آج سے تقریباً چھ سو سال قبل حضرت سیّد برہان الدین ابو محمد عبداللہ المعروف بہ قطب عالم نبیرۂ سیّد الاقطاب مخدوم جہانیاں بخاری (۱۳۸۸-۷۹۰ھ) کی نعت کا مصرع اس طرح ہے:

محمد پر میں کھڑیا سائیں پریم چکھائے[☆۱]

شیخ بہاؤ الدین باجن (۹۱۲ء-۷۹۰ھ) کا حسبِ ذیل شعر ابتدائی اُردو کا نمونہ ہے:

☆۱۔ بہ حوالہ اُردو کی نعتیہ شاعری، از طلحہ رضوی برق

محمد سرور پریم کا رحمت اللہ بھریا
باجن جیوڑا وار کر سر آگیں دھریا

دکن میں بہمنی دور کے ایک مشہور ومقبول شاعر فخر الدین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا زمانۂ تصنیف ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء تا ۸۳۹ھ/ ۱۴۳۵ء کے درمیان قیاس کیا جاتا ہے جسے اُردو کی ابتدائی اور قدیم تر تصنیف کہا گیا ہے۔ آغازِ کتاب میں مثنوی کے فارم میں ایک نعت قلم بند کی گئی ہے جس سے دو اشعار بہ طورِ نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

محمد بڑا راوت جگ تھا کہ شجرا چرن رائے جگ مگ تھا

―――

نبی یار سے پائے تھے جھار جھار بچارن نبی کام کرتے بچار

ٹیٹھ ہندی زبان میں لکھی گئی اس مثنوی کو محض اُردو رسم خط اور اُردو میں مروّجہ ایک لفظ کے استعمال کی بنیاد پر مصنف ''اُردو کی نعتیہ شاعری'' اس زبان کو اُردو کہنے میں تأمل کا اظہار کرتے ہیں۔ موصوف نے صرف ایک شعر بہ طورِ نمونہ پیش کیا ہے جو اُن کے خیال میں قدرے صاف شعر ہے۔ مثلاً یہ شعر:

امولک مکٹ سیس سینسار کا کرے کام نردھار کرتار کا

شمس العشاق شاہ میراں جی (المتوفی ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) کی ایک تصنیف ''شہادت الحقیقت'' ہے جس میں نعت و منقبت کے نمونے ملتے ہیں۔ حضرت کمال الدین بیابانی سے آپ کو بیعت و خلافت حاصل تھی، حمد ونعت اور منقبت کے بعد اپنے پیر ومرشد اور خاندانِ چشتیہ کا ذکر بھی قلم بند کیا ہے۔ نعت کے چند اشعار اس طرح ہیں:

محمد نبی تیرا اس پر ایمان میرا

―――

نادر اس دیں اس باج سب عالم کیرا تاج

―――

جو اس کے رخ آوے سو تیرا درس پاوے

بعد زوالِ سلطنتِ بہمنی دکن میں پانچ سلطنتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ سلطان محمد شاہ (۷۸۸ھ/۱۳۸۲ء تا ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء) کی نااہلی و ناتجربہ کاری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ملک احمد نظام الملک نے احمد نگر میں آزاد حکومتیں قائم کرلیں جو بعد میں اپنے بانیوں سے منسوب ہو کر نظام شاہی، عادل شاہی اور عماد شاہی سلطنتوں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ دوسری طرف تلنگانہ، گولکنڈہ کے صوبے دار قطب الملک

سلطان قلی نے (۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء) میں خود مختاری کا اعلان کر کے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اُردو زبان کی ترقی اور فروغ میں تاریخی نقطۂ نظر سے ان تین سلطنتوں قطب شاہی دور، گولکنڈہ (۹۰۰ھ/ ۱۴۸۵ء تا ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۹۰ء) عادل شاہی دور، بیجاپور (۸۹۵ھ تا ۱۰۹۷ھ) اور نظام شاہی دور، احمد نگر (۸۹۵ھ سے ۱۰۴۲ھ) کافی اہمیت ہے۔ نظام شاہی دور میں محمد اشرف کا نام قابلِ ذکر ہے جس نے ''نوسرہار'' کے عنوان سے ایک مثنوی قلم بند کی جس کا سنِ تصنیف ذیل کے شعر سے ظاہر ہے:

ہجرت نبی نو سو نو کہنیا اشرف نو سریو

بہ قول جناب طلحہ رضوی برقؔ:

''بیسیوں اشعار نعت کے بھی اس مثنوی میں شامل ہیں جو قدیم دکنی نمونہ ہیں۔''

اس مثنوی میں واقعۂ کربلا کا ذکر ملتا ہے جن کے شروع میں نعت و منقبت بھی شامل ہے۔ چند اشعار بہ طورِ نمونہ پیش ہیں:

نبی محمد حق رسول کیتا جن پہ فقیر قبول

دونوں جگ کیرا سرور میر جن کو چاروں یار وزیر

بوبکر صدیق ایک سرا عمر خطاب ہم دوسرا

اے دو بزرگ پیرا زاد عثمان علی دوی داماد[☆۱]

دس ویں صدی ہجری کے نام ور شعرا میں ملک محمد جائسی، شاہ علی محمد جیوگامدھنی اور خوب محمد چشتی گجراتی (۹۶۴ھ) کے اسمائے گرامی بہ طورِ خاص ہیں۔ ملک محمد جائسی کی ''پدماوت'' ایک مشہور نظم ہے جو مثنوی کے فارم میں لکھی گئی ہے۔ نعت اور منقبت کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:

چار میت جو محمد ٹھاؤں جنہ دینہ جگ نرمل ناؤں
ابا بکر صدیق سیانے پہلے صدق دین وے آنے
پن سو عمر خطاب سہائے بھا جگ عدل دیں جو آئے
پن عثمان پنڈت پر گئی لکھا پران جو آیت سنی

جیوگامدھنی گجراتی (المتوفی ۱۵۱۵ء/۹۷۳ھ) کی ایک نظم بہ عنوان ''سلطان العارفین''

☆۱۔ بہار میں اُردو کی نعتیہ شاعری، صفحہ ۸۴

ہے جو سیّد احمد کبیر کی منقبت میں ہے:

سانچا شاہ حسینی راجا ، نوکھنڈ تیری آن
سارے پیر مرید ، تمھارے پیارے کرے بکھان
سلطان انبیا کل جگ داتا را شاہ علی تن پیو
سلطان سیّدی احمدی ، راجے ساروں کا تو جیو[☆۱]

صوفی شاعر و نثر نگار خوب محمد چشتی گجراتی کی مثنویاں ''امواجِ خوبی'' اور ''خوب رنگ'' میں بھی نعتیہ اشعار ملتے ہیں:

حمد خدا کی خوب کر کہہ صلوٰۃ رسول پچھیں صف شعری کی کہے تو ہوئے قبول

''امواجِ خوبی'' میں ذیل کے چند اشعار اس طرح ہیں:

بسم اللہ کہوں چھوٹ ذات جس رحمٰن رحیم صفات
ذات اسما افعال صفات جمع مفصل چند اک ذات
ناموں محمد تس کو دیت اس تفصیل کو عالم کیت
اوسی روح ارواح تمام اوسی جیوں کے سب اجسام

مثنوی ''خوب ترنگ'' سے یہ چند اشعار:

جو سا آرسی وحدت جان جسم محمد اسے جان
ایک عکس اوس ماں جو ہوئے قلب محمد کا بے سوئے
ایک عکس پھر ایک عکس جو پائے یہی ابوالارواح کلہائے
مثل محمد ہوئے نہ کوئے سب اس کی تفصیل سو ہوئے
ذات سو ذاتوں مانہ تمام جسم محمد عین اجسام[☆۲]

زبان کی نشو و نما کے ابتدائی دور سے دس ویں صدی ہجری تک نظموں میں نعت و منقبت کے امتزاجی نقوش کا سراغ تو ملتا ہے تاہم مضامین کی مناسبت سے جو تقسیم ہونی چاہیے وہ بہت بعد میں نظر آتی ہے البتہ دس ویں صدی کے اواخر میں بہ قول ڈاکٹر شاہین: ''قطب الدین فیروز بیدری نے 'پرت نامہ' لکھ کر قدیم اُردو کی منقبتی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یہ نظم پیر دستگیر غوث الاعظم حضرت عبدالقادر محی الدین جیلانی کی شان میں ہے۔ 'پرت نامہ' کے بعد اسی طرز پر

☆۱۔ ماہنامہ مریخ جولائی، اکتوبر ۷۸، از ڈاکٹر محمد انصار اللہ، صفحہ ۱۸

☆۲۔ اُردو کی نعتیہ شاعری، صفحہ ۲۷

۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں پیار محمد عیسیٰ خان نامی ایک شاعر متخلص بہ قریشی نے 'ولایت نامہ' کے نام سے ایک نظم لکھی۔ اس میں انھوں نے اپنے پیر و مرشد فیروز بیدری سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔[☆۱]

گیارھویں صدی ہجری کے آتے آتے نعت و منقبت کافی حد تک مقبول ہو جاتی ہے اور انھیں بہ حیثیت اصناف کے امتیازی مقام حاصل ہو جاتا ہے جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

یہ بات مسلّم الثبوت ہے کہ اُردو شمالی ہند سے قبل دکن میں ترقی کی منزلیں طے کر چکی تھی اور ساتھ ہی قطب شاہی دور (۹۰۰ھ/۱۴۹۵ء تا ۱۱۰۰ھ/۱۶۹۰ء) میں نعت و منقبت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ گیارھویں صدی ہجری میں دکن میں وہ شعرا جو نعت و منقبت میں بھی طبع آزمائی کر رہے تھے ان میں سلطان محمد قلبی قطب شاہ، اسد اللہ المعروف ملا وجہی (انھوں نے وجیہہ، وجیہی اور وجہ بھی تخلص کیا ہے۔ ملاّ لقب تھا۔[☆۲] نصرتی معظم، بلاقی، مختار، فتاحی، غواصی اور ابن نشاطی گولکنڈہ اور بیجاپور کی شعری و ادبی محفلوں کو رونق افروز کیے ہوئے تھے۔ ان میں سلطان محمد قلی قطب شاہ، ملاّ وجہی، غواصی اور ابنِ نشاطی کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ ذہین، عالی دماغ، صاحبِ علم و فضل، بیدار مغز اور روشن خیال بادشاہ تھا۔ ملاّ وجہی درباری شاعر تھا۔ اس نے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ بہ قول ڈاکٹر برقؔ: ''وجہی کی عمر طویل ہوئی ہے۔ اس نے محمد قلی قطب شاہ سے پہلے ابراہیم قطب شاہ اور اس کے بعد کے عبداللہ قطب شاہ جیسے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔'' وجہی کی دو یادگار تصنیفیں ہیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ نثر میں ''سب رس'' اور نظم میں '''قطب مشتری'' جو مثنوی کے فارم میں لکھی گئی ہے۔ معراج کے بیان میں بھی تیس پینتیس اشعار قلم بند کیے ہیں۔ وجہی کی زبان عہد ماقبل کی زبان سے زیادہ صاف اور عام فہم ہے۔ وجہی نے سیدھے سادے انداز میں اپنے جذبات و وارداتِ قلبی اور عقیدت وارادتِ نظم کی ہیں۔''[☆۳] بہ طورِ نمونہ چند اشعار:

محمد نبی نائوں تیرا اہے عرش کے اُپر پانو تیرا اہے
کہ چودہ ملک کا توں سلطان ہے علی ساترے گھر میں پردھان ہے
اسی ہور یک لاکھ پیغمبر آئے ولے مرتبہ کوئی تیرا نہ پائے
ترا دین جس دن تے پرگٹ ہوا سو اس دن تے سب کفر تلپٹ ہوا[☆۴]

☆۱۔ بہ حوالہ بہار میں اُردو کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ، صفحہ ۸۶

☆۲۔ بہ حوالہ امکان، ابوبکر رضوی، صفحہ ۶۴

☆۳۔ اُردو کی نعتیہ شاعری، صفحہ ۲۷

☆۴۔ بہار میں اُردو کی نعتیہ شاعری، صفحہ ۸۶

سلطان محمد قلبی قطب شاہ عاشق مزاج اور بڑا پیارا شاعر تھا۔ اسے اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) اب تک محفوظ ہے۔ اس نے نعت کو غزل کا مزاج بخشا۔ بہ قول افسر امروہوی: ''وہ پہلا اُردو شاعر ہے جس نے نعت کو غزل کے معیار کے مطابق رکھا۔'' ذیل کے مطلع سے اس کی نعتیہ غزلوں کا مزاج و منہاج اور نعتیہ اشعار سے اس عہد کی ترقی پذیر اُردو کا اندازہ ہوتا ہے۔نعتیہ غزل کا مطلع دیکھیے:

تج مکھ اجت کے جوت تھے دینہارا ہوا
تج دین تھے اسلام لے ، مومن جگت سارا ہوا

اور نعت کے یہ اشعار:

اسم محمد تھے اہے جگ میں سو خاقانی مجھے
بندہ نبی کا جم رہے ، سہتی ہے سلطان مجھے
چاند سورج روشنی پایا تمھارے نور تھے
آبِ کوثر کوں شرف تھڈے کے پانی پور تھے
عاشقاں تج باٹ میں بسمل ہوئے ہیں بے شمار
عاشقِ بیچارہ کوں رکھ پیار کے دستور تھے

غواصی اور ابن نشاطی کا شمار بھی اس دور کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔غواصی نے ۱۰۳۵ھ میں مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' لکھی جس میں نعت و منقبت کے اشعار بھی تبرکاً شامل کیے ہیں۔عشق و ارادت سے لبریز یہ نعتیہ اشعار دیکھیے:

سچا توں محمد سچا مصطفیٰ سچا ہے توں احمد سچا مرتضیٰ
توں طٰہٰ توں یٰسیں توں ابطحی توں اُمی توں مکی توں مرسل سہی
توں اوّل توں آخر تو وہی ہے امیر توں ظاہر توں باطن نبیِ بے نظیر
تہیں ہاشمی ہور قریش رسول جکچ توں کہے سو کرے اب قبول

اور ابنِ نشاطی اپنی مثنوی ''پھول بن'' (۱۰۷۲ھ) میں سیّد المرسلین ﷺ سے عقیدت و محبت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

کروں میں لے قلم ہات ابتدا نعت سچے حق کے پیمبر کا ادا نعت
محمد پیشوا ہے سرواں کا اہے سرخیل سب پیغمبراں کا
محمد تو نبی ہے آج برحق قمر کوں یک اشارت سیں کیا شق

تری تعریف کا اونچا ہے پایا خدا قرآن میں تجھ کو سراہا

ان اشعار سے ابنِ نشاطی کی نعت گوئی کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عادل شاہی دور کے شعرا میں برہان الدین جانمؔ، ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہؔ اور نصرتیؔ اہم شعرا ہیں۔ تاہم نصرتیؔ کا مقام ان سب میں افضل ہے۔ اسے ملک الشعرا کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ وہ ایک قادر الکلام اور پُر گو شاعر تھا۔ اس نے حضور اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں اپنی عقیدتوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

تمھیں اے شہنشاہِ دُنیا و دیں شجاعت کی ہو صف کے کرسی نشیں[☆۱]

رہے نام ور سیّد المرسلیں کہ آخر ہے وے شافع المذنبیں[☆۲]

دکنی شعرا میں شانِ رسالت اور مدحِ رسول ﷺ کے لیے معراج نامے کا رواج بھی کافی مقبول تھا۔ اس کی مقبولیت نے اسے ایک صنفی حیثیت عطا کر دی۔ اس طرح تولد نامے، مولود نامے، نور نامے اور وفات نامے بھی کثرت سے لکھے گئے۔ سیّد بلاقیؔ (۱۰۵۶ھ)، معظم بیجاپوری (۱۰۸۰ھ)، مختار (۱۰۹۴ھ)، سیّد میراں ہاشمی (۱۰۹۹ھ)، اعظم ہاشمی (۱۱۲۰ھ)، محمد بن مجتبیٰ مہدیؔ، شاہ کمال الدین کچھی نرائن شفیقؔ اور شاہ ابوالحسن قربیؔ بیجاپوری نے ''معراج نامے'' کے ذریعے نعتیہ شاعری کے فن کو فروغ دیا۔ شفیقؔ تک آتے آتے اُردو زبان میں سلاست و روانی اور چمک پیدا ہوگئی تھی۔ ذیل میں موصوف کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جن کو پڑھ کے آپ کو اندازہ ہوگا کہ شاعر کو زبان و بیان پر کتنا عبور حاصل ہے:

عجائب رات تھی وہ نور افشاں کہ ہر کوکب تھا اک مہرِ درخشاں
کہو گر رات اس کو، ہے تأمل کہوں گر دن، تو عالم میں پڑے غل
غرض غفلت سبھوں پر چھا رہی تھی خرد داروئے حیرت کھا رہی تھی

فتاحی جو گیارھویں صدی ہجری کے اواخر کا شاعر ہے۔ اس کے ''مولود نامے'' میں تقریباً تین ہزار سے زیادہ اشعار کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح عبدالملک بھروچی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے میلادِ مصطفیٰ کے مقدس اور پاکیزہ موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے ڈھائی سو اشعار کی ایک نعتیہ مثنوی قلم بند کی جو بہ قول ڈاکٹر آزاد فتح پوری: ''اب تک کے دستیاب مواد کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے

☆۱۔ اُردو کی نعتیہ شاعری، از ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، صفحہ ۲۹

☆۲۔ بہار میں اُردو کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ، صفحہ ۹۱

کہ یہ پہلی نعتیہ کاوش ہے جس میں نعت کو موضوع بنا کر مثنوی کی ہیئت میں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔'' عبدالملک بھرونچی نے ۱۰۰۹ھ میں ایک مولود نامہ بھی تحریر کیا۔ امینؔ گجراتی (مولود نامہ ۱۱۰۰ھ) لکھ کر عاشقِ رسول ہونے کا شرف حاصل کیا۔ چار وفات نامے اور ایک نور نامہ کا سراغ بھی ملتا ہے، جسے ولیؔ اور علی بخش دریاؔ کے ''وفات نامے'' اور عبداللطیف اور عالم گجراتی کے ''وفات نامے'' بالترتیب ۱۰۷۴ھ اور ۱۰۸۷ھ میں لکھے گئے۔ اور احمدؔ نے ۱۰۸۹ھ میں ''نور نامہ'' قلم بند کیا۔ تاہم یہ سبھی کاوشیں منظوم واقعات کی آئینہ داری وعلم برداری سے آگے نہ بڑھ سکیں اور اس درمیان متعدد ''وفات نامے'' بھی قلم بند کیے گئے جنھیں شہرت نصیب نہ ہوئی۔ البتہ بارھویں صدی ہجری کے آخری دہے میں نوازش علی خاں شیداؔ دکنی کی کتاب ''اعجازِ احمدی'' اور محمد باقر آگاہؔ ارکاٹی کی ''ہشت بہشت'' رسالت مآب ﷺ کی تعریف وتوصیف کے لیے مشہور ہیں۔

مغلیہ عہدِ حکومت (۱۱۰۱ھ تا ۱۱۳۶ھ) میں ولیؔ دکنی (المتوفی ۱۱۱۹ھ) کو اُردو کی غزلیہ شاعری کا بے تاج بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اسے ہر صنفِ سخن پر قدرت حاصل تھی۔ غزل، قصیدہ، رُباعی، مستزاد، قطعہ، ترجیع بند کے علاوہ نعت ومنقبت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ چند اشعار بہ طورِ نمونہ پیش ہیں:

یا محمد دو جہاں کی عہد ہے تجھ ذات سوں
خلق کوں لازم ہے جس کوں تجھ پہ قربانی کرے
عارفاں بولیں گے جان و دل سوں لاکھوں آفریں
جب ولیؔ تیری مداح میں گوہر افشانی کرے

جنوبی ہند کے غیر مسلم نعت گو شعرا میں، جن کا تعلق مختلف ادوار سے رہا ہے، ان میں مہاراجہ سرکشن پرشادؔ حیدرآبادی (پ:۱۸۶۴ء) کا نام بہ طورِ خاص ہے۔ مہاراجہ موصوف کو انگریزی، مرہٹی اور تلنگی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور اُردو میں مکمل دست گاہ تھی۔ ان کے دو اُردو دیوان ''بیاضِ شادؔ'' اور ''خم کدۂ رحمت'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان کا ایک فارسی دیوان بھی شائع ہوا۔ مختلف زبانوں میں آپ کی چالیس سے زیادہ تصانیف موجود ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نعت گوئی کے فن سے پوری طرح واقف تھے۔ یہ اشعار دیکھیے:

ساز گار اپنا زمانہ ہوگیا — ہند سے طیبہ کو جانا ہوگیا
دفن یثرب میں ہوا لاشہ مرا — اب مسافر کا ٹھکانا ہوگیا

———

یا نبی صلِ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ
ورد میرا ہے یہی آٹھوں پہر اے مصطفیٰ

ابوالاعظم سیّد امجد حسین امجدؔ حیدرآباد (پیدائش: ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء) کو بھی شعر و سخن کا ذوق بچپن سے تھا۔ ان کی چودہ گراں قدر تصانیف یادگار ہیں۔ نعت گوئی کے فن سے بہ خوبی آشنا نظر آتے ہیں۔ بہ طورِ نمونہ یہ شعر:

میری زباں پہ نعت ہے، تیری زباں پہ حمد ہے
سبحانہٗ تیری صدا، صلِ علیٰ میرا بیاں

دکن میں مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین بھی نعتِ رسول مقبول ﷺ کا نذرانہ پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر مجید بیدار: ''دکن کی خواتین نے صرف اصنافِ شاعری میں اپنے فنِ کمالات کا اظہار نہیں کیا بلکہ نعت کی صنف کو بھی پورے لوازمات کے ساتھ استعمال کیا۔ انھوں نے بہ طورِ تبرک نعت نہیں لکھی بلکہ عالمِ جذب اور محویت کے ساتھ ساتھ حبِ رسول ﷺ میں سرشار ہو کر نعتِ رسول ﷺ کی بنیاد رکھی۔ موجودہ تحقیق اور دستیاب شدہ متن کے لحاظ سے لطف النسا امتیازؔ، مہ لقابائی چنداؔ اور شرف النسا شرفؔ یہ ایسی شاعرات ہیں جنھوں نے اپنی نعت گوئی کے ذریعے دکن کی شاعری میں خواتین کے حصے کی نشان دہی کر دی۔''[☆۱]

لطف النسا امتیازؔ کو دکن کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ وہ غیر منقسم ہندوستان کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہیں اس لیے کہ ''شمالی ہند میں اُردو کے آغاز و ارتقا کے طویل عرصے کے بعد بھی خواتین شعرا کا وجود دکھائی نہیں دیتا۔''[☆۲] موصوف اس ضمن میں ڈاکٹر اشرف رفیع کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''کل کی تحقیق نے مہ لقابائی چنداؔ کو پہلی صاحبِ دیوان شاعر کا رُتبہ عطا کیا تھا مگر آج اس تحقیق نے لطف النسا امتیازؔ کے سر پر اوّلیت کا تاج رکھا۔ چنداؔ کا دیوان ۱۲۱۳ھ میں پہلی مرتبہ مرتب ہوا— امتیاز نے صرف ایک سال کی اوّلیت سے مہ لقابائی کو مات دی۔ امتیازؔ کا دیوان ۱۲۱۲ھ یعنی تقریباً ۱۷۹۶ء میں مرتب ہوا۔ کتب خانہ سالار جنگ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔''[☆۳]

☆۱۔ نعت رنگ ۴، صفحہ ۱۷۶

☆۲۔ نعت رنگ ۴، صفحہ ۱۷۶

☆۳۔ نعت رنگ ۴، صفحہ ۱۷۶

لطف النسا امتیاز کے نعتیہ اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ انھیں نعت گوئی پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ یہ اشعار دیکھیے:

میں دل سے مصطفیٰ کا جاں فدا ہوں — محبِّ شیر یزداں باصفا ہوں
جہاں میں بندۂ خیر النسا ہوں — یہی ہر دم کہوں گا اور کہا ہوں
محبِّ اہلِ بیتِ مصطفیٰ ہوں — غلامِ خاندانِ مرتضیٰ ہوں

دکن کی صاحبِ دیوان نعت گو شاعرات میں شرف النسا شرفؔ (۱۲۴۵ھ تا ۱۳۳۰ھ) کا نام بھی اہم ہے۔ محترمہ ریاست میسور کی رہنے والی شریف النسب خاتون تھیں۔ وہ ٹیپو سلطان شہید کے مشہور سپہ سالار میراں سیّد اشرف کی پوتی تھیں۔ ایک ہزار اشعار پر مشتمل شرف النسا شرفؔ کے دیوان کا مسودہ خود ان کی تحریر میں 'ادارۂ ادبیاتِ اُردو' کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ دو شعر بہ طورِ نمونہ پیش ہیں:

مظہر کبریا نہیں ملتا — سرورِ انبیا نہیں ملتا
جان لب پر ہے ہجر میں جس کے — وہ مسیحا نہیں ملتا☆۱

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا باضابطہ آغاز ولیؔ اورنگ آبادی کی آمد کے بعد ہوتا ہے۔ ولیؔ پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء/۱۱۱۲ھ میں دلّی تشریف لائے تو ان کی شاعری کے چرچے اور ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگیا۔ اور جب ان کا دیوان ۱۷۲۲ء میں دلّی پہنچا تو شمالی ہند کے شعرا کو بھی ولیؔ کی شیریں بیانی، زبان کی چاشنی اور روانی بھاگئی۔ الفاظ کی پہلو دار کیفیت ومعنویت اور رنگینی ورعنائی نے اپنی طرف متوجہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ولیؔ کا رنگ وآہنگ شمالی ہند کے شعرا کا جزوِ لاینفک بن گیا۔ فارسی گو شعرا نے بھی اُردو شاعری کی جاذبیت اور وسعت کو محسوس کیا۔ ان دنوں شمالی ہند میں جن شعرا کے چرچے عام تھے اُن میں فائزؔ دہلوی، شاہ مبارک آبروؔ، مضمونؔ، ناجیؔ یک رنگؔ، آرزوؔ اور مظہر جانِ جاناںؔ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ شاہ مبارک آبروؔ کو شمالی ہند کا ''پہلا صاحبِ دیوان شاعر'' ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہر ایک کے یہاں حمد ونعت کے کچھ نمونے بہ طورِ تبرک ضرور مل جاتے ہیں، تاہم فکر وفن کا جہاں تک سوال ہے تو اس کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ البتہ ظہور الدین حاتمؔ کے یہاں غزل کے فارم میں چند اشعار ملتے ہیں۔ حاتمؔ، شاہ مبارک آبروؔ کے ہم عصروں میں تھے۔ ان کے نعتیہ غزل کے چند اشعار اس طرح ہیں:

اوّل خدا نے نور تمھارا عیاں کیا — اس نور سے بنا یہ زمیں و زماں کیا

☆۱۔ نعت رنگ ۴، صفحہ ۱۷۷

تجھ در پہ آرزو میں سلیمان شامل مور　　کیوں کر نہ ہو کہ تجھ کو شہہِ خسرواں کیا
صاحب دلوں کو حشر تلک ہے وہ سجدہ گہہ　　جس سرزمیں میں تم تھے قدم سے نشاں کیا[☆۱]

شمالی ہند میں نعت و منقبت کا آغاز مرزا محمد رفیع سوداؔ (المتوفی ۱۷۸۰ء) کے نعتیہ منقبتی کلام سے ہوتا ہے۔ رسالت مآب ﷺ کی شان میں لکھا گیا اڑتالیس اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ جو سوداؔ کی فکرِ رسا کا نتیجہ ہے، شمالی ہند میں اُردو کی باضابطہ نعتیہ شاعری کا ابتدائی نمونہ کہا جاتا ہے۔ قصیدہ نگاری میں سوداؔ کا کوئی ہم سر نہیں۔ قصیدے کے چند اشعار سے ان کی قادر الکلامی اور حبِ رسول ﷺ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ملک سجدہ نہ کرتے آدمِ خاکی کو گر اس کی
امانت دار نورِ احمدی ہوتی نہ پیشانی
ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اس وقت دُنیا میں
وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

بہ قول طلحہ رضوی برقؔ: ''مصحفیؔ و نظیرؔ کے عہد سے اُردو میں نعت نویسی فنی وصنفی حیثیت اختیار کرتی چلی گئی۔'' انشاؔ نے باضابطہ طور پر نعت نویسی اختیار نہ کی اس کی وجہ جو بھی رہی ہو، تاہم اپنے دیوان کی ابتدا حمد و نعت اور منقبت سے کی ہے۔ نعت کے چند اشعار اس طرح ہیں:

ہر چند کہ عاصی ہوں، پر اُمت میں ہوں اُس کی
جس کا ہے قدم عرشِ معلیٰ سے بھی بالا
مولائے جہاں رہبرِ عشاق محمد
سب عقدۂ مشکل کا مرے کھولنے والا

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ کو انشاؔ کا ''حریفِ سخن'' کہا جاتا ہے تاہم ان کی قادر الکلامی سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے مشہور قصیدے ''گریباں، آستیں، دامن'' سے چند نعتیہ اشعار پیش ہیں جن سے ان کی عقیدت و محبت اور نازک خیالی کا اندازہ لگ سکتا ہے:

تمھارا ابرِ رحمت یا محمد مجھ پہ گر برسے
تو ہو پاکیزہ و اطہر، گریباں، آستیں، دامن
وگرنہ مصحفیؔ تو وہ سیہ رو ہے کہ کالا ہو
بدن سے جس کے چھوئے گر گریباں آستیں، دامن

☆۱۔ بہ حوالہ بہار میں اُردو کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ، صفحہ ۱۰۶

مصحؔفی کو دشوار زمین اور سخت ترین ردیف میں شعر کہنے کا ملکہ تھا۔ ایک دوسرے نعتیہ قصیدے میں ''ثمار انگشت''، ''شاخسار انگشت'' کی مشکل ترین زمین کو جس خوبی سے ادا کیا ہے اس سے ان کے کاملِ فن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ بہ طورِ مثال ایک شعر:

چمن میں اوسکی رسالت کا جب کچھ آئے ہے ذکر
علم کرے ہے شہادت کی شاخسار انگشت

میرؔ کا شمار اُردو کے نام ور شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے شاعری کو درد میں اور درد کو شاعری میں ڈھال دیا ہے۔ اُردو کے چھ دیوان ان کی یادگار ہیں۔ ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ تذکرۂ نکات الشعرا، ذکرِ میر، رسالہ فیض میرؔ، خودنوشت سوانح عمری ان کی یادگاریں ہیں۔ غزل کی بادشاہت کے ساتھ نعت جیسی نازک ترین صنف کو بھی انھوں نے بڑی خوبی سے برتا اور اچھے خوب صورت اور معیاری شعر کہے ہیں۔ چہرۂ انور اور زلف کو بہ طورِ استعارہ کتنے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے:

بکھری ہے زلف اس رُخِ عالم فروز پر
ورنہ بناؤ ہووے نہ دن اور رات کا
کیا میرؔ تجھ کو نامہ سیاہی کی فکر ہے
ختمِ رسل سا شخص ہے ضامن نجات کا

اور جب وسیلے کی بات آئی تو میرؔ اس انداز میں گویا ہوئے:

حق کی طلب ہے کچھ تو محمد پرست ہو
ایسا وسیلہ ہے بھی خدا کے حصول کا

اس زمیں اور عہد سے تعلق رکھنے والے نظیؔر اکبرآبادی کا شمار ایسے شعرا میں ہوتا ہے جسے لوگوں نے نظر انداز کر رکھا تھا۔ مگر اُردو کا یہ عوامی شاعر آج اتنا مقبول ہے کہ بغیر اس کے ذکر کے اُردو شاعری کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ نظموں کا یہ شاعر اپنے زمانے سے اتنا فزوں تر ہے کہ اس کی ایجادات ادبی نقادوں کو حیران کرتی ہیں۔ نظموں کا یہ شاعر جب نعتِ رسول پر خامہ فرسائی کرتا ہے تو آج کی جدید نعتیہ شاعری کو آئینہ دکھاتا نظر آتا ہے۔ اس کے یہ اشعار جو ڈھائی سو سال قبل کے ہیں اس عشق وایمان اور محبتِ رسول کی زندہ مثال ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے:

تم شہِ دُنیا و دیں ہو، یا محمد مصطفیٰ سرگروہِ مسلمیں ہو، یا محمد مصطفیٰ
حاکمِ دینِ متیں ہو، یا محمد مصطفیٰ قبلۂ اہل یقیں ہو، یا محمد مصطفیٰ
رحمۃ للعالمیں ہو، یا محمد مصطفیٰ

اور نظم کا آخری بند اس طرح ہے:

مخبرِ صادق ہو تم یا حضرت خیر الوریٰ سرورِ ہر دوسرا اور شافع روزِ جزا
کیا نظیر اک، اور بھی سب کی مدد کا آسرا ہے تمھاری ذات والا منبعِ لطف و عطا
یاں بھی تم واں بھی تمھیں ہو، یا محمد مصطفیٰ

چھ بند پر مشتمل نظیر کا یہ خمسہ نعتیہ شاعری کی آبرو کہا جا سکتا ہے جس میں ''مبنی برصداقت عقیدوں کا اظہار'' برملا انداز میں کیا گیا ہے جس کی مثال ان کے ہم عصر شعرا اور بعد کی دو صدیوں کے درمیان کہی گئی نعتوں میں بہ مشکل ملتی ہے۔ ایک سچے عاشقِ رسول کی یہی پہچان ہے کہ وہ اپنے عقیدے کا اظہار صاف اور کھلے دل سے کرے جیسا کہ نظیر کی اس نعت میں ایک ایک لفظ نظیر کے عشق و ایمان اور عقیدے و محبت کا کھلا اظہار ہے۔ پروفیسر برق نے عقیدے سے متعلق نکتے کی بات یہ بیان کی ہے کہ ''حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق جن مبنی برصداقت عقیدوں کا اظہار عہدِ نبوی سے ہوتا آرہا ہے ان سب کا ذکر ہم ان عاشقانِ رسول کی نعتوں میں دیکھتے ہیں۔ اب یہی عقیدے بعض نئے فرقوں کے نزدیک اختلاف کا سبب بن گئے ہیں۔ مثلاً رسولِ مقبول کا شفیع المذنبین ہونا، خاتم المرسلین ہونا، عالم الغیب ہونا، وجہِ تخلیقِ کائنات ہونا، نور من نور اللہ ہونا، مولا و مختارِ کل ہونا، نتیجہ یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں ان مسائل و عقائد میں اختلافی گروہ سے متاثر حضرات جب نعتیں رقم فرماتے ہیں تو ان کے اشعار سادہ اور جذب وعقیدت سے عاری نظر آتے ہیں۔''

انشا، مصحفی اور نظیر کے ہم عصروں میں میر حسن کا شمار بہ حیثیت مثنوی نگار اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی مثنوی ''سحر البیان'' کو اُردو ادب کا ایک زندۂ جاوید شاہکار مانا جاتا ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی اس پائے کی مثنوی تخلیق نہ کی جا سکی۔ میر حسن کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اور شعرا کی طرح میر حسن نے بھی اپنی مثنوی کی ابتدا حمد و نعت اور منقبت کے روایتی انداز میں کی ہے تاہم ان کی زبان میں پختگی، فصاحت و بلاغت اور دل کش و دل نشیں انداز بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

نبی کون یعنی رسولِ کریم نبوت کے دریا کا درِ یتیم
ہوا گو کہ ظاہر میں اُمی لقب یہ علمِ لدنی کھلا دل پہ سب
کیا حق نے نبیوں کا سردار اسے بنایا نبوت کا حق دار اسے
نبوت جو کی حق نے اس پر تمام لکھا اشرف الناس خیر الانام

میر اثر اور منشی دیا شنکر نسیم (شاگردِ آتش) نے بھی ''خواب و خیال'' اور ''گلزارِ نسیم'' میں اس کا التزام

رکھا ہے۔ جیسا کہ میر حسنؔ نے بہ قول پروفیسر برقؔ: ''مثنویوں میں حمد و نعت و منقبت کو روایتی طور پر اجزائے لاینفک قرار دیا گیا اور ہر مثنوی نگار پر خواہ وہ کسی دین و مذہب کا ہو، مثنوی لکھتے وقت ان اجزا کی رسمی پیروی لازم ہوئی۔'' چناں چہ منشی دیا شنکر نسیمؔ جب مثنوی کا آغاز کرتے ہیں تو وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

کرتا ہے یہ دو زباں سے حمدِ حق و مدحتِ پیمبر

میر محمد باقر آگاہؔ دکن کے ایک کثیر التصانیف، عالمِ دین اور جامع العلوم شاعر تھے۔ ان کی مثنوی ''راحتِ جان'' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگاہؔ نعت کے فنی لوازمات سے خوب آگاہ ہیں۔ انھوں نے اور بھی کئی نعتیہ مثنوی لکھی ہیں جو اس طرح ہیں: من دیپک، من ہرن، من موہن، جگ سوہن، آرام دل وغیرہ۔ ''راحتِ جاں'' کے چند اشعار سے آگاہؔ کی قادر الکلامی اور حبِ رسول کا اندازہ ہوتا ہے:

جوں خدا کی حمد میں حیراں ہے عقل یوں نبی کی نعت میں ناداں ہے عقل

احمدِ مرسل شہنشاہِ رُسل سرورِ عالم امامِ جز و کل

جب خلائق کوں ہوا اس سوں ظہور اس سبب سوں حق رکھا نام اس کا نور

حق سوں ہر دم سو درود و سلام نت اچھو تربت پو اس کی صبح و شام

مثنوی ''سوز و گداز'' کے مصنف مولانا ظہیر احسن شوقؔ نیموی کے یہاں بھی حمد کے بعد چند نعتیہ اشعار ملتے ہیں۔ پروفیسر برقؔ ان کے کلام پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: ''علامہ شوق نیموی نے بڑی فنی چابک دستی، از دیا وعقیدت، محاسنِ شعری اور روایتی مسلّمات کے ساتھ سرکار کے قدِ بالا، سوادِ زلف، جمال روئے روشن، نقاطِ خال، لبِ جاں بخش، دُرِ دنداں، اندازِ تبسم، زیبِ زنخداں، گلا، سینہ، مہرِ نبوت کی تصویر کشی اور سراپا نگاری کی ایک روشن مثال پیش کی ہے۔'' ایک شعر بہ طورِ نمونہ اس طرح ہے:

اب اس سے بڑھ کے کیا کہیے کہ کیا تھے

وہ اک آئینہ وحدت نما تھے

تصدق حسین خاں شوقؔ لکھنوی (۱۷۸۲ء/۱۸۷۱ء) نے تین مثنویاں لکھیں۔ ''فریبِ عشق''، ''بہارِ عشق'' اور ''زہرِ عشق'' ان تینوں مثنویوں میں موصوف نے حمد، نعت اور منقبت روایتی انداز میں شامل کی ہیں۔ ''زہرِ عشق'' میں نعت کے دو اشعار اس طرح ہیں:

مدحِ احمد زباں پہ کیوں کر آئے بحر کوزے میں کس طرح سے سمائے

ذاتِ احمد کو کوئی کیا جانے یا علی جانے یا خدا جانے

مرزا شوقؔ نے جب ہوش سنبھالا تو اس وقت کے نام ور شعرا میں ناسخؔ، آتشؔ، رندؔ، خواجہؔ، وزیرؔ، صباؔ، اشکؔ، اسیرؔ، واجد علی شاہ اخترؔ، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور جلالؔ وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا۔ اور دوسری طرف اسی دور میں دلّی کے نام ور شعرا مومنؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، غالبؔ، شیفتہؔ جیسے اساتذہ موجود تھے پروفیسر برقؔ کا بیان ہے کہ ذوقؔ و غالبؔ و مومنؔ کے دور میں دلّی کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کی طرف سے باقاعدہ نعتیہ مشاعروں کا اہتمام ہونے لگا۔ ظفرؔ، مومنؔ، مجروحؔ، صہبائیؔ، مولانا غلام امام شہیدؔ، فتح الملک رمزؔ، رحیم میرٹھی، عزت سنگھ عیشؔ اور سندر لال شگفتہؔ لکھنوی ان نعتیہ مشاعروں کی جان ہوتے تھے۔

حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی (۱۷۵۹ء تا ۱۸۳۴ء) کا شمار عظیم المرتبت اور باکمال شاعروں میں ہوتا ہے۔ تصنیف و تالیف کا بے حد شوق تھا۔ کئی شعری و نثری کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کو عربی، فارسی اور اُردو ہر سہ زبان پر قدرت حاصل تھی۔ ''دیوانِ نیاز'' (اُردو فارسی) میں آپ کا عارفانہ کلام موجود ہے۔ اُردو زبان میں ان کا نعتیہ کلام عشقِ رسول سے معطّر و معتبر ہے۔ موصوف نعت پاک کو سوزِ دروں کی آنچ سے لفظوں میں یوں ڈھالتے ہیں:

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تابہ ماہی سب ہے ظہور تیرا
اسرارِ احمدی سے آگاہ ہو سو جانے
تو نور ہر شرر ہے، ہر سنگ طور تیرا

گر شان پیمبر کی ابوجہل پہ کھلتی
اسلام کے لانے میں اسے ننگ نہ ہوتا

مغلیہ سلطنت کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ جب تخت نشین ہوا تو ہندوستان کی تہذیبی و اقتصادی حالت انتہائی دگرگوں تھی۔ امن و امان کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ پھولوں کی سیج پر پلنے والے ظفرؔ رنگون کے قید خانے میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا مگر دل میں مدینہ کی آرزو اور تڑپ جاگزیں رہی:

یہی حسرت تھی کہ گھر میرا مدینے میں رہے
بنا رنگون میں ارماں مرے سینے میں رہے

آبِ زم زم کے عوض اشکِ خوں پینے میں رہے
لو خبر اس کی کہ چند دن مرے جینے میں رہے
ہے تمنا یہ ظفرؔ کی یا رسولِ عربی
اپنی آنکھوں کو ملے آپ کی چوکھٹ سے نبی

اور اس کی یہ آرزو اور تڑپ اس کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ ظفرؔ کی نعتیہ غزلیں تشبیہات کی رنگینی اور جذبات کی دل آویزی سے پُر ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام میں عقیدت و ارادت کا گہرا جذبہ پایا جاتا ہے۔

غالبؔ اور مومنؔ کے عہد میں نعتیہ شاعری کو خاصی پذیرائی ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے قبل اور بعد کا زمانہ ہماری تاریخ کا ایک زندہ باب ہے۔ مومنؔ کو اس تحریک کا شاعر مانا جاتا ہے۔ یہ امر فطری ہے کہ جب انسان مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو پھر خدا اور رسول کی پناہ اختیار کرتا ہے۔ اور جب قلم اُٹھاتا ہے تو عشق و عرفان اور عقیدت و محبت کے فوارے اُبلتے نظر آتے ہیں۔ مومنؔ نے غزل اور قصیدے کے فارم میں نعت کے اچھے اشعار نکالے ہیں۔ مضمون آفرینی و خیال بندی، نادر الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کا برمحل اور خوب صورت استعمال ان کے فنی لوازمات اور جولانیِ طبع کی غمازی کرتے ہیں۔ ایک نعتیہ قطعہ کے چند اشعار دیکھیے:

اگر کہے مددے یا محمد عربی
صغیر مرگ ہو رستم کو نعرۂ الکوس
مخالفوں کو ترے دو جہاں جہنم ہے
کہ تابِ مہر سے جلتے رہے ہیں یاں بھی مجوس
براق اسپ ترا ابروے فرشتہ رکاب
کہاں ہو چشم بشر ایسے پانو سے محسوس
نہ جس کے دھیان میں مضمون قابِ قوسین آئے
وہ دیکھ لے ترے زین و کمان کا قربوس

نعتیہ شاعری روایتی اقدار و اظہار سے نکل کر باضابطہ صنفِ سخن کی جانب گام زن دکھائی دینے لگی۔ نعت کے خدوخال روشن ہونے لگے اور نئے جذبے، ولولے اور نئی آب و تاب کے ساتھ ہمارے شعرا نے اس فن کو پختگی بخشی اور ادبی تاریخ میں نعت گوئی نے اپنی حیثیت کو تسلیم کرایا اور اپنے وجود کے احساسِ جمالیات سے شاعروں کے فکر و شعور کو تابندگی عطا کی۔ غلام امام شہیدؔ، کرامت علی خاں شہیدی، محسنؔ کاکوروی، امیرؔ مینائی، داغؔ دہلوی، مجروحؔ، صہبائیؔ، رمزؔ اور رحیمؔ کے

بعد الطاف حسین حالؔی، مولانا احمد رضا خاں، حسرتؔ موہانی، اقبالؔ، ظفؔر علی خاں اور مولانا محمد علی جوہؔر نے اُردو نعت کے دامن کو وسعت آشنا کیا۔ مولوی غلام امام شہید کا مرتبہ مولانا احمد رضا خاں کو چھوڑ کر مذکورہ تمام نعت گویوں میں سب سے بلند ہے۔ نہایت آسان، سلیس انداز میں ان کی ایک نعت کے چند اشعار پیش ہیں:

اُڑا لے گئیں دل صدائیں تمھاری
کدھر آ کے گلیوں میں جائیں تمھاری
اُتر آئیں پریاں نہ کیوں اُڑتے اُڑتے
فرشتوں کو بھائیں ادائیں تمھاری
کریں جان و دل کو فدا جن و انساں
جو دل‌داریاں ہم سنائیں تمھاری
شہیؔد اب عجب کیا ہے جن و بشر سب
غزل یہ مدینے میں گائیں تمھاری

کرامت علی خاں شہیدؔی کی نعت میں شاعرانہ حسن و طلاقت اور عظمتِ نبوت و محبت سے بھرپور یہ شعر دیکھیے:

ہوئی ہے ہمتِ عالی مری معراج کی طالب
میسر ہو طواف اے کاش مجھ کو تیرے مرقد کا
کبھی نزدیک جا کر آستانے پر ملوں آنکھیں
کبھی گر دُور بیٹھوں میں کروں نظارہ گنبد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

علامہ محسن کاکوروی (۱۸۲۶ء۔ ۱۹۰۵ء) کا عہد لکھنؤ کی شعری صنعت گری کے شباب کا عہد زرّیں کہا جاتا ہے۔ انھوں نے نعت کے توسط سے لکھنؤ کے بگڑے ماحول اور نری اور نامانوسِ لفظی صنعت گری کی اصلاح میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے نعتیہ شاہکار میں دو مثنویاں ''صبح تجلی'' اور ''چراغِ کعبہ'' اور ایک قصیدہ ''مدیح خیر المرسلین'' خاصے کی چیزیں ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن کے فارم میں بھی آپ کے نعتیہ کلام کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔ ایک قصیدہ کے مدحیہ حصے سے چند اشعار پیش ہیں۔ زبان و بیان کی سلاست اور مضمون آفرینی دیکھیے:

جس کی توصیف میں اک شمّہ ہے قرآن شریف
کہ لکھا خامۂ قدرت نے بوجہ احسن
شمس وصفِ رُخِ یٰسین ہے وصفِ دنداں
والضحیٰ وصفِ جبیں نور ہے وصف گردن
یعنی وہ جس کی ہوئی ذات سراپا برکات
باعثِ خلقِ زماں موجبِ ایجاد زمن
پیشوائے رسل و سیّد نسل آدم
جلوۂ حضرتِ حق نورِ مجسم ہمہ تن

محسن کاکوروی کا ذیل کا نعتیہ شعر تو کافی مشہور ہوا:

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
لائی ہے دوش پہ بھر بھر کے صبا گنگا جل

امیؔر مینائی اور ریاضؔ خیر آبادی نے بھی بالالتزام نعتیں کہی ہیں۔ امیؔر مینائی (۱۸۲۸ء تا ۱۹۰۰ء) کو اسیر لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن کے فارم میں نعتیں قلم بند کی ہیں۔ ان کا گراں قدر نعتیہ دیوان ''محامد خاتم النّبیین'' نعتیہ شاعری کا نادر تحفہ ہے۔ چند اشعار نمونتہً درج ہیں:

کیا محمد نے شرف حق کی بہ دولت پایا
شافعِ حشر ہوئے تاجِ شفاعت پایا
میہماں جب شبِ معراج ہوئے دعوت میں
چشمہ کوثر کا ملا ، روضۂ جنت پایا
نعت مولیٰ میں کہے شعر نئے تو نے امیر
واہ کیا صلِ علیٰ حسنِ طبیعت پایا

امیؔر مینائی کے ہم عصروں میں داؔغ دہلوی (۱۸۱۳ء، ۱۹۰۵ء) اور آسؔی غازی پوری کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ داؔغ کو خاقانی ہند ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ جیسے استاد کی شاگردی حاصل تھی۔ داؔغ کو ان کے شاعرانہ کمال کے تئیں اچھی خاصی شہرت حاصل ہے۔ ''گلزارِ داغ''، ''آفتابِ داغ'' اور ''ماہتابِ داغ'' ان کے تین اہم دیوان یادگار ہیں۔ فنِ نعت گوئی میں بھی انھیں قدرت حاصل ہے۔ غزل کے فارم میں نعت کے یہ اشعار دیکھیے:

تو جو اللہ کا محبوب ہوا خوب ہوا
یا نبی خوب ہوا خوب ہوا خوب ہوا
شبِ معراج یہ کہتے تھے فرشتے باہم
سخنِ طالب و مطلوب ہوا خوب ہوا
حشر میں اُمتِ عاصی کا ٹھکانا ہی نہ تھا
بخشوانا تجھے مرغوب ہوا خوب ہوا

———

دونوں جہاں میں بوئے محمد ہے عطر بیز
کونین میں ہے رنگ فقط ایک پھول کا

عبدالعلیم آسی غازی پوری (۱۸۳۴ء، ۱۹۱۶ء) خانقاہ رشیدیہ کے زیب سجادہ تھے۔ اسی لیے آپ کے کلام میں صوفیانہ خیالات و جذبات کا عنصر غالب ہے۔ ''عین المعارف'' کے نام سے آپ کا دیوان یادگار ہے۔ جس میں غزلوں کے علاوہ نعت پاک بھی شامل ہیں۔ حضور پُرنور کی سیرت پاک کا ذکر مختلف انداز میں ملتا ہے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کی والہانہ محبت کا اظہار ملاحظہ کیجیے:

کہاں گلشن کہاں روئے محمد — کہاں سنبل کہاں جوئے محمد
ہے عالم آہن و آہن ربا کا — کھنچا جاتا ہے دل سوئے محمد
ہے کیا رحم و کرم بندوں پہ اپنے — خدا سے ملتی ہے خوئے محمد
دم جاں بخش اعجازِ مسیحا — نسیم گلشنِ کوئے محمد

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء، ۱۹۱۴ء) کو غالب سے شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے۔ غالب کی صحبت نے حالی کے مزاج کو اور بھی دو آتشہ بنا دیا تھا۔ مسدس حالی (مدو جزرِ اسلام) ان کی ایک مشہور تصنیف ہے جس نے حالی کو قومی شاعر بنا دیا۔ حالی نے ''مدو جزرِ اسلام'' کے ابتدائی حصے میں نعتیہ کلام بھی شامل کیے ہیں جن سے رسالت مآب ﷺ کی زندگی کے مختلف گوشے منور ہوئے ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر برق: ''حالی نے اپنے مشہورِ زمانہ مسدس میں جو نعتیہ بند لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نعتوں میں ان سے زیادہ مقبولیت اور کسی کو نہ ہوئی۔'' مثال کے طور پر یہ بند:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی ، غلاموں کا مولا

ان اشعار میں حقیقت کا کتنا کھلا صاف اور واضح اظہار ہے۔ شاید اس سے پہلے (نظیر اکبر آبادی کے علاوہ) کسی اور شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کے فضائل اخلاقی کارگزاریوں اور ہم دردیوں کو شعری پیکر میں جس خوب صورتی سے ڈھالا ہے اس سے پہلے کسی شاعری میں اس کی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی۔

مذکورہ تمام شعرا کے کلام میں فرقِ مراتب کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی نے ان سب کی مشترکہ خصوصیات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

(۱) رسول اللہ (ﷺ) کی شان میں عاشقانہ الفاظ مثلاً وصل، ہجر، شوق اور بے تابی وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے اور اسی حیثیت سے آپ کی خط و خال، زلف و گیسو، لب و دہن اور چہرۂ رُخسار وغیرہ کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے اور یہ ان شعرا کا قصور نہیں بلکہ ہمارے صوفیہ کا قصور ہے۔

(۲) معنی سے زیادہ الفاظ پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی جدید استعارے پیدا کیے گئے ہیں اور رعایتِ لفظی اور صنعتِ تضاد وغیرہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔

(۳) بہت سی موضوع روایتیں اور فرضی معجزات نظم کیے گئے ہیں۔

چناں چہ اس تعلق سے موصوف نے امیرؔ مینائی کی نعتیہ دیوان کے دیباچہ سے یہ عبارت نقل کی ہے۔ امیرؔ مینائی لکھتے ہیں:

> اس سے پہلے مسدسات جن کے اسما یہ ہے، ذکرِ شاہِ انبیا، صبحِ ازل، شامِ ابد، لیلۃ القدر میں نے موزوں کیے ہیں اور وہ چھپ کر شائع ہوئے ہیں۔ ان میں بعض روایات جیسے عکاشہ، ابن محصن کا قصہ، ذکر شاہِ انبیا میں ہے قطعاً غیر صحیح ہیں اور جو روایات نامعتبرہ ان مؤلفات میں موزوں ہوگئے ہیں۔ ان سب سے میں توبہ کرتا ہوں۔"☆۱

اس کے بعد ہی حالیؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

(۴) شاعرانہ مبالغہ طرازیوں میں صحیح واقعات اور مستند روایات کی صورت بھی بدل گئی

☆۱۔ بہ حوالہ شعر الہند، حصہ دوم، صفحہ ۲۰۴

ہے، لیکن خود رسول اللہ (ﷺ) کے فضائل، اخلاق، وعظ و پند اور ہدایات و ارشادات میں ان سب سے زیادہ زور اثر ہے، اور مولانا حالؔی نے اس قابلِ اصلاح روش کو چھوڑ کر اپنے مسدس میں آپ (ﷺ) کی اسی روحانی طاقت کو نمایاں کیا ہے، اس لیے اُردو شاعری میں اس سے زیادہ صحیح، اس سے زیادہ مستند اور اس سے زیادہ پُراثر کوئی نعتیہ نظم نہیں مل سکتی۔

حالؔی کی اس نعتیہ نظم کو جدید شعرا کے لیے نمونہ قرار دیتے ہوئے ندوی رقم طراز ہیں:

> مولانا حالؔی نے شعرائے دورِ جدید کے لیے جو بہترین نمونہ قائم کر دیا تھا اس سے اگر چہ یہ توقع تھی کہ اب نعت گو شعرا کے کلام میں عاشقانہ شاعری کے عناصر رقیقہ کے بجائے مذہبی عظمت اور دینی متانت کے اجزا شامل ہو جائیں گے۔ تاہم اس توقع میں کافی کامیابی نہیں ہوئی۔

اس کے باوجود ان کا ماننا ہے کہ ''دورِ جدید کے شعرا کی نعتیہ نظمیں قدما اور متاخرین کی نعتیہ نظموں سے زیادہ پُرعظمت زیادہ متین اور زیادہ مؤثر ہیں۔''☆۱

شمس العلما خان بہادر نواب عزیز جنگ ولؔا کی نظم ''تصویرِ نو'' جو چار سو بند پر مشتمل ہے۔ اس میں سراپائے مبارک، شمائلِ اقدس نبی کریم ﷺ پیش کیے گئے ہیں۔ نظم بے حد اہمیت کی حامل ہے۔

ولؔا جسمِ مبارک نورِ یزدانی کا پتلا ہے
جسے خود اپنے ہاتھوں صانعِ قدرت نے ڈھالا ہے
اسی نورِ مجسم کا مرقع یہ سراپا ہے
اسی کا عکس ہے جرم قمر خورشید سایا ہے
زمیں پر عمر بھر ہم نے نہ پایا اس کے سایے کو
سمجھتے ہی نہ تھے کچھ آج تک ہم اس کنائے کو

ڈاکٹر برقؔ لکھتے ہیں: ''ولؔا نے نہایت تفصیل اور باریک بینی کے ساتھ سراپائے حضور کی تصویرِ نورانی پیش کی ہے۔ شعری محاسن پیدا کرنے کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ واقعات و روایات کی مدد سے اپنے توصیفی اور مدحیہ انداز کو تقویت پہنچائی ہے۔'' شمس العلما ولؔا ہی کی طرح مولانا وحید الٰہ آبادی کا شمار بھی اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بہ قول ڈاکٹر برقؔ کثیر تھی جن میں بیش تر رُؤسائے عظیم آباد، صوفیا و مشائخ تھے مثلاً شاہ اکبر دانا پوری بے نظیر شاہ وارثی

☆۱۔ شعر الہند حصہ دوم، صفحہ ۲۰۷

کٹڑا مانک پوری اور اکبر الہ آبادی وغیرہ۔ بے نظیر شاہ اور اکبر دانا پوری نے تو بڑی والہانہ نعتیں لکھی ہیں۔ شاہ اکبر دانا پوری کو وحید الہ آبادی کے تلامذہ میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ انھوں نے کثرت سے نعتیں قلم بند کی ہیں۔ ''جذباتِ اکبر'' اور ''تجلیاتِ عشق'' دونوں دواوین نعتیہ غزلوں سے معمور ہیں۔ ان کا رنگِ سخن دیکھیے:

مصحفِ ناطق رُخِ پُرنور ہے اس ماہ کا
ابروے سلطانِ دیں ہے بسم اللہ کا
تھا مدینہ سامنے آنکھوں کے ہنگامِ طواف
میں نے کعبہ میں بھی دیکھا گھر رسول اللہ کا

انیس ویں صدی عیسوی کی اہم شخصیتوں میں مولانا احمد رضا خاں، مولانا حسنؔ رضا خاں، سیّد محمد کچھوچھوی، ظفرؔ علی خاں، شاہ عظیم آبادی، اقبالؔ اور بیدم وارثی کے نام نعتیہ شاعری میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تاہم ان تمام شعرا میں بہ حیثیت نعت گو مولانا احمد رضا خاں کا نام نمایاں ہے۔ آپ نے نعت پاک کو نئی سمتوں اور جہتوں سے آشنا کیا۔ شاعرؔ لکھنوی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''نعت گوئی کی دو حیثیتیں ہیں (۱) وہ نعت گوئی جو روایت سے چل کر عقیدے پر ختم ہو جاتی ہے۔ (۲) وہ نعت جو عشق سے چل کر ایمان پر ختم ہو جاتی ہے۔ رضاؔ بریلوی کی نعت دوسری حیثیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے ان کی نعت گوئی اپنے معیار کے اعتبار سے ایک انفرادی و امتیازی شان کی مالک نظر آتی ہے۔''☆۱

مولانا احمد رضا کے یہاں مضامین و موضوعات کا جو تنوع ہے، تکنیک، ساختیات اور لسانی تجربے کے اعتبار سے وہ اپنے ہم عصروں میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ ان کی نعت گوئی کو عصری یا زمانی اعتبار سے مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نعت گوئی کو ادب و فن کے مقام پر پہنچا کر اسے اعلیٰ شاعری کا درجہ عطا کر دیا اور علمی و شعری وقار کا متحمل بنا دیا۔ بہ قول ڈاکٹر ریاض مجید: ''تبحرِ علمی، زورِ بیان اور وابستگی و عقیدت کے عناصر ان کی نعت میں یوں گھل مل گئے ہیں کہ اُردو نعت میں ایسا خوش گوار امتزاج کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتا۔'' اور فرمان فتح پوری کے خیال میں: ''جہاں تک خاص نعتیہ شاعری کا تعلق ہے اُردو میں جو قبولِ عام مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی شاعری کو ملا کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔'' اور یہ حقیقت ہے کہ ''اُردو نعت کی ترویج و اشاعت میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ انفرادی طور پر کسی شاعر کی نعت گوئی نے وہ اثر مرتب

☆۱۔ بحوالہ تاریخ نعت گوئی میں حضرت رضا بریلوی کا منصب، مرکزی مجلس رضا، لاہور، صفحہ ۲۴

نہیں کیے جو رضاؔ کی نعت گوئی نے۔''

فاضل بریلوی کے عہد میں نعتیہ شاعری کا معیار کم و بیش وہی تھا جو انیس ویں صدی کے نصف آخر میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سراج احمد بستوی کے خیال میں: ''اس دور میں نعتیہ شاعری واضح طور پر دو خیموں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ نعت گو شعرا کا ایک حلقہ حالیؔ، شبلیؔ، محسنؔ، نظمؔ، طباطبائی کے زیرِ اثر تھا تو دوسرا طبقہ شعرائے نعت گو امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی کے زیرِ اثر تھا۔ اوّل الذکر کے یہاں مسائلِ حاضرہ بھی نعت کے دامن میں جگہ پاتے تھے جب کہ آخر الذکر شعرا کے یہاں نعت میں تغزل کا فنی اور لسانی دروبست نظر آتا ہے اور آخر الذکر شعرا کے یہاں نعت کا روایتی اسلوب بھی خاصا نمایاں ہے۔ گویا گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹ رہی تھی۔ اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے زخم اب اتنے تازہ نہیں رہے تھے، لیکن اوّل الذکر شعرا نے اس کسک کو اپنی نعت گوئی میں قائم رکھا جو زوالِ اُمتِ مسلمہ سے دلوں میں پیدا ہوئی تھی۔ ایک گروہ کی زمام میلادا کبر والے اکبر میرٹھی کے ہاتھ میں تھی تو اوّل الذکر کی قیادت مولانا ظفر علی خاں اور اقبال وغیرہ کے ہاتھوں میں تھی۔''

''اس منظر نامے میں فاضل بریلوی کی آواز ایک تیسری آواز کے طور پر شامل تھی۔ اس آواز میں عشقِ رسول کی کچھ ایسی سمتیں شامل ہوگئیں تھیں جو اس سے پہلے نعتیہ شاعری کا مقدر نہ بن سکی تھیں۔''[☆۱]

نعت گوئی کا فن عشقِ رسول کی منزل میں انتہائی کٹھن، دشوار اور خار دار راہ ہے جس سے ہو کر گزر جانے کی سعادت کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ یہ ایسا پل صراط ہے جس پر قدم رکھنا اور توازن برقرار رکھتے ہوئے گزر جانا سب کے بس کا کام نہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب دینی علوم کی آگہی اور شریعت و طریقت کا مکمل عرفان ہو۔ فاضل بریلوی کی تاریخ ساز نعت گوئی اور اس فن پر مکمل گرفت ان کی علمی بصیرت، فکری گہرائی و گیرائی و ذہنی صلاحیت، فقیہانہ بصیرت اور مجتہدانہ کوشش بین ثبوت ہیں۔ موصوف اپنی نعت گوئی کے متعلق خود گویا ہیں:

میں ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ
بے جا سے ہے لِلّٰہ المنۃ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکامِ شریعت ملحوظ

چند اشعار بہ طورِ نمونہ پیش ہیں جن کے مطالعہ سے فاضل بریلوی کی غیر معمولی ذہانت اور تبحرِ علمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

☆۱۔ مولانا احمد رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری، تحقیقی مطالعہ، صفحہ ۲۰۴

طوبیٰ میں جو سب سے اونچی نازک سیدھی نکلی شاخ
مانگو نعت نبی لکھنے کو روحِ قدس سے ایسی شاخ
مولا گلبن ، رحمت زہرا ، سبطین اس کی کلیاں پھول
صدیق و فاروق و عثمان و حیدر ہر اک اس کی شاخ

———

حاجیو! آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو
غور سے سن تو رضاؔ! ، کعبہ سے آتی ہے صدا
میری آنکھوں سے مرے پیارے کا روضہ دیکھو

———

واہ کیا جود و کرم ہے شہہِ بطحیٰ تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

فاضل بریلوی کا قصیدہ سلامیہ اُردو زبان کا سب سے مقبول قصیدہ ہے جس کی گونج برِصغیر ہند و پاک میں ہی نہیں بلکہ یورپ کے ایوانوں میں بھی گونجتی ہے۔ یہ قصیدہ ۱۷۲/اشعار پر مشتمل ہے۔ ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام
جن کے سجدے کو محرابِ کعبہ جھکی
ان بھووں کی لطافت پہ لاکھوں سلام
پتلی پتلی گلِ قدس کی پتیاں
ان لبوں کی نزاکت پہ لاکھوں سلام

آپ کی حدائقِ بخشش (دو حصوں میں) ایک ایسی متاعِ بے بہا ہے جس پر اُردو کی نعتیہ شاعری کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

مولانا حسن رضاؔ خاں، شادؔ عظیم آبادی اور محدثِ اعظم ہند حضرت سیّد محمد کچھوچھوی علیہ

الرحمہ کے نعتیہ اشعار روحانی و نورانی لمحات کا مظہر ہیں۔ بنیادی طور پر زبان و بیان اور اسلوب کی پیش کش میں اساتذۂ قدیم سے انحراف نہیں کرتے تاہم شاؔد کے یہاں غزل کا انداز نمایاں ہے جب کہ مولانا حسن رضا فاضل بریلوی کے رنگِ سخن کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقباؔل نعت گوئی میں بھی اپنی اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں۔ ان کی نعتیہ شاعری کا بیش تر حصہ عشقِ رسول کی تجلّیوں کا مظہر ہے۔ بہ قول پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ: ''اُردو کی نعتیہ شاعری میں اقبال سے ایک مستقل باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ انھوں نے نعتیہ شاعری کو تکنیکی طور پر جو ندرت بخشی ہے، صوری و معنوی طور پر جو شوکت و وسعت عطا کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسلوب و ادا کا یہ فنی حسن بھی اُردو میں نایاب ہے۔'' ظفر علی خاں کے یہاں جذبات کی حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔ انھوں نے نعت کو ایک نیا روپ اور جذبہ عطا کیا۔ علامہ اقباؔل اور ظفؔر علی خاں نے زندگی کی حقیقتوں کو سیرتِ پاک کے مختلف پہلوؤں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان حضرات کے یہاں تعمیری انقلاب کی مثالیں حضورِ اقدس کی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ نمونہ ہائے کلام درجِ ذیل ہیں:

نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں
لیے ہوئے یہ دلِ بے قرار ہم بھی ہیں
ہمارے دستِ تمنا کی لاج بھی رکھنا
ترے فقیروں میں اے شہریار ہم بھی ہیں
(حسن رضا خاں بریلوی)

لکھتے رسالہ ہم ترے وصفِ جمیل کا
ملتا قلم ہمیں جو پرِ جبرئیل کا
ساقی کی چشمِ مست کا اللہ رے اثر
پانی شرابِ ناب بنا سلسبیل کا
(شاؔد عظیم آبادی)

یاد آئے ہیں تو پھر یاد کی لذت لوٹو
جھوم کر بولو کہ اے میرے نبی صلی اللہ
کیا ثنا ان کی کروں جن کا ثنا خواں ہے خدا
یہ تو سیّد کی ہے درماں طلبی صلی اللہ
(محدثِ اعظم ہند حضرت سیّد محمد کچھوچھوی)

ہوئی تکمیلِ دیں تم سے کہ ختم المرسلین تم ہو
رسالت ہے اگر انگشتری اس کی نگیں تم ہو
نشاں انا فتحنا کا نہ ہو کیوں آشکارا
علم بردارِ حق تم ہو، سپہ سالارِ دیں تم ہو
(مولانا ظفر علی خاں)

اور علامہ اقبالؔ کی شاعرانہ انفرادیت اور عظمت ملاحظہ کیجیے:

وہ دانائے سبل ختمِ رُسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ، عقلِ تمام بولہب

حضرت سراج الدین بیدم شاہ وارثی ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اس لیے ان پر عشق و عقیدت کا رنگ غالب ہے۔ تاہم احساسِ جمال، ندرتِ تخیل اور نئے اظہار کی حامل نعتیہ شاعری کے نمونے بھی ان کے یہاں مل جاتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات و کیفیات کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں:

پرتوِ گیسوئے خم دار دکھا کر حضرت
سبق سورۂ واللیل پڑھا دیتے ہیں
ان سے پیغامِ صبا تشنہ لبی کا کہیو
شربتِ دید جو پیاسوں کو پلا دیتے ہیں

رسول اللہ بے شک لائقِ وصف و ثنا تم ہو
محمد مصطفیٰ واللہ محبوبِ خدا تم ہو

بہارِ گلشنِ کونین ہو ، ابرِ سخا تم ہو
فزائے فرش ہو ، زینت ہو وہ عرشِ علیٰ تم ہو

اگر ہم سلطان محمد قلی قطب شاہ سے کرامت علی خاں شہیدی تک دورِ اوّل مان لیں اور محسن کاکوروی سے بیدم وارثی تک دورِ دوم، تو پھر تیسرے دور کے لیے عزیز لکھنوی، ضیاء القادری، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، اختر شیرانی، ماہر القادری، عرش ملسیانی اور حمید صدیقی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان تمام شعرا میں کچھ تو انیس ویں صدی کے اختتام تک اور کچھ بیس ویں صدی کے پہلے دہے میں ہوش سنبھال چکے تھے اور آزادی کا پرچم لہرانے تک ان کی شاعرانہ عظمت بامِ عروج پر تھی۔ ان حضرات کے یہاں نعت نگاری کے آداب اور ضابطے کا فکری نظام انتہائی منضبط نظر آتا ہے۔ ان حضرات کے ذریعے موضوعاتی اور ہیئتی ہر دو اعتبار سے اس فن میں وسعت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش ملتی ہے۔

عزیز لکھنوی کے یہاں حافظ، عرفی اور نظیر کا رنگ غالب نظر آتا ہے جب کہ ضیاء القادری، میر اور غالب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ عزیز لکھنوی کے نعتیہ قصائد فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان کی مضمون آفرینی، زورِ بیان اور علوئے فکر ملاحظہ فرمائیں:

کسے زیبندہ ہے کون و مکاں کی مسند آرائی
محمد رحمت للحق آقائی و مولائی

یہ **سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ** سے ہوا ظاہر
کہ تھی منظورِ حق کس درجہ ان کی عزت افزائی

ملائک کہتے ہیں **یا لیتنی کنت تراب** آ کر
شب و روز ان کے چوکھٹ پر ہے غولِ ناصیہ سائی

''گل کدہ'' اور ''انجم کدہ'' غزلوں کے دواوین، قصائد عزیز اور منقبت حضرت علی شیر خدا ان کی اہم یادگار ہیں۔ ضیاء القادری کا نعتیہ کلام عشق و محبت کے جذبے سے سرشار ہے۔ منظر کشی اور فضا آفرینی میں انھیں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

طیبہ کے شگفتہ باغوں کی دل کش وہ فضائیں ہوتی ہیں
خوش بو سے معطر دم بھر میں عالم کی ہوائیں ہوتی ہیں

زوارِ حرم پر ہوتی ہے انوارِ الٰہی کی بارش
جب گنبدِ خضریٰ پر چھائی رحمت کی گھٹائیں ہوتی ہیں
دیوانے ہجومِ محشر میں جب نعت کے نغمے گاتے ہیں
کہتی ہی صفیں وہ صلِ علیٰ جو دائیں بائیں ہوتی ہیں
مظلوم دہائی دیتے ہیں جب کالی کملی والے کی
ٹل جاتی ہے اُمت کے سر سے نازل جو بلائیں ہوتی ہیں
زوار کے دل ہو جاتے ہیں پر نور شبِ قربت میں ضیا
روضہ کی حسیں قندیلوں کے سینہ میں ضیائیں ہوتی ہیں

حفیظؔ جالندھری، بہزاد لکھنوی اور مولانا اقبال سہیلؔ بھی عشقِ رسول ﷺ کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ مثنوی شاہنامہ اسلام حفیظ جالندھری کی شاہکار تخلیق مانی جاتی ہے، ''شاہنامہ'' حفیظ کا وہ زندہ کارنامہ ہے جس میں شاعر کے اسلوب اور اظہار کے قرینے، نرم و نازک اندازِ بیان اور طرزِ اظہار کا لطف نمایاں ہے۔ شاعر کا درد و گداز اور خلوص و شوق کی آئینہ داری دیکھیے:

وہ دن آیا کہ پورے ہوگئے توراۃ کے وعدے
خدا نے آج ایفا کر دیے ہر بات کے وعدے
سرِ فاراں پہ لہرانے لگا جب نور کا جھنڈا
ہوا اِک آہ بھر کر فارس کا آتش کدہ ٹھنڈا
بجائی بڑھ کے اسرافیل نے پرکیف شہنائی
ہوئی موجِ ملائک جمع زیرِ چرخِ مینائی
سحابِ نور آکر چھا گیا مکے کی بستی پر
ہوئی پھولوں کی بارش ہر بلند اور پستی پر
مبارک ہو کہ دورِ راحت و آرام آ پہنچا
نجاتِ دائمی کی شکل میں اسلام آ پہنچا
مبارک ہو کہ ختم المرسلیں تشریف لائے ہیں
جنابِ رحمت للعالمیں تشریف لائے ہیں

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حفیظؔ نے سراپا شوق اور ہمہ اضطراب کی کیفیت کو ادب و احترام کی تنگنائے سے گزارا ہے، نئے لہجے اور اسلوب کے ساتھ۔

بہزآد لکھنوی کو بھی شعر و سخن سے گہرا شغف رہا ہے۔ نعت میں مخصوص انداز اور لب و لہجے کے مالک ہیں حالاں کہ غزل میں ان کا لہجہ نہایت تیز اور تیکھا ہے تاہم ان کے نعتیہ کلام میں نرم و نازک طرزِ اظہار کا لطف نمایاں ہے۔ ان کا کلام جدت و ندرت اور کیف و اثر سے بھرپور ہے:

اے صاحبِ شوکت صلِ علیٰ اے رہبرِ اُمت کیا کہنا
ہر سمت تجلّی ہے تیری اے شمعِ رسالت کیا کہنا
ہر سانس تھی محوِ یادِ خدا ، ہر بات تھی جانِ الّا اللہ
اس زہد و عبادت کے صدقے یہ شانِ عبادت کیا کہنا
دشمن پہ کرم دشمن پہ عطا ، دشمن کے لیے بھی لب پہ دُعا
اس شے کو سخاوت کہتے ہیں یہ رنگِ سخاوت کیا کہنا
ہے ذاتِ مقدس خیرِ بشر ، ہے آپ کی جانب سب کی نظر
کیوں کر نہ ہو فرقِ والا پر یہ تاجِ شفاعت کیا کہنا
یہ نعت پڑھوں جب جھوم کے میں ، انگشتِ شہادت چوم کے میں
بہزآد حزیں سب لوگ کہیں مداحِ رسالت کیا کہنا

مولانا اقبال سہیلؔ کا انداز اس اعتبار سے بالکل مختلف ہے کہ ان کے یہاں جدید طرزِ احساس، اصابتِ فکر اور لفظوں کی تازہ کاری کا ہنر بھی ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کی ردیف میں ان کی یہ نعت نہایت مقبول رہی ہے:

احمد مرسل ، فخرِ دو عالم ، صلی اللہ علیہ وسلم
مظہرِ عالم ، مرسلِ خاتم ، صلی اللہ علیہ وسلم
فرد و جماعت ، امر و اطاعت، کسب و قناعت ،عفو و شجاعت
حل کیے جو اسرار تھے مبہم ، صلی اللہ علیہ وسلم
صدقے جس کی خاکِ قدم پر تختِ فریدوں تختِ سکندر
سطوتِ کسریٰ ، شانِ کے و جم ، صلی اللہ علیہ وسلم
صدرِ اُمم ، سلطانِ مدینہ ، وہ جن کے کفِ پا کا پسینہ
گل کدۂ فردوس کی شبنم ، صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ نعتیہ شاعری کے ارتقا میں ان حضرات کا بھی اہم رول رہا ہے۔ بیس ویں صدی کا آغاز

ہندوستان کے لیے سیاسی اعتبار سے کڑی آزمائشوں، آلائشوں، ہلاکت خیزیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا دور رہا ہے۔ تاہم ان نامساعد و ناموافق حالات میں بھی مذہبِ اسلام اور بانیِ اسلام سے ان حضرات کی وابستگی غیر معمولی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ ان شعرا کی پاک طینتی اور قوتِ ایمانی کا عکس ان کے کلام سے نمایاں ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے متعلق پروفیسر طلحہ رضوی برؔق نے لکھا ہے کہ: ''وہ اگر صرف اُردو شاعری کے ہو رہتے تو نہ معلوم شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام کتنا بلند ہوتا۔ تاہم جو کلام ان کا دستیاب ہے وہی ان کی قادر الکلامی اور فن کارانہ مہارت کی دلیل ہے۔''
چند اشعار نعت پاک کے پیش ہیں جن سے ان کی فن کارانہ صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

کلفتِ قطعِ منازل ہوئی کافور ہے آج
ہے مدینہ سے جو نزدیک تو سب دُور ہے آج
اپنے پلے کوئی سوغات نہیں اس کے سوا
نقدِ جاں نذر کر اے دل یہی دستور ہے آج
سنگِ در تک تو بہرحال رسائی بخشی
دیکھوں کیا کیا مرے سرکار کو منظور ہے آج
جس سے چہرے دمک اُٹھے تھے کبھی یثرب کے
دیکھو جوہؔر کی بھی آنکھوں میں وہی نور ہے آج

مولانا حسرؔت موہانی کی شخصیت ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ ان کا شمار اُردو کے خوش فکر اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ موصوف نیشا پوری خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے تھے جو مسلکِ تصوف سے وابستہ تھا۔ ہندوستان کی گرما گرم سیاست میں بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ قدم جمایا۔ آزادی کی بے پناہ خواہش اور اس کے حصول میں سب کچھ نثار کر دینے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ حسرؔت کو عشقِ مجازی کے ساتھ عشقِ حقیقی کے بیان میں یدِ طولا حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نعتیہ اشعار پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عشقِ نبی میں حسرؔت کی سرشاریت ملاحظہ کیجیے:

عجب بہار ہے آب و ہوا مدینے کی — پسندِ شوق ہے صلِ علیٰ مدینے کی
بامتیاز بہ تخصیص خواب گاہِ رسول — قلوب اہلِ ولا میں ہے جا مدینے کی
علاجِ ملتِ عاصی کی فکر کیا ہو اُسے — جسے نصیب ہو خاکِ شفا مدینے کی

مظہرِ شانِ کبریا صلِ علیٰ محمد — آئینہ خدا نما صلِ علیٰ محمد

مونسِ دل شکستگاں پشت و پناہ خستگاں شافعِ عرصۂ جزا صلِ علیٰ محمد
حسرتؔ اگر رکھے ہے تو بخشِ حق کی آرزو وردِ زباں رہے سدا صلِ علیٰ محمد

جوشؔ اپنے ہم عصروں میں اسلوب اور آہنگ کے اعتبار سے منفرد لہجے کے شاعر ضرور ہیں اور ان کے یہاں غزلوں اور نظموں کی طرح نعت میں بھی وہی طمطراق اور زبان و بیان میں وہی جاہ و جلال دیکھنے کو ملتا ہے تاہم پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کے خیال میں: ''ان کے یہاں لفظوں کے طمطراق، شوکتِ زبان، زورِ بیان اور علوئے تخیل میں گداختگی قلب و رقتِ جذبات کا دُور دُور پتا نہیں۔نعتِ رسول میں عقیدت و عبدیت کی گھلاوٹ طرۂ امتیاز سمجھی گئی ہے۔جوشؔ کی نعتیں محض رسمِ شاعری کے طور پر لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔''[☆۱]

ذیل کے چند اشعار سے مذکورہ بیان کی صداقت ہوتی ہے:

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری
اے کہ ترا غبارِ راہ تابشِ روئے ماہتاب
اے کہ تیرا نشانِ پا نازشِ مہر خاوری
چھین لیں تو نے مجلسِ شرک و خودی سے گرمیاں
ڈال دی تو نے پیکرِ لات وہبل میں تھرتھری
تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
بخشا گدائے راہ کو تو نے شکوہِ قیصری
چشمہ ترے بیان کا غارِ حرا کی خامشی
نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتحِ خیبری

اخترؔ شیرانی کو اُردو کی رومانی شاعری کا شہنشاہ مانا جاتا ہے۔ان کی شاعری کا معتد بہ حصہ رومانیت پر مبنی ہے۔تاہم ان کی نعتیہ شاعری جذبات کی دل آویزی اور تشبیہات کی رنگینی سے بھرپور ہے۔اقبال کی زمین میں اخترؔ کی نعت کے چند اشعار پیش ہیں:

اگر اے نسیم سحر ترا ہو گزر دیارِ حجاز میں
مری چشمِ تر کا سلام کہنا حضور بندہ نواز میں

☆۱۔ اُردو کی نعتیہ شاعری، صفحہ ۶۷

نہ جہاں میں راحتِ جاں ملی ، نہ متاعِ امن واماں ملی
جو دوائے دردِ نہاں ملی ، تو ملی بہشتِ حجاز میں

اور دوسری نعت کے یہ اشعار:

مسند نشینِ عالمِ امکاں تمھیں تو ہو   اس انجمن کی شمعِ فروزاں تمھیں تو ہو
روشن ہے جس کی ضو سے شبستانِ زندگی   وہ ماہِ نیم ، ماہ شبستاں تمھیں تو ہو

———

ماؔہر القادری کی شاعرانہ زندگی میں مذہب کے گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام میں سچے خلوص اور گہری عقیدت ومحبت کا عکس نمایاں ہے۔ عالمِ جذب اور عشق کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے لفظوں کے گہری آب وتاب دیکھیے:

کس بیم و رجا کے عالم میں طیبہ کی زیارت ہوتی ہے
اِک سمت شریعت ہوتی ہے اِک سمت محبت ہوتی ہے
اے صلِ علیٰ ، ایک ایک ادا اللہ کی آیت ہوتی ہے
ہے روئے محمد پیشِ نظر قرآں کی تلاوت ہوتی ہے
طیبہ کے ببولوں کے کانٹے ، پھولوں سے بھی نازک تر نکلے
تلووَں کو بھی لذت ملتی ہے ، آسودہ طبیعت ہوتی ہے

ان اشعار میں ماؔہر کے جذبات کی صداقت، اظہار کی سادگی، بیان کی سلاست، اسلوب کی لطافت اور جذب وکیف کو بہ خوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں عرؔش ملسیانی اور عبدالحمید صدیقی نے بھی نعت میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں بھی داخلیت، سوز وگداز، رقت اور والہانہ پن غیر معمولی طور پر موجود ہے۔ عرؔش ملسیانی کا پیرایۂ بیان دیکھیے:

رُخِ مصطفیٰ کا جمال اللہ اللہ   زباں کا وہ حسن مقال اللہ اللہ
نگاہوں کا جادو دلوں پر مسلّط   جمال اللہ اللہ ، جلال اللہ اللہ
لبِ مصطفیٰ پر یہ اسرارِ وحدت   یہ بادہ یہ مینا یہ جام اللہ اللہ

———

لطفِ خدائے پاک شفاعت کے بھیس میں
فیضِ عمیم کا وہ اشارہ تمھیں تو ہو

اور عبدالحمید صدیقی کا والہانہ پن دیکھیے:

دیکھے تو کوئی رحمتِ سلطانِ مدینہ میں اور درِ دولتِ سلطانِ مدینہ
ارشادِ خدا ہے ورفعنالک ذکرک جس سے ہے عیاں رفعتِ سلطانِ مدینہ
محشر کا نہیں ڈر مجھے شافع ہیں جو میرے محبوبِ خدا حضرتِ سلطانِ مدینہ

———

علامہ قتیل دانا پوری کا تعلق صوبہ بہار کے اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ ان کے متعلق ان کے صاحب زادے پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ رقم طراز ہیں: ''فارسی و اُردو میں صاحبِ دیوان ہیں۔ آپ کی نظمیں 'ایک ہندی بھکاری دربارِ رسول میں'، 'گنبدِ خضریٰ مدینہ کے حضور'، 'الوداع اے ارضِ مدینہ' اور ''فریاد' بے حد مقبول ہوئی ہیں۔ جذبات کی شدت میں دُکھے دل کی فریاد نے اشعار کی صورت اختیار کر لی ہے۔''[☆۱]

قتیل دانا پوری کا تعلق ناسخ اسکول سے رہا ہے۔ جن کے احسانات سے اُردو زبان قیامت تک سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ موصوف کی شاعری پر ناسخ کا خاص اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ یہ کہ ناسخ کی طرح ان کے یہاں بھی تشبیہات و استعارات کے علاوہ فصیح الفاظ ومحاورات اور متانت وسنجیدگی ان کی شاعری کا حصہ بن گئی ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور اسلوب سے ان کے کلام کی جہت کا تعین ہوتا ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار میں التزامِ شعری کے علاوہ غزل کی روایات کی دل آویزی میں بڑا توازن پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے چند نعتیہ اشعار:

وہ رُخِ آئینہ وحدت نما معلوم ہوتا ہے
نبی کو دیکھتا ہوں اور خدا معلوم ہوتا ہے
وجود ان کا ہے یا میزان حسن و قبح ہستی کی
اسی معیار پر کھوٹا کھرا معلوم کرتا ہوں
کلاہ بادشاہت ہے تری نعلین کا صدقہ
شہنشاہِ جہاں تیرا گدا معلوم ہوتا ہے
خدا کو دیکھنا ہو تو نبی کی ذات کو دیکھو
یہی مظہر ہے وہ جس میں خدا معلوم ہوتا ہے

علامہ کی نظم ''فریاد'' کے پہلے بند سے چند اشعار پیش ہیں جن سے زورِ بیان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

☆۱۔ بہ حوالہ اُردو کی نعتیہ شاعری، ص ۶۸

اے سوادِ چشم بینش ، اے بیاضِ صبح دہر
اے کہ تیری ذات ہے معیارِ حسن و قبح دہر
اے بہائے آفرینش ، اے گلِ باغِ خلیل
اے کہ تو سرتا قدم تفسیر اللہ و جمیل
اے ضیا پاشِ سپہرِ کشورِ بیم و اُمید
اے کہ تیرے حسن سے جملہ محاسن مستفید
اے سراجِ نور حق انور تراز مہرِ منیر
اے کہ تیرے نور سے سارے منور مستیز

علامہ جمیلؔ مظہری، سیّد شاہ فضل امام واقفؔ آروی، عبدالحمید عدمؔ، عندلیبؔ شادانی، شکیلؔ بدایوانی، محمد عثمان عارف، نازش پرتاب گڑھی، عبدالعزیز خالدؔ، بیکلؔ اُتساہی، عمیق حنفی ایسے شعرا ہیں جنھوں نے نعتیہ شاعری میں خاطر خواہ اضافے کیے ہیں۔ جمیلؔ مظہری مذکورہ شعرا میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی فکر انگیز شاعری منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ پروفیسر برقؔ نے ان کی شاعری پر یوں تبصری کیا ہے۔ موصوف کے خیال میں: ''علامہ کی اکثر نظموں میں تشکیک کی لہر کا پتہ چلتا ہے۔ مگر حضور رحمۃ للعالمین کی شان میں موصوف نے جو شان دار نعت نظم فرمائی ہے وہ آپ کی عقیدت و مذہبیت کا آئینہ ہے۔'' جمیلؔ کی نعتیہ شاعری فنی اعتبار سے بلندی پر ہے۔ وہ کسی افراط و تفریط کا شکار نظر نہیں آتے۔ وہ اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وہ دیکھو چاند نکلا وادیِ تاریک بطحیٰ کا
وہ دیکھو چاندنی چھٹکی فروغِ روئے روشن سے
یہ کس نے وادیِ بطحیٰ میں دل کی بانسری چھیڑی
کہ پر تو لے چلے آتے ہیں طائر بندرابن سے
ہوئے جاتے ہیں فسق و کفر کے آتش کدے ٹھنڈے
پئے تسلیم خم ہے سطوتِ کسریٰ مداین سے
وہ جلوہ جو سرورِ معرفت دیتا ہے آنکھوں کو
وہ آنکھیں جو خراجِ دوستی لیتی ہیں دشمن سے

واقفؔ آروی کا شمار بھی اُردو کے قادر الکلام شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری میں خلوص و محبت اور عقیدت و احترام کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ جذب و اثر سے بھرپور

نعت کے چند اشعار دیکھیے:

کیا کہیے مقامِ دلِ شیدائے محمد — یا کنگرۂ عرش ہے یا جائے محمد
ہے شورِ ورفعنا لک ذکرک کا جہاں میں — اللہ ہے خود انجمن آرائے محمد
ظاہر ہے کہ سرکار ہیں جب رحمتِ عالم — مغضوب ہیں مقہور ہیں اعدائے محمد
واقفؔ کبھی اغیار کو ہرگز نہ بتانا — کیوں عرش پہ ہے نغمۂ اسمائے محمد

———

شکیلؔ بدایونی کا تعلق گرچہ فلمی دُنیا سے رہا اور انھیں جو شہرت ملی وہ فلمی گیت اور غزلوں کے ذریعے ہی ملی۔ تاہم ان کی غزلوں کے متعدد مجموعے منظرِ عام پر آئے مثلاً ''رعنائیاں''، ''نغمۂ فردوس''، ''صنم و حرم اور شباستاں''۔ ''نغمۂ فردوس'' جو اُن کا نعتیہ مجموعۂ کلام ہے، اس کے حرفِ آغاز میں والیؔ آسی اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''شکیل بدایونی صاحب کے نعتیہ کلام میں احساسِ عظمت و پاسِ ادب بھی ملتا ہے۔ سلاست روی و اعتدال بھی ملتا ہے۔ سوز و گداز، تڑپ نشتریت اور جاذبیت بھی ملتی ہے۔ اور عشقِ رسول ﷺ کا پاکیزہ اور صادق جذبہ بھی ملتا ہے— یہی سوز و گداز اور تڑپ یہی نشتریت اور جاذبیت اور عشقِ نبی ﷺ ان کی کامیاب ترین نعت گوئی کا ضامن ہے۔''[☆۱] ذیل میں چند اشعار بہ طورِ نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

ہے دل میں جلوۂ رُخِ تابانِ مصطفیٰ
قندیل کعبہ ہے تہِ دامانِ مصطفیٰ
سمجھے نہ ہم خدا کی قسم شانِ مصطفیٰ
کھائی خدا نے خود قسمِ جانِ مصطفیٰ
زاہد ہے بزمِ حشر میں شرمندۂ عمل
کوثر بہ کف ہے مجمعِ رندانِ مصطفیٰ

———

شکیل کس منہ سے ہو ثنائے حبیبِ داور رسولِ اکرم
خدا کے جلوے دکھانے والے خدا کو جلوہ دکھا رہے ہیں

———

محمد عثمان عارفؔ نقشبندی کا شمار عصرِ حاضر کے اہم نعت نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ علمی

☆۱۔ نغمۂ فردوس، صفحہ ۱۰

اعتبار سے آپ کا مرتبہ قابلِ قدر ہے۔ اترپردیش کے گورنر کی حیثیت سے بھی آپ نے خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کی شعری نگارشات میں ''نذرِ وطن''، ''عقیدت کے پھول''، ''قلم کی کاشت''، ''نورِ زندگی''، ''دیارِ محبوب'' اور ''لمحوں کی دھڑکنیں'' یادگار مجموعے ہیں۔ ''عقیدت کے پھول'' نعت و سلام اور منقبت پر مشتمل ہے۔ زبان و بیان کی دل آویزی، جملوں کی ساخت اور تشبیہات و استعارات کی تازہ کاری ان کی نعتیہ شاعری کا بنیادی وصف رہا ہے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کی شان وعظمت اور عقیدت ومحبت کے اظہار میں والہانہ پن، وارفتگی، دل کشی اور تڑپ، نئی فضا اور نئے احساس کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر نعت کے چند اشعار:

ہجر کی راتیں بھی روشن ہیں تصور سے ترے
اشک کی ہر بوند رشکِ روشنیِ طور ہے

سینہ ہے کہ گنجینۂ اسرارِ الٰہی
چہرہ ہے محمد کا کہ قرآنِ مبیں ہے

کچھ نہ باقی رہے اب عشقِ محمد کے سوا
عشق کی آگ جو پھیلے مری جاں تک پہنچے

آنکھوں کے اشک دھوئیں گے دل کے غبار کو
پہلے وضو کروں تو محمد کا نام لوں

نازشؔ پرتاب گڑھی، عبدالعزیز خالدؔ، بیکلؔ، اُتساہی اور ساحرؔ شیوی عصرِ حاضر کے ایسے شعرا ہیں جنھوں نے غزلوں اور نظموں کی جہاں خوب خوب آبیاری کی وہیں نعت پاک کی محفلوں کو بھی عشق وعرفان کی روشنی سے منور کر دیا۔ نازشؔ کے متعدد شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے جن میں ''نوائے ایماں'' اور ''نوائے سرمدی'' ان کے نعتیہ کلام کے اہم مجموعے ہیں۔ عبدالعزیز خالدؔ کے بھی کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ ۱۹۶۳ء میں ان کی ایک کتاب ''فارقلیط'' شائع ہوئی۔ اس کتاب پر ۱۹۶۵ء میں انھیں ''آدم جی'' انعام سے بھی نوازا گیا۔ اس کتاب کے علاوہ ''ورق ناخواندہ''، ''دشتِ شام''، ''ماذ ماذ''، ''طاب طاب''، ''پروازِ عقاب''، ''حمطایا''، ''سلومی''، ''زنجیر رمِ آہو''، ''کلک موج''، ''گل نغمہ''، ''غزل الغزلات''، ''زر داغِ دل''، ''سرورِ رفتہ'' اور ''منحمنا'' جیسے

شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ ان میں ''ماذ ماذ''، ''طاب طاب''، ''حمطایا''، ''فارقلیط'' اور ''منحمنا'' نعتیہ مجموعے ہیں۔

بیکل اُتساہی کا شمار عصرِ حاضر کے اہم نعت گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں حکومتِ ہند نے ان کی اعلیٰ شعری خدمات کے عوض ''پدم شری'' کے اعزاز سے نوازا۔ غزل، گیت اور نظم نگاری کے یہ بے تاج بادشاہ ہیں۔ ''پروائیاں''، ''اپنی دھرتی چاند کا درپن'' اور ''کومل مکھڑے بیکل گیت'' غزلوں، نظموں اور گیتوں کے مجموعے ہیں۔ ''جامِ گل''، ''موجِ نسیم''، ''نورِ یزداں'' اور ''سرورِ جاوداں'' نعتیہ مجموعے ہیں۔

نازش پرتاب گڑھی نے اپنے جذبات و خیالات کو نہایت سادگی و پرکاری کے ساتھ دل نشیں انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ عبدالعزیز خالدؔ کے یہاں ایک خاص فضا بندی کا احساس ملتا ہے۔ زورِ بیان، اندازِ فکر، لب و لہجے کی بلند آہنگی اور قصائد کی روایتی شان پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

نازشؔ کی نعتیہ شاعری میں احساس کی شدت، اظہار و بیان کا خلوص اور عقیدت و ارادت ملاحظہ کیجیے:

ہو جائے گی سرد اس کے لیے آتشِ دوزخ
لے لے جو کوئی نام رسولِ عربی کا
نازاں ہو کہ اک ذرۂ ناچیز ہوں میں بھی
دربارِ شہہِ ہاشمی و مطلبی کا
نازشؔ یہ دُعا کر کہ دمِ واپسیں میرے
ہونٹوں پہ رہے نام رسولِ عربی کا

———

جانبِ طیبہ نسیمِ شوق لے جاتی ہمیں
جلوۂ صبحِ حرم با چشم گریاں دیکھتے
گر شریکِ حال ہوتی عشرتِ یادِ رسول
اپنے مستقبل کو اے نازشؔ درخشاں دیکھتے

———

عبدالعزیز خالدؔ کی نعتیہ شاعری میں موضوعات کی وسعت اور خیالات کے تنوع کے ساتھ

فکر و فلسفہ کی ہمہ گیری کا احساس جاگزیں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ''منحمنا'' کے چند اشعار پیش ہیں:

محمد انجمنِ کن فکاں کا صدر نشیں — محمد افسرِ آفاق و سرورِ عالم
وہی ہے شمعِ شبستانِ بے در و دیوار — اسی کی آس ہے آشا کے پھول بن کی الم
عطائے حق کا جو قاسم ہے وہ ابوالقاسم — ملیک مقسط و معطی و مقتدر کی قسم
وہی ہے کاشفِ رازِ نہانِ یزدانی — امین سرِ سرا پردۂ وجود و عدم

خالدؔ نے عربی و فارسی الفاظ کو جس برجستگی اور بے تکلفی سے استعمال کیا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ خالدؔ کے یہاں ہندی الفاظ بھی موتی کی طرح پروئے ہوئے نظر آتے ہیں تاہم بیکلؔ اُتساہی کے یہاں ہندی الفاظ کچھ اور ہی لطف و اثر رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں اپنے ہم عصروں سے مختلف اندازِ بیان ملتا ہے۔ گیت کا سا انداز اور مترنم لے اور لہجے کی انفرادیت انھیں امتیازی شان عطا کرتی ہے۔ بیکلؔ کے والہانہ پن میں سادگی اور روانی دیکھیے:

نہ پوچھو مدینے میں کیا دیکھ آئے — درِ پاکِ خیر الوریٰ دیکھ آئے
حسیں سبز گنبد وہ نوری منارے — سرِ فرش عرشِ علیٰ دیکھ آئے
کوئی ان سے پوچھے تو رحمت کا عالم — جو طیبہ کو اک مرتبہ دیکھ آئے
کہاں تیری تقدیر میں ایسا بیکلؔ — تو جا کر درِ مصطفیٰ دیکھ آئے

اور ہندی الفاظ کو شعری پیکر میں اس طرح ڈھالتے ہیں:

بطحا سے اک چاند اُدے بھے ، ہوئی گئے دوؤ جگت اُجیار
تارے جھک جھک لیت بلیّاں ، مکھ سے چومت چرن پیار
دھوئے چرن پھول کی شبنم کلیاں دیپ جلائے
گنگنائے بھنورے صل اللہ رحمت رس برسائے

اس طرح بیکلؔ اُتساہی نے اپنے نعتیہ کلام میں مقامی رنگ سے بھی کام لے کر لطف و اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اُردو زبان کے غیر مسلم شعرا نے بھی نعت پاک میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں تلوک چند محرومؔ، آنند نرائین ملّاؔ، جگن ناتھ آزادؔ، نریش کمار شادؔ، عرشؔ ملسیانی، جوشؔ ملسیانی، رانا بھگوان داس بھگوانؔ، پنڈت رگھوندر جذبؔ، پربھودیال مصرؔ، پچھمی نرائن شفیقؔ، پنڈیا دیا شنکر نسیمؔ، عزت سنگھ عیشؔ دہلوی، سندر لال شگفتہؔ لکھنوی، کالی داس گپتا رضاؔ، سرورؔ جہاں آبادی، کالکا پرشاد، ولورام کوثریؔ، شیو پرشاد وہبیؔ، راجندر بہادر موجؔ فتح گڑھی، رگھوناتھ خطیبؔ سرحدی، سوم ناتھ سومؔ، پریم سوشیل ورد

ہوشیار پوری اور سکھ دیو پرشاد بسملؔ الہ آبادی کے نام بہ طورِ خاص لیے جا سکتے ہیں۔ ہر ایک کے یہاں نعت کے فنی و فکری لوازمات کو بڑے ادب و احترام سے پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح متقدمین میں آیت اللہ جوہریؔ، رُکن الدین عشقؔ، حشرؔ عظیم آبادی، محمد علی فدویؔ، راسخؔ عظیم آبادی، وجدؔ بہاری، صفیرؔ بلگرامی، صوفیؔ منیری، عبدالحمید حمیدؔ سہسرامی، راحت سہسرامی، صوفی حسن جان خاں حسنؔ سہسرامی کے اسمائے گرامی نعت نگاروں کی صف میں رکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح سیّد سلیمان ندوی، مانوس سہسرامی، اوجؔ گیاوی، سریرؔ کابری، عطاؔ کاکوی، کلیم عاجزؔ، ارشدؔ کاکوی، حفیظؔ بنارسی، طلحہ رضوی برقؔ، حبیبؔ ہاشمی اچھے نعت نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اس دور کے اہم شعرا میں بہتیرے نام ایسے ہیں جن کے ذکر کے بغیر نہیں گزرا جا سکتا۔ ان میں چند ایسے ہیں جنھوں نے نعت گوئی میں اہم اضافے کیے ہیں۔ ان نام ورشعرا میں حمیدؔ صدیقی، جلیلؔ مانک پوری، شفیقؔ عماد پوری، سیمابؔ اکبر آبادی، آغا حشرؔ کاشمیری، بیخودؔ دہلوی، قمرؔ نعمانی، عندلیبؔ شادانی، مولانا فرخند علی فرحتؔ سہسرامی، مولانا محمد صدیق صادقؔ، مولانا محمد ضیاء الحسن ضیاؔ، مولانا حافظ انوار الحق نازشؔ سہسرامی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان شعرا نے زیادہ نعتیں غزل کے فارم میں کہی ہیں۔ غزل چوں کہ اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف رہی ہے۔ اس لیے بھی نعت کے لیے غزل کی ہیئت زیادہ مقبول رہی۔ سدا بہار صنف غزل کی مقبولیت، ہمہ گیری و اثر آفرینی کا کون قائل نہیں۔ اس کی توانائی اور امکانات نے دیگر اصناف کو کافی پیچھے چھوڑ رکھا ہے۔ ہر چھوٹا بڑا اس کی پناہ میں جذب باہمی کا شکار نظر آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس ہیئت میں گائے یا پڑھے جانے میں نعت خواں کو لطف ملتا ہے اور سامعین کو جو سرور حاصل ہوتا ہے، شاعری کی دیگر اصناف میں وہ بات نہیں۔ غزل کی ہیئت میں لہجے کا ساحرانہ انداز سامعین کو اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے۔ تاہم ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ غزل کے مزاج سے ہٹ کر جو نعت کہی گئیں یا کہی جا رہی ہیں وہ نعت نہیں۔

غزل کی ایمائیت اور اشاریت ہی دراصل اس کا بنیادی وصف رہا ہے۔ اس کی تفہیم آسان بھی ہے اور دشوار بھی۔ آسان اس معنی میں کہ میں اس کی پہلی قرأت میں ہی قاری معنی و مفہوم کی پہلی سیڑھی پر بآسانی اُتر کر یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے کچھ ہاتھ آ گیا ہے اور دُشوار اس معنی میں کہ اس کی ایمائیت اور اشاریت میں جو بیکرانی، وسعت اور گہرائی ہے، اس میں غواصی کے لیے نہایت مہذب اور تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ذہانت ہر قاری کو میسر نہیں ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر نے شعر کسی اور پس منظر میں کہے ہیں، تاہم قاری کی تربیت یافتہ اور مہذب ذہن معانی و مفاہیم کی قوس و قزح کو پالیتا ہے۔ اور تہہ در تہہ رنگوں کی جلوہ گری سے تخلیق کی دُھندلی،

پیچیدہ اور طلسماتی تصویر کو صاف دیکھ لیتا ہے اور پھر ''مشاہدۂ حق'' کی گفتگو کو دل اور جذبے کے آہنگ میں ڈھال کر عام قاری کے لاشعور میں ڈال دیتا ہے۔

غزل کا شعر چوں کہ ایک اکائی اور وحدت ہوتا ہے اس لیے فکر و خیال، جذبے اور تجربے کی مکمل آہنگی کا متقاضی بھی ہوتا ہے۔ غزل کی ہیئت میں نعت پاک ماضی میں بھی لکھی گئی اور موجودہ دور تو نعت کا دور کہا جا رہا ہے۔ جس میں نعت کے لیے غزل کی ہیئت مقبول ترین ہے۔ متاخرین اور قدما کے یہاں غزل کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رُباعی اور نظم کی ہیئت میں نعت پاک ملتی ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر انشاؔ، غالبؔ، مومنؔ، لطفؔ، ظفرؔ، داغؔ، امیرؔ — غرض کہ ہر ایک کے یہاں نعتیہ غزلوں کے نمونے مل جاتے ہیں۔ غالبؔ اور مومنؔ کے دور میں نعتیہ غزل کی خوب پذیرائی ہوئی۔ لطفؔ کی نعتیہ غزلیں بھی درد و اثر سے خالی نہیں۔ ان کے دیوان میں سو سے زائد نعتیہ غزلیں موجود ہیں جن میں زبان و بیان کی پختگی کے ساتھ رسالتِ مآب ﷺ کی محبت و عقیدت کا اظہار بھی ہے۔ ظفرؔ کی نعتیہ غزلوں میں زبان کی سلاست و روانی بدرجۂ اتم موجود ہے اور داغؔ کی نعتیہ غزلوں میں داخلیت اور خارجیت کی دل آویز کیفیت کا بھرپور احساس ملتا ہے۔

بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جو کسی اور پس منظر میں لکھی گئی ہیں، تاہم ان کے بعض اشعار کو نعتیہ شعر کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔ مثلاً غالبؔ کی ایک غزل کا مطلع ہے:

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے
رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

اسی غزل کے دو شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں جن میں نعتیہ امکانات کی زیریں لہریں محسوس کی جا سکتی ہیں:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

دراصل یہ غزل غالبؔ نے تجمل حسین خاں[☆۱] کی تعریف میں کہی ہے۔ تاہم فکرِ رسا ذہن نے ان اشعار کی اُٹھان، فکر کی بلندی، خیال کی ندرت اور پاکیزگی کے باعث اسے نعت کا شعر کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا کیوں کہ ان اشعار کی جو خلاقیت ہے، تجمل حسین کی شخصیت اس کی متحمل نہیں

☆۱۔ بہ حوالہ الہامات غالبؔ، ص ۳۶۴

ہوسکتی۔ اسی طرح میرؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، نظیرؔ، میر باقر آگاہؔ، مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، امیرؔ مینائی، آسیؔ غازی پوری، حالیؔ، سیمابؔ، اقبالؔ، بیدم وارثی، حفیظؔ جالندھری، بہزاد لکھنوی، ماہر القادری، فیض احمد فیض اور دیگر ایسے شعرا ہیں جن کی غزلوں کا اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو ان میں نعت کی جلوہ گری دیکھی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:

تو میری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی
اقبالؔ

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
حسرتؔ موہانی

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنا ترے قدموں کی صدا ہے
فیضؔ

محبت کا حق یوں ادا کون کرتا
یہ سجدہ ہمارے سوا کون کرتا
مانوسؔ سہسرامی

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
ترا نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے کو
احسانؔ دانش

ترے نقشِ پا کے میں قربان جاؤں
مجھے اور کوئی تمنا نہیں ہے
علامہ ضیاء الحسن ضیاء

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی رقم طراز ہیں: ''شاعر جو کچھ کہتا ہے خود اس پر اس کے مکمل معانی منکشف نہیں ہوتے۔ اقبال کے شعر ''تو میری رات کو......'' یقیناً نعت کا شعر ہے کیوں کہ ''ساقی'' کی علامت اقبال نے بہت مقامات پر رسول اللہ ﷺ کے لیے استعمال کی ہے۔''☆[۱]

☆۱۔ بہ حوالہ نعت رنگ شمارہ ۹، مارچ ۲۰۰۲ء ص ۱۵

مذکورہ اشعار غزل کے ہیں تاہم ان میں نعت کے رموز و علائم سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل تخیل ایک انتہائی ''پیچیدہ اور طلسماتی عمل'' ہے۔ اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے بہ قول: ''ضروری نہیں کہ فن کار کو تخلیق کے ہنگام اپنے عمل کے تمام محرکات وعوامل کا علم اور شعور ہو۔ تخلیق میں تو ہمارا پورا وجود شامل ہوتا ہے۔ شعور بھی اور لاشعور بھی۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا معاشرتی اور اجتماعی شعور بھی اس عمل میں شامل ہوتا ہے۔'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تلاش وجستجو، کرید اور غور وفکر انسانی ذہن کا بنیادی وصف اور اہم وظیفہ رہا ہے اور محدود سے لامحدود کی جانب اس سفر میں شعر کے اسلوب اور لفظوں کی لسانی فضا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بیکلؔ اُتساہی، اجملؔ سلطان پوری اور رازؔ الہ آبادی تین ایسے شعرا ہیں جن کا نعتیہ شاعری کے فروغ میں نمایاں کردار رہا ہے۔ ان شعرا نے زیادہ تر نعتیں غزل کے فارم میں ہی کہی ہیں۔

نعتیہ شاعری کے فروغ میں محافلِ میلاد، سماع، جلسہ ہائے میلاد، نعتیہ مشاعرے اور وسائلِ ابلاغِ عامہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وسائلِ ابلاغِ عامہ میں بالعموم وہ معیاری رسائل و اخبارات ہیں جنھیں اعلیٰ صحافتی اقدار نیز الیکٹرانک میڈیا کا بھی اس کے فروغ میں اہم رول رہا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

اُردو میں نعت نگاری—— ایک جائزہ ۱۹۷۵ء تک

اصنافِ ادب میں نعت قصیدے ہی کی ایک ذیلی صنفِ سخن ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ موضوع اور ممدوح کے واسطے سے قصیدے کی حدود متعین نہیں، لیکن نعت کی حدود میں رسول خیر الانام ﷺ کے علاوہ اور کوئی ممدوح راہ نہیں پا سکتا۔ حتیٰ کہ خدائے تعالیٰ کی تعریف و ثنا کا دائرہ بھی رسول ﷺ کی مدح سے یکسر الگ ہے اور اس کے لیے شعر کی اصطلاح میں حمد کا لفظ مروّج، سخن وروں نے جدتِ طبع کے اظہار کے لیے موضوع، اسلوب اور ہیئت میں گوناگوں تبدیلیاں پیدا کیں۔ تاہم ان سب کو کسی نہ کسی انداز میں حضور ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے ضرور متعلق کیا گیا اور مدحتِ رسول ﷺ کے بنیادی موضوع سے انحراف کبھی نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے نعت کا میدان بہ ظاہر بڑا تنگ نظر آتا ہے، لیکن عقیدت کے ان گل دستوں کو جو تیرہ سو سال سے شفیع المذنبین ﷺ کی بارگاہِ عالی مقام میں پیش کیے جا رہے ہیں، دیکھا جائے تو احساس ہوگا کہ محبت کی فراوانی میں کمی آئی نہ جنونِ اظہار ختم ہوگا، اور نہ ہی موضوع کو تنگ دامانی کی کبھی شکایت پیدا ہوئی۔ پیغمبرانؑ عالم میں شاید یہ خصوصیت صرف رسولِ عربی ﷺ کو حاصل ہے کہ ہر دور، ہر ملک اور ہر زبان کے شعرا نے ان کے اوصافِ جمیلہ نظم میں بیان کیے اور یہ شرف صرف حضور ﷺ کی اُمت کے شعرا کو ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ بہت سے غیر مسلم شعرا نے بھی نعتِ پیغمبر ﷺ کہنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ایک ہندو شاعر دِلّو رام کوثریؔ بڑے فخر سے کہتا ہے:

کچھ عشقِ پیمبر ﷺ میں نہیں شرطِ مسلماں
ہے کوثریؔ ہندو بھی طلب گار محمد ﷺ

سروجنی نائیڈو اور سرکشن پرشاد کی نعتوں کی دھوم مچ چکی ہے، ایک اور شاعر کالیکا پرشادؔ نے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے:

دریا سبھی موتی بنیں پارس بنے کہسار
گر فرش سے ہو، عرش تلک درہم و دینار
پھر کالیکا پرشاد سے پوچھے کوئی کیا لے
سب چھوڑ دے، نعلینِ نبی ﷺ سر پر اٹھالے

دلو رام کے لیے سرمایۂ توقیر صرف یہ ہے کہ:

لے کے دلو رام کو حضرت ﷺ گئے جنت میں جب
غل ہوا، ہندو بھی محبوبِ خدا ﷺ کے ساتھ ہے

اُردو شعر و ادب میں جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی اور ہری چند اختر کی نعتیں اس پایے کی ہیں کہ ان میں وفورِ جذبات کی صداقت پوری شان سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ پنڈت ہری چند اختر یوں گویا ہوتے ہیں:

کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا
سات پردوں میں چھپا بیٹھا تھا حسنِ کائنات
اب کسی نے ان کو عالم آشکارا کر دیا
کہہ دیا لا تَقنَطُو اختر کسی نے کان میں
اور دلوں کو سر بسر محوِ تمنا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

(پنڈت ہری چند اختر)

شاعری جذباتِ انسانی کی فن کارانہ اظہار کا نام ہے، اور عشق انسان کے نازک اور لطیف ترین جذبوں کو سب سے زیادہ متحرک کرتا ہے۔ نعت میں مرکزِ عشق وہ ذاتِ گرامی ہے، جس کی تعریف و توصیف خود خالقِ کائنات نے قرآنِ حکیم میں متعدد جگہوں پر مختلف پیرایوں میں کی ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ ہم نے تیرا ذکر بلند کیا۔

حضور ﷺ کے اوصافِ جمیلہ، اخلاقِ حمیدہ، عاداتِ کریمہ اور فضائل و شمائل کا تذکرہ آپ ﷺ کی محبت کا متقاضی ہے۔ آپ ﷺ کی محبت لازمۂ ایمان ہے۔ چناں چہ اُس دور میں جب حضور ﷺ حیات تھے تو شعرائے عرب نے نیاز مندانہ تعلقات کے بے لوث اظہار کے لیے نعت کو ہی وسیلہ بنایا۔ جنابِ سرورِ کائنات ﷺ کا قول ہے کہ:

"جب حسانؓ بن ثابت نعت کہتے ہیں تو ملائکہ انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے عرشِ معلیٰ سے زمین پر نزولِ اجلال کرتے ہیں۔"

اسی زمانے کے ایک اور شاعر حضرت کعبؓ بن زہیر ہیں، جن کی نعت کی اصلاح خود اللہ کے رسول ﷺ نے فرمائی۔ آنحضور ﷺ کی وفات کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ اس ذاتِ ستودہ صفات کا ذکر جو عدالت میں یکتا، شجاعت میں لاثانی، حکومت میں بے مثال، سیاست میں لاجواب اور تمام عالمِ انسانی کے لیے ابرِ کرم تھا تازہ رکھا جائے۔ چناں چہ حسانؓ بن ثابت اور کعبؓ بن زہیر کی پیروی میں نعتیں کہنے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ عربی میں محمد بن زید بوصیریؔ، فارسی میں سعدیؔ، رومیؔ، خسروؔ، حافظ اور جامیؔ، اُردو میں ولیؔ، مومنؔ، امیر مینائیؔ، حالیؔ، محسنؔ کاکوروی، ظفر علی خان، اقبالؔ اور عرشؔ ملسیانی سے ہوتا ہوا عبدالعزیز خالدؔ، حافظ مظہرؔ الدین اور حفیظ تائبؔ تک پہنچ کر بھی رُکا نہیں، بلکہ اس بے کراں خزینے میں ہر لحہ اضافہ ہو رہا ہے اور عقیدت کے چراغ ہر چہار جانب نت نئی جوت سے روشن ہو رہے ہیں۔

اُردو شاعری میں نعت کا ورود عربی شاعری کے تتبع سے ہوا اور اس کے نقوش اُردو کی قدیم ترین کتابوں میں بھی ملتے ہیں۔ حمد اور نعت اس زمانے میں ہر کتاب کے آغازِ متن سے قبل برکت، عقیدت اور ثواب کی خاطر شامل کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے شاعروں کے ہاں بھی ایک آدھ نعت کا نمونہ ابتدائے دیوان میں آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھیے تو ان نعتوں میں تقلیدی اور رسمی انداز نمایاں ہے اور یہ ایک رسم تو پورا کر دیتی ہے، لیکن اس صنف نے مرثیہ کی طرح ایک الگ فن کی حیثیت کبھی حاصل نہیں کی۔ مرثیہ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے مونسؔ، خلیقؔ، انیسؔ اور دبیرؔ جیسے کاملانِ فن میسر آ گئے، جنھوں نے ساری عمر اسی ایک صنف میں سخن آرائی کی اور اس کے اتنے تاب دار پہلو پیدا کر دیے کہ فارسی مرثیہ بھی اس سے پیچھے رہ گیا۔ اُردو نعت نگاروں کا حلقہ یقیناً بے حد وسیع ہے۔ اس میں ہر سطح اور ہر قبیل کے شعرا شامل ہیں، لیکن اس ہمہ گیریت کے باوجود بدقسمتی سے اس صنف کو آج تک کوئی انیسؔ یا دبیرؔ میسر نہیں آ سکا۔ عبدالعزیز خالدؔ کے سوا جس نے نعت کی کئی کتابیں بہ یک قافیہ لکھی ہیں، کسی بڑے شاعر کے وسیع ادبی

ذخیرے سے نعتوں کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں۔ اسی لیے ہر شاعر کے ساتھ نعت کا ایک انفرادی رنگ تو سامنے آجاتا ہے، لیکن نعت کے حوالے سے شاعر کا تخلیقی کُل (creative totality) تشکیل نہیں پاتا۔

اُردو کی قدیم ترین نعتوں میں دکن کے فرماں رواں قلی قطب شاہ کی نعت زبان کی اس غیر ترقی یافتہ صورت کو ظاہر کرتی ہے۔ جب اظہار و بیان کے جملہ اسالیب نشو و نما کی ابتدائی منزل میں تھے۔ زبان کی اس تنگ دامانی کے باوجود قلی قطب شاہ کی نعت میں جذبات کی فراوانی موجود ہے:

تج مکھ جگت کی جوت سے عالم دیں ہارا ہوا
تج دین کے اسلام کے مومن جگت ہمارا ہوا
ہک لک اسّی پیغمبراں اپجے جگت میانے ولے
تج پر نبوت ہے ختم سب تے توں ہی پیارا ہوا
صدقے نبی جم راج کر، قلبِ زماں آنند سوں
قدرت سے کہکش آئے کر دیناں کے سو آرا ہوا

زبان قدم قدم پر عجز کا اظہار کر رہی ہے، لیکن عشقِ رسول ﷺ کا لپکتا ہوا جذبہ ہے کہ وسیلے کی کوتاہی کو خاطر میں نہیں لاتا اور شاعر خود اس بے پایاں جذبے میں پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ولیؔ کے دیوان میں بھی نعتیہ اشعار جا بجا بکھرے پڑے ہیں اور یہ زبان کی اس سادگی کا مظہر ہے، جو اس دور میں ولیؔ کی بہ دولت دلّی تک مروّج ہو رہی تھی:

زندگی پاوے ابد کی جگ منیں وہ خضرِ وقت
جو اپن کو ندویِ محبوب ﷺ سبحانی کرے
یا محمد ﷺ دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں
خلق کو لازم ہے جی کوں تجھ پہ قرباں کرے

یہاں یہ بات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ دوسری اصنافِ شعر کی طرح اُردو نعت نے بھی ارتقا کی منزل زبان کی ترقی کے شانہ بہ شانہ ہی طے کی ہے۔ قلی قطب شاہ اور ولیؔ کی نعت میں جذباتی لحاظ سے شاید زیادہ فاصلہ نہ ہو، لیکن زبان کے لحاظ سے خاصہ فرق نظر آتا ہے۔ پھر اصلاحِ زبان کا جو سلسلہ شاہ حاتم دہلوی نے شروع کیا تھا، وہ جب میرزا رفیع سوداؔ تک پہنچا تو یہ رنگ اختیار کر چکا تھا:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنارِ تسبیحِ سلیمانی

نہ ہونے کو جدا سایہ کے اس قامت سے پیدا ہو
قیامت ہووے گا دل چسپ وہ محبوبِ سلطانی ﷺ
ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اس وقت دُنیا میں
وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

اس سے ذرا آگے بڑھیے تو وہ زمانہ آجاتا ہے جب زبان سے ہندی کے بیش تر الفاظ اخراج حاصل کر چکے تھے اور عجمی اثرات کے تحت ان الفاظ کی جگہ فارسی لفظوں نے لے لی تھی۔ دیکھیے مومن خان مومنؔ کے فن کی سطوت آبگینۂ نعت کو فارسی کی بوجھل ترکیبوں کے سہارے کس طرح سینہ گداز کرتی ہے:

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس
کہ جیسے صبحِ شبِ ہجر نالہ ہائے خروس
وہ خواب میں بھی کبھی دیکھتی جمال اس کا
نہ دیتی دل کبھی یوسفؑ کو دُخترِ طیموس
جو شمعِ بزم کہوں اس کے روئے تاباں کو
کتاں وہ ماہ بنے نورِ شعلۂ فانوس

بہادر شاہ ظفر کی نعت میں انکسار اور خود سپردگی کا جذبہ زیادہ نمایاں ہے۔ شہنشاہِ ہند جب شاہِ دوجہاں ﷺ سے خلوت میں باتیں کرتا ہے تو افتخارِ سلطنت نالۂ شب بن جاتا ہے اور سیاست کا سارا بوجھ آنسوؤں میں ڈھلنے لگتا ہے:

اے سرورِ ﷺ دو کون ، شہنشاہِ ذی الکرم
سر خیلِ مرسلین و شفاعت گرِامم
موکب ترا ملائک مرکب ترا براق
مولا ہے تیرا مکہ و معبد ترا حرم
محروم تیرے دستِ مبارک سے رہ گیا
کیوں کر نہ چاک اپنا گریباں کرے رقم
عالم کو تیرا نور ہوا باعثِ ظہور
آدم ترے ظہور سے ہے مظہر اتم

واللیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا
والشّمس ہے ترے رُخ پُرنور کی قسم

غالبؔ آزادہ فکر اور کشادہ خیال تھا۔ وہ دین سے بیگانۂ محض تھا اور مذہب کا کھلا مذاق اُڑاتا تھا۔ شخصی لحاظ سے خالصتاً ایک دُنیا دار انسان تھا۔ نجی ضرورتوں کا اسیر تھا۔ اور شراب اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس سب کے باوجود غالبؔ کو شہِ دیں ﷺ کا اُمتی ہونے کا شرف حاصل تھا اور اس پر وہ کچھ کم فخر کا اظہار نہیں کرتا:

اس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

اس زمانے میں نعت کا ایک اسلوب میر حسن کے ہاں پرورش پا رہا تھا۔ جس کا ایک نمونہ مثنوی سحر البیان میں ملتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلّی کی بساط لُٹ جانے کے بعد لکھنؤ میں ایک نیا دربار پوری شان وشوکت سے آراستہ ہو رہا تھا۔ میر حسنؔ جب نعت لکھنے بیٹھے تو یہ دربار اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھا۔ چناں چہ انھوں نے شاہِ شہنشاہاں ﷺ کی مدح لکھی تو تمام تشبیہیں اور استعارے اسی دربار سے مستعار لیے:

کروں اس کے رُتبہ کا کیا میں بیاں
کھڑے ہیں جہاں باندھے صف مرسلاں
مسیحؑ اس کے خرگاہ کا پارہ دوز
تجلّی طور اس کی مشعل فروز
خضرؑ اس کی سرکار کا آب دار
زِرہ ساز داؤدؑ سے واں ہزار
خلیلؑ اس کے گل زار کا باغباں
سلیمانؑ کئی مہر دار اس کے ہاں

اُردو نعت کے ارتقا میں حالؔی ایک ایسا سنگِ میل ہے جس پر نظر دور سے ہی پڑ جاتی ہے۔ حالؔی کی نعت گوئی کا اعلیٰ ترین نمونہ ان کی مسدس میں ملتا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ حالؔی نے اپنی عقیدت کو طغیانِ جذبات کے حوالے نہیں کیا، بلکہ نرم، رسیلے اور سادہ الفاظ میں حضور ﷺ کی سیرت کے کچھ ایسے نقوش اُبھار دیے ہیں کہ ان کا اثر دیرپا اور کیف وسرور لافانی ہوگیا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس آبگینے سے چند ایک جرعے پیشِ خدمت ہیں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
دعائیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ، ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی ، غلاموں کا مولا
خطا کار سے در گزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

حالؔی میں شیفتگی بھی ہے اور خود سپردگی بھی۔ ضبط بھی ہے اور تحمل بھی۔ سنجیدگی بھی ہے اور حقیقت افروزی بھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ تأثر کی جو گہرائی سوداؔ کے وجیہہ الفاظ اور مومنؔ کی بوجھل ترکیبیں پیدا نہ کرسکیں، ان سے کہیں زیادہ شدید اثر حالؔی کے بے رنگ الفاظ پیدا کر گئے۔ اُردو نعت کے تاریخی ارتقا میں حالؔی وہ مینارۂ نور ہے، جس سے بعد میں آنے والے اکثر شعرا نے روشنی حاصل کی، چناں چہ حالؔی کی باوقار سادگی کے نقوش بیش تر شعرا کے ہاں نمایاں نظر آتے ہیں۔ دیکھیے یہ سادگی داغؔ کے ہاں کیسا جادو جگاتی ہے:

دونوں جہاں میں بوئے محمد ﷺ ہے عطر بیز
کونین میں ہے رنگ فقط ایک پھول کا
صلِ علیٰ ، ہے نام محمد ﷺ میں کیا اثر
درمانِ دل ، علیل و حزیں و ملول کا
اس شاہِ انبیا ﷺ کے در کا ہوں میں سلامی
آیا سلام جس کو ، پہنچا پیام تیرا

تاہم کچھ ایسے شعرا بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے حالؔی کے رنگ کو قبول نہیں کیا اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ مثال کے طور پر داغؔ کے ہم عصر امیر مینائؔی کے ہاں نعت کا جو زاویہ اُبھرتا ہے،

اس پر شاید حالیؔ کا سایہ بھی نہیں پڑا۔ امیرؔ کی نعت میں بلا کی حلاوت اور نرمی ہے اور انھوں نے غیر معتبر روایات کو نعت میں شامل کرنے سے اجتناب برتا ہے۔ ایک نعت میں امیر مینائیؔ نے حضور ﷺ کی جملہ صفات کا تذکرہ اس خوبی سے کیا ہے کہ اس می مزید کسی تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی:

خلق کے سرور شافعِ محشر صلی اللہ علیہ وسلم
مرسلِ داور ، خاص پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم
بحرِ سخاوت ، کانِ مروّت ، آیہ رحمت ، شافعِ اُمت
مالکِ جنت ، قاسمِ کوثر صلی اللہ علیہ وسلم
دولتِ دنیا ، خاک برابر ، ہاتھ کے خالی ، دل کے تونگر
مالکِ کشور ، تخت نہ افسر صلی اللہ علیہ وسلم

امیر مینائیؔ کی نعتوں کا ایک مجموعہ ۱۸۸۱ء میں نولکشور پریس سے شائع ہوا اور اس پر سرآمدِ اہلِ کمال حکیم میر ضامن علی جلال نے حسبِ ذیل قطعہ تاریخ کہا:

نعتیہ چھپ چکا جو یہ دیوانِ بے مثال
منشی امیر! احمد والا صفات کا
مصرعِ سال طبع قلم نے لکھا جلالؔ
دیواں ہے نعتِ احمد والا صفات کا
(۱۲۹۸ھ)

دیوانِ ''محامد خاتم النبیین ﷺ'' میں امیرؔ نے ردیف اور قافیے بدل بدل کر متعدد نعتیں کہیں ہیں اور حضوری اور نیاز مندی کی کیفیت پیدا کی ہے:

چاہیے مجھ پہ عنایت شہِ دیں ﷺ تھوڑی سی
دیجیے قبر کو یثرب میں زمیں تھوڑی سی

رفعت سے کس قدر ہے فلک رُتبہ وہ زمین
ہے جس کے ذرّے ذرّے پہ اختر کا اشتباہ

شاعرو! ہو نعت وصفِ اہلِ دُنیا سے جدا
کیوں صنم خانہ بناتے ہو خدا کے گھر کے پاس

یہی ہے کحلِ بصیرت ، یہی ہے سرمۂ چشم
تلاش ہے تو مجھے ان کے خاکِ پا کی تلاش

محسن کاکوروی نے نعت نگاری کی وجاہت کو برقرار رکھ کے جدت آفرینی اور ندرتِ فن کا ثبوت دیا۔ محسن کاکوروی کے قصیدۂ لامیہ میں پہلے تشبیب ہے پھر گریز۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ تشبیب کی ابتدا گوکل، بندرابن، کاشی اور سری کرشن سے ہوتی ہے، لیکن گریز یثرب و بطحا کے مے خانوں سے ہوتا ہوا طوبیٰ و کوثر تک پہنچ جاتا ہے۔ اک ابرِ رحمت ہے کہ وادیِ بطحا سے اُبھرتا ہے اور کشورِ ہند پر برس جاتا ہے۔ اس سیلِ جذبات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھیے ہوگا سری کرشن کا درشن کیوں کر
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل
کالے کوسوں نظر آتی ہے گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
شاہدِ فکر ہے مکھڑے سے اُٹھائے گھونگٹ
چشمِ کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل
سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل

اور اب گریز ملاحظہ کیجیے:

چھوڑ کر مے کدہ ہند و صنم خانۂ برج
آج کعبے میں بچھائے ہے مصلّا بادل
بحرِ امکاں میں رسولِ عربی ﷺ دُرِ یتیم
رحمتِ خاص خداوند تعالیٰ بادل

اور مدح دیکھیے:

گلِ خوش رنگ رسولِ مدنی عربی ﷺ
زیبِ دامانِ ابد طرۂ دستارِ ازل
نہ کوئی اس کا مشابہہ ہے نہ ہم سر نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مماثل ، نہ مقابل ، نہ بدل
اوجِ رفعت کا قمر ، نخلِ دو عالم کا ثمر

بحرِ وحدت کا گہر، چشمۂ کثرت کا کنول
مرجعِ روحِ امیں زیب دہِ عرشِ بریں
حامیِ دینِ متیں، ناسخِ ادیان و ملل
بے حقیقت کو مجاز آپ کا حیرت کا مقام
بے نیازی کو نیاز، آپ کی نازش کا محل

اور آخر میں دعا ہے:

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل
کہیں جبریلؑ اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

محسن کاکوروی کی نازشِ زندگی نعت گوئی ہے اور اس پر اس نے کچھ کم فخر کا اظہار نہیں کیا:

سخن کو رُتبہ ملا ہے مری زباں کے لیے
زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لیے
خدا کے سامنے محسنؔ پڑھوں گا وصفِ نبی ﷺ
سجے ہیں جھاڑ یہ باتوں کے لامکاں کے لیے

نعت نگاری کے اس دور میں اکبر الہ آبادی، سرورؔ جہاں آبادی، امجدؔ حیدر آبادی، محمد علی جوہرؔ اور حسرتؔ موہانی کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اکبر کی نعت نگاری اس کی شاعری کا ایک اور مثبت زاویہ ہے۔ اس نے اپنے طنزیہ کلام میں جس تہذیب کو ہدف بنایا ہے، نعت میں اس مثالی معاشرے کو پیش کیا ہے، جس کی طرف مراجعتِ اکبرؔ کا مقصدِ وحید ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نعت میں اکبر الہ آبادی کی بانیِ اسلام ﷺ سے محبت چھلک چھلک جاتی ہے:

تیری صورت پہ ہوں قربان رسولِ عربی ﷺ
ہو خدا تجھ پہ میری جان رسولِ عربی ﷺ
تجھ سے اور ایزدِ غفار سے آتی ہے شرم
ہوں گناہوں سے پشیمان رسولِ عربی ﷺ
ہو قیامت میں ترے اور تری اولاد کے ساتھ
اکبرؔ بے سروساماں رسولِ عربی ﷺ

محمد علی جوہؔر کے فکر پر وجدان غالب ہے اور یہ اسی کا فیضان ہے کہ جوہؔر پر ''من تو شدی'' کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور انھیں سجدوں میں بھی معراج کی کیفیت نظر آنے لگتی ہے، چناں چہ فرماتے ہیں:

تنہائی کے سب دن ہیں ، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

اپنے پلے نہیں سوغات کوئی اس کے سوا
نقدِ جاں نذر کر اے دل یہی دستور ہے آج
آرزو ہائے دو عالم تھیں اور اک دل کل تک
فقط اک تیری تمنا سے وہ معمور ہے آج
اب بھی دیدار سے محروم ہی رکھیے گا ہمیں
تھی جو وہ حسرتِ پابوس بہ دستور ہے آج
جس سے چہرے چمک اُٹھے تھے کبھی یثرب کے
دیکھو! جوہؔر کی بھی آنکھوں میں وہی نور ہے آج

حسرؔت موہانی کے لہجے میں التجا نمایاں ہے اور وہ درِ مصطفیٰ ﷺ پر کاسۂ دُعا پھیلاتے ہیں تو ان کا ایقان یہ ہے:

پہنچ کر درِ شاہِ مرداں پر اکثر
خصوصی شرف پا گئے ہم سے عاصی

لیکن دیکھیے اس شرف کا معیار کتنا بلند ہے:

خیالِ غیر کو دل سے بھلا دو یا رسول اللہ ﷺ
خرد کو اپنا دیوانہ بنا دو یا رسول اللہ ﷺ

علیؓ آگاہ ہو کے جس سے بابِ علم کہلائے
وہ رازِ عشق ہم کو بھی بتا دو یا رسول اللہ ﷺ
حسینؓ ابنِ علیؓ کے صبر کے جس نے مزے لوٹے
ہمیں بھی اس بلا کا حوصلہ دو یا رسول اللہ ﷺ

الطاف حسین حالیؔ کے بعد جس شاعر نے نعت کو نیا اسلوب، نئی رعنائی اور نیا عروج دیا، وہ ظفر علی خان ہے۔ ظفر علی خان کی نعت جہاں علمی اور ادبی معیار پر پوری اُترتی ہے، وہاں اس نے عوام میں بھی بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ان کے قالب میں ایک مصلح کی رُوح پرورش پا رہی تھی اور انھوں نے اپنی قادر الکلامی اور بدیہہ گوئی سے جو اوّلیں مقصد حاصل کرنا چاہا وہ سوئی ہوئی قوم کی بے داری تھا۔ اسی لیے وہ صحافت، سیاست اور مدنیت کے مقام پر عوام کے ساتھ برابر رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ چناں چہ نعت میں بھی ان کا ہاتھ قوم کی نبض پر ہے، لیکن نگاہ بارگاہِ رسالت ﷺ پر جمی ہوئی ہے اور وہ ایک والہانہ دل گرفتگی سے زمزمہ خواں ہیں:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دُنیا تمھیں تو ہو
پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اس نورِ اوّلیں کا اُجالا تمھیں تو ہو
گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدارِ یثرب و بطحا تمھیں تو ہو

اور اب اس نعت کے چند اشعار بھی سن لیجیے، جس نے اپنی اوّلیں نمود سے ہی شب خانۂ ہند کے تاریک در و دیوار کو نورِ نبوت کی تابندہ کرنوں سے منور کر ڈالا اور جس کا پرتوِ جمال آج بھی قلوبِ مردہ کو تازگی اور زندگی عطا کر رہا ہے:

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی کُل دُنیا کے درباروں میں
جو نکتہ وروں سے حل نہ ہوا اور فلسفیوں سے کھل نہ سکا
وہ راز اک کملی والے نے سمجھا دیا چند اشاروں میں
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی ﷺ، کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

اُردو کی نعتیہ شاعری میں اقبالؔ کی حیثیت سب سے الگ ہے۔ یوں رسمی اور التزامی طور پر شاید انھوں نے اُردو میں ایک نعت بھی نہیں کہی، لیکن نعت کے تمام جملہ اوصاف ان کے کلام میں ہر کہیں پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں وہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ان سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ کہیں خاکِ حجاز میں مرنے کی آرزو کرتے ہیں اور کہیں سمندِ جذبات مائلِ بہ پرواز ہوتا ہے تو نعتیہ شاعری کی والہانہ کیفیت یوں جلوہ گر ہوتی ہے:

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمت بے چاری کے دیں بھی گیا دُنیا بھی گئی

وہ دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

اور ان کے دل کی مراد یوں کھل کر سامنے آتی ہے:

اوروں کو دیں حضور ﷺ یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

اقبالؔ کی شاعری کے پہلو متنوع اور فکر کے زاویے بوقلموں ہیں، لیکن ایک جذبہ جو ان کی شاعری کے ہر پہلو سے عیاں ہوتا ہے۔ وہ اقبالؔ کا عشقِ نبوی ﷺ ہے۔ ان کی شاعری کے اساسی موضوعات عشق، خودی اور مردِ کامل کی تلاش ہے۔ اور ان تینوں کو پیش کرتے ہوئے جو ذاتِ والا صفات مثالی صورت میں ان کے سامنے تھی، وہ محمدِ عربی ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے اور اسی سے انھوں نے روشنی اور بصیرت حاصل کرکے اُمتِ مرحوم کو جگانے کی کوشش کی۔ اقبالؔ کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے نعت کو ممدوح کے جلال و جمال کی ثنا خوانی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس سے یادِ سلف اور حسنِ موعظت کا کام بھی لیا اور نتائج کو تازیانۂ عبرت بھی بنایا۔ اقبالؔ کی نعت میں درد کا پورا رچاؤ ہے اور اس نے ہمیشہ اپنی فریاد کا دامن حضور ﷺ کے سامنے ہی پھیلایا ہے:

حضور ﷺ دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی

اور جوں جوں عشقِ رسول ﷺ کا جذبہ شرر سے شعلہ بنتا گیا، اقبالؔ کے اظہار کے تیور بھی بدلتے گئے اور اس جذبے کی انتہا یہ تھی کہ اقبالؔ کا وجودِ معنوی آفتابِ رسالت ﷺ کی ایک ایسی کرن بن گیا، جس نے سارا نور حضور ﷺ سے ہی اکتساب کیا تھا۔ چناں چہ دیکھیے اقبالؔ کس تیقّن سے حضور ﷺ کے کمالات کے سامنے سرِ عجز جھکاتے ہیں:

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ ، تیرے محیط میں حباب
بزمِ عالم میں طرازِ مسندِ عظمت ہے تُو
بہرِ انساں جبرئیلِ آیۂ رحمت ہے تُو
اے دیارِ علم و حکمت قبلۂ اُمت ہے تُو
اے ضیائے چشمِ ایماں زیب ہر مدحت ہے تُو
درد جو انسان کا تھا وہ تیرے پہلو سے اُٹھا
قلزمِ جوشِ محبت تیرے پہلو سے اُٹھا

اقبال سہیلؔ کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے جو پہلا شعر نظم کیا، وہ نعت کا شعر تھا۔ اقبال سہیلؔ کو رسولِ عربی ﷺ سے والہانہ محبت تھی اور اس کا عملی اظہار انھوں نے یوں کیا کہ جس زبان نے پہلا شعر نعت میں کہا تھا، اس زبان نے پھر کسی اور کی مدح میں شعر نہیں کہا۔ ان کی نعت میں تجلیاتِ نبوی ﷺ پوری طرح منعکس ہوتی ہے۔ اقبال سہیلؔ کی خوبی یہ ہے کہ وہ مدح میں متوازن اندازِ نظر اختیار کرتے ہیں اور اوصافِ نبوی ﷺ کے تمام گوشوں کو وسیلۂ نور بناتے چلے جاتے ہیں:

وہ شاہِ بوریا مسند سکھایا جس نے دُنیا کو
یہ اندازِ جہانگیری ، یہ آئینِ جہاں بانی
وہ جامع جس نے یک جا کر دیے بکھرے ہوئے دانے
مٹا دی جس نے آکے باہمی تفریقِ انسانی
وہ رابط عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے
وہ فارق ، زہد سے جس نے مٹایا داغِ رہبانی

تعالیٰ اللہ ذاتِ مصطفیٰ ﷺ کا حسن لاثانی
کہ یک جا جمع ہیں جس میں تمام اوصافِ امکانی

دعائے یونسؑ ، خلق خلیلیؑ ، صبر ایوبؑ
جلالِ موسویؑ ، زہد مسیحیؑ ، حسن کنعانی
احمدِ مرسل ، فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
مظہر اوّل مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم
صدرِامم ، سلطانِ مدینہ ، وہ جس کی کفِ پا کا پسینہ
گل کدۂ فردوس کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم
بچھڑے ہوئے کو گلے ملایا ، نسل و وطن کا فرق مٹایا
رہ نہ گیا کچھ تفرقہ باہم صلی اللہ علیہ وسلم

اقبال سہیل پر جب وفورِ جذبات کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ان کی نعت میں ترنم کی رعنائی، موسیقی کی لذت اور الفاظ کا پُرتاثیر بہاؤ خود بہ خود پیدا ہو جاتا ہے:

بلائیں لیں قیامتیں نہ کیوں ہر ایک گام کی
مرے جنوں نے سیکھ لی روش ترے خرام کی
جنونِ عشق کی ، نہیں ملک سے شان کم
ترے شہیدِ عشق کی ، ترے اسیرِ دام کی

اُردو شاعری میں اختر شیرانی اپنی تخیلی رومانیت کی بنا پر بے حد معروف ہے۔ نعتِ نبی ﷺ لکھنے کی سعادت اس نے بھی حاصل کی اور یہاں اس کی آرزوؤں کا مسکن ایک ایسا دیار ہے جس کی جھلک اس نے نہیں دیکھی، لیکن جہاں اس کے درد کی دوائے نہاں آسودۂ خواب ہے، چناں چہ جب نسیمِ صبح گاہی کا کوئی جھونکا حجاز کی طرف جاتا ہے تو وہ اپنے ارمانوں کا سلام بھیجے بغیر نہیں رہتا۔

اگر اے نسیمِ سحر ترا ہو گزر دیارِ حجاز میں
مری چشمِ تر کا سلام کہنا حضور ﷺ بندہ نواز میں
عجب اک سرور سا چھا گیا ، مری روح و دل میں سما گیا
ترا نام ناز سے آ گیا ، مرے لب پہ جب بھی نماز میں

کروں نذر نغمۂ جانفزا ، میں کہاں سے اختر بے نوا
کہ سوائے نالۂ دل نہیں ، مرے دل کے غم زدہ ساز میں

حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام اس کے قلم کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ حفیظ نے سیرت کے جملہ پہلوؤں سے اخلاقی نتائج اخذ کیے ہیں اور خیر البشر ﷺ کو ایک ایسے انسان کی صورت میں پیش کیا ہے، جس کی تقلید سے ہر زمانہ اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی کامرانی حاصل کرسکتا ہے۔ حفیظ کے جذبات میں سلیقہ اور اظہار میں شائستگی ہے، لیکن جب وہ نعتِ نبوی لکھتا ہے تو اس کا قلم عقیدت کی نہایت کے آگے کسی پابندی کو قبول نہیں کرتا۔ چناں چہ اس کی عقیدت کا معمولی اظہار یہ ہے کہ وہ تخلیقِ کائنات کو حضور ﷺ کی میلاد کی تمہید قرار دیتا ہے اور جب حضور ﷺ کی ولادت ہوتی ہے تو سارا عالم استقبال کے لیے سرنگوں نظر آتا ہے:

یہ کس کی جستجو میں مہرِ عالم تاب پھرتا ہے
ازل کے روز سے بے تاب تھا بے خواب پھرتا ہے
یہ کس کی آرزو میں چاند نے سختی سہی برسوں
زمیں پر چاندنی برباد و آوارہ رہی برسوں
یہ کس کے واسطے مٹی نے سیکھا گل فشاں ہونا
گوارا کر لیا پھولوں نے پامالِ خزاں ہونا
بہ صد اندازِ یکتائی ، بہ غایت حسنِ زیبائی
امیں بن کر امانت آمنہؓ کی گود میں آئی
ندا آئی ، دریچے کھول دو ایوانِ قدرت کے
نظارے خود کرے گی آج قدرت شانِ قدرت کے

حفیظ جالندھری نے حضور ﷺ کی سیرت کو صرف دو مصرعوں میں بیان کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور دیکھیے ان کے محاسن کا قلزم ان دو مصرعوں میں کیسی شان سے جلوہ فگن ہے:

تری صورت ، تری سیرت ، ترا نقشہ ، ترا جلوہ
تبسم ، گفتگو ، بندہ نوازی ، خندہ پیشانی

پھر ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے، جب حفیظ کے سامنے عرب کے ستم زدہ انسان اپنے تمام زخم عریاں کر ڈالتے ہیں اور محسنِ اعظم ﷺ کی بعثت فضلِ ربانی بن جاتی ہے:

ترے آنے سے رونق آ گئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہوگیا پھر فضلِ ربانی

نعت حفیظ کے فن کا کوئی الگ زاویہ نہیں بلکہ اس کی ذات کا ایک حصہ ہے اور سلام میں تو اس نے خود حضور ﷺ کے سامنے بیٹھ کر اپنی داستانِ درد سنائی ہے:

سلام اے آمنہؓ کے لال ، اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات ، فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے آتشِ زنجیر باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے
زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہو جائے
ترے پرتو سے مل جائے ہر ایک ذرّے کو تابانی
زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی

حفیظ کا اپنا بیان ہے کہ:

مجھے اس وقت اپنے آپ پر بے اختیار پیار آ گیا، جب شاہنامۂ اسلام لکھتے وقت نعت کا یہ شعر بغیر کسی غور وفکر کے مجھ پر وارد ہوگیا:

زباں پہ اے خوشا صلِ علیٰ یہ کس کا نام آیا
کہ جبریلِ امیں میرے لیے لے کر سلام آیا

اصغر گونڈوی کی دُنیا روحانی لطائف اور ارضی پاکیزگی سے عبارت ہے۔ اس کی کل کائنات صرف دو نعتیں ہیں، لیکن ان دونوں نعتوں میں احترامِ نبوی ﷺ کی انتہا نظر آتی ہے۔ ان میں وہ تڑپ ہے جو صرف خلشِ فراق سے پیدا ہوتی ہے، تاہم اصغر گونڈوی میں جمالِ جہاں تاب کا سامنا کرنے کی سکت نہیں اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ:

ساقیا! جام بہ کف پھر ہو ذرا گرم نوا
حسنِ یوسفؑ ، دمِ عیسیٰؑ ، ید بیضا دیکھیں

کچھ دردِ عشق کا حاصل ، نہ عشق کا مقصود
جز ایں کہ لطف خلش ہائے نالۂ بے سود

بہزآد لکھنوی نے غزل کی لکھنوی روایت کو نعت میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ بہزآد کی غزل کو مقبول بنانے میں اختر بائی فیض آبادی کی آواز نے اہم کردار ادا کیا ہے، تو اس کا نعتیہ کلام گھر گھر تک پہنچانے میں ریڈیو پاکستان نے عمدہ فریضہ انجام دیا ہے۔ اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل بہزآد کی زندگی میں ہی ڈوب گئی ہے اور وہ صرف نعت نگاری کی یہ دولت زندہ ہے۔ بہزآد لکھنوی کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ اس نے مدینۃ النبی ﷺ کو موضوعِ نعت بنایا اور کوئے محمد ﷺ، خاکِ حجاز، یثرب نگری وغیرہ پر بے شمار نعتیں کہہ ڈالیں۔ اس کی نعت کی دوسری اہم خوبی زبان کی سادگی ہے۔ دراصل جب عشق اپنی نہایت کو پہنچ جاتا ہے تو زبان کی کوئی آرائش ضروری نہیں رہ جاتی۔ بہزآد نے بھی اس عروج کو پہنچ کر زبان کے رسمی تکلفات کو درمیان سے ہٹا دیا ہے اور اپنے جذبے کو فطری لہجے میں ادا کر کے سہلِ ممتنع کی کیفیت پیدا کی ہے:

روح کہتی ہے کہ بہزآد مدینے کو چلو
قلبِ مضطر کو کرو شاد مدینے کو چلو

———

مری روحِ رواں مدینہ ہے
دل مدینہ ہے، جاں مدینہ ہے

———

اے شہِ بے کس نواز، کوئی نہیں ہے چارہ ساز
ہم ہیں یہاں پر تپاں، دور ہے ہم سے حجاز

بہزآد نے ہندی گیت کی لچک اور کوملتا کو بھی نعت میں استعمال کیا ہے، لیکن دیکھیے یہاں بھی قربتِ رسول ﷺ کا وسیلہ یثرب نگری ہی ہے:

چلو آئیں چلیں یثرب نگری
یہاں ہند میں ہے بڑی درد سری
کب تک یہ رہے گی بے خبری
چلو آؤ چلیں یثرب نگری
وہاں رونے والے روتے ہیں
اور داغ گناہ کے دھوتے ہیں

وہاں ذرّے سورج ہوتے ہیں
چلو آؤ چلیں یثرب نگری

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد لکھنوی کا یہ انداز زیادہ مقبول نہیں ہو سکا۔ چناں چہ دیکھیے ان کے ایک ہم عصر آرم لکھنوی کی داخلیت کس طرح جذبے کو گداز کرتی ہے اور ان پر گیت نگاری کا ذرا اثر نہیں پڑا:

درِ نبی ﷺ پہ جسے باریاب دیکھا ہے
اس ایک ذرّے کو پھر آفتاب دیکھا ہے
تمھارے ایک ہی معجز نما اشارے سے
دو نیم ہوتے ہوئے ماہتاب دیکھا ہے
فرازِ عرش پہ معراج ہے محبت کی
یہ دل نے فیضِ رسالت مآب ﷺ دیکھا ہے
خدا نے ایک محمد ﷺ میں دے دیا سب کو
کریم کا کرم بے حساب دیکھا ہے

احسان دانش نے بھی زندگی میں گہرے نشیب سے فرازِ افتخار کی طرف سفر کیا ہے۔ اس طویل اور کٹھن سفر میں انھیں ہر قدم پر حضور ﷺ کی عنایتِ بے پایاں کا احساس ہوا۔ چناں چہ جب وہ اپنے فن کی رفعتوں کو چھو رہے تھے تو اُن کے ہر بُنِ مُو میں رسول ﷺ کی محبت پوری عقیدت سے سرایت کر چکی تھی۔ احسان دانش کے ہاں عقیدت اور جذبے میں فاصلہ دریافت کرنا ممکن نہیں۔ ان کے ہاں حضور ﷺ کی محبت اور انسانی زخموں کی مسیحائی کا عنوان ہے۔ ہر چند انھیں اپنی ''مفلسی'' پر ناز ہے، لیکن انھیں ایقان ہے کہ:

میرے آقاؐ ، میرے مولاؐ ہیں محمد مصطفیٰ ﷺ
میری دنیا ، میرا عقبیٰ ہیں محمد مصطفیٰ ﷺ
ہوگا جن کو ہوگا کارِ طاعت و تقویٰ پہ ناز
ہم غریبوں کو وسیلہ ہیں محمد مصطفیٰ ﷺ

———

گزری ہے مفلسی میں بڑی آبرو کے ساتھ
اللہ کا کرم ہے عنایت حضور ﷺ کی

کھولے ہیں مشکلاتِ جہاں نے کئی محاذ
کام آئی ہر قدم پر حمایت حضور ﷺ کی

احسان دانش کا وفورِ اظہار بے پایاں ہے، لیکن وہ اس بے نہایت جذبے کے اظہار کے لیے خداوندِ تعالیٰ اور رسولِ اکرم ﷺ کی ذات کو باہم مدغم کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور وہ مقامِ کبریا کے اعتراف کے ساتھ ہی مقامِ رسالت کی عظمت کے آگے سرِ نیاز خم کرتے ہیں:

اقرار ہے نہیں کوئی اللہ کے سوا
اس قول کو سند ہے شہادت حضور ﷺ کی

ہم تو واقف ہیں کہ ملبوسِ مشیت ہیں رسول ﷺ
اور واقف ہیں خدا کیا ہے محمد مصطفیٰ ﷺ

ان کے سجود میں حضوری کی کیفیت ہے اور قیام میں نیاز مندی کی:

سجدوں میں ہے درود، دعاؤں میں ہے سلام
اب یہ خدا کی ہو، کہ عبادت حضور ﷺ کی

اور یہی وجہ ہے کہ جب احسان دانش کی ذات کو حضور ﷺ کی مدح کا لمس حاصل ہوتا ہے تو ان کے سامنے دُنیا کی تمام رفعتیں حقیر ہو جاتی ہیں اور وہ ترفع کی ایک ایسی نہایت سے دوچار ہو جاتے ہیں، جہاں امتیازِ من و تُو ختم ہو جاتا ہے اور زندگی موت کے خدشے سے نجات حاصل کر لیتی ہے:

چوما ہے اپنی آنکھوں کو رکھ رکھ کے آئینہ
جب بھی ہوئی مجھ کو زیارت حضور ﷺ کی
چشمِ طلب میں کس کا اُجالا؟ حضور ﷺ کا
دُنیائے دل میں کس کی حکومت؟ حضور ﷺ کی
دل میرا خوفِ مرگ سے مطلق ہے بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضور ﷺ کی

ماہر القادری نزہت و نور کا شاعر ہے۔ اس کے اشعار میں پچھلی رات کے وقت چلنے والے حدی خوانوں کی خود کلامی ہے۔ یہ بے کراں خوشی کا نغمۂ سرمدی جب نعت میں ڈھلتا ہے تو شبنم کی پھوار بن جاتا ہے۔ اور دل و جان کو ہمیشہ تازگی عطا کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہر القادری کے جسدِ خاکی میں حبِ نبوی ﷺ کی خوش بو اتنی رچ بس گئی تھی کہ یہ خوش بو اس کی

نعت کی تخلیق میں بھی ڈھل کر آ گئی ہے اور سامع کے مشامِ جاں کو بھی معطر کرتی ہے:

درود اس پر کہ جس کا نام تسکینِ دل و جاں ہے
درود اس پر کہ جس کے خلق کی تفسیر قرآں ہے
درود اس پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی
درود اس پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی
درود اس پر کہ جس کا تذکرہ عینِ عبادت ہے
درود اس پر کہ جس کی زندگی رحمت ہی رحمت ہے

رسولِ مجتبیٰ ﷺ کہیے، محمد مصطفیٰ ﷺ کہیے
وہ جس کو ہادیِ دَعْ کَدَرَ خذ ما صفا کہیے

دُنیا ہے ایک مزرعِ ویراں ترے بغیر
عقبیٰ ہے صرف خوابِ پریشاں ترے بغیر
جانِ حیات ہے ترے اخلاق کی جھلک
خود زندگی ہے موت کا ساماں ترے بغیر
تجھ سے جو ہو نہ ربط وہ فکر و نظر ہی کیا
علم و خرد میں جہل نمایاں ترے بغیر
حکمت تری کنیز، تفکر ترا غلام
سمجھے ہیں کس نے معنیِ قرآں ترے بغیر

اسؔد ملتانی کی شاعری میں حضور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی اور سیرت مبارکہ کو اہم ترین موضوع کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ احسان دانش اور ماہر القادری کے عہد کے نعت نگار تھے، لیکن اتنے منکسر المزاج کہ اپنی قادر الکلامی کو کبھی خود نمائشی کی سطح پر اُترنے نہیں دیا۔ چناں چہ ان کا شمار اکثر اوقات گم شدہ نعت نگاروں میں ہوتا ہے۔ اسؔد ملتانی کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ نعت ان پر ایک کیفِ مسلسل کی صورت میں اُتری، ''تحفۂ حرم'' اس کیفِ حضوری ہی کا مظہر ہے اور جو ارادۂ حج سے شروع ہوا اور فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد وطن واپس آنے تک قائم رہا۔ چناں چہ ان کے ہاں ابتدا دعائے سعادتِ حج سے ہوتی ہے اور اختتام اس ''آہ'' پر ہوتا ہے، جو ارضِ تمنا کو چھوڑنے پر ہر زائر

کے دل سے بے اختیار اُٹھتی ہے۔ارضِ تمنا کا سفر اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا تو اسد ملتانی نے لکھا:

اس طرح کھینچا ہے بیت اللہ نے
راہ پائی ہے دلِ گم راہ نے
کیوں نہ جاؤں اے اسد آنکھوں کے بل
یاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے

اب ''طوافِ کعبہ'' کے دوران اسد ملتانی کے دل سے اُبھرنے والی صدا کی صورت دیکھیے:

نظر کو عشق کے پاک آنسوؤں سے صاف کرے
کوئی جب آنکھ کا رُخ جانبِ غلاف کرے
جو عہد کرتا ہو کعبے کی پاسبانی کا
وہ آ کے سنگ کو چومے ، وہی طواف کرے
بہت ہی تنگ سمجھ لی گئیں حدودِ حرم
کوئی وسیع انھیں قاف تا بہ قاف کرے

مدینے پہنچنے پر اسد ملتانی کیفِ حضور سے شرابور نظر آتے ہیں تو ایک جذبۂ بے اختیار اشعار میں یوں ڈھل جاتا ہے:

ہیچ ہیں دونوں جہاں میری نظر کے سامنے
میں کھڑا ہوں روضۂ خیر البشر ﷺ کے سامنے
جھلملانے لگ گئیں روضے کی روشن جالیاں
اک نیا منظر ہے میری چشمِ تر کے سامنے

اور اب مکے اور مدینے کا موازنہ بھی ملاحظہ کیجیے:

ہم نے مکے میں مروّت ہی مروّت دیکھی
اور مدینے میں محبت ہی محبت دیکھی

دل کو کھینچے نہ اگر گنبدِ خضرا کی کشش
جی نہ چاہے کبھی کعبے سے جدا ہونے کو

حضور ﷺ کے ایک اور منفرد ناعت راجہ محمد عبداللہ نیاز ہیں، جن کی نعت نگاری اور کارنامہ ہائے رسول ﷺ کی مدحت کے نقوش اب تک بہت کم دستیاب ہیں۔ راجہ محمد عبداللہ نیاز

کی نعت نگاری میں چشمِ جہاں بین ماضی اور حال پر پوری طرح حاوی نظر آتی ہے۔ انھوں نے تعلیماتِ نبوی ﷺ کو دلِ بیدار سے دیکھا اور انھیں حرفِ دل نشیں سے اپنے قارئین تک پہنچایا۔ عقیدت کی فراوانی اور محبت کا وفوران کے ہر بن لفظ سے اُبلتا ہوا صاف نظر آتا ہے:

تُو جہاں دارِ مشرق و مغرب
تو شہنشاہ آسمانوں کا
حق نے تجھ کو امیں بنایا ہے
عرش اور فرش کے خزانوں کا
کون ہوگا ، اگر نہ ہوگا تُو
دست گیر اپنے مدح خوانوں کا
دو جہانوں کا تاجدار ہے تُو
میں صلہ لوں گا دو جہانوں کا

جب وہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں تو ایک دائمی حیرت انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں کہ:

تم کو شبِ الست کا بدرالدجیٰ کہوں
یا صبحِ کائنات کا شمس الضحیٰ کہوں
یا شہر یارِ مملکتِ انبیا کہوں
یا تاجدارِ سلطنتِ دوسرا کہوں
مشرق کے متقی کو تمھاری ضیا کہوں
مغرب کے فلسفی کو تمھارا گدا کہوں

راجا محمد عبداللہ نیازؔ کی نعت محض اظہارِ عقیدت ہی نہیں، ان کا توشۂ آخرت بھی نظر آتی ہے۔

نعت نگاری میں ظفر علی خاں کی طرح طغیانِ جذبات کو جس فردِ وحید نے والہانہ جذبۂ عقیدت سے سمیٹا، اس کا نام شورشؔ کاشمیری ہے۔ شورشؔ کا قلم جب نعتِ پیمبر ﷺ میں رواں ہوتا ہے تو وہ محض حضور ﷺ کے اوصاف کے لفظی بیان تک محدود نہیں رہتا بلکہ تلاطم کی ایک ایسی کیفیت سے بھی گزرتا ہے، جہاں اس کی مادّی جسم کی کوئی حقیقت نہیں رہتی اور نعتِ پیمبر ﷺ ہی اس کی اُخروی نجات کا باعث بن جاتی ہے۔ شورشؔ کاشمیری کے ہاں خودسپردگی اور جاں سپاری کا جذبہ ہے اور نعت اس کی زندگی کا موٗقفِ اعلیٰ بن کر ظاہر ہوتی ہے:

جب قلم نعتِ پیمبر ﷺ میں رواں ہوتا ہے
اپنی بخشش کا سرِ حشر گماں ہوتا ہے
جن کو ملتی ہے محمد ﷺ کی غلامی کی سند
مہرباں ان پہ خداوندِ جہاں ہوتا ہے

———

جب سے ترے خیال کی رہ اختیار کی
عنقا ہوئی ہے فکر غمِ روزگار کی
اس کے کرم نے زندۂ جاوید کر دیا
حد ہی نہیں ہے رحمتِ پروردگار کی
جاتا ہوں ان کے در پہ لیے جان و دل کو میں
حاجت نہیں ہے زندگیِ مستعار کی

———

اک شخص سراپا رحمت ہے ، اک ذات ہے یکسر نورِ خدا
ہم ارض و سما کو دیکھ چکے ، لیکن کوئی اس جیسا نہ ملا
ہم ایسے فقیروں کی زد میں دولت بھی رہی حشمت بھی رہی
اس در سے ہمیں جب نسبت ہے ، دارا و سکندر چیز ہیں کیا

———

کیا بات کہی ہے مرشد نے اللہ کی اس پر رحمت ہو:

سُبحان اللہ مَا اَجمَلکَ ، ما اَحسنکَ ، ما اَکمَلکَ

کتھے مہرِ علی ، کتھے تیری ثنا ، گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں

اثر صہبائی کی نعت میں الفاظ کا شکوہ نہیں لیکن اس نے سادگی سے شعریت پیدا کرنے کے جگمگاتے جذبے کی دل فریب عکاسی کی ہے اور ایک ایسی کیفیت پیدا کی ہے جو دل گرفتہ مگر پرحلاوت ہے:

دل کو ہے تیری آرزو محبوب
لب کو ہے تیری گفتگو مرغوب

تیری آنکھوں پہ بے حجاب اسرار
تیری ہر بات کاشف المحجوب
تجھ سے نسبت خدا سے نسبت ہے
حق کو محبوب جس کو تو محبوب
نورِ عشق محمدِ عربی ﷺ
ایک خورشید بے زوال و غروب

بہزادؔ لکھنوی نے خاکِ پاک و ہند میں رہ کر دیارِ نبوی ﷺ سے لپٹنے کی بے پایاں خواہش کا اظہار کیا تھا، لیکن نعیم صدیقی کو ''دلِ حزیں کا کاس الکرام'' لے کر روضۂ نبوی ﷺ پر حاضر ہونے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ سرزمینِ پاک سے دیارِ حجاز تک نعیم صدیقی پر جو کیف وکم کی بارش ہوئی، وہ بے اختیار اشعار کا رُوپ اختیار کر گئی۔ نعیم صدیقی کی نعت میں خود کلامی کی کیفیت ہے۔ اس میں جذبے کا لطیف ترین اظہار بھی کمالِ عقیدت سے ظاہر ہوتا ہے، ان کی نعت میں خضوع وخشوع کی وہی کیفیت ہے، جو بندہ و آقا کے درمیان سے دوئی کا پردہ ہٹ جانے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ دیارِ پاک سے خاکِ حجاز تک قافلۂ دل نے جو سفر اختیار کیا۔ نعیم صدیقی نے اس کا تاثر ہر منزل سے کشید کیا ہے۔ چند کیفیات ملاحظہ ہوں:

زمینِ پاک سے صدہا سلام لایا ہوں
میں ارمغانِ خلوصِ عوام لایا ہوں
ہے کاشمیر کا اک خط لکھا ہوا خوں سے
یروشلم! ترے زخموں کے نام لایا ہوں

حضور ﷺ! کیسے کہوں میں کہاں سے آیا ہوں
دروغ و مکر و فسوں کے جہاں سے آیا ہوں
نشانِ راہ بنا خود تصورِ منزل
وگرنہ ایک رہِ بے نشاں سے آیا ہوں

ٹھوکریں کھا کے اک زمانے تک
آ گیا تیرے آستانے تک

یہ بہت ہے کہ جلے اس میں تری شمعِ خیال
زندگی اپنی بس اک خانۂ ویراں ہی سہی

———

جس سے بشر، بشر بنا، جس سے جہاں بدل گیا
روضۂ پاک سے ملے پھر وہ پیام اے حضور ﷺ!
سخت کتنا امتحاں، منزل کشوں کے درمیاں
سوئی پڑی ہے سب سپہ، وقتِ قیام اے حضور ﷺ!

———

اے حبیبِ کبریا، صلِ علیٰ، صلِ علیٰ
جس سے دل زندہ رہے یاں سے وہ ساماں لے چلا

نعیم صدیقی کے لہجے میں بے پایاں نیاز مندی ہے، لیکن وہ جذبات کو عقل پر غالب نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنی نیاز مندی کو حضور ﷺ سے شفاعت پانے کا وسیلہ سمجھتے ہیں: وہ ذاتی آلام سے بڑھ کر اُمتِ مرحوم کے اخلاقی زوال کا پُرسوز اظہار کرتے ہیں۔ نعیم صدیقی کی نعت میں محمد علی جوہؔر کی دردمندی، اقبال کی جاں سپاری اور ظفر علی خان کی خطابت پوری فن کارانہ صداقت سے جلوہ گر ہے۔

عبدالکریم ثمؔر کی توقیرِ جنوں پر جذبات کی تقدیس زیادہ غالب ہے۔ ان کی نعت عقیدت اور حکیمانہ نظر کا امتزاج ہے۔ وہ جذبے کے تلاطم میں بھی تشبیب اور مدح میں توازن قائم رکھتے ہیں۔ اور نعت میں آدابِ فن کی طہارت سمو ڈالتے ہیں:

تری ہی ذات جمال و جلال کا سنگم
ترا جمال منزہ، جلال پاکیزہ!
ضیائے نور کی تقدیس ہے ترا پیکر
یہ چاندی بھی ہے عکسِ جمال پاکیزہ

———

عرب کو اس نے عطا کی قیادتِ کبریٰ
عجم کا محسنِ اعظم محمد عربی ﷺ

———

محمد کاشفِ سرِ نہاں اور نور کا مظہر
محمد ظاہر و باطن ، محمد اوّل و آخر
محمد ﷺ ہیں فروغِ آفرینش ، رحمتِ عالم
محمد ﷺ مخزنِ حکمت ، محمد ﷺ خُلق کے پیکر

عبدالعزیز خالدؔ کی شاعری میں غزل سے قرآن کی طرف مراجعت کا واضح رُجحان ملتا ہے۔اس کا اپنا قول ہے کہ:

قرآن غزل گوئی پہ غالب آیا
دل اس کے طفیل از سرِ نو زندہ ہوا

اس مراجعت کا دوسرا بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ خالدؔ غزل کی ضم پرستی کو خیر باد کہہ کر خواجۂ یثرب کی نعت نگاری کی طرف اس تڑپ کے ساتھ مائل ہوا کہ بہ یک قیدِ قافیہ نعت کی متعدد کتابیں لکھ کر اپنی والہانہ عقیدت کے چراغوں کو روشنی عطا کر دی۔عبدالعزیز خالدؔ کے ہاں نعت نگاری محض ایک روایت نہیں بلکہ ایک وجدانی جذبے کا نام ہے اور یہی خالدؔ کا سرمایۂ افتخار ہے، جو کبھی ''فارقلیط'' میں اظہار پاتا ہے،کبھی ''من حمنا'' میں مظہرِ عقیدت بن جاتا ہے:

ہے نعت و نامِ نبی ﷺ مایۂ مباہا تم

اور یہی وجہ ہے کہ خالدؔ جب رسولِ اکرم ﷺ کے حضور پیش ہوتا ہے تو اپنی تمام تر قادر الکلامی کے باوجود اپنی شاعرانہ حیثیت کو نظر انداز کر دیتا ہے اور سراپا عجز و انکسار بن جاتا ہے:

میں فرشِ زمیں ہوں ، تو سقفِ سما ہے
میں سانسوں کا مہماں ، تو موجِ ہوا ہے
شہنشاہِ لولاک و مولائے سدرہ
تو میرے تخیل سے بھی ماورا ہے
تری ذات فخرِ بنی نوعِ آدم
تو صلِ علیٰ ، خیرِ خلقِ خدا ہے
سنی اُمِ معبد سے تعریف تیری
بہت تجھ سے ملنے کو جی چاہتا ہے

مندرجہ بالا نعت کا آخری مصرع درحقیقت عبدالعزیز خالدؔ کی نعت گوئی کا اساسی ماخذ ہے، ہر چند شہنشاہِ لولاک اس کے تخیل سے بھی ماورا ہیں،لیکن خالدؔ نے حضور ﷺ کے روشن وجودِ

گرامی کی بہت سی تاب ناک کرنیں اپنے قلم کی گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالدؔ نے حضور ﷺ کی زیارت بھی کی ہے اور شاید ان کے نظارۂ جمال کو محسوس کر کے ہی نعت نگاری کا عروج حاصل کیا ہے:

تجلّی سے چہرہ ترا ارغوانی
تو خورشید رو — زمہِ چہاردہ ہے
تری زلف ہے بدر کے گرد ہالہ
چکور آتشِ رشک سے جل رہا ہے
وقارِ سکوت اور حسنِ تکلم
تری گردِ رہ عنبر و توتیا ہے

جمیل و اجمل و کامل مکمل و اکمل
ستم زدہ بشریت کا محسنِ اعظم
نگار خانۂ کُن کی حسیں تریں تصویر
ہے جیسے نازکناں خود مصورِ مرصم
وہ جس کا بیضوی چہرہ ہے چاند کا ٹکرا
وجیہہ و خوش دل و بیدار مغز تازہ دم
شمیم خلدِ بریں کاکلِ مجلّا میں
سحاب رحمتِ رحمٰن زلفِ عالیہ شم

عبدالعزیز خالد کی نعت حضور ﷺ کی سراپا نگاری یا اپنی تمام تر انکساری تک محدود نہیں، بلکہ اس نے حضور ﷺ کی سیرت کے تمام روشن نقوش سمیٹنے کی سعی کی ہے۔ اس عمل میں خالدؔ کی قادر الکلامی نے اس کی پوری معاونت کی ہے اور وہ نعت کا ایک ایسا پیکر تشکیل دینے میں کامیاب ہوگیا، جو نبی نوعِ انسان کے لیے پیغامِ منظوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھیے تو ''فارقلیط''، ''من حمنا''، ''عبدہٗ''، ''طاب طاب'' اور متعدد دوسرے مجموعے محض ایک شاعر کا ارمغانِ عقیدت نہیں، بلکہ ''مدحِ اربابِ کرم'' کے اس زمانے میں خالدؔ کا ''کلمۂ حق'' ہے، جو ''فریضۂ اہلِ قلم'' بن گیا ہے۔

خالدؔ کی خصوصی عطا یہ ہے کہ اس نے نعت کو ایک الگ صنفِ سخن کے طور پر قبول کیا اور

اس میں اپنی قادر الکلامی اور جذبِ دروں سے انفرادیت پیدا کی۔ بلاشبہ وہ اُردو شاعری کا حسانؓ بن ثابت ہے اور اس کی نعت قصیدہ لامیہ اور میمیہ کی ہم پایہ قرار دی جا سکتی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ طغیانِ جذبات کو نعت میں اس فراوانی سے پیش کرنے میں تا حال اس کا کوئی مثیل نہیں۔

عقیدت کی فراوانی اور جذبے کی تابانی کی منور صورت حافظ مظہر الدین اور حفیظ تائب کی نعت کے نمایاں اوصاف ہیں۔ حافظ مظہر الدین کے بیان کی روانی سے مطالب کی حقیقت افروزی ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے حضور ﷺ کی سیادت سے رومانیت کی جوالا کو نقشِ بیدار کی صورت میں پیش کیا ہے:

آہ میں تاثیر ہے ، اک کیف ہے فریاد میں
جانے کیا لذت ہے محبوبِ ﷺ خدا کی یاد میں
یہ بھی تو ہے خاص فیضانِ درِ شاہِ اُمم
ایک حسرت جو مچلتی ہے دلِ ناشاد میں

حفیظ تائب کی نعت ایک ایسی شرحِ دل ہے، جس سے روشنی کا در مزید کشادہ ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت کی کرنیں حفیظ تائب پہلے اپنے دل میں سمیٹتا ہے، پھر ایک ملّی اثاثے کے طور پر نعت کی صورت قوم کو لٹا دیتا ہے اور خوبی کی بات یہ ہے کہ ان کرنوں سے حضور ﷺ کا جمال بھی ہویدا ہے اور ان کی تعلیمات کا عکسِ دل نشیں بھی:

سراپا رشد و ہدایت ، سراپا رحمت و جُود
مرے رسول ﷺ کا اسوہ ، مرے نبی کا وجود
طلوعِ مہرِ رسالت تھی مرگِ ظلمتِ شب
رسولِ پاک ﷺ کی بعثت تھی ، صبحِ نو کی نمود
نبی ﷺ کے حسنِ مروّت نے سارے توڑ دیے
کدورتوں کے طلسمات ، رنگتوں کے قیود
سوائے احمدِ مرسل ﷺ کوئی نہیں تائبؔ
مرا سہارا ، مرا مدعا ، مرا مقصود

حافظ لدھیانوی کی نعت گریۂ زیرِ لب ہے۔ اس کی فریاد کی لَے مدھم لیکن تأثر گہرا ہے:

مجھ پر بھی نگاہِ لطف و کرم ، اے سرورِ عالم شاہِ اُمم
اے باعثِ تخلیقِ آدم ، اے ختمِ رُسل ، اے شمعِ حرم

یہ ارض و سما کے خوش منظر، سب تیرے نور کے ہیں مظہر
یہ تیرا فیض تھا روزِ ازل، مسجودِ ملائک ہے آدم
عصیاں سے ہے دامن آلودہ، یہ اشکِ ندامت کچھ بھی نہیں
اک عمر کا سرمایہ ہے یہی، دامانِ مژہ میں گوہرِ غم

اُخگر سرحدی نے اپنے آپ کو تحفظ و اظہارِ ناموس محمد ﷺ کے لیے وقف کر رکھا ہے اور اس کے لیے انھوں نے قید و بند کی صعوبت بھی قبول کی۔ ان کا ایقان ہے کہ:

ترے نقشِ پا سے جو نسبت رہی ہے
بڑے اوج پر اپنی قسمت رہی ہے
جسے تیرے ناموس کا غم رہا ہے
اسی کی زمانے میں عزت رہی ہے

جعفر طاہؔر نے طویل نظم "ہفت کشور" میں حضور ﷺ کی آمد کو خورشیدِ تازہ کا طلوع قرار دیا ہے اور اس خورشید کے طلوع سے تاریک دُنیا کو جو اُجالا ملا، اُسے جعفر طاہر کی زبان سے سنیے:

نہ ذلتوں کی سیاہیاں ہیں، نہ آفتوں کے زبوں سویرے
عرب تو کیا دو جہاں کی آغوش میں اُترنے لگے سویرے

یہ بزم جس میں تمیزِ شاہ و گدا نہیں ما و تو نہیں ہے
یہاں پہ نام و نسب کی اور ملک و قوم کی گفتگو نہیں ہے

یہاں سفید و سیاہ کچھ اس طرح ملے ایک ہوگئے ہیں
وہ قہر مانانِ تلخ پیشہ، وہ ننگِ دیں نیک ہوگئے ہیں

شیر افضل جعفری کے ہاں ایک مست قلندر کی صدا کا لہرا ہے ایک ایسا قلندر جس نے حضور ﷺ کے فقر سے بختِ جواں پایا ہے اور دُنیا کو مٹی کا ٹھیکرا سمجھ کر چھوڑ دیا ہے:

آسماں آپ ﷺ کی رفتار پہ جاں دیتا ہے
آپ ﷺ کا دور زمانے کو اماں دیتا ہے
بعد از قتلِ جفا آپ ﷺ کا فرزندِ جلیل
درسِ قرآن، سرِ نوکِ سناں دیتا ہے

شہ رہِ بندگی میں آپ ﷺ کا اسلوبِ حیات
عشق کی منزلِ یزداں کا نشاں دیتا ہے

محشؔر بدایونی کی نعت میں ظفر علی خان کی خطابت کی ایک ہلکی سی جھلک ملتی ہے، لیکن مطالب کی حقیقت افروزی میں اس کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے:

وہ نور کی مشعل روشن کی اک خاک نشینِ بطحا نے
عالم پہ طرب کا رنگ آیا، ضو دینے لگے ظلمت خانے
وہ جلوۂ بزمِ صبحِ ازل ظاہر نہ اگر یوں ہو جاتا
بے نام حقائق رہ جاتے، بے عنواں سارے افسانے

گوؔیا جہان آبادی نے اپنے جہان کو حضور ﷺ کے نور سے انوار بنا لیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں انکسار کے ستارے ہیں اور جبین پر عقیدت کی دھول:

اللہ اللہ رحمت للعالمین ﷺ
رشکِ دل دامانِ رحمت کے نگیں

قرب کی حد سے گزر جاتا ہے جب ذوقِ نیاز
درِ محبوب ﷺ پہ سجدے کو جبیں کہتے ہیں

نور اُنؐ کا ہے، ضیا انؐ کی، اُجالا اُنؐ کا
ماہِ معراج و سراجِ دو جہاں، شمعِ حرم

ان کے نقشِ پا سے جب آنکھیں ملیں
چشمِ پُرنم کو ستارہ مل گیا

محشؔر رسول نگری نے نعت نگاری کے جنونِ شوق میں خود کو دیارِ رسول ﷺ سے وابستہ کر لیا ہے۔ ''فخرِ کونین'' کے حوالے سے وہ التزاماً فنافی النعت ہے:

نہیں فروغِ تجلّی سے کم تمھارا خیال
تمھاری یاد سے یہ خاک جگمگا ہی گئی

مشامِ جاں میں بسی ان کی بوئے پیراہن
ہماری شاخِ تمنا بھی لہلہا ہی گئی

یوسف ظفر نے جب درِ مصطفیٰ ﷺ پر حاضری دی تو وہ جمال کی ایک ایسی کرن سے دو چار ہوا، جس نے لپک کر اس کی ساری کائنات کو منور کر ڈالا۔ یوسف ظفر نے بارہا اس جمال کا تذکرہ کیا ہے، جسے اس نے مدینے کو جاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کا بیان ہے کہ میں اس اُجالے کو لفظوں میں ڈھال نہیں سکتا۔ اس کی نعت اس کے تجربے کا شاید ایک نامکمل عکس ہے۔ تاہم دیکھیے کہ اس میں اپنے آپ کو محبوبِ خدا ﷺ کے جمال میں مدغم کر دینے کی کتنی صداق تڑپ ہے:

مری نگاہ بھی تو ، تو مرا خیال بھی ہے
مگر یہ دل کہ جسے حسرتِ وصال بھی ہے
ظفر یہ میرا مقدر کہ اس کو چاہتا ہوں
جو خود جمیل بھی ، آئینۂ جمال بھی ہے

جدید شعرا میں منیر نیازی کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس نے انسان کے داخلی خوف کو آشکار کیا اور ہجومِ مردہ سے تازہ سویرا اُگانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نعت میں اس کا صرف ایک شعر اس کی عقیدت کا ارمغاں ہے، لیکن نعت کا یہ ایک شعر سننے کے لیے آپ کو پس منظر سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے:

شعاعِ مہرِ منور ، شبوں سے پیدا ہو
متاعِ خوابِ مسرت ، غموں سے پیدا ہو
مری نظر سے جو گم ہوگیا وہ ظاہر ہو
صراطِ شہرِ وفا ، اُلجھنوں سے پیدا ہو
مثالِ قوسِ قزح ، بارشوں کے بعد نکل
جمالِ رنگ ، کھلے منظروں سے پیدا ہو

اور اس کا ایک یہ شعر:

فروغِ اسمِ محمد ﷺ ہو بستیوں میں منیرؔ
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو

شہزادؔ احمد اور انجمؔ رومانی نے نعت کے وسیلے سے سرورِ کائنات ﷺ کے حضور میں

موجودہ دور کا ظلم، جہولت، شکست و ریخت، عدمِ آگہی، تضاد اور دو رنگی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شہزاد احمد کا مشاہدہ ہے کہ:

ڈوبے ہوئے لہو میں ہیں اس دور کے بھی ہاتھ
پھر کیا کہوں اسے نہ اگر کربلا کہوں

اور انجم رومانی کا ایقان ہے کہ:

حق آگہی کہاں کی ، ہے زر آگہی کا دور
سُرمہ ہے آج آنکھ کا باطل کہیں جسے
یاں بایزید بھی ہو تو کہلائے بولہب
ہے معتبر! حسین کا قاتل کہیں جسے

اس سب کے باوجود انجم رومانی کے ہاں مایوسی کا اظہار نہیں ہوتا اور وہ اس مشکل مرحلے میں حضور ﷺ کی رہنمائی کا امیدوار ہے:

درکار اک نظر ہے کہ آسان ہو سکے
در پیش مرحلہ ہے کہ مشکل کہیں جسے
بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی کے واسطے
تنہا وہ سنگِ میل کہ منزل کہیں جسے
ہم وہ کہ دو جہاں میں کوئی نام بھی نہ لے
تو وہ کہ کائنات کا حاصل کہیں جسے

انجم رومانی نے زمانے کی آلائش کو خارج کی نگاہ سے دیکھا ہے اور حضور ﷺ سے اجتماعی بہبود کی درخواست ہے۔ شہزاد احمد نے غمِ کائنات کو ذات کے حوالے سے بیان کیا ہے اور حضور سے انسان کی انفرادی رفعت اور داخلی عروج کی استدعا کی ہے:

اے رحمتِ اُمم مرے دل میں وہ آگ ہے
جلنے لگے زبان اگر ماجرا کہوں
مجھ کو بھی اس زمین پہ معراج بخش دے
توفیق دے کہ خود کو ترا نقشِ پا کہوں

———

شہزادؔ عمر بھر مری جھولی بھری رہی
کیا کچھ نہیں ملا مجھے اس کی جناب سے

اور یہ سب محض اس لیے ہے کہ:

معراجِ زندگی ترے قدموں کی دھول ہے
پھر کیوں نہ آسماں کو تری گردِ پا کہوں

———

آنکھوں میں نور دل میں بصیرت ہے آپ ﷺ سے
میں خود تو کچھ نہیں مری قیمت ہے آپ ﷺ سے
ہے آپ ﷺ کا کرم یہ مری خواہشِ نمو
گو خاک ہوں مگر مجھے نسبت ہے آپ ﷺ سے

اُردو نعت میں مظفر وارثی کی منفرد عطا یہ ہے کہ اس نے استعارے کی زبان کو نئی معنویت سے برتا ہے۔ وہ بعض غیر معروف اور نسبتاً کھردرے لفظوں کو اس سلیقے سے استعمال کرتے ہیں کہ انھیں اعجاز گوئی حاصل ہو جاتا ہے، اور یہ الفاظ مدحِ پیمبر ﷺ میں اپنے نطق کے بوسے لینے لگتے ہیں:

وحدانیت کے پھول کھلے گرم ریت سے
دی سنگِ بے زباں نے گواہی رسول ﷺ کی
بہبودی و فلاح کے جگنو نکل پڑے
تاریکیوں میں جب کھلی مٹھی رسول ﷺ کی
سیڑھی لگائے عرشِ خدا پر نبی ﷺ کی یاد
چلتی ہے سانس تھام کے انگلی رسول ﷺ کی

اطہر نفیسؔ نے نعت میں نظم آزاد کا اسلوب برتنے کی سعی کی ہے اور اظہار کا وہ زاویہ دریافت کیا ہے، جس سے تأثر کی گہرائی اور اکائی وجود میں آتی ہے:

سلام اس پر—
جو ظلمتوں میں منارۂ روشنی ہوا
وہ ایسا سورج ہے، جس کی کرنیں ازل ابد تک تمام
گوشوں میں نور بن کر سما چکی ہیں۔

ہر ایک ذرّے کو ماہِ تاباں بنا چکی ہیں

سلام اس پر—

سلام اس پر—

جو بے نواؤں کا آسرا ہے

جو سارے عالم کی ابتدا ہے

جو سب زمانوں کی انتہا ہے

سلام اس پر—

جو راہِ حق میں بلا رہا ہے کہ رہنما ہے

جو سب کو حق سے ملا رہا ہے کہ رہنما ہے

انجم نیازی نے حضور ﷺ کے ذکرِ گرامی سے اپنی ذات کو تلاش کرنے کی سعی کی۔ وہ زمانے کے آلام میں آسودگی تلاش کرتا ہے تو حضور ﷺ کی تعلیمات کو زادِ راہ بنانے پر بھی آمادہ ہوتا ہے۔ چناں چہ اس کی نعت نشاطِ دل بھی ہے اور آرامِ جاں بھی اور اس نے پابندِ اسلوب کے علاوہ آزاد اسلوب بھی کامیابی سے استعمال کیا ہے:

کس کی خوش بو سے مہک اُٹھا گلستانِ وجود

قطرہ قطرہ جسم و جاں میں آ کے اُترا کون ہے؟

———

عنایت کا سمندر سامنے ہے بے نواؤں کے

معطر ہوتے جاتے ہیں بدن بھیگی دُعاؤں کے

———

ہر لفظ مقدس تھا اس کا

ہر بول تھا اس کا لافانی

وہ روشنیوں کا پیغمبر ﷺ

فاران کی چوٹی پر جس نے

توحید کا پرچم لہرایا

آغازِ سفر کا فرمایا

———

زمیں سانس لینے سے گھبرا رہی تھی
ستاروں کا تنہائیوں کی مقفل فضاؤں میں دم گھٹ رہا تھا
بہت ہی گھٹن تھی
اچانک سیہہ اونگھتے آسماں سے
زمیں پر سنہرا سنہرا بدن آ کے اُترا
کہ جس کی ضیا سے مقدس ترنم کی آواز گونجی

عبداللہ خاور کے لہجے میں فریاد بھی ہے اور التجا بھی۔ یہ وہی خود کلامی ہے، جو صرف خیال کی خلوت سجانے سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ خاور کی اس خلوت میں جب ذکرِ نبی ﷺ شروع ہوتا ہے، تو فرشتے اس کی فریاد کو بابِ نبوت ﷺ تک پہنچانے کے لیے خود حاضری دیتے ہیں:

حضور ﷺ ! دشتِ بلا میں ہے شامِ غم کا ظہور
حضور ﷺ ! آپ کی چشمِ کرم ہے آیۂ نور
فروغِ آتشِ پنہاں سے جل رہا ہے وجود
سلگ رہی ہے کوئی شمع ، بزمِ ناز سے دور
حضور ﷺ! کوئی مجدد عطا ہو دُنیا کو
ہو جس کے فیض سے احیائے دینِ حق کا ظہور
حضور ﷺ! ایک نظر التفات سے مملو
بنامِ آیۂ رحمت ، بنامِ ربِ غفور

نعت نگاری کے اس اجمال میں، میں نے صرف ان شعرا کا ذکر کیا ہے، جن کے دل سے زمزمۂ نعت دفور بے اختیار سے اُبل پڑا۔ گزشتہ دس سالوں کے دوران پاکستان میں نعت نگاری کو فروغِ اسلام کے وسیلے کے طور پر قبول کیا گیا اور ان گنت شعرا نے نعت کہنے کا بھولا ہوا فریضہ اختیار کیا۔ طغیانِ اظہار کی صورت یوں ہے کہ ''نقوش'' نے رسولؐ نمبر کے سلسلے میں ایک اشاعت صرف نعت کے لیے مخصوص کی۔ رسالہ ''شام و سحر'' چار ضخیم نعت نمبر پیش کر چکا ہے اور محسوس یوں ہوتا ہے کہ یہ اظہار و اشاعت محض ایک ابتدا ہے۔ متعدد شعرا نے غزل سے مکمل انحراف کر کے اب کلیتہً نعت نگاری کو اظہار کی واحد صنف کے طور پر قبول کر رکھا ہے۔ اب غزل کی مقبول

صنف کے مقابلے میں نعت کے مجموعے بھی وجاہت و جمال سے پیش کیے جا رہے ہیں، متعدد چھوٹے چھوٹے شہروں سے نعتوں کے قابلِ قدر انتخاب شائع ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے حال ہی میں نعت نگاری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ اس مقالے کے بعض حصے رسائل و کتب میں بھی شائع ہوئے۔ ممتاز حسن، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، گوہر ملسیانی، اخلاق عاطف اور حاجی گل بخشالوی نے تنقید اور انتخابِ نعت میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اس مقالے میں ۱۹۷۵ء سے پہلے کے نعت نگاروں کو شامل کیا ہے۔ اس سے بعد کی نعت نگاری ایک الگ مقالے کا موضوع ہے۔ تاہم یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ گزشتہ دس سال کے دوران حافظ محمد افضل فقیرؔ، عارف عبدالمتین، طفیلؔ دار، عابدؔ نظامی، سرورؔ بجنوری، حشمت یوسفیؔ، اقبالؔ صلاح الدین، عاصیؔ ضیائی، صہبا اختر، ذوقیؔ مظفر نگری، ہلالؔ جعفری، منیرؔ قصوری، حنیف اسعدیؔ، کرمؔ حیدری، قیوم نظرؔ، عاصی کرنالی، سروسہارن پوری، عاصمؔ گیلانی، یزدانی جالندھری، اعجازؔ رحمانی، غافلؔ کرنالی، رعناؔ اکبر آبادی، راغب مراد آبادی، عزیز حاصل پوری، الطافؔ قریشی چند ایسے نعت نگار ہیں جن کی نعتوں کے مجموعے اشاعت کی منزل کو پہنچے اور مقبول ہوئے۔

۱۹۷۵ء تک کے منفرد نعت نگاروں کے اس اجمالی جائزے کے بعد اب اسالیبِ نعت پر چند باتیں۔

اُردو نعت نگاری پر شاعری کے تمام اسالیب کا گہرا اثر پڑا ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے نعت میں غزل کے اسلوب کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ چناں چہ بیش تر شعرا نے ردیف اور قافیہ کی پابندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے طغیانِ جذبات کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ نعت نگاری کے جدید دور میں دوسری اصنافِ شعر کو بھی عمدگی سے استعمال کیا گیا۔ مثال کے طور پر یوسف ظفرؔ، مظفر وارثی، جعفر طاہرؔ، حافظ لدھیانوی، اطہر نفیسؔ، ظہور نظرؔ، انجم نیازیؔ کے علاوہ متعدد دوسرے شعرا نے مختلف اسالیبِ بیان استعمال کیے۔ یوسف ظفر نے عقیدت کے آبگینوں کے مثنوی کے انداز میں پیش کیا:

میں معجزہ خود حضور ﷺ کا ہوں
میں پیکرِ خاک بولتا ہوں

دل شمع صفت ہے ان کے دم سے
لایا ہوں چراغ یہ حرم سے

لولاک لما ہے شانِ احمد ﷺ
قرآن ہے ترجمانِ احمد ﷺ
(یوسف ظفر)

جعفر طاہر کی جولانیِ اظہار نے کینٹو کا روپ اختیار کیا:

فاراں کا ماتھا چمکا وہ چمکا
بدلا وہ بدلا صحرا کا منظر
اس کی ضیائیں صحرا بہ صحرا
اس کی تجلّی کشور بہ کشور
اس مہر کی ہیں پُرنور کرنیں
صدیقؓ و فاروقؓ، عثمانؓ و حیدرؓ
(جعفر طاہر)

مظفر وارثی کے ہاں مثنوی کا اندازِ دیگر پروان چڑھ رہا ہے۔ اس نے لفظوں کی نو تراشیدہ ترکیبوں سے جذبات کے پیکر نئے انداز میں سنوارے ہیں اور یوں عقیدت اور نیاز مندی کی مطہر قندیلیں روشن کی ہیں:

سخن کی داد خدا سے وصول کرتی ہے
زبان آج ثنائے رسول ﷺ کرتی ہے

———

ہر ایک سانس محمد ﷺ کے نام پر نکلا
خیالِ ذہن سے احرام باندھ کر نکلا

———

جبینِ شعر جھکی جذبۂ سجود لیے
امیرِ نطق اُٹھا پرچمِ سجود لیے

———

بلند ہوگیا سایہ مرا مرے قد سے
لپٹ گئی مری آواز سبز گنبد سے

———

مکینِ گنبدِ خضرا پیمبرِ آخر
ترے حضور ادب سے نگوں ہے اک شاعر

ترے دیار کی آنکھوں میں دھول لایا ہوں
چڑھانے قبر پہ لفظوں کے پھول لایا ہوں

سیاہیوں کے محل میں شگاف ڈال دیے
ہوائے تیز کے اوپر چراغ اُچھال دیے

قمر جلالوی نے سیلابِ جذبات کو رباعی کے صرف چار مصرعوں میں بند کرنے کی سعی کی اور اس سے معنوی عمق پیدا کیا۔ تضمین کی صورت ملاحظہ کیجیے:

حکم ہی ایسا کچھ آیا ہے کہ ممتاز ہے حُسن
نگہِ خالقِ اکبر میں سرفراز ہے حُسن
جا رہے ہیں شبِ معراج سوئے عرشِ بریں
"اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز ہے حُسن"

صہبا اختر نے شاید پہلی مرتبہ نعت میں مثلث کا استعمال کیا۔ اس وارفتۂ محبت کا ہر جرعہ بہ ظاہر مصرعۂ ثالث پر ختم ہو جاتا ہے، لیکن یہ تو صہبائے آبگینہ گداز کا صرف ایک گھونٹ ہے، جو ہر نئے سانس پر ایک جرعۂ نو کا طلب گار ہوتا ہے:

مری نظر نے وہ آفتاب بلند دیکھا
کہ جس کے سایے میں شب کو شعلہ پسند دیکھا
تمام انسانیت کو احسان مند دیکھا

میں کملی والے کے سایے میں اب رواں دواں ہوں
یقیں سے شاداب ، نسل در نسل بے گماں ہوں
مسافرِ حق ہوں ، منزلِ حق کا راہ داں ہوں

محشر رسول نگری نے مرثیہ کے تتبع میں مسدس کا استعمال پوری رفعتِ خیال اور ندرتِ فکر سے کیا ہے:

ان کا جمال خالقِ اکبر کی معرفت
ان کا جلال مشرق و مغرب کی سلطنت
ان کا کمال عشق و رضا خلق و مرحمت
ان کا خیال شمعِ رہِ صدقِ حریت
انسان کو ان کے خلق نے انساں بنا دیا
اک خاک داں کو صاحبِ عرفاں بنا دیا

اطہر نفیس، ظہور نظر اور انجم نیازی نے آزاد نظم میں نعت کہنے کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ پرویز بزمی کی ایک نعت بھی مدینۃ النبی ﷺ پر حاضری کے وفور سے لبریز آزاد نظم کے پیکر میں ہی ظہور فرما ہے، لیکن تا حال یہ اسلوب قبولِ عام حاصل نہیں کر سکا اور غزل کا اسلوب ہی مروّج و مقبول نظر آتا ہے۔

اُردو نعت نگاری نے غزل سے کچھ منفی اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ بعض شعرا نے افراط و تفریط کا شکار ہو کر شریعت کی حدود سے تجاوز بھی کیا ہے۔ حسنِ سیرت کے بیان میں مبالغے کی ہر وسعت نبی اکرم ﷺ کے اوصافِ حسنہ کے سامنے گرد نظر آتی ہے، لیکن حسنِ صورت کی مداحی اور اپنے عشق کے اظہار میں کہیں کہیں تشبیہ و استعارہ کا بے جا استعمال بھی در آیا ہے۔ اور اس سے بعض اوقات استخفافِ انبیا علیہم السلام کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر میر حسن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں واضح طور پر انبیاؑ کی شان کم کرنے کی جسارت ہوئی ہے:

کروں اس کے رُتبے کا کیا میں بیاں
کھڑے ہوئے جہاں باندھے صف مرسلاں

———

مسیحؑ اس کے مژگاہ کا پارہ دوز
تجلّیِ طور اس کی مشل فروز

———

خلیلؑ اس کے گلزار کا باغباں
سلیمانؑ کئی مہر دار اس کے ہاں

اسی طرح آسی غازی پوری کا یہ شعر بھی ایسی ہی جسارت کا اظہار کرتا ہے:

یوسفؑ سے سیکڑوں ہیں خریدارِ مصطفیٰ ﷺ
مثلِ مسیحؑ لاکھوں ہیں بیمارِ مصطفیٰ ﷺ

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

''مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ، جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کے ساتھ کیا۔ میں تو خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ مجھے صرف خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہی سمجھو!''

چناں چہ سعدیؒ شیرازی کی وارفتگی بڑھی تو وہ ''حَسنَت جمیعُ خِصَالہٖ'' پر آ کر رُک گیا اور جامیؒ نے مبالغہ کی حد تلاش کی تو بس اتنا کہا:

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''

وہ اس رفعت سے آگے نہ بڑھ سکا کہ اس سے آگے خدا کا مقام آ جاتا ہے، لیکن اُردو کے بعض نعت نگاروں نے حضور ﷺ کے اس ارشادِ گرامی پر پوری توجہ نہیں دی اور مقامِ نبوت کو مقامِ یزداں سے ٹکرا دیا ہے:

سودا:

جو صورت اس کی ہے لاریب ، وہ ہے صورتِ ایزد
جو معنی اس میں ہیں بے شک وہی معنی ربانی

آسیؔ غازی پوری:

وہی جو مستویِ عرش تھا خدا ہو کر
اُتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

محسنؔ کاکوروی:

مدینہ کی طرف جائیں کہ لیں کعبہ کا ہم راستہ
نظر آتا ہے ان دونوں گھروں میں ایک ہی جلوہ
کہاں اب جبہ سائی کیجیے کچھ بن نہیں پڑتا
احد کو کیجیے یا احمد ﷺ بے میم کو سجدہ

کئی شعرا نے حضور ﷺ کو مثالی محبوب کی صورت میں دیکھا اور سیلابِ اظہار میں ایسے الفاظ استعمال کر گئے جس سے دُنیا دار انسان کا مزاج آشکار ہوتا ہے۔ بعض شعرا نے اپنے لیے صیغۂ تانیث استعمال کر کے برہا اور سنجوگ کی ہندی روایت نبھانے کی کوشش کی اور یہ

حضور ﷺ کی شان سے بہت فروتر ہے:

میں شبدوں کی پیاسی ، میں چرنوں کی داسی
تری جستجو مجھ کو صبح و مسا ہے

———

پنم کو مات کرے چھب سے شیام سانولی گات
یہ آنکھیں درس کو کب سے ترس رہی ہیں بلم!

———

یہ سرب بھومی کا راجا مہابلی سمراٹ
اپارا تھاہ انت ایک انیک وشوا تم

بعض شعرا نے نعت سے طبقاتی تضاد اُبھارنے کی کوشش کی، لیکن انداز اتنا مکینکل تھا کہ نعت کی بے ساختگی میں آورد کا زاویہ در آیا:

قصرِ مرمر سے شہنشاہ نے از راہِ غرور
تیری کٹیا کو جو دیکھا تو بہت شرمایا

بعض شعرا کے ہاں قصیدے کا انداز ڈپلومیٹک نظر آتا ہے اور جو صفات حضور ﷺ کی بیان کی ہیں، وہ کسی دنیا دار انسان پر بھی صادق لائی جاسکتی ہیں:

یہ بھی ہے سچ کہ آپ ﷺ کی گفتار ہے جمیل
یہ بھی ہے حق کہ صاحبِ کردار آپ ﷺ ہیں
یہ فخر کم نہیں کہ میں ہوں جس کا گردِ راہ
اس قافلے کے قافلہ سالار آپ ﷺ ہیں
مجھ پر یہ جرمِ غربت و دامن دریدگی
سب لوگ سنگ زن ہیں تو گلبار آپ ﷺ ہیں

اس قسم کی نعتوں میں شعرا دانستہ حضور ﷺ کا اسمِ گرامی درج نہیں کرتے بلکہ اوصاف کا ذکر تجریدی انداز میں ہی کرتے چلے جاتے ہیں۔

حوالہ:

۱۔ ظفر علی خان کی اس نعت کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بعد کے کئی شعرا نے ''تمھیں تو ہو'' کی ردیف میں قافیے بدل بدل کر بہت سی نعتیں کہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

خلیق قریشی

وجہِ قرارِ قلبِ پریشان تمھیں تو ہو
اصلِ فروغِ دیدۂ حیراں تمھیں تو ہو
حسنِ فروغِ عارضِ انسانیت ہو تم
تابِ جمالِ محفلِ امکاں تمھیں تو ہو
لکھا ہے جس میں رازِ چمن بندیِ جہاں
اس نامۂ جمیل کا عنوان تمھیں تو ہو

شمس وارثی لکھنوی:

انسانیت کی شمع فروزاں تمھیں تو ہو
خُلق و کرم کے مہرِ درخشاں تمھیں تو ہو
تم ہو وہ عہد جس پہ ہے معبود کو بھی فخر
نازاں ملک ہیں جس پہ وہ انسان تمھیں تو ہو
امیدوارِ لطف ہے یہ شمس وارثی
اس کے لیے نجات کا ساماں تمھیں تو ہو

انور سدید:

دُنیا ہے تیرے مصحفِ زیبا کی اک کرن
عقبیٰ کے آسمان کا تارا تمھیں تو ہو
کجلا دیا تھا ہم کو زمانے کی دھوپ نے
جس نے ہمارا روپ سنوارا، تمھیں تو ہو
انور سدید تیرے غلاموں کا ہے غلام
اس کے دلِ حزیں کا سہارا، تمھیں تو ہو

عرش ملسیانی:

طوفانِ زندگی میں سہارا تمھیں تو ہو
دریائے معرفت کا کنارا تمھیں تو ہو
تم پر ہمیشہ مطلعِ عالم کو ناز ہے
رہتا ہی اوج پر جو ستارا تمھیں تو ہو

لطفِ خدائے پاک شفاعت کے بھیس میں
فیضِ عمیم کا وہ اشارا تمھیں تو ہو

حافظؔ لدھیانوی:

ہے سب کو جس کی دید کا ارماں تمھیں تو ہو
سرمایۂ سرورِ دل و جاں تمھیں تو ہو
جس نے وقارِ عظمتِ انساں بڑھا دیا
انسانیت کے درد کا درماں تمھیں تو ہو
سرمایۂ حیات ہے تیرا ہی ذکرِ پاک
حافظؔ رہا ہے جس کا ثنا خواں تمھیں تو ہو

وجہِ سکون و قلب و نظر ہے تمھاری یاد
ہے درد و غم میں جس کا سہارا تمھیں تو ہو
جس نے تمام عمر صداقت کی راہ میں
ہر درد کو کیا ہے گوارا تمھیں تو ہو
سوزِ دروں ہے تیری عطا تیرا ہی کرم
نازاں ہے جس پہ درد ہمارا تمھیں تو ہو

رُجحانات

محسنؔ کاکوروی

ایک زمانہ تھا اور وہ بھی کوئی دور کی بات نہیں، یہی اب سے بیس پچیس برس پہلے تک ہر معمولی پڑھے لکھے آدمی کو محسنؔ کاکوروی کا نام اور کم سے کم ان کا ایک مصرع ''سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل'' ضرور یاد ہوتا تھا۔ اب حال یہ ہے کہ اوّل تو لوگ انھیں بھول چلے ہیں اور دوسرے اگر کسی کو ان کا خیال آتا بھی ہے تو ان کے اس نعتیہ قصیدے میں وہ کشش محسوس نہیں ہوتی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ شاید وہ بات ہو کہ:

نکل گئیں ضرورتیں بدل گئیں طبیعتیں

اُردو کے نئے نقادوں کے یہاں میں نے صرف ایک جگہ محسنؔ کا ذکر دیکھا ہے اور ان صاحب نے بھی محسنؔ کی شاعری کو خلوص اور شدت سے عاری، خشک اور مصنوعی کہہ کر اُڑا دیا ہے۔ چلیے جیسے ہم لوگ موہن جوداڑو اور ہڑپا کے کھنڈر دیکھنے جاتے ہیں، ایک نظر محسنؔ کے کلام پر سہی۔ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کی خیالی تشکیل میں جو مزہ ہے وہ تو اس میں نہیں ملے گا، لیکن اپنی قوم کی ذہنی اور جذباتی تبدیلیوں سے واقفیت پیدا کرنے کا درد ضرور حاصل ہو جائے گا۔

محسنؔ کاکوروی کی شاعری پر (آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے سہی) غور کریں تو اس میں تین عجب تضاد نظر آتے ہیں۔

(۱) محسنؔ نے کچھ ایسا زیادہ تو نہیں لکھا مگر دو ڈھائی سو صفحے کا مجموعہ تو بن ہی گیا ہے۔ پھر اس مجموعے میں تین چار چیزیں ایسی موجود ہیں جو نہ صرف نعتیہ شاعری میں، بلکہ پوری اُردو شاعری میں ایک امتیازی درجے کی مستحق ہیں، مثلاً دو مثنویاں ''چراغِ کعبہ'' اور ''صبحِ تجلّی'' ایک ''سراپائے رسول اکرم ﷺ'' اور وہ لمبی غزل جس کا مطلع ہے:

مٹانا لوحِ دل سے نقشِ ناموسِ اب و جد کا
دبستانِ محبت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا

مگر لے دے کے جسے قبولِ عام حاصل ہوا ہے وہ ان کا قصیدہ لامیہ یعنی ''سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل''۔ محسنؔ کی ساری شہرت اس ایک قصیدے پر موقوف ہے۔ آخر اس نظم میں ایسی کیا بات ہے، جو آج سے سو سال پہلے ہماری اجتماعی روح کی کسی پوشیدہ رگ کو چھو گئی ورنہ اس قصیدے پر تو کئی اعتراضات وارد ہو سکتے تھے، مثلاً ایک تو بعض لوگوں کو یہی شکایت ہوئی کہ نعتِ رسول ﷺ میں مناسباتِ کفر کا استعمال غیر مشروع ہے۔ چناں چہ امیر مینائی کو صنف کے جواز میں یہ دلیل لانی پڑی کہ حضرت کعبؓ بن زہیر نے حضور سرورِ کائنات ﷺ کے حضور میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کی تشبیب مشروع نہیں تھی۔ پھر خود محسنؔ کو اپنی صفائی میں چند شعر پیش کرنے پڑے:

پڑھ کے تشبیب مسلماں مع تمہید و گریز
رجعتِ کفر بہ ایماں کا کرے مسئلہ حل
کفر کا خاتمہ بالخیر ہوا ایماں پر
سب کا خورشید کے اشراق سے قصہ فیصل
ظلمت اور اس کے مکارہ میں ہوا طول سخن
مگر ایمان کی کہیے تو اسی کا تھا محل
مدعا یہ ہے کہ رندوں کی سیہ بختی سے
ظلمتِ کفر کا جب دہر میں چھایا بادل
ہوا مبعوث فقط اس کے مٹانے کے لیے
سیفِ مسلول خدا نورِ نبیِ مرسل

یہ اعتراض تو خیر کٹھ ملاؤں کی طرف سے ہوا تھا، لیکن ایک اعتراض خالص ادبی نوعیت کا ہو سکتا تھا۔ قصیدے کے لیے شوکتِ الفاظ لازمی قرار دی گئی ہے اور جزالت الفاظ سے گریز نہایت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ چناں چہ جلال الدین سحرؔ لکھنوی کے بارے میں جلال الدین جعفریؔ اپنی ''تاریخِ قصائدِ اُردو'' میں لکھتے ہیں کہ ان کی زبان متانتِ قصائد کے لیے موزوں نہیں۔ اب سحرؔ کی زبان کا نمونہ دیکھیے:

اے ہوا جا کے بنارس سے اُڑا لا بادل
چاہیے ہندوی سوسن کے لیے گنگا جل

قمریاں کہتی ہیں مستی میں جو چلتی ہے ہوا
پھول ہنس ہنس کے یہ کہتے ہیں ذرا دیکھ سنبھل
آج تو خوب سی جی کھول کے پی لو یارو
فکرِ فردا نہ روا نہ کرو دیکھ لیا جائے گا کل
آن کر پیڑوں کے تھالوں میں نہاتے ہیں لال
سوکھتے سوکھتے ہو جاتے ہیں بالکل ہریل
کس قدر کیاریوں میں جمع ہیں گلہائے فرنگ
یہ بڑے دن کے لیے ہوتی ہے شاید کونسل

زمین بھی محسنؔ کے قصیدہ لامیہ کی ہے اور زبان بھی، لیکن محسنؔ کا قصور معاف ہو گیا، بلکہ عیب، ہنر ٹھہرا۔ حالاں کہ وہ نعت لکھ رہے تھے، جس میں ادب و لحاظ اور بھی ضروری تھا۔ تو اس قصیدے میں وہ کیا چیز تھی، جو لوگوں کے لاشعور میں اُترتی چلی گئی اور جس نے لوگوں سے بے ساختہ سبحان اللہ کہلوا لیا۔

(۲) محسنؔ کے متعلق ہر پرانے نقاد نے یہی کہا ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ سے نہایت پُرخلوص اور شدید محبت رکھتے تھے۔ جلال الدین احمد جعفریؔ لکھتے ہیں: ''اس کلام پاک کو پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا مداح فی الحقیقت عاشقِ صادق ہے، اہلِ ہوس میں نہیں— ان کا ایک ایک لفظ درود پڑھنے کے قابل ہے۔'' لیکن اس جذبِ صادق کا اظہار نہایت پُرتکلف اور پُرتصنع انداز سے ہوا ہے۔ یہی جعفری صاحب ان کے کلام کی خصوصیات بتاتے ہیں۔ ''ان کی نعت گوئی میں تشبیہ و استعارات، مبالغہ و اغراق، تلازمات و مرعاۃ النظیر سب کچھ موجود ہے اور بہ حدِ کمال موجود ہے۔ پڑھنے والا ان کی معنی آفرینی اور سخن گستری کو دیکھ کر بے ساختہ داد دینے لگتا ہے— ہر شعر مذاقِ شاعری میں ڈوبا ہوا ہے۔'' جعفری صاحب ان کی پُرزور طبیعت اور رسائیِ فکر کی قوت و بلندی سے بہت متاثر ہیں۔ ''گل رعنا'' میں عبدالحی بھی تقریباً یہی صفات گنواتے ہیں— ''ہر شعر مذاقِ شاعری میں ڈوبا ہوا ہے۔''

مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کا شان و شکوہ، بندش کی چستی، استعاروں کی رنگینی، تلمیحات، بلاغتِ کلام، سخن آفرینی، غرض محسنؔ کے کلام میں وہ سارے شرعی عیب موجود ہیں جن کی وجہ سے اُردو غزل خلوص پرست لوگوں کے نزدیک نیم وحشیانہ صنفِ ادب قرار پاتی ہے، یعنی محسنؔ کاکوروی ایسے عاشقِ صادق ہیں جو ہر بات بناوٹی کرتا ہے۔

(۳) جلال الدین احمد جعفری جو بھی کہتے ہوں، مفلر والے مولانا حالیؔ کی تعلیم کی رُو سے تو محسنؔ کاکوروی کا ہر شعر مذاق شاعری سے بے گانہ اور بے اثر ٹھہرتا ہے، لیکن زندگی ہم سے جو پہلیاں بجھواتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مولانا حالیؔ اور لارڈ میکالے کی توقعات کے برخلاف ایک زمانے میں محسنؔ کا نعتیہ قصیدہ اسی طرح زبان زدِ خلائق تھا جس طرح بعد میں مسدسِ حالیؔ ہوا۔

محسنؔ کی شاعری کے ان متضاد پہلوؤں کو نظر میں رکھیں تو بحث تین حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ محسنؔ کا جذبہ کس نوعیت کا تھا؟ اگر وہ نعت گوئی میں کامیاب ہوئے تو کیا ان کا عشقِ رسول ﷺ اوروں سے زیادہ صادق یا شدید تھا؟ اگر ان کا جذبہ صادق اور پُرخلوص تھا تو انھوں نے پُرتکلف اندازِ بیاں کیوں اختیار کیا؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ ان کے قصیدہ لامیہ سے لوگ اتنے زیادہ کیوں متاثر ہوئے؟

محسنؔ کا خلوص یا ان کے جذبے کی شدت کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ان کی محبت وہ محبت نہیں تھی جو عاشق و معشوق کے درمیان یا دو دوستوں کے درمیان یا ایک عقیدت مند اور اس کے رہنما کے درمیان ہوتی ہے، بلکہ اس محبت کا مرکز رسولِ اکرم ﷺ تھے، یہاں میں نے ذات کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا۔ کیوں کہ یہ لفظ ہمارے ذہن کو خواہ مخواہ کھینچ کر شخصیت کی طرف لے جاتا ہے اور محسنؔ یا اس زمانے میں ان کے پڑھنے والوں کے لیے آنحضرت ﷺ ایک ''شخصیت'' قطعاً نہیں تھے۔ اُردو شاعری میں آنحضرت ﷺ کو ایک ''شخصیت'' تو حالیؔ نے اپنے مسدس میں بنایا اور اس طرح نعت گوئی کی روایت کو سخت نقصان پہنچایا۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

اس نعت میں جو مٹھاس اور جو کسک ہے اس کا تو میں بھی قائل ہوں اور فراقؔ صاحب نے اس کی تعریف میں جو چند جملے کہے ہیں، ان سے اس حد تک متفق ہوں کہ ممکن ہے کسی دن اس موضوع پر الگ سے مضمون ہی لکھ ڈالوں، مگر اس حقیقت سے بھی گریز نہیں کہ مولانا حالیؔ کے لیے آنحضرت ﷺ کچھ اور تھے، محسنؔ کاکوروی کے لیے کچھ اور۔ یوں تو حالیؔ کے زمانے سے بہت پہلے ''تقویت الایمان'' شائع ہو چکی تھی اور اس بات پر پورا غدر برپا ہو چکا تھا کہ رسول ﷺ کی عزت اتنی کرنی چاہیے جتنی ''نعوذ باللہ'' بڑے بھائی کی، یعنی رسول ﷺ کے پہلوئے بشریت پر زور دینے والے پیدا ہو چکے تھے اور حالیؔ کے زمانے میں ''بنانا نہ تربت کو میری صنم تم'' کچھ ایسا باغیانہ تصور نہ رہا تھا، لیکن اب سرسیّد کے زیرِ اثر اور پیرویِ مغربی کے شوق میں لارڈ میکالے کے عقیدت مند اُبھرنے لگے تھے جو کہتے تھے کہ اسلام افضل ترین مذہب ہے کیوں کہ یہ مذہب ہی

نہیں، بلکہ دُنیاوی زندگی بسر کرنے کا ایک سیدھا سادہ راستہ ہے اور آنحضرت ﷺ محض پیغمبر نہیں بلکہ ''مصلح'' اور ''ریفارمر'' ہیں۔ اس مشرب میں واقعی رواداری تھی۔ ان حسابوں سے سرسیّد تو بڑی چیز ہیں، فلورنس نائٹ انگیل تک کو پیغمبری کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ چناں چہ مولانا اور ''ریفارمر'' حالی جادۂ شوق پر چلے تو ضرور، لیکن مرحلۂ سود و زیاں میں اٹک کے رہ گئے۔ انھوں نے ساری زندگی کو نفع نقصان، جمع خرچ کی کھتونی بنا ڈالا۔ پیروِی مغربی اور پیروِی عقلِ خدا داد کے طفیل ایک دن وہ بھی آیا کہ نعت گوئی غیر مشروع اور بدعت ٹھہری اور نعت کہنے اور سننے والا مردود۔

ترکِ الفت کے عذر ہیں لاکھوں

خوئے بد را بہانۂ بسیار

بہرحال مولانا حالؔی سے ترکِ الفت ممکن نہ ہوا تو انھیں تو چاٹ پڑ چکی تھی، انھوں نے نعت کہی اور بڑے سوز و گداز کے ساتھ، لیکن جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے حالؔی نے ان فوائد کی فہرست بنائی ہے جو آنحضرت ﷺ سے انسانیت کو اور بالخصوص عرب کو پہنچے اور فوائد بھی روحانی اور اندرونی قسم کے نہیں، بلکہ ظاہری اور سماجی قسم کے یا پھر اخلاقی محاسن گنوائے ہیں۔ حالؔی کی نعت کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا کردار نہایت بلند تھا اور ان سے ہمیں بڑے فائدے پہنچے۔ بلند کردار کے لوگ اور انسانیت کو فائدہ پہنچانے والے تو بہت ہوئے ہیں مگر ان سے لاکھوں انسانوں کو ایسی والہانہ محبت کیوں نہیں ہوتی، جیسی آنحضرت ﷺ سے ہے؟ اس کا جواب ہمیں حالؔی کی نعت میں نہیں ملتا۔ بہی کھاتے میں ایسی باتیں ہوا بھی نہیں کرتیں۔ حالؔی کا کمال یہ ہے اور سرسیّد جیسے بزرگوں پر انھیں فوقیت یہ حاصل ہے کہ انھوں نے بہ کھاتا بھی لکھا تو ایسی دردمندی کے ساتھ مگر وہ سماجیات اور اخلاقیات سے آگے نہ جا سکے۔

محسؔن کے یہاں حساب، کتاب، ناپ تول اور جانچ پرکھ کا سلسلہ نہیں۔ رسول ﷺ کے بارے میں ان کا تصور وہی تھا جو آج سے سو سال پہلے (یعنی مغرب پرستی، عقل پرستی اور خود پرستی سے پہلے) سب مسلمانوں کا تھا:

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

یہ ایسی تعریف ہے جس میں نہ سرسیّد احمد خاں شریک ہو سکتے ہیں، نہ مس فلورنس نائٹ انگیل۔ ماروائے عقل بات کہنے کا فائدہ یہی ہے کہ دو چیزیں بالکل الگ ہو جاتی ہیں اور آپس میں گڈ مڈ نہیں ہو سکتیں۔ یہ تو خیر محسؔن کاکوروی بھی مان لیتے ہیں کہ رسول ﷺ یتیموں کے والی اور غلاموں کے مولیٰ تھے، لیکن ان کی نظر میں آنحضرت ﷺ کی شان دراصل یہ تھی:

بامیم احد احمدِ بلا میم
الٰہی پھیل جائے روشنائی میرے نامے کی
بڑھا معلوم ہو لفظ احد میں میم احمد کا
جس کو گلدستۂ باغ ابدیت کہیے
خندۂ صبحِ بہارِ احدیت کہیے
یعنی وہ جس کی ہوئی ذات سراپا برکات
باعثِ خلقِ زماں موجبِ ایجاد زمن
جس کی توصیف میں خود خامۂ نقاشِ ازل
لکھ چکا مطلعِ ایجاد بہ وجہِ احسن

یہ وہ عقیدہ ہے کہ جو کٹھ ملاؤں کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو شرک کے برابر ہوتا ہے۔ اسی لیے وہابی خیال کے مولویوں نے نعت گوئی کیا، درودِ تاج کے خلاف بھی فتویٰ دے دیا تھا کیوں کہ اس میں رسول ﷺ کو دافع البلاء والوبا والقحط المرض والالم کہا گیا ہے۔ آج کل کا زمانہ تو وہ ہے جب یار لوگوں نے قرآن میں سے دن کی صرف دو ٹھنڈی نمازیں نکال لی ہیں مگر سو پچاس سال پہلے عام مسلمان کا ایمان یہ تھا کہ حقیقتِ محمدی ﷺ احاطۂ بیان میں نہیں آ سکتی اور رسول ﷺ کی بنیادی صفت یہی ہے، 'خطا کار سے درگزر کرنے والا' نہیں کیوں کہ اتنا کام تو خود مولانا حالی بھی کر لیتے ہوں گے۔ چناں چہ مدحِ رسول ﷺ لکھتے ہوئے بیان و اظہار کی ناکامی کا مضمون محسن کاکوروی بار بار لاتے ہیں:

تشبیہ اچھی تری کوئی نہ پائی ہم نے
جس کی تشبیہ نہ ہو اس کی صفت کیا ممکن
فکرِ وصفِ دُرِ دنداں میں کٹا سارا دن
رات بھر تارے ہی گنتے رہے بیٹھے محسنؔ

(یہاں صیغۂ غائب کی شوخی اور طنز بجائے خود ایک نعت ہے)

ہمیں پتا یہ چلانا تھا کہ محسنؔ کا جذبہ کہاں تک صادق ہے۔ جذبہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم تول کر دیکھ سکیں۔ شعر میں اس کا اندازہ ہم الفاظ ہی سے لگاتے ہیں۔ مگر خود محسنؔ کا اعتراف اور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ان کے ممدوح کی تعریف الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ شاعر کا کام ہے اظہار، لیکن محسنؔ ایک ایسی چیز کا نقشہ کھینچنے بیٹھے ہیں جو ناقابلِ اظہار ہے۔

یہ کھینچا تانی صرف محسن کے نعتیہ کلام میں ہی نہیں، بلکہ دُنیا بھر کی مذہبی شاعری میں ملتی ہے اور خصوصاً ایسی شاعری میں جو براہِ راست خدا یا کسی اوتار یا پیغمبر سے متعلق ہو۔ اسی لیے دُنیا کی ہر زبان میں مذہبی شاعری کے ایسے نمونے کم یاب ہیں جو شاعری کے لحاظ سے بھی امتیازی نشان رکھتے ہوں۔ اس کی وجہ تو اچھے شاعروں کی مذہب سے بے نیازی ہے نہ خلوص نہ جذبے کی کمی، نہ شاعرانہ تکلفات کا استعمال، نہ موضوع کی بے رنگی (محسن کے صاحب زادے مولانا نور الحسن مؤلف ''نور اللغات'' اُردو میں اچھی نعتوں کے فقدان کی توجیہہ یوں کرتے ہیں: ''نظم اُردو کی قدر دانی اور صلے کی امیدیں جن حضرات کے دامنِ توجہ سے وابستہ تھیں ان کی نظریں رنگین الفاظ، مبالغہ آمیز استعارات کو ڈھونڈتی تھیں۔ نعت کی سادگی میں کچھ لطف نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نعتیہ کلام کی طرف میلان کی کوئی بھی وجہ نہیں تھی، اس میں وہ مضمون ہی نایاب تھے جن میں مقناطیسی کشش ہو۔'') بیشتر مذہبی شاعری کے ناکام رہنے کی ایک تاویل تو ہم یوں کر سکتے ہیں کہ شاعری کا تعلق عالمِ طبعی سے ہے اور مذہبی تجربات عالمِ طبعی سے ماورا ہیں۔ اس لیے شاعری سے ان تجربات کے اظہار کا کام لیا ہی نہیں جا سکتا۔ چناں چہ ایسی شاعری کرنے والے اکثر شاعر اپنی ناکامی کو درگفتن نمی آید کے پردے میں چھپاتے رہے ہیں، یا پھر ایک دو بڑے شاعروں نے اس بے اظہاری کو اظہار کا وسیلہ بنایا ہے جیسے ڈانٹے اور رومی نے۔ دوسری تصریح نفسیات کی مدد سے ہوتی ہے۔ ژونگ کے نزدیک Archetypes براہِ راست کبھی ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ ثانوی اور اشتقاقی مشکلوں میں۔ اسی طرح Arhetype کا براہِ راست تجربہ غیر شخصی اور غیر ذاتی چیز ہے۔ اس لیے فنی اظہار کی گرفت میں نہیں آتا۔ بڑے سے بڑے مصور نے بھی اگر ایسے تجربے کو تصویر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے تو تصویر ہمیشہ بے جان رہی ہے۔ فنی اظہار کامیاب اس وقت ہوتا ہے جب شاعر بذاتِ خود Archetype کو بیان کی قید میں لانے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس سے اپنا ایک شخصی اور ذاتی رشتہ قائم کرے اور اس رشتے کو اظہار کا موقع دے۔ یعنی جو مقام صوفیوں کے نزدیک اعلیٰ ترین ہے، وہاں پہنچ کر شاعری نہیں ہوسکتی۔ البتہ جب عارف عارضی طور سے ہی سہی روبہ تنزل ہو اس وقت البتہ شعر کہہ سکتا ہے۔ اسی لیے بعض لوگوں کے نزدیک تصوف اور شاعری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

شعر کہنا روحانی تنزل کی علامت ہو یا ترقی کی، بعض لوگوں کے لیے یہ حرکت ایسی ہی ضروری بن جاتی ہے جیسے سانس لینا اور ہر قسم کے تجربے کو جسم اور شکل عطا کرنے کی ترغیب کہیں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ایسی صورت میں شاعروں نے عموماً چار طریقے اختیار کیے ہیں:

(۱) اظہار کی ناکامی کا اعتراف کر لیا اور اس طرح یا تو واقعی ناکام ہوگئے یا پھر یہی

بے چادری عصمت بن گئی۔

(۲) حقیقی تجربے کا اظہار عقلی اصلاحات پر رسمی الفاظ میں کیا، یوں شعر تو پھس پھسا اور بے جان ہو کے رہ گیا۔ یا صرف ان لوگوں کو جان دار معلوم ہوا جن میں میلانِ قبولیت پہلے سے موجود تھا۔ یہ پُرخلوص بے خلوص کا معاملہ نہیں، بہت سی مذہبی شاعری جو کامیاب کہلاتی ہے اسی قسم کی کامیابی حاصل کرتی ہے۔ اسی لیے بیشتر مذہبی شاعری صرف ایک ہی عقیدے کے لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ اس میں نہ تو شاعری کی خامی ہے، نہ کسی خاص مذہب کی۔ مذہبی شاعری کی نفسیاتی نوعیت ہی ایسی ہے۔

(۳) روحانی حقائق کو مجازی عشق کی اصطلاح میں بیان کیا۔ مذہبی شاعری کی یہ صنف سب سے زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ خود ہمارے یہاں ایسی ہی نعتوں کو ہر دل عزیزی حاصل ہوئی ہے۔ اس نوعیت کی شاعری کو سب سے زیادہ کامیابی کرشن جی کے سلسلے میں رہی۔ کیوں کہ انھوں خدا کا جلوہ مجازی عشق کی شکل میں دکھایا تھا۔ ہندوؤں کا عقیدہ شاعری کے لیے معاون ثابت ہوا۔ ہمارے یہاں نعتوں میں مجازی عشق کے تصورات خاصی فراوانی سے استعمال ہوئے۔ خصوصاً ایسی نعتیں جو عوام میں مقبول ہوئیں۔ مثلاً ''رخسار سے برقع کو اُٹھا کیوں نہیں دیتے''، ''نبی جی صورتیا دکھانی پڑے گی''، مگر نعت گو ہمیشہ ڈرتے رہے کہ اس معاملے میں کہیں حد سے تجاوز نہ کر جائیں۔

(۴) مذہبی شاعری کو ایک الگ نوعیت کی شاعری نہ سمجھا جائے، بلکہ شاعر سادگی یا سلاست یا خیال آرائی اور مضمون آفرینی کا اسلوب جو اور جگہ برتتا ہے، یہاں بھی برتے اور فنِ شعر کو جہاں دوسرے موضوعات کے سلسلے میں بیان کرتا ہے وہاں مذہب کے سلسلے میں بھی استعمال کرے۔ اس رویے میں غالباً وہ لطائف وطہارت یا ماورائیت تو نہیں ہے جو ہم مذہبی شاعری میں دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن شاعری کی حدوں اور پابندیوں کا جرأت مندانہ اعتراف ضرور موجود ہے۔ یہ رویہ اختیار کرنے کے لیے خاصی دلیری چاہیے، بلکہ شاید طبیعت میں خالص رومانیت کے بجائے تھوڑی سی مجلسیت اور دُنیا داری بھی ہونی چاہیے۔ یہ رویہ شاعر کو ڈانٹے اور رومیؔ یا اقبالؔ تو نہیں بناتا مگر اُس کی شاعری کو پھس پھسا اور بے جان بھی نہیں بننے دیتا، مثلاً محسنؔ کاکوروی کے یہاں ہمیں جذب وسرمستی یا استغراق کی شاعری نہیں ملتی، ان کے لب ولہجہ پر مجلس آرائی غالب ہے۔ دیدارِ رسول ﷺ کا جلال یا جمال انھوں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ وہ کسی ایسے مقام کا تصور نہیں کر سکتے جہاں پہنچنے سے ان کے پر جلتے ہوں۔ رسول ﷺ کے حضور میں پہنچتے بھی ہیں تو خلوت میں نہیں، بلکہ بھرے دربار میں اور اپنی محبت وعقیدت اور سخن گوئی کی داد وصول کرنے کے لیے، مثال

کے طور پر ''سراپائے رسولِ اکرم ﷺ'' کا خاتمہ دیکھیے:

ہے یہ اُمید کہ جب گرم ہو بازارِ نشور
یوں کہے بادشہِ بارگہِ عالمِ نور
لو سراپا ہمیں تم دو عوضِ حور و قصور
میں کہوں واہ مجھے یہ نہیں ہرگز منظور
مفت حاضر ہے مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں بکے یوسف کی یہ تصویر نہیں

یہی حال قصیدہ لامیہ کے آخری اشعار کا ہے:

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل
کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

ان اشعار کی نفاستِ بیاں، چستی، بے ساختگی اور عقیدت مندانہ شوخی پر تو میں بھی فدا ہوں اور اس ایمان کی پختگی، معصومیت اور بھولے پن میں بھی کلام نہیں جسے یقین ہو کہ قیامت کے ہنگامے میں بھی شافعِ محشر اپنے عاشق کا کلام سننے اور داد دینے کو تیار ہوں گے مگر جس شخص کو ''احمد بلامیم'' کے سامنے پہنچ کے سب سے پہلے اپنا کلام یاد آئے، وہ بڑا شاعر نہیں ہو سکتا، لیکن ہمارے یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ بُرا شاعر بھی نہیں ہو سکتا۔

جلال الدین احمد جعفری کہتے ہیں کہ محسن کاکوروی نے نعت گوئی کو فنِ شریف بنایا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کا عشقِ رسول ﷺ اوروں سے زیادہ صادق تھا یا انھوں نے حقیقتِ محمدی ﷺ کو اوروں سے زیادہ سمجھا تھا۔ نعت گوئی میں ان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ نہ تو انھوں نے اپنی صلاحیتوں کی حد سے آگے جانے کی کوشش کی اور نہ اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے شرمائے۔ جوئس کا مشہور قول ہے، ''میں جیسا کچھ بھی ہوں اسی کا اظہار کروں گا۔'' فنی تخلیق اسی اعتراف اور اسی تسلیم و رضا سے شروع ہوتی ہے۔ ممکن ہے محسن کاکوروی کے عقائد میں کوئی اختصاص یا امتیاز یا انفرادیت نہ ہو اور ان کا اسلوبِ بیاں خالی تصنع اور تکلف ہو، مگر شاعری اپنے آپ کو قبول کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

یہاں ایک دوسری اُلجھن یہ نکلتی ہے کہ محسن اچھے شاعر سہی، لیکن کیا یہ بات مناسب تھی

کہ وہ دربارِ رسالت میں ایسا جذبہ، ایسا لب و لہجہ اور ایسا اندازِ بیاں لے کر پہنچیں؟ اوّل تو محسنؔ کے عقیدے کی رو سے رسول ﷺ کی شان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے کسی اُمتی کو رد نہیں کرتے اور انھیں ہر قسم کی پُرخلوص عقیدت قبول ہے۔ یہ اعتماد محسنؔ کی شاعری کی جان ہے۔ یہ مصرع دیکھ لیجیے، کیسے لاڈ میں آ کے بولے ہیں:

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ

پھر جس چیز کو مغرب والے اور ان کے زیرِ اثر ہم بھی قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت کہتے ہیں، وہ عجیب شے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ فرد کی اہمیت کا حقیقی تصور انسانیت کی تاریخ میں پہلی بار اٹھارویں صدی کے یورپ میں پیدا ہوا، لیکن انیس ویں صدی کے متھیو آرنلڈ نے ''اعلیٰ سنجیدگی'' کا ڈھکوسلا شروع کیا، جس نے کم سے کم ساٹھ ستر سال سے خود ہمارے ادب کو خراب کر رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس شخص میں ''اعلیٰ سنجیدگی'' نہ ہو وہ بے چارہ کیا کرے؟ کیا ایسا شخص حقیر و رذیل ٹھہرے گا؟ اس کے برخلاف قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت (جو ہمارے یہاں اور کچھ نہیں تو غدر کے زمانے تک ضرور چلی) ہر انفرادی مزاج اور طبیعت کو قبول کر لیتی تھی۔ اس کی نوعیت کے لحاظ سے اسے عزت کا درجہ دیتی تھی اور اعلیٰ ترین موضوعات کے سلسلے میں بھی انفرادی مزاج کو اظہار کی اجازت دینے سے انکار نہ کرتی تھی۔ رومانی درد کو انفرادیت پرستی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، لیکن اس دور میں رونا انسان کی بلندی کی علامت تھی اور ہنسنا معیوب۔ جب ہمارے ادب پر مغرب کی رومانیت کا اثر پڑنا شروع ہوا یعنی مولانا حالیؔ کے زمانے میں تو ہمارے ادیب بھی ہنستے ہوئے جھینپنے لگے، مگر قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت انسانی فطرت کے ہر عنصر کو اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے استعمال کر لیتی تھی، بلکہ اصرار کرتی تھی کہ ہر انسانی صلاحیت اپنے دین و ایماں کی خدمت میں صرف کی جائے اور انسان کے لیے اس سے بلند درجہ کوئی نہ تھا کہ وہ جیسی کچھ بھی صلاحیتیں رکھتا ہو، انھیں اپنے خدا کے حضور پیش کر دے چناں چہ محسنؔ کاکوروی کو زمانہ اچھا ملا۔ ممکن ہے ان کے مزاج میں ٹھٹھول بازی اور ہنسوڑ پن کے سوا اور کچھ نہ ہو، یا انھوں نے شاعری کو محض خیال آرائی اور لفظوں کی بازی گری تک محدود کر دیا ہو، لیکن یہ چیزیں بھی انسانی فطرت کے عناصر ہیں اور اس اعتبار سے اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے استعمال ہونے کے لائق۔ ان کے معاشرے نے انھیں یہ چھوٹ دے رکھی تھی اور انھوں نے جو ہنر بھی سیکھا تھا، اس کے کمالات بے جھجک دربارِ رسالت میں پیش کر سکتے تھے۔ ایسا راسخ ایمان، ایسی طمانیت اور مولانا حالیؔ کی پیرویِ مغربی نے محسنؔ کی قسم کی نعت گوئی کو ناممکن بنا دیا۔

مطلب یہ کہ نعت گوئی کے سلسلے میں محسنؔ کاکوروی پر کسی خاص اسلوب یا خاص لب و

لہجہ کی پابندی نہ تھی۔ سوائے اس روایتی پابندی کے "باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" چناں چہ انھوں نے وہی اندازِ بیاں اختیار کیا جو اس زمانہ میں لکھنوی شاعری کا تھا اور جو انھوں نے سیکھا تھا، گو اس اندازِ بیان کو استعمال اس طرح کیا کہ بازی گری، کرشمہ کاری بن گئی اور لفاظی میں معنویت پیدا ہوگئی۔ چوں کہ حقیقت محمدی بہ نفسہ ایک ایسی چیز ہے جو الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی اور جس کے متعلق محض خیال آرائی ہوسکتی ہے، اس لیے بے دھڑک خیال آرائی اور مضمون آفرینی کر کے محسنؔ نے تصنع کو خلوص میں بدل دیا۔ خیر، اس قلبِ ماہیت کا بیان تو بعد میں ہوگا۔ پہلے محسنؔ کی غزلیہ شاعری کے نمونے دیکھ کر اندازہ لگایئے کہ انھوں نے لکھنؤ کی مروّجہ شاعری سے کیا سیکھا اور شروع سے ان کی طبیعت کا رنگ کیا تھا:

گل و بلبل کو لیے ساتھ صبا چلتی ہے
کچھ عجب رنگ کی گلشن میں ہوا چلتی ہے

آنکھ پر ٹھہری نظر مائلِ ابرو ہو کر
ہم پھرے کعبہ سے اے قبلہ تو ہندو ہو کر

کیوں نکلتے ہو ابھی کنجِ لحد سے محسنؔ
حشر کا دن ہے بہت گرم ہوا چلتی ہے

رات بھی دوڑتی آئے جو کرو وعدۂ وصل
کہیے تو چار گھڑی دن سے اندھیرا ہو جائے

کچھ تو لکھنوی شاعری میں اور پھر خود محسنؔ کے مزاج میں جو ولولہ، شوخی، جولانی اور نشاطیہ کیفیت تھی اسے نعت گوئی میں آکر انھوں نے بدلنے کی کوشش نہیں کی، اور نہ یہ چیز انھیں اپنے موضوع کی سنجیدگی کے خلاف معلوم ہوئی، بلکہ موضوع نے اس انداز میں ایک نئی معنویت پیدا کر دی کہ ذاتِ محمدی کی برکت سے دُنیا میں نشاط کے سوا کسی اور کیفیت کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ چناں چہ موضوع کے تقدس نے ان کی شوخی کو بھی سنجیدگی اور پاکیزگی عطا کر دی۔ اس شعر میں محسنؔ نے اپنی نعتیہ شاعری کی صحیح تعریف پیش کر دی ہے:

سلامِ حق کو لے کر دم بہ دم جبریل آتے ہیں
عجب مضموں کھپا اس بیت میں آورد و آمد کا

آورد کو آمد بنانے والی چیز ایک تو خود موضوع کی وسعت، پیچیدگی اور ہمہ گیری ہے۔ دوسرے محسنؔ کی جسارت جو ضدین کو نہ صرف ایک جگہ جمع کرتی ہے، بلکہ ان کی کایا پلٹ کر کے رکھ دیتی ہے، مثلاً جزالتِ الفاظ اور بازاری لب ولہجہ سے گریز قصیدے کی متانت برقرار رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے، لیکن محسنؔ کا ایمان ایسا کچھ نہیں جو رکاکت سے ڈر جائے۔ وہ رکاکت سے بھی ایک مضمون نکال لیتے ہیں، مثلاً ایک مشہور مصرع ہے، غالباً انشا کا: ''دیکھ آئینے کو کہتی تھی کہ اللہ رے میں'' محسن اسے یوں کلام میں لائے ہیں:

ناز سے خانۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
بول اُٹھا عارضِ پُرنور کہ اللہ رے میں

چوں کہ جمالِ محمدی کی صحیح تعریف صرف اس کا خالق کرسکتا ہے، اس لیے جو چیز عام انسان کے حق میں ابتذال ہوتی، وہ یہاں لطافت بن گئی۔ اس طرح موضوع محسنؔ کو شوخی پر اُکساتا ہے اور محسنؔ کی شوخی موضوع کی لطافت کو اور نمایاں کرتی ہے۔

موضوع کے تقدس اور بیان کی شوخی کے اجتماع ضدین ہی سے نعت میں ان کا امتیازی رنگ پیدا ہوا ہے۔ ان کے فرزند مولوی نورالحسن ان کی کلام کے خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''انھوں نے شاعرانہ شوخی کو گستاخانہ و خلافِ ادب سے بچا کر متانت، سنجیدگی و نفاست کے ساتھ نعت گوئی میں صرف کیا ہے۔ بیان حکایت میں شاعرانہ شوخی حدودِ تہذیب و متانت سے ایک قدم آگے بڑھتی ہے اور مبالغے کے استعارات صلاحیت کا جوہر اپنے ساتھ لیے رہتے ہیں۔ ان کی سدا بہار طبیعت حسرت و یاس کے مضامین سے الگ رہتی ہے۔ شگفتگی کی چستی ان کا خاصۂ طبیعت ہے۔'' اس بیان کے مطابق محسنؔ کی نعتیہ شاعری کے اجزائے ترکیبی تین ہوئے۔ (۱) موضوع کی متانت (۲) مضمون آفرینی اور بلند پروازی (۳) شوخی۔

محسنؔ اپنی شاعری کے اجزائے ترکیبی سے اچھی طرح واقف تھے اور انھوں نے باقاعدہ شعوری طور پر اپنے اسلوب کو نکھارا تھا، مثلاً مضمون آفرینی کے متعلق اشارے دیکھیے:

مضموں کو ہے ازدیاد کا شوق
مصرع کو ہے مستزاد کا شوق

ہے جی میں اس زمیں کو تختۂ سروِ رواں کیجے
قیامت ایک سیدھا سا ملا ہے قافیہ قد کا

مضموں نئے روپ کی دلھن ہے
اک راستی لاکھ بانک پن ہے

منشیِ دفترِ عالی کا کرم کافی ہے
مشق کرنے کو مرے لوح و قلم کافی ہے

وقت ہے برہمیِ انجمنِ گردوں کا
کہ شفق پر بھی ارادہ ہے مرا شب خوں کا

اس طرح بیان کی شوخی کا اعتراف جا بجا ملے گا۔

یوں خرامدہ بشوخی قلم رعنا ہے

مجھ کو گستاخ نہ کرتا جو ترا عشقِ کہن

ہو معاف اب نظرِ لطف سے بے ساختہ پن

اس عشقِ کہن اور نظرِ لطف کے بل پر محسنؔ شوخ بیانی کی ہمت کرتے ہیں اور انھیں پوری طرح احساس ہے کہ ان کی نعتیہ شعری کا سارا مزاج اسی شوخی اور جسارت میں پنہاں ہے اور تقابل، تضاد اور اجتماعِ ضدین کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ انھوں نے ایک شعر میں اپنی شاعری کی بالکل صحیح تعریف پیش کر دی ہے:

ہم دکھاتے ہیں طبیعت سے تماشے کتنے
عالمِ نور میں چھوڑ آئے ہیں شوشے کتنے

عالمِ نور کے بیان میں بھی اپنی طبیعت کی شوخی کو دبایا نہیں، بلکہ اُبھارا۔ ان کے معاشرے نے اس کی اجازت دی، موضوع کی رنگا رنگی نے شوخی کو کھل کھیلنے کے مواقع فراہم کیے اور ساتھ ہی کثافت میں لطافت پیدا کی۔ نعتیہ شاعری میں یہ جرأت کوئی اور شاعر نہ کر سکا تھا، اس

لیے محسؔن کا کلام عالمِ نور میں شوشے چھوڑنے کی بدولت اوروں کے کلام سے امتیاز حاصل کر گیا۔ یہ ہے محسؔن کا نعتیہ شاعری کا نقشہ۔

اس شاعر میں وہ جذب و سرمستی نہ سہی جو ''محمد شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم'' میں ہے۔ اس پر یہ اعتراض بھی وارد ہو سکتا ہے، محسؔن کاکوروی نے نعت نہیں قصیدہ کہا ہے، مگر نعت کا میدان ہی ایسا مشکل ہے کہ محسن سے بڑے شاعر عالمِ نور میں شوشے چھوڑنے کا تماشا تک نہ دکھا سکے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ جو چیز بیان کی گرفت میں نہ آسکے اس سے عہدہ برآ ہونے کا ایک طریقہ یہ ہے۔ یہ شوشے چھوڑنا اور اس طریقۂ کار کا جواز خود محسؔن کے عقیدے کے اندر موجود ہے۔ لہٰذا اب محسؔن کی شاعرانہ پھلجھڑیوں کے نمونے دیکھیے:

الٰہی کس کے غم میں نکلے آنسو چشمِ فتاں سے
کہ عطرِ فتنہ میں ڈوبا ہے رومال اس سہی قد کا
کہاں ہے آتشِ یاقوتِ لب میں وہ بھڑک باقی
کہ خطِّ سبز نے چھینٹا دیا آبِ زمرّد کا
چھپے کیوں مجھ سے تم سب ہنستے ہیں شاخیں نکلتی ہیں
ہوا میں ناتواں سن کر صدائے پائے دلبر کو
مجھے کھٹکا تھا مثلِ ہمزۂ وصل اس کی آمد کا
نکالی چیستاں چوٹی کی گیسوئے مسلسل سے
معما نام رکھا ہے ترے موئے معقّد کا
ملا ہے لب کو جس کے وصف سے گنجینۂ معنی
زباں نے رُتبہ پایا ہے کلیدِ قفلِ ابجد کا
عجب کیا ہے جو خوابِ ناز میں سوتی رہے ناگن
نہ کھولے آنکھ گر چھینٹا نہ دیں آبِ زمرد کا

ہر شعر میں آپ کو وہی مبالغہ آرائی سے لفظوں کی بازی گری ملے گی، جس کی مذمت مولانا حالؔی کر گئے ہیں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ محسؔن کاکوروی متاثر ہوئے بھی ہیں تو کس سے؟ ''مثنوی گلزارِ نسیم'' سے جو آج کل اُردو تنقید میں تصنع اور مہمل خیال آرائی کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ ''چراغِ کعبہ'' اور ''صبحِ تجلی'' کی بحر تک وہی ہے جو ''مثنوی گلزارِ نسیم'' کی ہے، مثلاً چند شعر دیکھیے جن میں یہ اثر نمایاں ہے:

بھیگی ہوئی رات آبرو سے
داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیِ گل اندام
شبنم کی ردا بہ قصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال
جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال
آنا ہی کہیں ہوا نہ جانا
اندازِ خرام صوفیانہ
سکتے میں ہیں گل یہ کیا کھلا ہے
اس رات کا رنگ روپ کیا ہے
دامانِ نگاہ بن کے پھیلی
کس دیدۂ منتظر کی پتلی
اعلیٰ کی طرف ہے سیلِ انوار
پروانہ چراغ سے خبردار
شبنم کی ہے پر لگائے گلشن
بلبل سے کہو کہ پکڑے دامن
ذرّوں کی طرح نہ دشت اڑ جائیں
دیوانوں سے کہیے ہوش میں آئیں
شمشاد نہیں کسی کے بس میں
قمری نہ پڑی رہے قفس میں

رعایتِ لفظی، مراعات النظیر، صنائع بدائع کی بھرمار — یہاں ہر چیز موجود ہے جسے معیوب سمجھنے کی تلقین پچھلے سو سال سے ہو رہی ہے مگر محسنؔ نے ایسے تصنعات کو فنِ شریف کیسے بنایا، اس رمز کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے شعری اسالیب کا رشتہ ان کے موضوع اور ان کے عقائد سے ملائیں۔ رعایت لفظی بری چیز سہی، لیکن محسنؔ کی نعتیہ مثنویوں میں یہ رعایت تین دائروں میں یا تین سطحوں میں بہ یک وقت عمل کرتی ہے۔

(۱) انفرادی طور سے شعر کے اندر رعایتِ لفظی اور مناسبات کا استعمال۔

(۲) پوری مثنوی میں ایک خاص مضمون کی رعایت اور اس کے مناسبات کا انتخاب۔
(۳) مناسبات سے اس طرح کے مضمون کا نکالنا جن سے حقیقتِ محمدی کی طرف اشارہ ہو۔

اگر یہ رعایتِ لفظی اور مضمون آفرینی صرف الگ الگ شعروں میں ہی کام کر رہی ہوتی تو بھی ہمیں کم سے کم ان کی قوتِ ایجاد کی داد دینی پڑتی، جو پارے کی طرح بے تاب رہتی ہے اور مچلتی ہوئی ایک شعر سے دوسرے شعر میں نکلتی چلی جاتی ہے، لیکن یہ مسلسل اور ان تھک مضمون آفرینی بجائے خود حقیقتِ محمدی ﷺ کی گونا گوں کیفیتوں کا ایک استعارہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ نئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ محسنؔ کے کلام کی شگفتگی اور تازگی سدا بہار جمالِ محمدی کا ایک عکس ہے۔ محسنؔ کا کمال اس بات میں ہے کہ ان کا آئینۂ شعر کبھی ماند نہیں پڑتا اور ہر لحظہ یہ بدلتے ہوئے عکس قبول کرتا رہتا ہے۔ ان کی قوتِ ایجاد صرف شعروں میں ہی ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ مناسبات کو شعر میں، شعر کو مثنوی کے نقش میں اور اس نقش کو اپنے مستقل موضوع میں پیوست اور منضبط کرتی ہے۔ تنظیم کا یہ عمل، کسی معمولی درجے کے تخیل کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے لیے تعمیری صلاحیت درکار ہے۔

چناں چہ محسنؔ کے کلام کی صحیح داد اسی وقت دی جا سکتی ہے، جب ہم ان کے اسالیبِ شعر کو ان کے عقائد کے مطابق رکھ کر دیکھیں۔ لکھنؤ کی بہت سی شاعری کی خرابی یہ ہے کہ وہاں خیال آرائی اور مناسبتِ لفظی بجائے خود مقصد بن گئی ہے۔ محسن نے انھی چیزوں کو مقصد نہیں، بلکہ ذریعہ اور وسیلہ بنایا۔ رعایتِ لفظی سے زیادہ انھوں نے رعایتِ معنوی ملحوظ رکھی۔ انھیں شوخی سے بھی کام لینا تھا اور پاسِ ادب بھی لازمی تھا۔ لہٰذا پہلی ہوشیاری تو انھوں نے یہ دکھائی کہ اپنی خیال آرائی کے لیے شوشے بھی چھوڑ لیے اور حدِ ادب سے آگے نہ نکلنے پائے۔ پھر ادب اور شوخی کی یہ مسلسل آویزش ان کے کلام میں ایک مزید لطف پیدا کر گئی — مثلاً کمر کی تعریف میں یہ شعر دیکھیے:

نہیں ثابت قدم اس نفی سے استثناء بھی
یہ وہ لا ہے کہ نہیں اِس سے بچا اِلّا بھی

یا اسی قبیل کے چند اور اشعار:

صاف و بے موے نبی کا برِ سیمیں شفاف
جیسے لفظوں سے حروفِ لک صدرک ہیں صاف
ہاں مگر سینہ سے ہے اک خط مشکیں تا ناف
جس کو کہتا ہے سخن ور کششِ مرکزِ کاف

صدر پُرنور کے شق ہونے کی تمثال ہے یہ
عقل کہتی ہے وہ آئینہ ہے اور بال ہے یہ

آیا سوئے بزم لی مع اللہ
آئینے میں جیسے پرتوِ ماہ

اسی طرح کی مزید مثالیں پیش کرنا تحصیلِ حاصل ہوگا۔ کیوں کہ محسن کے بیشتر اشعار تلمیح طلب ہیں اور بیشتر مضامین اسلامی روایات اور اسلامی علوم سے اخذ کیے گئے ہیں۔ رعایتِ معنوی پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ محسن نے یہ نکالا ہے کہ پوری مثنوی ''صبحِ تجلی'' میں ایک مرکزی استعارہ رکھا ہے کتاب اور پھر اس مناسبت سے تمام مضامین اور تشبیہات، تفسیروں اور مفسروں کے ناموں اور متعلقہ روایات سے نکالے ہیں، مثلاً

بیضاوی صبح کا بیاں ہے
تفسیر کتاب آسماں ہے
عنوان فلک ہے در منشور
لوح زریں سورۂ نور
موقوف حدیثِ شب کی تصحیح
رکھ دیجیے طاق پر مصابیح
مظہر کا خطاب میرزا ہے
منظر کا لقب ابوالعلا ہے

کتاب کے استعارے کو اس مثنوی میں تو خیر انھوں نے کمال کو پہنچا دیا ہے، لیکن ویسے بھی یہ استعارہ انھیں بہت عزیز ہے۔

تیری صورت سے کھلے معنی ماقل و دل
انبیا شرحِ مفصل ہیں تو متن مجمل
تو ہے خورشید ترے سامنے انجم ہیں نبی
تو ہے شمسیہ تصور ہیں تو سب ہیں قطبی

اسی طرح علمی اصطلاحات سے مضمون نکالنے کا انھیں خاص شوق ہے۔ مثال کے طور پر علمِ صرف کی اصطلاحات کا استعمال دیکھیے:

لکھوں اک مختصر جملہ کہ روضہ ہے محمد ﷺ کا
یہی مسند الیہ اچھا سبب ہے رفعِ مسند کا
محمول کا کس طرف ہے موضوع
مسند کو کہا ہے کس نے مرفوع
یہ کس کی خبر کا مبتدا ہے
موصول کہاں کہاں صلہ ہے
ہیں کس سے مضاف یہ عجائب
راجع ہے کدھر ضمیر غائب

ایک استعارے اور اس کی شاخوں کو اتنی دور دور تک لے جانا ہی کوئی معمولی بات نہیں، یہ کام صرف شوخی نہیں، بلکہ ذہانت اور تخیل مانگتا ہے۔ لیکن محسنؔ نے تو خصوصیت کے ساتھ ''صبحِ تجلی'' میں اپنے موضوع اور استعارے کے درمیان ایک خاص ربط پیدا کیا ہے۔ یہاں نورِ محمدی ﷺ کا بیان مقصود ہے، جس کا عرفان شاعر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ علم وعرفان بذاتِ خود نور ہے۔ پھر سارا علم وعرفان ذاتِ محمدی ﷺ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ معنویت کتاب کے مرکزی استعارے اور اس سے نکلنے والے تمام استعاروں میں پنہاں ہے۔ اس التزام اور تکلف نے نظم کو اور بھی معنی خیز بنا دیا ہے، اور اسلوب کو معنی کے ساتھ یک جان کر دیا ہے۔

اسی طرح مثنوی ''چراغِ کعبہ'' میں استعارے نظامِ شمسی اور کائنات سے لیے گئے ہیں۔ بدیہی سبب تو یہ ہے کہ اس نظم میں معراج کا بیان ہے، لیکن استعارے کا موضوع سے اصل رشتہ اور ہے۔ پوری نظم کے پیچھے یہ عقیدہ کام کر رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ باعثِ تکوینِ کائنات ہیں۔

اس قسم کی خیال آرائی اور اس قسم کے استعارے تو خیر پھر بھی ایسی چیز ہیں جنھیں مولانا حالیؔ اور ان کے پیرووں کی ''اعلیٰ سنجیدگی'' بہ جبر واکراہ قبول کر ہی لے گی، لیکن محسنؔ کی تشبیہوں اور استعاروں کا میدان صرف قرآن وحدیث یا نظامِ شمسی تک محدود نہیں ہے۔ اس کی شوخی اور جولانیِ طبع ایسے ایسے استعارے نکال کر لائی ہے جنھیں نعت تو الگ رہی کسی سنجیدہ نظم میں استعمال کرتے ہوئے دوسرے شاعر ڈرتے مگر محسنؔ بے دھڑک اور اطمینان کے ساتھ کھپا جاتے ہیں۔ استعارے انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں لیے ہیں۔ اس لیے فہرست بنانا تو مشکل ہے چند نمونے پیش کروں گا:

ساہوکار کی اصطلاحات:

پلا بے حساب آج ساقی مجھے
دکھا اپنی واصل نہ باقی مجھے
کہاں ناتوانوں کو گرمی کی تاب
انھیں بخش دے کر کے ڈیوڑھا حساب
حساب اِن کی نیکی ہی کی مد میں ہو
جو ان کی بدی ہے مری بد میں ہو

انگریزوں کے ساتھ جو نئے الفاظ اور نئی ایجادات آئی تھیں:

ہر اک دیدۂ تر ہوا تار گھر
اسی تار میں ہے ہماری خبر
ہوا بےقرارانِ حق کا گزر
چلے تار برقی پہ جیسے خبر

پلِ صراط کے بیان میں:

یہ بگڑی ہے گردوں کی جیسی گھڑی
کہ ایک ایک پل میں ہو سو سو گھڑی

ترا اسمِ گرامی زیرِ بسم اللہ عنواں میں
ازل کے ہر صحیفے میں ابد کی ہر رجسٹر میں

ہندوؤں کی رسوم:

جہنم کے گھر میں غمی ہو گئی
مرا غصہ آتش ستی ہوگئی

ایسے استعارات سے اوّل تو انھوں نے قاری کو چونکانے کا کام لیا ہے۔ دوسرے بے جوڑ چیزوں کو بے ساختہ ایسے غیر متواقع طور پر ایک جگہ لاتے ہیں کہ پہلے تو پڑھنے والا حیران و ششدرہ رہ جاتا ہے۔ موزونیت کا احساس تو بعد میں ہوتا ہے۔ ویسے تو شاعری میں یہ ایک مسلمہ طریقۂ کار ہے، لیکن محسنؔ کے یہاں اس کی بڑی ریل پیل ہے اور انھوں نے اسے ایک عجب رعنائی اور سگھڑاپے کے ساتھ برتا ہے۔ خیر، مثالیں دیکھیے:

یا دیدۂ منتظر میں نقشہ
اُڑتی ہوئی وصل کی خبر کا

خدا کے دیدار کا بیان:

پتلی میں ہے وہ جمالِ دل خواہ
جس طرح چنے پہ قل ہو اللہ

حشر کے دن کے لیے دُعا:

یوں سر پہ ہو مہرِ آتشیں خو
ٹوپی میں کسی کی جیسے جگنو

بظاہر تو یہ شاعری نہیں، بلکہ دل لگی بازی معلوم ہوتی ہے، مگر تشبیہہ سے مفہوم یہ نکلتا ہے کہ رسول ﷺ کی شفاعت ایسی کارگر ہوگی کہ قیامت ایک کھیل بن کر رہ جائے گی۔

جسارت اور بے ساختگی کی تین چار مثالیں اور دیکھتے چلیے:

لب جاں بخش کی تشبیہہ دم عیسیٰ سے
دی نہ دم دیتے رہے گرچہ مسیحا بھی مجھے
آبِ حیواں نہ کہا خضر نے گو چھینٹے دیے
اب فقط رہ گئے خورشید کے جھوٹے شوشے
کہیں یاقوت تو وہ باتیں یہاں پائیں نہیں
لعل سمجھوں اسے آنکھیں مری پتھرائیں نہیں

بارک اللہ وہ گردن ہے کہ فوارۂ نور
جس سے ڈوبی عرقِ شرم میں ہے شمعِ طور
کسی محفل کی صراحی کا یہاں کیا مذکور
بزمِ تنزیہہ کی کہیے اسے سرجوش سرور
جس کی کیفیت اگر دیدۂ باطن میں نہ آئے
خلد میں شربتِ دیدار حق اچھو ہو جائے

ہنگامِ سپیدۂ سحر گاہ
ساعات میں روز شب کی واللہ
اک مخبر صادق البیاں ہے
پیغمبرِ آخر الزماں ہے

القاب نسیمِ دامنِ دشت

مخدوم جہانیاں جہاں گشت

استعارات کا یہ استعمال محسنؔ کے یہاں محض ایک طریقۂ کار نہیں رہا، بلکہ ایک اندازِ فکر اور اندازِ احساس بن گیا ہے اور اس میں بڑا دخل ان کے عقائد کا ہے۔ ایسے استعارات کے ذریعے عام رنگ و بو کے تنوع اور زندگی کی ہماہمی کا احساس تو انشاء بھی پیدا کر لیتے ہیں اور یہ چیز محسنؔ کے یہاں بھی موجود ہے مگر محسنؔ اس لیے انشا سے آگے نکل جاتے ہیں کہ ان کے پورے نعتیہ کلام میں یہ عقیدہ جاری و ساری ہے کہ کائنات میں شکلوں کے تنوع کے پیچھے ایک وحدت پنہاں ہے اور یہ وحدت ہے ''احمد بلا میم'' کا نور۔ چناں چہ استعارات کی کثرت میں معنی کی وحدت پوشیدہ ہے۔ چوں کہ ہر چیز کی حقیقت وہی ایک ہے، اس لیے ایک چیز کا بیان دوسری چیز کی اصطلاح ہو سکتی ہے اور ہر جگہ سے بے جھجک استعارات لیے جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہر چیز دقیع ہے۔ اگر ہر چیز کے پیچھے حقیقتِ محمدی ﷺ ہے تو ہر چیز جان دار ہے، باحرکت ہے اور اپنی اصل کی طرف راجع ہے۔ اس عقیدے کی قوت سے محسنؔ نے کائنات کی ہر چیز کو سمیٹ کر رسول ﷺ کے قدموں میں لا ڈالا ہے۔

دوسرے نبیوں نے اچھے اچھے لقب پائے ہیں، لیکن ہمارے نبی کا سیدھا سادا لقب ہے ''رحمت اللعالمین''۔ اس جمع کے صیغے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ہستی متضاد حقیقتوں کو امتزاج و انضباط دینے والی ہے۔ محسنؔ کا ایک نعتیہ شعر ہے:

عاشقوں سے ہے موافق بخدا دور فلک

اب تو اضداد کو ہے شوق بہم پیوستن

یہ شوق بہم پیوستن، ان کی ساری خیال آرائی اور مضمون آفرینی اور ان کے سارے استعارات کی تہ میں کارفرما ہے۔ مفہوم اور مطلب تو الگ رہا، ان کے اسالیبِ شعر کی بنیاد بھی اسی ''بہم پیوستن'' یا اجتماعِ ضدین پر ہے۔

چناں چہ یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہاں تصنعات اور تکلفات کے سوا کچھ نہیں۔ سلاست اور سادگی پر بھی انھیں ایسی ہی قدرت حاصل تھی۔ ان کی نظم ''پیاری باتیں'' کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

چھینٹے دے دے کے رُلاتا ہے مجھے

غیر بن بن کے بناتا ہے مجھے

زردی چھائی ہوئی رخساروں پر

سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر

مردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو
اپنی جاتی ہوئی دُنیا دیکھو
بند آنکھیں کیے روتے دیکھا
بند آنکھیں کیے سوتے دیکھا
بیٹھے بٹھلائے یہ سودا تجھ کو
کیا ہوا میرے کنہیا تجھ کو
جال پھیلائے ہیں منتر والے
بال کھولے ہوئے گھونگھر والے
جان لیتے ہیں نکھرنے والے
تم سلامت رہو مرنے والے

محسنؔ نے اپنے شاعرانہ کمالات کے بارے میں کہا ہے، بڑے استاد نے مجھ کو سکھایا ہے پھری گدکا۔ اگر انھوں نے نعت کا میدان اختیار نہ کیا ہوتا اور ان کے عقائد ایسے نہ ہوتے تو شاید ان کی شاعری پھری گدکا بن کر رہ جاتی، لیکن موجودہ صورت میں ان کا کلام ''بہم پیوستن'' کی صنعت کا ایک شاہکار ہے۔ کیوں کہ اس میں طرح طرح کے اضداد گھل مل کر یک جان ہوگئے ہیں۔ شوخی اور ادب، تکلف اور سادگی، خیال آرائی اور سہل ممتنع، علمیت کی خشکی اور بیان کی رعنائی، متانت اور ٹھٹھول، عالمانہ الفاظ اور روزمرہ کے الفاظ، عالمِ طبعی کا حسن اور عالمِ روحانی کی طہارت، بلند و پست، ناممکن البیان کا بیان، محسنؔ کی شاعری ضدین کا امتزاج پیدا کرتی ہوئی نظر آئے گی، معنی اور اسلوب دونوں اعتبار سے محسنؔ کی بنیادی صفت ہی یہ ہے کہ وہ دو متضاد چیزوں کو ایک جگہ لا کر کشاکش پیدا کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان دونوں کو ایک دوسرے میں ضم کرکے یہ کشاکش رفع کرتے ہیں۔ یہ عمل ان کے ہاں مسلسل چلتا رہتا ہے۔

یہ وہ صفت ہے جس کے بل پر اس سے بڑے درجے کی شاعری بھی ہوسکتی ہے، مگر محسنؔ ان لوگوں میں نہ تھے جو اپنی جان گھلا کر نئے حقائق دریافت کرتے ہیں۔ یا اپنے ایمان کو شک کی بھٹی میں تپا کے نکھارتے ہیں۔ انھیں جو تصورات اپنے ماحول سے ملے، وہ انھوں نے قبول کیے اور اسی پر قناعت کی۔ بہرحال یہ اطمینان محسنؔ کاکوروی سے ایسی شاعری کرا لے گیا جس نے کم ازکم اس زمانے میں ہزاروں کا دل موہ لیا۔

اب آخر میں اس سوال کی طرف آیئے کہ محسنؔ کے پورے نعتیہ کلام میں صرف ''سمتِ کاشی

سے چلا جانبِ متھرا بادل'' ہی کو اتنی زبردست مقبولیت کیوں حاصل ہوئی ہے— جو نظمیں ضرب الامثال کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں، ان کی ہر دل عزیزی کا سبب محض ادبی نہیں ہوا کرتا۔ ایسی نظمیں عموماً صرف افراد کی نہیں، بلکہ پورے اجتماعی گروہ کی کوئی نہ کوئی لاشعوری ضرورت پوری کرتی ہیں یا کسی پوشیدہ جذباتی اُلجھن کا تھوڑا بہت حل سمجھاتی ہیں۔

برصغیر ہند کے مسلمانوں کا ایک بہت ٹیڑھا جذباتی مسئلہ رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان نہ تو ایک دوسرے کو جذب کر سکے نہ ختم کر سکے۔ اس لیے دونوں کے درمیان منافرت کا ایک رشتہ قائم ہوگیا۔ اس لیے مسلمانوں نے کبھی تو ہندوؤں کو بت پرست کہہ کرانھیں رد کیا اور کبھی ان کے عقائد کو قبول کیے بغیر ان کی تہذیب کے بعض عناصر سے محبت کرنی چاہی۔ چناں چہ بعض صوفیا نے رام چندر جی اور کرشن چندر جی کو پیغمبروں کا درجہ دیا۔ یا حسرت موہانی نے نعتوں کے ساتھ ساتھ کرشن جی کی مدح میں غزلیں کہیں۔ پھر دوسری چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کا خدا تو عالمِ طبعی سے بلندتر ہے اور ہندوؤں کا خدا اسی عالمِ خاکی میں رہتا ہے۔ چناں چہ ہندو جس آسانی کے ساتھ عالمِ طبعی سے محبت کر سکتے ہیں، اس آسانی کے ساتھ عالمِ طبعی سے محبت کر سکتے ہیں۔ اس آسانی کے ساتھ مسلمان نہیں کر سکتے۔ برصغیر ہند سے باہر بھی عام مسلمانوں کے لیے یہ بات ہمیشہ ایک مسئلہ بنی رہی ہے کہ مادی اور طبعی حقیقت کے بارے میں کیا رویہ اختیار کریں۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی روایات کا اس سرزمین سے کوئی واسطہ نہ تھا جہاں ہندی مسلمان رہتے تھے۔ اسلام ایک عالم گیر مذہب سہی، لیکن انسانی فطرت مذہب کے معاملے میں بھی مادی مناسبات ڈھونڈتی ہے۔ جن ملکوں میں پوری کی پوری آبادی مسلمان ہوگئی وہاں اسلامی تصورات کا مقامی مناسبات پیدا کر لینا کچھ ایسا مشکل نہ تھا جیسے ایران میں ہوا، مگر یہاں ہر مقامی عنصر کے پیچھے ایک مذہبی عقیدہ تھا جو مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ جب سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ہندوستان سے اُٹھا یہ کش مکش اور بھی زور پکڑ گئی اور مسلمان مقامی عناصر سے دور ہٹنے یا ان کے قریب آنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس قسم کے اشعار جیسے:

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآن اُترتا بزبانِ دہلی

اسی جذباتی اُلجھن کی پیداوار ہیں:

''سمتِ کاشی سے جانبِ متھرا بادل'' والے قصیدے میں اجتماعِ ضدین کی وہ تمام قسمیں موجود ہیں جو محسنؔ کی شاعری کی بنیاد ہیں، بلکہ یہاں محسنؔ کا فن اپنے عروج پر ہے مگر ان کے علاوہ اس میں ایک اور طرح کا امتزاج ہے جس کی جھلکیاں تو پہلے بھی دکھائی دیتی ہیں مگر جو اس شان کے ساتھ کسی اور نعت میں نمودار نہ ہوا تھا۔ عالمِ طبعی کو جس کیف کے ساتھ محسنؔ نے یہاں قبول کیا ہے، اس کا تو نشان بھی ان کی کسی اور نظم میں نہیں ملتا۔ فطرت اور انسان اس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں کہ انسانی عوامل کا بیان فطرت کی اصطلاح میں ہوا ہے۔ اور فطرت کا بیان انسانی زندگی کی اصطلاح میں۔

خبر اُڑتی ہوئی آتی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
دھر کا ترسا بچہ ہے برق لیے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے لیے آگ میں جل
ابرِ پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم
برق بنگالہ ہے ظلمت میں گورنر جنرل
جو گیا بھیس کیے چرخ لگائے ہے بھبوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل
خوب چھایا ہے سرگوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنہیّا کے ہے ڈوبا بادل
دل بے تاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی
چشمِ پُر آب کا ہے ایک کرشمہ بادل
راجا اندر ہے پری خانۂ مے کا پانی
نغمۂ نے ہے سری کرشن کنہیّا بادل

محسنؔ نے عناصرِ فطرت میں ایسی زندگی کی لہر دوڑائی ہے، روح فطرت کی تازگی اس طرح نچوڑی ہے، انسان اور فطرت میں وہ انضباط پیدا کیا ہے کہ صرف ہند اسلامی تہذیب میں نہیں، بلکہ پوری اسلامی تہذیب میں اس نظم کا ایک خاص مقام ہے اور مسلمانوں کے یہاں فطرت کا جو تصور رہا ہے، اس کے متعلق کچھ کہنا ہو تو اس نظم پر غور کیے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ کے مستشرقین نے اُردو سے بے اعتنائی برت کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

فطرت کے علاوہ دوسری چیز جسے محسنؔ نے جذب کرنے اور اسلامی تصورات کے ساتھ انضباط دینے کی کوشش کی ہے، مقامی عناصر ہیں جن کا تعلق سری کرشن سے ہے— چوں کہ سری کرشن اوتار بھی ہیں اور جسمانی محرکات سے ان کا خاص رشتہ ہے۔ اس لیے فطرت کے حسن اور مقامی عناصر کی لطافت سے محسنؔ ہوس و عشق اور جسم و روح کی دوئی مٹانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔ یہاں بھی وہی امتزاج کا عمل کام کر رہا ہے۔

گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے ایک طویل امل
کالے کوسوں نظر آتی ہے گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا نہ ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

ان اشعار میں عربی و فارسی اور ہندی الفاظ کا سنگم بھی معنویت سے خالی نہیں اور اضداد کے اسی امتزاج پر دلالت کرتا ہے۔ الفاظ کے ذریعے محسنؔ نے ہندو عرب کو گلے ملا دیا ہے۔

اس قصیدے میں سب سے گہرا اجتماعِ ضدین کفر و اسلام کا ہے۔ امیر مینائی اور خود محسنؔ نے تشبیب کا جواز پیش کرتے ہوئے یہ شعری حیلہ تو ضرور نکالا ہے کہ قصیدے میں نورِ اسلام کو ظلمتِ کفر پر غالب آتے دکھایا گیا ہے۔ یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔ محسنؔ کے عقیدے کے مطابق اسلام کفر سے بلند تر درجہ رکھتا ہے اور انھوں نے اپنے پورے کلام میں اجزائے شعر کا استعمال اس اصول کے مطابق کیا ہے:

روئے معنی ہے بہکنے میں بھی اعلیٰ کی طرف
تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل

لیکن اس غلبۂ اسلام کا تعلق فکری عنصر سے زیادہ ہے۔ قصیدے کی جذباتی کیفیت کچھ اور کہتی ہے۔ ہر قصیدہ نگار کی طرح محسؔن نے بھی تشبیب پر مدح کی نسبت زیادہ زور دیا ہے اور تشبیب کی ملاحتِ بیان آگے چل کر کم ہوگئی ہے۔ سری کرشن کی مناسبات جس چٹخارے کے ساتھ نظم ہوئی ہیں۔ اوہ بھی کہتے ہیں کہ کفر کوئی ایسی چیز نہیں جس سے گھبرایا جائے، خصوصاً قصیدے کا خاتمہ:

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

صاف اعلان کرتا ہے کہ اسلام نے کفر کو قبول کر لیا۔ اس قصیدے کی سب سے بڑی جذباتی معنویت یہی ہے۔

—اسلام کو چھوڑے بغیر کفر و اسلام کا امتزاج

اور یہی اس قصیدے کی مقبولیت کا راز ہے۔

یہ قصیدہ پڑھتے ہوئے محسؔن کی پوری شاعری کے بارے میں ایک سوال میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جس کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ نعت گوئی میں محسؔن نے جس شوخی سے کام لیا ہے، اس میں کرشن بھگتی کی روایت کو دخل ہے یا نہیں؟ مجھے محسؔن کی شاعری کی کم زوریوں کا احساس ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ جذب و سرور کی شاعری نہیں بلکہ مجلس آرائی اور طباعی کی شاعری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محسؔن نشاطیہ رنگ میں ایسے ڈوبے کہ قیامت کے بیان اور دیدارِ خداوندی کے بیان میں سخت ناکام رہے، لیکن محسؔن کا کلام محض کامیاب یا اچھا نہیں۔ یہ ایک تہذیبی مظہر ہے۔ اس سے ہمیں اپنی قوم کی اندرونی نشوونما اور اس کی سمت کا پتا چلتا ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب کی تاریخ میں ان کا کم سے کم ایک قصیدہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے یہ مضمون اس اُمید میں نہیں لکھا کہ محسؔن کی شاعری کو حیاتِ نو مل جائے گی اور لوگ تو الگ رہے ہمارے شاعروں میں سے بھی مختار صدیقی کے سوا کسی نے محسن کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ شاعری ایک خاص معاشرے اور ایک خاص ذہنیت کی پیداوار تھی۔ رات گئی بات گئی۔ اب دوسرے ذہن ہیں اور ان کی دوسری ضرورتیں ہیں۔ محسؔن کا کلام وہیں پہنچ گیا، جہاں ہر کتاب آخر میں پہنچتی ہے۔ کتب خانے میں؟ ممکن ہے موہنجوداڑو کی طرح کسی دن یہ بھی برآمد ہو جائے۔ بہرحال دو شخص تو اسے پڑھتے ہی رہیں گے، ایک حضرت جبریلؑ، ایک میں۔

۞

مجید امجد

صنفِ نعت

شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے ایک فکری کاوش ہے۔ ایک تجسّس کا دائرہ ہے جس کا مرکز شاعر کے جذبے کا صدق ہے۔ اس دائرے کا محیط حرف و بیاں کی امکانی وسعت ہے۔ جذبہ ہی اس محیط کی وسعت کو متعین کرتا ہے اور یوں یہ عمل ایک دریافت کا عمل ہے۔ دریافت اس مرکز کی، اس حقیقت کو جو دلِ انساں میں مضمر ہے اور چوں کہ اس حقیقت کے رشتے، ماضی، حال و مستقبل کے لاکھوں اثرات، نادیدہ و پُراسرار اثرات سے پیدا ہوتے ہیں، اس لیے فنی حقیقت ایک نئی دُنیا ہے جو ذہنِ انسانی سے اُبھر کر زبان و بیاں کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن اس کا علاحدہ وجود اور اپنی علاحدہ زندگی ہے۔ یہی سچائی خود بیان کو واضح کرتی ہے اور خود بیان کا مقصد بھی ہے۔ یہ سچائی اگر اساسِ اظہار نہ ہو تو الفاظ و حروف کی ساری عمارتیں گرتی دیواریں ہیں۔

شعر کی ایک صنف نعت ہے۔ نعت سب سے پہلے خالقِ اکبر نے کہی۔ قرآنِ کریم، نبیِ کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف واقعات اور حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس اور اسوۂ حسنہ کے متعلق بیانِ خداوندی کا ایک ضابطہ ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس ساری کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی نبیِ اکرم ﷺ کا ظہورِ پُرنور ہے۔ اس دُنیا میں اگر کوئی چیز زندہ ہے، باقی ہے، اگر کوئی چیز اصلِ حیات اور غایتِ مقصود ہے تو وہ حضور ﷺ کی تعلیمات ہیں۔ یوں کائنات تمام کی تمام حضور ﷺ کے مقامِ بلند اور رُتبۂ عالی کی شاہد ہے۔ جو کچھ ہے، انھیں کے لیے ہے، انھیں کے اس نصب العین کے لیے جو وہ دُنیا کے لیے لائے۔ یہ نصب العین نہ ہوتا تو دُنیا نہ ہوتی۔ یہ سب کچھ حضور ﷺ کی آمد کی تقریب میں پیدا کیا گیا۔ حضور ﷺ ہی کی تشریف آوری کے اعزاز میں کون و مکاں کے نگار خانے کو آراستہ کیا گیا۔ گویا زمین و آسماں، صانعِ ازلی کی جانب سے حضور ﷺ کی مداحی کا ایک اسلوب ہیں۔ تمام عالمِ موجودات، تمام امصاد و دہور، حضور ﷺ ہی کی ثنا کا ایک پیرایہ ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو صنفِ نعت ایک نہایت ادق اور نہایت دقیع صنف ہے۔

شعر اور اس کے اوزان میں جکڑے ہوئے الفاظ کا سلسلہ اپنی تمام اثر اندازیوں کے باوجود، توصیفِ رسول ﷺ کے اظہار کے مقام پر آ کر عاجز ہو جاتا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ جب تک حقیقتِ رسالت کی عظمت کا ادراک کامل نہ ہو، لکھنے والے کا بھٹک جانا ایک یقینی امر ہے اور سب سے بڑھ کر ضروری شرط یہ ہے کہ نعت نویس عشقِ رسول ﷺ کے جذباتِ صادق سے بہرہ مند ہو اور یہ جذبہ اس کے اعمال و تصورات پر حاوی ہو۔ یہ عشقِ رسول کا جذبہ روحِ نعت ہے اور مقامِ مصطفوی (ﷺ) کا سچا ادراک رُجحانِ نعت ہے۔ دونوں صفات ایک ہی جلوے کا پرتو ہیں اور یہ صفات جب آئینۂ شعر میں منعکس ہوں گی تو نعت اس رُتبے کو پہنچ سکے گی جو اس کا مقصود ہے، لیکن عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ مروّجہ نعتیں اس معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ یہاں یہ بات مناسب معلوم نہیں ہوتی کہ بعض جلیل القدر شعرا کا نام لے کر ان کی ان نعتوں کا ذکر کیا جائے جن کے بیان کی معنویت اس نازک اور مشکل مقام پر آ کر مطالبِ مقصودہ کی سطح تک نہیں پہنچ سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنابِ رسالت مآب ﷺ کی تعریف میں ذرا سی لغزش، نعت گو کو حدودِ کفر میں داخل کر سکتی ہے۔ ذرا سی کوتاہی مدح کو قدح میں بدل سکتی ہے۔ ذرا سا غلو ضلالت کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ ذرا سا عجزِ بیاں اہانت کا باعث بن سکتا ہے۔ فنِ شعر کے لحاظ سے اس کام کے لیے کمالِ سخن وری اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے اس کے لیے کمالِ آگہی درکار ہے اور پھر ان دونوں چیزوں کو جلا جس چیز سے ملتی ہے وہ عشق کا سرمدی جذبہ ہے جو لفظوں کو تجلیات سے بھر دیتا ہے اور ان میں معانی اور وسعتیں سمو دیتا ہے۔ یوں نعت ایک مقدس آزمائش ہے۔ بیانِ عقیدت کی رو سے جوہرِ ایماں کی آزمائش اور غایتِ غایات کی جستجو کے ضمن میں قوتِ ادراک کا امتحان۔ سچے نعت لکھنے والوں کا مرتبہ، انسانی اکتسابات کی معراج ہے۔ اس کا ہر سانس دیدارِ حبیب کی منزل ہے۔ وہ فرشتوں کا ہم زبان ہے، وہ تمام ارواحِ مبارکہ کا ہم نوا ہے۔ اس کی زبان پر اس (ﷺ) کی مدح ہے جس کی مدح خود ذاتِ باری نے کی ہے۔ اس کی فکرِ لامحدود کی حدیں متعین بھی ہیں۔ وہ قدم قدم پر نصِ قرآنی کا پابند ہے۔ اس کا ہر لفظ زنجیری احتیاط بھی ہے۔ اس کا ہر حرف سرشارِ احترام بھی ہے۔ احتیاط کی قدغن یہ کی گئی کہ بات قرآنِ حکیم کے ارشاد کے مطابق ہو اور احترام کا تقاضا یہ ہے کہ مدح مرتبۂ رسالت کی حقیقی سطح پر فائز ہو۔ جب تک زمان و مکاں کے رموز جس طرح کہ وہ کلام الٰہی میں منکشف ہیں، اس کی نگاہ میں نہ ہوں، اس کا بیان اور اظہار ناتمام و نارسا ہے۔ نعت ان ذی فضیلت لوگوں کا منصب ہے جن کی عمرِ عزیز، معانیٔ قرآن کو پرکھنے اور اسوۂ رسول ﷺ کو اپنانے میں صرف ہوئی ہو اور جو اس روحانی سفر کے دوران پیش آنے والے مقامات کو شعری اظہار کی منزلوں تک پہنچا سکیں۔

۞

عارف عبدالمتین

جدید اُردو نعت

جدید اُردو نعت کے خد و خال کے تعین کا فریضہ اس وقت تک بطریقِ احسن سرانجام نہیں دیا جا سکتا، جب تک ہم قدیم نعت کے نین نقش سے اجمالاً ہی سہی، آ گہی حاصل نہیں کر لیتے اور نعت کی روایت سے مختصراً روشناس نہیں ہو جاتے۔ جیسا کہ تاریخ کے حوالے سے ہمیں پتا چلتا ہے، عربی میں نعت کا آغاز حضرت ابو طالب سے ہوا، پھر مدینے کی لڑکیوں نے آنحضور ﷺ کی شان میں جو استقبالیہ اشعار پڑھے اور حضرت حمزہؓ، حصرت خدیجہ الکبریٰؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ سے جو نعتیہ اشعار منسوب ہیں، ان سب کو نعت کی شروعات قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ انھیں بطورِ فن تخلیق نہیں کیا گیا تھا، بلکہ وہ آنحضور ﷺ سے محبت، عقیدت اور ارادت کے بے محابا و بے ساختہ اظہار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ حسان بن ثابتؓ، کعب بن زبیرؓ اور بوصیریؒ کے ہاں نعت گوئی ایک باقاعدہ فن کا اعزاز حاصل کر لیتی ہے، اور ہم حسان بن ثابتؓ کی زبان سے ایسا نعتیہ شعر بھی سننے کا شرف حاصل پاتے ہیں، جس کے بارے میں بعض فن شناسوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آج تک کسی زبان میں نعت کا کوئی شعر اس پر تفوق حاصل نہیں کر سکا۔

خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

اس شعر کا ترجمہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

حسان بن ثابتؓ کہتے ہیں، ''(اے محمد ﷺ!) تو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے۔ گویا تو ہو بہ ہو ایسا پیدا کیا گیا ہے جیسا تو خود چاہتا تھا!'' پھر کعب بن زبیرؓ ایسا کیف آور قصیدہ تخلیق کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں جو ''بانت سعاد'' کے نام سے شہرتِ آفاق کا حق دار ہوا اور جسے سماعت فرما کر آنحضور ﷺ نے فرطِ انبساط کے جلو میں انھیں اپنی ردائے منزہ سے نوازا۔ اسی

طرح بوصیریؒ ایک ایسا دلآویز نعتیہ قصیدہ سپردِقلم کرتے ہیں، جواس روایت کے حوالے سے دُنیائے ادب میں ''قصیدہ بردہ'' کے نام سے موسوم ہوا کہ بوصیریؒ نے عالمِ خواب میں آنحضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کیا اورانھوں نے ان پر اپنی ردائے ہمایوں ڈال کر اپنی اس خوشنودی وقبولیت کا اظہار فرمایا جس کے فیضان سے بوصیریؒ نے اپنی جانکاہ علالت سے رہائی پائی۔

اُردو نعت اپنے آغاز اور فروغ و ارتقا کے لیے عربی بالخصوص فارسی نعت کی مرہونِ منت ہے اوراس سلسلے میں مذکورہ نابغوں کے اثرات بڑے گمبھیراور دوررس ہیں اور شیخ سعدی کا یہ نعتیہ شعر:

حسنِ یوسف ، دمِ عیسیٰ ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند ، تو تنہا داری

اہلِ ذوق کی کتنی بڑی تعداد سے بےمحابا ستائش کا حق دار بن چکا ہے، اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے، اوراُن کے یہ لطیف نعتیہ پیکر:

بلغ العُلٰی بکمالہ
کشف الدجٰی بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ وآلہ

ہر چند کہ عربی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں، تاہم فارسی اور اُردو کی حدودِ اقتدار میں اپنی مقبولیت کی لامحدودیت میں اپنا مثیل نہیں رکھتے۔اسی طرح حضرت امیر خسرو کے یہ نعتیہ اشعار:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہرِ سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم
خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو!
محمد ﷺ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

تو ہمیں اپنی کیف آوری کے تسلسل کا ادراک آج بھی ان پاکیزہ محفلوں سے بخوبی کرواتے ہیں، جو نعت، درود اور سلام کے لیے خصوصی طور منعقد کی جاتی ہیں۔ پھر مولانا جامی کی وہ نعتیہ غزل، جو یوں طلوع ہوتی ہے:

لی حبیب ، عربی، مدنی ، قریشی
کہ بود درد و غمش مایہ ، شادی و خوشی

اپنی پذیرائی کے اعتبار سے لائقِ ہزار رشک مقام پر ایستادہ ہے اور حضرت قدسی کی وہ آفاق گیر

شہرت رکھنے والی نعتیہ غزل، جس کا دل پذیر مطلع یوں ہے:

مرحبا سیّدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

تو جتنے صاحبانِ فکر و نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں، اُن کا شمار واقعتاً محال ہے اور یہ سعادت تو غالباً صرف اسی نعت کے حصّے میں آئی ہے کہ اُردو اور فارسی کے سیکڑوں شاعروں نے اس کے اشعار کی تضمین کی اور یوں اس کی مقبولیت کی بیکرانی پر عملاً مہرِ تصدیق ثبت کی۔

یوں تو اُردو کے بیشتر کلاسیکی شعرا نے نعت گوئی کی سعادت حاصل کی مگر اس ضمن میں جنھیں قبول و نفوذ نصیب ہوا، ان میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی کے اسمائے گرامی نسبتاً زیادہ اہم ہیں۔ محسن کاکوروی کے ''قصیدۂ لامیہ'' کو تو ہم اس اعتبار سے اُردو کے بہترین قصائد میں سے ایک قرار دے سکتے ہیں کہ اس نے اپنی جدت طرازی سے اُردو نعت کو ایک ایسے نئے موڑ سے آشنا کر دیا، جو زبان اور ماحول کے اعتبار سے علاقائی حوالہ رکھتا ہے اور اُردو نعت کو عقیدت کے جلو میں جذبے کی سطح پر استوار کر کے اُسے محبت کے والہانہ پن کا مظہر بناتا ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

سمتِ کاشی چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل

واضح رہے کہ اس جمالیاتی اسلوب کے اوّلیں سرچشمے کا سراغ کعب زبیرؓ کے اسی نعتیہ قصیدے میں ملتا ہے، جس کا تذکرہ آغازِ گفتگو میں کیا گیا ہے اور جس کی تشبیب میں کعب بن زبیرؓ نے اپنی محبوبہ سعاد کی زیبائیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور آنحضور ﷺ نے جس پر اپنے عدم تعرض سے نعت میں ایسے اسلوبِ رعنا کو بروئے کار لانے کا جواز ارزانی فرمایا ہے، مگر یہاں اس امر کی طرف تاکیدی اشارہ کرنا بے حد ناگزیر ہے کہ آنحضور ﷺ کا یہ فراخ دلانہ، عالی ظرفانہ اور جمال دوست طرزِ عمل ہمارے لیے ایسے طریقِ کار کی اجازت مرحمت نہیں کرتا کہ ہم نعت کہتے ہوئے حدودِ آداب سے تجاوز کر جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ نعت کی تخلیق کو بالکل جدا انداز میں تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہ محبت اور احترام کے دل آویز سنگم پر ظہور میں آتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سنگم کی تشکیل غیر معمولی دل و دماغ کے غیر معمولی اشتراکِ عمل کا ایسا

تقاضا کرتی ہے، جس کی تکمیل جوئے شیر لانے سے کسی طور کم نہیں۔

محسن کاکوروی کے بعد مولانا حالی، علامہ اقبال، اور مولانا ظفر علی خان کا نعتیہ کلام دراصل اُردو نعت میں جدیدیت کا در وا کرتا ہے۔ اگر قدیم نعتیہ شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس نے نعت کے لغوی معنی و مفہوم کو جو مدح، ثنا، تعریف اور توصیف پر اپنی تمام تر فکری و جذباتی جامعیت کے ساتھ محیط تھا، بحیثیتِ مجموعی یوں قصیدہ آشنا کر دیا کہ نعت آنحضور ﷺ کے بے مثال سراپے، اُن کے حلیۂ اقدس اور اُن کے تحیر خیز معجزات کے عقیدت آگیں بیان سے وابستہ ہوگئی اور آنحضور ﷺ کی عظیم ترین شخصیت کے وہ پہلو، اس میں اپنا بھرپور اظہار نہ پا سکے، جو نعت کے لوازم کی حیثیت رکھتے تھے اور جن کے حوالے سے آنحضور ﷺ کی ہمہ گیر ہستی ایک طرف عرفانِ خداوندی کا موجب بنتی ہے، دوسری طرف معرفتِ کائنات کا سبب ٹھہرتی ہے اور تیسری طرف شعورِ ذات کا وسیلہ قرار پاتی ہے۔ گویا ہماری کلاسیکی نعت نے آنحضور ﷺ کی سیرت کے مقابلے میں صورت پر اپنی توجہ نسبتاً زیادہ مرکوز رکھی۔ اس صورتِ حال کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نعت ارادت اور احترام کا دل آویز مظہر بن کر تو اُبھری اور اس میں شبہ نہیں کہ اس حوالے سے اس نے ہمیں:

یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر
من وجهک المنیر لقد نور القمر
لایمکن اثناء کما کان حقه
بعد از خدا بزرگ توئی قصه مختصر
(شاہ عبدالعزیز دہلوی)

جیسے نادر قطعے اور:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمد ﷺ است
(اسد اللہ خاں غالب)

جیسے بے مثال شعر ارزانی کیے، مگر اس رویے نے اس دو گونہ حقیقت کو جماد بھی دیا کہ نعت اگر ایک طرف جذباتی آمیختگی (Emotional Envolvement) کی متوقع سطح کے حصول میں ایک مخصوص قسم کی صنف کی آئینہ دار بن گئی اور یوں تخلیقی فن کے حوالے سے اس کا مقام متاثر ہوا تو دوسری طرف وہ آنحضور ﷺ کی شخصیت کی اُن معنوی عظمتوں کا احاطہ کرنے میں مستعد نہ ہو سکی جو

انفس اور آفاق کے اعتبار سے لامحدود اہمیت اور نہایت قدر و منزلت رکھتی ہیں، کیوں کہ یہی وہ عناصر ہیں جو آنحضور ﷺ کی شخصیت کو ایسی لاعصریت (Timelessness) عطا کرتے ہیں جو ہر عہد میں اس کے مخصوص تقاضوں کی تعین و تفہیم کر کے، اپنے آپ کو یوں Assert کرتی ہے کہ اس میں عصریت (Temporalily) آجاتی ہے جسے روحِ عصر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جدید نعت نے روایتی نعت کو اس کی مذکورہ تحدید سے آزاد کر کے ایک مجتہدانہ اقدام کیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جدید نعت، جہاں آنحضور ﷺ سے جذباتی اور احساساتی تحرک کا فیضان حاصل کر کے اپنی فنی سطح کو ارفع تر بناتی ہے اور اس کی تخلیقی گرفت کو مضبوط تر بناتی ہے، وہاں آنحضور ﷺ کی سیرت کے پیکرِ زرّیں سے اکتسابِ نور کرتی ہے اور ان کے کردار کے گوناگوں اوصافِ حمیدہ سے، اور عمرانی حوالے سے اُن کے افعال و اعمال کی نوعیت و وقعت کا ادراک کر کے آشوبِ ذات اور آشوبِ کائنات پر قابو پانے اور اُن کا مؤثر سدِباب کرنے کے طریقے نہ صرف خود سوچتی ہے، بلکہ دوسروں کو بھی سمجھاتی ہے اور یوں وہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر فروغ و ارتقا کی راہیں کھول کر شخصی، قومی، ملی اور بالآخر انسانی نشوونما و ارتقا کے امکانات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے میں گراں قدر معاونت کرتی ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ جدید نعت آنحضور ﷺ کے حوالے سے بے خوف حمایت، شر کے خلاف بے مفاہمت جہاد کے دوران میں صبر و استقامت کا اٹوٹ مظاہرہ، رنگ اور نسل کے بتوں پر حوصلہ مندانہ تیر زنی، غلامی، استعمار اور استبداد کے ہر خفی و جلی روپ سے نبرد آزمائی کی غم گسارانہ عکاسی پر بھی قادر ہوئی اور کیوں کہ اس نے ہماری قومی شناخت کا بے نظیر فریضہ سرانجام دے کر ہمیں نہ صرف بیرونی سامراج سے طویل خوں چکاں آویزش کی بہ دولت ایک آزاد مملکت کے حصول کے قابل بنایا، بلکہ کرۂ ارض کی تمام محکوم و مجبور اقوام کو رستگاری اور خودمختاری کی راہ دکھانے میں بھی بالواسطہ طور پر گراں قدر کردار انجام دیا ہے۔

جدید نعت کے اوّلین ظہور کے ایک نمونے کے طور پر مولانا حالی کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمایئے اور قومی آشوب کے دل گداز اظہار سے نعت کے مفہوم کی توسیع کا اندازہ کیجیے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دُعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غرب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے
جس دین نے غیروں کے تھے دل آ کے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

اسی طرح علامہ اقبال کی جدید نعتیہ لے میں ارتقائے ذات اور فروغِ کائنات کے اس زیروبم کا قیاس کیجیے، جو فکر و جذبہ کی ہم آہنگی سے منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

لوح بھی تو ، قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب

اب جدید نعت کے ایک اور بڑے علم بردار مولانا ظفر علی خان کی معروف نعت کے ضیا پاش، توحید آگیں اور حریت پسندانہ لب و لہجہ سے حظ اٹھائیے۔ وہ کہتے ہیں:

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دُنیا کے درباروں میں
رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر
وحدت کی تجلی کوند گئی آفاق کے سینہ زاروں میں
ہم حق کے علم برداروں کا ہے اب بھی نرالا ٹھاٹھ وہی
بادل کی گرج تکبیروں میں ، بجلی کی تڑپ تلواروں میں

مولانا حالی، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کے علاوہ جن فن کاروں نے اپنے اپنے منفرد اسلوب میں اُردو نعت کے جدید رنگ روپ کو نکھارا سنوارا اُن میں حسرت موہانی، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم، احسان دانش، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، روش صدیقی، بیدم وارثی، امجد حیدرآبادی، اثر صہبائی، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر سیّد صفدر حسین، مولانا ماہر القادری، مولانا نعیم صدیقی، حافظ مظہر الدین، عبدالکریم ثمر، آذر عسکری، محشر رسول نگری، منظور حسین شور، اقبال عظیم، یوسف ظفر، قیوم نظر، ظہیر کاشمیری، ادا جعفری، شیر افضل جعفری، سجاد باقر رضوی، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، محسن احسان، رضا ہمدانی، منیر نیازی، جمیل ملک، ظہور نظر، جعفر طاہر، حمایت علی شاعر، احمد شمیم، احمد ظفر، افضل پرواز، طفیل ہوشیارپوری، انجم رومانی، شہرت بخاری، سیّد فیضی، رضی ترمذی، سراج الدین ظفر، تبسم رضوانی، توصیف تبسم، سرمد مظاہری، ساغر صدیقی، راسخ عرفانی، اختر انصاری اکبرآبادی، مجیب خیرآبادی، فضلِ حق، طفیل دارا، محمد اعظم چشتی، خالد بزمی، راز کاشمیری، راجا رشید محمود، شبنم رومانی، امین طارق قاسمی، انوار ظہوری، علیم ناصری، حافظ امرتسری، عابد نظامی، رفعت سلطان، جیلانی کامران، مرزا محمد منور، غلام رسول ازہر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، طاہر شادانی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

نعت کے نئے روپ کی ایک حیات افروز جھلک دیکھنے کی غرض سے مولانا نعیم صدیقی کی ایک نعت کے چند اشعار کا مطالعہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں:

دنوں کو رکھی ہے چاہ تیری ، غموں کے گلشن سجا سجا کے
شبوں کو دیکھی ہے راہ تیری ، دیے پلک پر جلا جلا کے
تمام ذرّوں میں خاک رہ کے ہزاروں عالم مچل رہے ہیں
یہ علم و دانش ، یہ تاج و سطوت ہیں معجزے تیرے نقشِ پا کے
خود آگہی کا سبق سکھایا ، مقامِ انسانیت دلایا
غرور والوں کے سر جھکا کے ، پسے ہوؤں کو اُٹھا اُٹھا کے
دلائی پھر بندگی کی عظمت ، بڑھائی پھر زندگی کی عزت
سجائی کیا محفلِ اخوت شہ و گدا کو گلے ملا کے
خود اپنے گھر میں تھا فقر و فاقہ ، مہینوں ٹھنڈا رہا ہے چولھا
بھری زمانے کی تو نے جھولی ، غنا کی دولت لٹا لٹا کے

اب نعت کے آہنگِ نو کا خوش گوار ذائقہ چکھنے کے لیے احمد ندیم قاسمی کی ایک نعت کے

چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں:

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا
پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا
شرق اور غرب میں بکھرے ہوئے گلزاروں کو
نکہتیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیرا
اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا
تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر یہ فردا ہے وہ تنہا تیرا

اب عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی سے کیف و نور کا اکتساب کیجیے۔ وہ کہتے ہیں:

ہمہ آیۂ نور و خلقِ محمد
تو محبوبِ یزداں و نورِ ہدا ہے
تو فقر و قناعت کا روشن منارہ
محمدؐ ہے، احمدؐ ہے تو مصطفیٰ ﷺ ہے
تو دل جوئی و غمگساری کا پیکر
تو خیر البشر ، اشرف الانبیا ہے
رہِ حق میں رہتا ہے پیہم تو ساعی
حقوقِ قرابت کو پہچانتا ہے
اولوالعزم ، عالی ہمم ، خانِ عالم
تو ختم الرسل ، خاتم الانبیا ہے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان نمونوں میں فن کاروں کی ساری توجہ آنحضور ﷺ کی سیرت پر مرکوز ہے اور وہ اُن کے کردار کی تحسین کے حوالے سے خود شناسی، کائنات شناسی اور خدا شناسی کے مراحل طے کرنے میں کوشاں ہیں۔

میں نے اسوۂ حسنہ کے حوالے سے جدید نعت کی جس سہ گونہ عطا یعنی خودشناسی،

کائنات شناسی اور خدا شناسی کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید نعت ایک ایسی منفرد نوعیت کی تخلیق کا ارفع مقام حاصل کر گئی ہے جس کے ظہور کے لیے اس کے خالق کا حلقہ بگوش اسلام ہونا لازمی شرط کی حیثیت نہیں رکھتا۔ جس شخصیت کی عظمت کے بارے میں قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق کے عظیم مرتبے پر فائز ہے[۱] (''اِنک لَعالیٰ خلقم عَظیم'' (بے شک آپ ﷺ اعلیٰ اخلاق کے عظیم مرتبے پر ہیں)۔ سورۂ القلم ۶۸:۴) اور جو خود اپنے منصبِ جلیلہ کا تعین کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اسے اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہی، اس کے کردار کے اثر و نفوذ کا دائرہ کیوں کر صرف اُن فن کاروں تک محدود رہ سکتا تھا جو اصطلاحی معنوں میں اس پر ایمان لائے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی بے مثال ہستی کی بے مثالیت کا ناگزیر تقاضا تھا کہ اس کا قبول و تاثر عالمگیر ہوتا اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی گہرائی میں اضافہ میں نہ ہوتا بلکہ اس کی گیرائی بھی فزوں تر ہوتی اور یہ بات پوری انسانیت کے لیے باعثِ افتخار ہے کہ عہدِ نو میں یہ ناگزیر تقاضا بطریقِ احسن پورا ہوا اور ہم دیکھتے ہیں کہ جدید اُردو نعت کے سرمایے میں توسیع کا اعزاز اُن شعرا کو بھی حاصل ہوا جنھیں معروف ایمانی مفہوم کے مطابق وابستگانِ رسول ﷺ میں کبھی شمار نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں دلو رام کوثری سے قطعِ نظر کہ وہ مدح پیمبر کرتے کرتے اور اس دوران میں آنحضور ﷺ کی سیرت کی معنوی تہوں سے آشنائی حاصل کرتے ہوئے بالآخر دائرۂ دین میں اعلانیہ داخل ہو گئے تھے۔ پنڈت ہری چند اختر، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، بالمکند عرش ملسیانی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مہاراج کشن پرشاد شاد اور منشی بسیشور پرشاد منور لکھنوی کے نام اہم ہیں۔ آنحضور ﷺ کی سیرت کے سلسلے میں ان شعرا کی حدودِ فہم کا اندازہ کروانے کے لیے میں صرف پنڈت ہری چند اختر اور جگن ناتھ آزاد کے نعتیہ کلام کو نمونے کے طور پر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اوّل الذکر کہتے ہیں:

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِّ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

اور مؤخر الذکر رقم طراز ہیں:

حقیقت کی خبر دینے بشیر آیا ، نذیر آیا
شہنشاہی نے جس کے پاؤں چومے ، وہ فقیر آیا
بھٹکتی خلق کو رستہ دکھانے رہنما آیا
سفینے کو تباہی سے بچانے ناخدا آیا
خلیق آیا، کریم آیا ، رؤف آیا، رحیم آیا
کہا قرآں نے جس کو صاحبِ خلقِ عظیم آیا
سراپا علم بن کر صاحبِ ام الکتاب آیا
زمینِ تشنہ لب کی زندگی بن کر سحاب آیا

نئی نسل نے نعت نگاری کی طرف بالخصوص توجہ مبذول کی ہے اور اُن کی جمیل کوششوں سے نعت روحِ عصر کی ایک انتہائی اہم نمائندہ بن کر ہمارے ادب میں غیر معمولی قدر و منزلت کی حامل ہوگئی ہے۔ نئی نسل میں جن فن کاروں کی نعتیہ عطائیں نسبتاً زیادہ وقیع ہیں، اُن میں حفیظ تائب، عبدالشکور بیدل، مظفر وارثی، حافظ لدھیانوی، بشیر منظر، اقبال صلاح الدین، صلاح الدین محمود، عرش صدیقی، صلاح الدین ندیم، کامل القادری، سجاد باقر رضوی، شہزاد احمد، امجد اسلام امجد، کشور ناہید، عطاالحق قاسمی، اختر امان، خالد احمد، نجیب احمد، پروین شاکر، ناہید قاسمی، سیف زلفی، اقبال ساجد، اظہر جاوید، طاہر تونسوی، الطاف قریشی، عبدالستار سیّد، اظہر نفیس، صہبا اختر، سلطان رشک، حسن رضوی، حفیظ صدیقی، حفیظ احسن، زاہدہ صدیقی، رشید کامل، واصف علی واصف، رشید قیصرانی، ظہیر صدیقی، نعیم اظہر، یوسف مثالی، خالد شفیق، احمد حسن حامد، تحسین فراقی، یونس احقر، جان کاشمیری، محمد نواز اور سرفراز امر کے نام سرِفہرست ہیں۔

نئی نسل کی نعتیہ کاوشوں کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے:

سرچشمۂ اقدارِ منور تری سیرت
سر نامۂ پیشانی خاور تری سیرت
زیبائیِ افکار کا مصدر تری گفتار
رعنائیِ کردار کا جوہر تری سیرت
تخلیق کے چہرے کا ضیا ہے تری ہستی
تہذیب کے ماتھے کا ہے جھومر تری سیرت

ہر رہ پہ مرا ہاتھ لیے ہاتھ میں اپنے
چلتی ہے مرے ساتھ برابر تری سیرت

(حفیظ تائب)

مجھ کو بھی اس زمین پہ معراج بخش دے
توفیق دے کہ خود کو ترا نقشِ پا کہوں
میدانِ زندگی میں مرے ہاتھ شل نہ ہوں
حق بات دل میں ہو تو کہوں ، برملا کہوں
پھر خاکداں کو تیری ضرورت ہے لوٹ آ
یہ بات کس سے دہر میں تیرے سوا کہوں
شہزاد مانگتا ہے دُعا سب کے واسطے
کس طرح اپنی ذات کو سب سے جدا کہوں

(شہزاد احمد)

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیّت لکھی
سرحدِ رنگ بہ عنوانِ اخوت ڈھائی
ورقِ دہر پہ ہر سطرِ محبت لکھی
تو نے ہر ذرّے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اک بحر کی وسعت لکھی

(خالد احمد)

نعت ایک طویل عرصے تک اپنے اظہار کے لیے قصیدے یا غزل کا مروّجہ پیٹرن بروئے کار لاتی رہی ہے مگر گزشتہ چند برسوں میں جدید نعت نے فارم کے اعتبار سے آزاد نظم کو اپنا کر اس حقیقت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کی ہے کہ نئے افکار کی ترسیل کے لیے بسا اوقات نئی ہیئت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان آزاد نعتیہ نظموں میں نئی شاعری کے اسی آب دار عنصر کا بالخصوص لحاظ رکھا گیا جو ایمانیت سے عبارت ہے اور جو مافی الضمیر کے اظہار کے لیے علائم و رموز کو بروئے کار لانے کا قائل ہے۔ اس علامتی طرزِ ابلاغ نے جدید نعت کو ایک ایسی تہ داری سے ہم کنار کیا ہے جس نے اُسے نہ صرف مزید عمق فراہم کیا ہے، بلکہ اس کو ایک انفرادی آن بان بھی ارزانی کی

ہے۔ میری منکسرانہ رائے میں جدید نعت کا یہ مخصوص و منفرد روپ مستقبل میں مستحکم تر بنیادوں پر استوار ہوگا اور اس کے نین نقش کے تعین میں اہم کردار ادا کرے گا، کیوں کہ نئے ادب کے ان خالقین اور قارئین کے لیے اس میں زیادہ کشش ہے جن کی تربیت بنیادی طور پر آزاد علامتی نظم کے ماحول میں ہوئی ہے۔ رشید قیصرانی کی مندرجہ ذیل نعتیہ نظم کو آزاد علامتی نعت کی ایک خوب صورت مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں:

اک دیپ جلا اندھیاروں میں
ظلمت کے بپھرے سینوں سے
اک چیخ اُٹھی
اک شور مچا
یہ روپ سروپ اندھیاروں کا
برسوں سے قائم دائم ہے
یہ کس کی جرأت
کس کا دم
یہ کون ہماری نگری میں
ظلمات کا دم یوں نوچتا ہے؟
صدیوں کی سوئی دھرتی پر
یہ کون اُجالے پھینکتا ہے؟
بے خوف و خطر
چپکے چپکے
وہ دیپ مگر جلتا ہی رہا
یہ دیکھ کے ظلمت گاہوں سے
کچھ زہر بھرے اژدر نکلے
کچھ سانپ سنپولے در آئے
کچھ تند ہوائیں چیخ اُٹھیں
کچھ تیز بگولے لہرائے
ظلمات کی ساری سینائیں

اک تنہا دیپ پہ ٹوٹ پڑیں
اتنے میں کچھ پروانوں نے
اس دیپ پر گھیرا ڈال لیا
یہ پروانے لاچار بھی تھے
کم زور نحیف و نزار بھی تھے
ہر دیپ کی رکھشا کی خاطر
وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر
طوفان کے منہ میں کود پڑے
کچھ پار لگے
کچھ ڈوب گئے
یلغار سے پروانوں کی مگر
طوفان کے چھکے چھوٹ گئے
اتنے میں کچھ بیراگی بھی
قندیل جلانے آ پہنچے
وہ دیپ جو تنہا جلتا تھا
اس دیپ سے لاکھوں دیپ جلے
طوفان کا سینہ چاک ہوا
دم ٹوٹ گیا اندھیاروں کا

شعرا کی نئی نسل کو علامہ اقبال کے اس لطیف ترین نکتے کا نہ صرف فہم میسر آ چکا ہے، بلکہ اس نے اپنے فن کے ذریعے اس کی عملی تفسیر بھی پیش کرنے کا تہیہ کر لیا ہے جسے انھوں نے اس شعر میں بیان کیا ہے:

بہ مصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

ممتاز حسن

نعت کے فکری زاویے

میرے نزدیک ہر وہ شعر نعت ہے جس کا تأثر ہمیں حضور رحمۃ للعالمین کی ذاتِ گرامی سے قریب لائے، جس میں حضور ﷺ کی مدح ہو یا حضور ﷺ سے خطاب کیا جائے۔ صحیح معنوں میں نعت وہ ہے جس میں محض پیکرِ نبوت کے صوری محاسن سے لگاؤ کی بجائے مقصدِ نبوت سے دل بستگی پائی جائے، جس میں جناب رسالت مآب ﷺ سے صرف رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو بلکہ حضور ﷺ کی شخصیت سے ایک قلبی تعلق موجود ہو۔ وہ مدح یا خطاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اور وہ شعر نظم ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا مثنوی رُباعی ہو یا مثلث، مخمس ہو یا مسدس، اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدر و قیمت کا دارومدار اس کے نفسِ مضمون پر ہے۔ اگر اس کا مقصد ذاتِ رسالت کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا اور آقائے دو جہاں کی بعثت کی جو اہمیت نوعِ انسانی اور جملہ موجودات کے لیے ہے، اسے نمایاں کرنا ہو تو وہ صحیح طور پر نعت کہلانے کا مستحق ہے۔ پیکرِ رسالت سے قرب کا جذبہ یقیناً ایک نعتیہ پہلو رکھتا ہے۔ البتہ اگر شاعر کی توجہ صرف حضور ﷺ کے حسن و جمال ظاہری پر رُک جائے، اور اس سے آگے نہ بڑھ سکے کہ حضور ﷺ کے قد کا سایہ نہ تھا، یا حضور ﷺ کے سر کے بال آخر وقت تک سیاہ تھے، تو اس شاعری کا درجہ وہ نہیں ہوگا جو حقیقی نعتیہ کلام کا ہے۔ کسی نے کہا ہے:

معراج کی رتیا دھوم مچی اک راج دلارا آوت ہے

یا ایک اور نعت:

بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آجا
کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے آجا

اسی طرح کچھ اور گیت ہیں جو اُس عاشقانہ اور جذباتی شاعری کی یاد دلاتے ہیں جو

ہندوؤں کے ہاں، عام ہے اور جس کا مرکز کرشن جی مہاراج کی ذاتِ والا صفات ہے۔ مثلاً

مدینے میں مور پیا بالا ہے رے

یا

مستی ہے یادِ چشمِ رسول انام ﷺ کی

اس سے بھی آگے بڑھیے تو اس قسم کے شعر نظر آئیں گے:

اے دوستوں فرقت میں مری مرتے ہو ناحق
اے چارہ گر و فکرِ دوا کرتے ہو ناحق

اچھا نہ کبھی ہوں گا میں بیمارِ نبی ﷺ ہوں

اور یہ اس ذاتِ گرامی کے متعلق کہا گیا ہے جو جسم و روح کی بالیدگی اور توانائی کا سرچشمہ ہے۔

تقریباً یہی حال ہماری میلاد کی محفلوں کا ہے جہاں اکثر تاریخی واقعات اور مقصدی تذکرے کی بجائے ذکرِ رسول ﷺ ایک افسانوی اور جذباتی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور سننے والے نوعِ بشر کے سب سے بڑے نمائندے کی زندگی اور پیغام سے بڑی حد تک ناآشنا رہتے ہیں۔

اس پر کوئی شک نہیں کہ تعلیماتِ رسالت سے قلبی تعلق پیدا ہونے کے بعد ذاتِ رسالت اور پیکرِ رسالت سے دل بستگی بلکہ ایک والہانہ شیفتگی پیدا ہونا لازم ہے اور اس مقام پر پہنچ کر جذبۂ دل جو کچھ کہلوائے وہ سننے کے لائق ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اسلامی تعلیمات پورے طور سے نہیں بھی اُتری ہیں مگر وہ حضور ﷺ کا نام سنتے ہی بے قرار ہو جاتے ہیں، اُن کا درجہ بڑے بڑے علما اور فقہا سے بلند ہے، اور شمعِ رسالت ﷺ کے اُن پروانوں کا تو کیا کہنا جنھوں نے اپنی جانیں دے دیں مگر حضور ﷺ کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ سننا گوارا نہ کیا۔

اُردو نعت کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ ہم ایک مسئلے پر غور کر لیں جس کی نزاکت اس کی اہمیت سے کم نہیں۔ یہ مسئلہ ذات و صفات کا ہے جو خدا اور رسول ﷺ دونوں میں مشترک ہے اگرچہ خدا معبود ہے اور رسول عبد۔ مگر اپنے اپنے مقام پر دونوں وحدہٗ لاشریک ہیں۔ شرک دونوں جگہ گناہ ہے۔ شرک فی اللہ بھی اور شرک فی الرسول بھی۔

ذات اور صفات کا باہم گہرا تعلق ہے۔ صفات ذات کی مظہر ہے۔ مگر اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں، جس طرح کسی انسان کی عکسی تصویر اس کی شخصیت کا پتا تو دیتی ہے مگر اس پر

حاوی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح صفاتِ خداوندی ذات کی نشان دہی تو کرتی ہیں مگر ہمیں از خود عین ذات تک پہنچا نہیں سکتیں۔

اس میں شک نہیں کہ ذاتِ خداوندی کا جلوہ کائنات کے ہر مظہر میں جھلکتا ہے اور یہ سب مظاہر ایک حد تک رہنمائے ذات ہیں، لیکن یہ رہنمائی بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ادراک صفات کو شعورِ ذات کا وسیلہ سمجھا جائے۔ اگر اس کی بجائے تماشائے صفات مقصود بالذات کی حیثیت اختیار کر لے تو یہی وسیلہ راستے کی رکاوٹ بن جائے گا۔ یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، یہ ستارے، یہ کائنات کے دل کش اور نظر افروز منظر، یہ سب کے سب ذاتِ خداوندی کے پرتو ہیں۔ البتہ اگر انسان ان کی رنگا رنگی میں محو ہو جائے تو یہی پرتو اس کی آنکھ کا پردہ بن جائے گا۔ کسی نے کہا ہے:

آستانِ یار را پنہاں ز چشم می کند
صد تفو بر ہستی ، دنیا و مافیہا تفو

یہی وجہ ہے کہ صفات کو ایک بت کدہ کہا گیا ہے جہاں جبینِ شوق صنم پرستی پر مائل نظر آتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

اس نکتے کی مزید وضاحت انھوں نے معراجِ نبوی ﷺ کے سلسلے میں ایک اور شعر میں کی ہے:

مردِ مومن در نسا زد با صفات
مصطفیٰ راضی نشد الا بذات

لیکن یہ لازم نہیں آتا کہ انسان دُنیا کے کام کاج میں ہاتھ ڈالنے کے بعد خدا سے غافل ہو جائے۔ ہمیں تو دُنیا اور آخرت دونوں میں اپنے لیے بہتری چاہنا ہے۔ فی الدنیا حسنۃً وّ فی الاٰخرۃ حسنۃً، اکابر صوفیہ کا مقولہ دست در کار و دل با ریاد، اسی مسلک کا اظہار ہے یعنی دُنیا سے دل چسپی تو صحیح ہے مگر دل باختگی صحیح نہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے اسی طریقِ فکر و عمل کی تشریح کی ہے:

دُنیا میں ہوں دُنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اگر ذاتِ خداوندی سے قرب حاصل کرنے کے لیے صفات کے نگار خانے سے گزرنا لازم ہے تو ذاتِ رسالت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ صفاتِ رسالت، ذاتِ رسالت کی پردہ پوشی

کرنے کے بجائے حقیقتِ رسالت کونمایاں کرتی ہیں۔اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول کا ایک انسان کی حیثیت سے پیدا ہونا اور دوسرے انسانوں کے درمیان رہ کران کے ساتھ زندگی بسر کرنا بے معنی ہو جاتا۔

صفاتِ رسالت محض پیکرِ نبوی ﷺ کے حسن و جمال کا نام نہیں ہے۔ یہ نام ہے اس خلقِ عظیم کا جو ساری نوعِ انسانی کے لیے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم مقصدِ بعثت سے اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم پر حضور خیر البشر ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلو منکشف نہ ہوں۔ جناب رسالت مآب ﷺ کی زندگی سارے انسانوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے خواہ ہم انھیں ایک بچے کی حیثیت سے دیکھیں یا ایک جواں اور بوڑھے کی حیثیت سے دیکھیں۔حضور ایک شہری، ایک فرماں روا، ایک خاوند، ایک باپ، ایک قائد، ایک مجاہد، ایک سپاہی، ایک سپہ سالار، ایک جج، ایک مقنن، ایک منتظم سبھی کچھ ہیں۔ ہم اس زندگی کے جس پہلو پر نظر ڈالیں وہ اسی اسوۂ حسنہ کا مظہر ہے جس کا ذکر خود قرآن نے کیا ہے۔اگر حضور ﷺ کی زندگی چند مافوق الفطرت واقعات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہوتی اور اس میں عام انسانوں کے رنج و راحت، مسرت وغم، مصیبت اور کامرانی یہ سب موجود نہ ہوتے تو ہم بہ حیثیت انسان اس زندگی سے کوئی سبق نہ سیکھ سکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی زندگی میں انسانی رنج وغم اور کرب و الم کی ساری کیفیتیں، ساری اذیتیں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے ذاتِ رسالت کے شعور کے لیے صفاتِ رسالت کا ادراک اور سیرتِ رسول ﷺ کی پیروی ناگزیر ہے۔اصل چیز یہاں بھی ذاتِ رسالت ہے۔ مگر ذات و صفات لازم وملزوم ہیں۔خلاصہ یہ کہ نعتِ رسول ﷺ کی بنیاد یا تو عشقِ ذات ہے، یا ادراکِ صفات۔ یا تو وہ ذاتِ رسالت سے ایک گہرے اور والہانہ جذبے کا اظہار ہے یا صفاتِ رسالت کی عکاسی۔ دونوں کا مقصد اور حاصل یہ ہے کہ دُنیا کے سب سے بڑے انسان کی شخصیت اور کردار ہمارے سامنے آئیں اور ایک مثالی حیثیت سے زندگی میں ہمارے لیے مشعلِ راہ کا کام دیں۔

جنابِ رسالت مآب ﷺ پر درود و سلام بھیجنا نہ صرف تسکینِ خاطر اور فلاح دارین کا باعث ہے بلکہ یہی ایک ایسا عمل ہے جس میں فرشتے اور خود ذاتِ خداوندی دونوں انسان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔

خدا کے جتنے احسان اولادِ آدم پر ہیں ان میں سب سے بڑا احسان ظہورِ محمدی ہے اور اولادِ آدم ہی پر کیا یہ احسان ساری کائنات پر ہے۔ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاک۔ محمد بن عبداللہ محسنِ اعظم ہی نہیں خود احسانِ اعظم بھی ہیں ذاتِ محمدی ﷺ کا ظہور کون و مکاں کی تخلیق کا

نقطۂ عروج ہی نہیں بلکہ منتہائے مقصود بھی ہے۔ ذاتِ محمدی ﷺ الطافِ ایزدی کی سب سے بڑی مظہر ہے۔ وہ بجائے خود ایک رحمت ہے، سب سے بڑی رحمت، جس کے بغیر زندگی اور کائنات کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ غالب نے کیا خوب کہا:

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود

آج ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ ہم نے سیرتِ رسول ﷺ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس مثالی سیرت کی رہنمائی سے محروم ہوگئے ہیں۔ غور فرمائیے کہ صداقت اور امانت وہ صفات ہیں جو رسالتِ مآب میں بعثت سے قبل موجود تھیں اور جن کے دوست دشمن سب قائل تھے:

کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہیں

آج ہمارے نام نہاد اسلامی معاشرے میں کتنے آدمی ایسے ملتے ہیں جنھیں صادق اور امین کہا جاتا ہے۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس مملکتِ پاکستان میں جسے اسلامی ہونے کا دعویٰ ہے جب آئینی قرار دادِ مقاصد منظور کی گئی تو خدا اور قائدِاعظم محمد علی جناح کا نام تو لیا گیا مگر اس رسول ﷺ کا کہیں ذکر نہ آیا جس کے توسط سے ہم نے خدا کو پہچانا اور جس کی تعلیمات کا یہ کرشمہ ہے کہ ہم میں محمد علی جناح جیسے حق پرست مجاہد پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔

جہاں تک اُردو نعت کا تعلق ہے اُردو کے بعض اساتذہ کے نعتیہ کلام میں زیادہ تر استادانہ صنعت گری پائی جاتی ہے۔ مثلاً امیر مینائی نے جو غزل کے شاعر تھے اور اسی حیثیت سے مشہور ہیں، معراج پر جو کچھ کہا ہے، اس میں زیادہ تر الفاظ پر زور ہے:

کس کے آنے کی فلک پر ہے خبر آج کی رات
آنکھ سورج سے ملاتا ہے قمر آج کی رات
کہکشاں کہتی ہے قسمت کا ستارہ چمکا
ہوگا اس راہ سے حضرت کا گزر آج کی رات
حوریں فردوس سے نکلی ہیں نچھاور کرنے
سر پہ رکھے طبق لعل و گہر آج کی رات

مگر میں ایسی نعتوں کی مثالیں زیادہ دینا نہیں چاہتا جو میرے خیال کے مطابق نعت کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اُردو نعت کے چند ایسے نمونے آپ کی خدمت میں پیش کروں جو میرے نزدیک نعت کہلانے کے مستحق نہیں۔

میری رائے میں اُردو میں کوئی نعت حالیؔ کے مسدس کے برابر موجود نہیں ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

ان چند شعروں میں کوئی تکلف کوئی مبالغہ کوئی طباعی کوئی صنعت گری نہیں۔ مگر جو تأثر ان میں موجود ہے ان کی نظیر اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔ حضور رسالت پناہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اَلْخَلقُ کُلُّھُمْ عِیَالُ اللّٰہِ وَاَحَبُّھُمْ اِلَی اللّٰہِ من اَنفَعُھُمْ اِلَی الْخَلقِ یعنی ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور خدا کو سب سے عزیز وہ انسان ہے جو خلقِ خدا کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ حالیؔ کے یہ شعر اسی حدیث اور صاحبِ حدیث کی تصویر ہیں۔ اور اس قدر پُراثر ہیں کہ انسان کی ساری زندگی کا رُخ بدل سکتی ہیں سچ تو یہ ہے کہ جو خلوص اور سادگی حالیؔ کے ان اشعار میں جھلکتی ہے۔ وہ خود حالیؔ کی روحانی پاکیزگی کی آئینہ دار ہے۔ حالیؔ کی زندگی سراپا خلوص ہے، اور جب تک کسی انسان کی زندگی سراپا خلوص نہ ہو، حضور رسالت مآب ﷺ سے کسی قسم کے قلبی تعلق کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ ان اشعار کو نعت کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئے گی کہ ہر شعر میں رسالت کا پرتو ہے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کو گیسوؤں والا اور کسی ایسے ہی پیارے نام سے خطاب کر کے جذباتِ عقیدت کی تسکین کی کوشش کرنا اور بات ہے اور حضور ﷺ کی بشر دوستی اور انسان نوازی کی طرف توجہ دلا کر دُنیا کو مقصدِ نبوت سے آگاہ کرنا اور بات۔ یہی حالیؔ کی عظمت ہے۔ اُن میں عشقِ ذات اور شعورِ صفات دونوں بہ یک وقت موجود ہیں۔ حالیؔ کی دوسری نعت جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اُس میں سرورِ کونین سے خطاب ہے۔ حالیؔ سرکارِ دو جہاں ﷺ کے دربار میں اُمت کی فریاد لے کر پہنچتے ہیں:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے

اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

شاید درد و غم کی یہ عرض داشت بہت طول پکڑ جاتی مگر ایک مقام پر پہنچ کر حالؔی اپنے آپ کو روک دیتے ہیں کہ کہیں فریاد شکایت کی صورت اختیار نہ کر لے:

ہاں حالیِ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے
ہے تجھ کو خبر یہ بھی کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

یہ عجز، یہ انکسار، یہ ادب، یہ سب محبت ہی کے کرشمے ہیں۔ میؔر کا کہنا سچ ہے کہ:

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

حالؔی کے بعد میرے ذہن میں جس شخص کا نام آتا ہے وہ ظفر علی خاں ہیں۔ ان کی طبیعت کا سا تنوع کہیں اور کم ملے گا۔ طنز و ظرافت، ہجو و مذمت، قومی جذبہ، سیاسی نعرہ بازی، غرض شاعرانہ طباعی اور قادر الکلامی کا کون سا مظاہرہ ہے جو ان کے کلامِ بلاغت نظام میں نہ ملتا ہو۔ یہ ان کی سعادت ہے کہ وقتی اور ہنگامی قافیہ پیمائی کے ساتھ ساتھ خدا نے نعت گوئی بھی ان کے لیے مقدر کی۔ وہ ایک آدھ نعت تو ایسی لکھ گئے ہیں جو اُردو کے کسی انتخاب سے الگ نہیں رکھی جا سکتی:

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی سب دُنیا کے درباروں میں

یہ اور اس نعت کے دوسرے اشعار اُردو کے مشہور ترین نعتیہ اشعار میں سے ہیں۔ ان کی دوسری مشہور نعت وہ ہے، جس کا مطلع ہے:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنائیں تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دُنیا تمھیں تو ہو

یہ نعت جہاں اپنی معنویت کے اعتبار سے بلند ہے، وہاں اپنے والہانہ جذبۂ محبت کی وجہ سے نعتوں میں بے نظیر ہے۔ ہر شعر جوشِ عقیدت اور خلوصِ بیان کا بھرپور نمونہ ہے۔ پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔

اکبر الٰہ آبادی کے کلام میں حکمت اور معرفت کے جو موتی ہیں وہ بیش تر طنز و ظرافت کی

نذر ہوگئے ہیں، لیکن انھوں نے نعت میں جو کچھ کہا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

دُرفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا ، آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے رہبر بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

اقبال کا شمار باقاعدہ نعت گویوں میں نہیں ہے۔ ان کی ابتدا شاعری میں ایک آدھ روایتی نعت ملتی ہے جسے انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں کیا ہے۔ جیسے:

نگاہِ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

اس قسم کی نعت گوئی حدِ ادب ہی سے متجاوز نہیں ہے، دین کے دائرے سے بھی باہر ہے۔ کوئی شاعر تو صاف صاف کہہ گیا ہے:

ذکی کیوں کر نہ ہر دم احمدِ بے میم کی رٹ ہو
کہ اُلفت میں لحاظِ کفر و ایماں ہو نہیں سکتا

اس قسم کے افکار و اقوال اکثر صوفیہ اور ان کے معتقدین پر وارد ہوتے ہیں، اور ان کی صفائی یہ پیش کی جاتی ہے کہ یہ حالتِ ''سکر'' کے واردات ہیں۔ اور ہم بھی عقیدت کی رَو میں بہہ کر انھیں قابلِ مواخذہ نہیں سمجھتے۔ یہاں صحو اور سکر سے بحث نہیں البتہ یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوّل تو معتبر صوفیہ حالتِ سکر کی کہی ہوئی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرے یہ کہ سکر اور جہان کہیں بھی جائز سمجھا جائے دربارِ نبوی ﷺ میں جائز نہیں ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

باخدا دیوانہ و با مصطفیٰ ﷺ ہشیار باش

بارگاہِ رسالت مقامِ ادب ہے۔ یہاں کسی قسم کی گستاخی اور بے باکی خطا کاری ہے۔ یہاں جو باریاب ہوا اسے احتیاط سے سنبھل کر بیٹھنا ہوگا۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

خدا اور بندے کا فرق اسلام کے بنیادی تصورات میں سے ہے۔ رسول کی بشریت پر قرآن نے اور خود رسول ﷺ نے بار بار زور دیا ہے۔ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ اور مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ اس پر شاہد ہیں۔ البتہ ہمارے نعت گو تصوف کی سکر انگیز روایتوں سے

متاثر ہو کر اس بنیادی حقیقت کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ خود حضور سرورِ انبیاؐ کی زندگی میں ایک لمحہ بھی سکر کا نہیں ہے۔ اقبالؔ کا مندرجہ بالا شعر بھی روایتی نعت کا نمونہ ہے اور ابتدائی کلام ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دینے کے لائق ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسے اپنے مرتب کردہ مجموعے میں جگہ نہیں دی۔

اقبالؔ کی ابتدائی غزلوں میں کہیں کہیں نعتیہ اشعار ملتے ہیں:

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بتا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
پھڑک اُٹھا کوئی تیری ادائے ماعرفنا پر
ترا رُتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

ایک آدھ مقام کے علاوہ اقبالؔ نے عام طور پر اُردو میں بہ راہِ راست نعت گوئی نہیں کی۔ جہاں حضور ﷺ کی محبت کا جذبہ اُمڈ آیا ہے، وہاں بھی حدِ ادب ملحوظ ہے۔ تعریف کی ہے تو مؤذنِ رسول ﷺ کی، یا دربارِ رسالت میں پہنچے ہیں تو طرابلس کے شہیدوں کے لہو کا آبگینہ لے کر۔ یہ دونوں نظمیں عشقِ رسول ﷺ سے معمور ہیں۔ بلالؓ والی نظم کے دو شعر سنیے:

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اُٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

بلالؓ پر اقبالؔ کی ایک اور نظم بھی ہے جس سے پہلے اسکندر رومی اور اس کی فتح یابیوں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد اسکندر کا مقابلہ بلالؓ سے کیا گیا ہے۔ دوسرا بند یہ ہے:

لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلال
محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر

ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخ پیر
اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومیؔ فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

یہاں دو شخصیتوں کا تقابل کیا گیا ہے۔ ایک تو وہ شخصیت ہے جس کا شمار دُنیا کے سب سے بڑے فاتحین میں ہوتا ہے، جس کی شہرت کی بنیاد قوتِ اقتدار اور دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش پر ہے اور چوں کہ یہ خواہش اور غلبہ خود بے بنیاد ہے، اس لیے وہ شخصیت اور اس کی شہرت بھی پا در ہوا ہے۔ آج اسکندر رومی کو تاریخ کے اوراق میں تو دیکھا جا سکتا ہے، مگر عام انسانوں کے دلوں سے اس کی یاد اُٹھ گئی ہے۔ آج نہ اس کی سلطنت باقی ہے نہ قصرِ سلطنت۔ اس کے برعکس اس دوسری شخصیت کو دیکھیے۔ ایک ادنیٰ نسل کا حبشی دُنیا کے سب سے بڑے انسان کی صحبت سے فیض یاب ہو کر فضا میں ایک ایسی صدا بلند کرتا ہے جو آج بھی ہمیں ہر روز سنائی دیتی ہے۔ اذان اور اس کا پہلا مؤذن دونوں زندۂ جاوید ہیں اور وہ اس لیے کہ اس صدا کا مقصد انسانوں کو فاتح اور مفتوح یا کالے اور گورے میں تقسیم کرنا نہیں ہے، بلکہ بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، محتاج و غنی، بندہ اور آقا کی تمیز کو دور کرنا۔ سب کو ایک دوسرے سے ملانا اور ایک ہی صف میں لا کھڑا کرنا ہے اور ان کو یہ یاد دلانا ہے کہ وہ کچھ ہی کیوں نہ سمجھیں، انسانوں کی حیثیت سے سب برابر ہیں، اور وہ خدا، جس کے وہ سب بندے ہیں ان سب سے بڑا ہے اور اس سے بڑا کوئی نہیں۔

''طرابلس'' والی نظم ایک خاص جذبۂ عقیدت سے معمور ہے۔ آخری بند ہے:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ریاضِ دہر میں ہیں یوں تو رنگ رنگ کے پھول
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ایک ابتدائی نظم میں ہندوستان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

''ترانۂ ملّی'' میں ملتِ اسلامیہ کا سرچشمۂ الہام وہی ایک ذاتِ رسالت ہے جو تسکین اور توانائی دونوں کی ضامن ہے:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

یہی جذبہ آپ ''شفاخانۂ حجاز'' میں بھی پائیں گے:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

حضور ﷺ کی ذات سے اقبالؔ کو جو لگاؤ ہے وہ اتنا گہرا اور مستقل ہے کہ ان کا فکر و خیال اکثر بے ساختہ نعت کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ مثلاً اُن کا یہ شعر جو ایک مشہور غزل کا مقطع ہے:

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

اقبالؔ نے خدا سے مسلمانوں کی بدحالی کا شکوہ کیا اور اس شکوے کا جواب بھی سنا۔ ''جوابِ شکوہ'' کیا ہے، سارا جواب تو ایک ہی شعر میں موجود ہے، اور وہ اس نظم کا آخری شعر ہے:

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہی کیفیت ''صدیقؓ'' والی نظم کی ہے جس میں ابوبکر صدیقؓ کا حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں اپنا سارا اثاثہ دین کے لیے قربان کر دینے کا ذکر ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

''جنگِ یرموک کا ایک واقعہ'' میں یہی جذبہ جھلکتا ہے:

اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
آ کر ہوا امیرِ عساکر سے ہم کلام
اے بوعبیدہؓ رخصتِ پکار دے مجھے
لبریز ہوگیا مرے صبر و سکوں کا جام

جاتا ہوں میں حضورِ رسالت ﷺ کی پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام

یہ جذبۂ سرفروشی، یہ شہادت کی تمنا، ذاتِ رسالت سے یہ والہانہ عقیدت نعت کی انتہا ہے، مگر یہاں بھی نعت بہ راہِ راست نہیں کہی گئی ہے۔ یعنی شاعر نے بہ راہِ راست حضور رسالت مآب ﷺ سے خطاب نہیں کیا، ''بالِ جبریل'' کی ایک غزل کا شعر ہے:

خبر ملی ہے یہ معراجِ مصطفٰے ﷺ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس طرح کی بالواسطہ نعت ایک فنی نزاکت اور شاعرانہ بلاغت کی حامل ہے، جو بہ راہِ راست مدح رسول ﷺ میں مشکل سے ملتی ہے۔ بہ راہِ راست اور بلاواسطہ نعتیہ خطاب ہر شاعر کے بس کی بات بھی نہیں۔ یہ کام حالؔی، اقبؔال، سعدی اور جامی جیسے شاعر ہی کر سکتے ہیں۔ اقبؔال نے بلالؓ کے واسطے سے بھی رسول ﷺ کو دیکھا ہے، اور خود بھی حضور رسالت مآب ﷺ میں باریابی کی سعادت حاصل کی ہے۔ ''بالِ جبریل'' ہی میں دو ایک مقام ایسے ہیں جہاں شاعر خود دربارِ رسالت میں حاضر ہے، اور دل کے جذبے کو الفاظ کا جامہ پہنا کر خیر البشر ﷺ کے حضور میں زبان کھول رہا ہے:

لوح بھی تو ، قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

اور حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کے بعد انھوں نے جو نظم کہی ہے، اس کے چند شعر تو ایسے ہیں کہ انھیں نعت کی معراج کہنا چاہیے:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ جذب و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

اس کے بعد وہ منزل ہے جہاں اقبؔال مسلمانوں کے تشتت و افتراق اور ان کی زبوں حالی سے افسردہ خاطر ہو کر ذاتِ رسالت سے توجہ اور امداد کے ملتجی ہیں۔ یہاں ان کی التجا فریاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ شاید وہ مقام ہے جہاں وہ آقائے دو جہاں کی ذاتِ گرامی سے

بہت زیادہ قریب ہیں:

شیرازہ ہوا اُمتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
اس راز کو کر فاش اب اے روحِ محمد ﷺ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ خدا سے امداد کا طالب ہوتا ہے مگر سہارا رسول ﷺ کا لیتا ہے۔ آغا حشؔر کاشمیری کسی وقت بھی اولیاء اللہ کے زمرے میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں سمجھے گئے۔ ساری عمر ڈرامے لکھے۔ شعر کہے اور زندگی کی رنگینیوں سے وابستہ رہے، مگر جب قوم کی زبوں حالی نے انھیں بے قرار کیا اور دُکھے ہوئے دل کو پکارنے ''شکریۂ یورپ'' کی صورت اختیار کی تو انھوں نے خدا کو رسول ﷺ ہی کا واسطہ دیا:

خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب ﷺ کی اُمت میں ہیں

نعت گویوں کا کوئی تذکرہ کرامت علی شہیدیؒ کے ذکرِ خیر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ وہ حج کو گئے اور بعد ادائے حج مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے اثنائے راہ میں بیمار ہوئے، لیکن بیماری کی حالت میں بھی مدینے تک پہنچ گئے۔ وہاں روضۂ مبارک کو دیکھتے ہی اس عاشقِ رسول نے فرطِ اشتیاق سے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ پروانہ اپنی ہی آگ میں جل بجھا۔ ان کا ایک شعر ہے:

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

یہ شعر خدا جانے کس وقت کہا تھا کہ پیش گوئی کی طرح پورا ہوا۔ اقبالؔ نے حجاز میں موت مانگی تھی، شہیدیؔ کو خاص مدینے میں ملی:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہمارے زمانے میں محمد علی جوہؔر مرحوم عشاقِ رسول میں سے ہو گزرے ہیں۔ ان کی زندگی اخلاص اور ایثار سے پُر تھی۔ ان کا ایک نعتیہ شعر تبرک کے طور پر ہدیۂ قارئین ہے:

جب اپنی پوری جوانی پہ آ گئی دُنیا
تو زندگی کے لیے آخری پیام آیا

حسرتؔ موہانی اپنی مستقل مزاجی اور عشقِ رسول میں محمد علی سے بھی آگے ہیں:

حسرتؔ مجھے اس جانِ جہاں سے ہے تعلق
سمجھے کہ نہ سمجھے کوئی جانے کہ نہ جانے

پاکستان کے قومی ترانے کے شاعر نے ولادتِ رسول ﷺ پر جو چھ شعر کہے ہیں وہ بھی عقیدت کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشعار کا حفیظؔ کی شاعری اور اُردو کے نعتیہ کلام میں ایک خاص مقام ہے:

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے ظلِ رحمانی ، سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی

نعت، مشہور نعت گویوں کے کلام میں ملتی ہے، اور غیر نعت گو شعرا کے ہاں مقابلتہً زیادہ۔ غالبؔ کے تین شعر جنھیں لوگ اکثر غزل کے شعر خیال کرتے ہیں، غور سے دیکھیے تو نعت کے سوا کچھ نہیں ہیں، اور نعت بھی کس پائے کی:

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رُتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

پہلے شعر میں ''الفقر فخری'' کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے دو شعروں میں معراج کی طرف۔

محسن کاکوروی عمر بھر دامنِ رسول ﷺ سے وابستہ رہے۔ ان کا کلام تقریباً تمام تر نعت ہی پر مشتمل ہے، لیکن جو نعتیں اُنھوں نے رسمی اہتمام اور روایتی شان وشکوہ سے کہی ہیں ان کا وہ رُتبہ نہیں، جو ان کے بے ساختہ کلام میں ہے۔

''سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل'' والا قصیدہ بڑے ٹھاٹھ کی چیز ہے اور اس کا حسنِ مطلع بہت مشہور ہے:

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل

میرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل

مگر محسنؔ کے اس قصیدے اور ان کی بہت سی دوسری نعتوں سے زیادہ مؤثر ان کی وہ نظم ہے جو انھوں نے ایک لمبی اور خطرناک بیماری سے شفا پانے کے بعد فی البدیہہ کہی اور جو نظرِ ثانی سے بھی محروم رہی۔ ابتدا کے چند شعر سنیے:

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا
تڑپنے لگا دل اُچھلنے لگا
زمیں پر مرے آنسو آنے لگے
فلک تک مرے نالے جانے لگے

محسن اپنے مرض الموت کا ایک خیالی نقشہ کھینچتے ہیں:

چلی آتی ہیں ہچکیاں دم بہ دم
مجھے یاد کرتے ہیں اہلِ عدم

اس کے بعد انھوں نے چار پانچ شعر ایسے کہے ہیں جو ان کے سارے نعتیہ کلام کا حاصل ہیں:

خطا ہو کے محسنؔ نہ پھیریں مجھے
فرشتوں سے کہہ دو نہ گھیریں مجھے
نہ میں نے کیا کچھ نہ جانا کبھی
بہ جز سجدۂ آستانِ نبی

جس بے تکلّفی، جس عقیدت، جس اعتماد سے محسنؔ کاکوروی نے یہ شعر کہے ہیں وہ ان کے نجات کے لیے کافی ہیں۔

سیّد انشا ایک بحرِ مواج تھے۔ جدھر جی چاہا چل دیے۔ غزل، ہزل، مدح، ہجو سبھی کچھ کہا۔ مگر ایک آدھ نعت بھی ایسی کہہ گئے ہیں جو ان سے یادگار ہے۔ دیکھیے کیا پاکیزہ کلام ہے:

آپ خدا نے جب کہا صلِ علیٰ محمد
کیوں کہیں پھر انبیا صلِ علیٰ محمد
عرش سے آتی ہے صدا صلِ علی محمد
نورِ جمالِ مصطفیٰ صلِ علیٰ محمد
صلِ علیٰ نبینا صلِ علیٰ محمد

چودھری دلّو رام کوثری کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ آخر عمر میں کوثر علی کوثری ہو گئے تھے۔ مگر ہندو رہے جب بھی اور مسلمان ہوئے جب بھی، ان کی ساری عمر مدحِ رسول ﷺ میں گزری۔ اپنے آپ کو فخریہ حسانِ ثانی کہتے تھے۔ ایک نعت کے چند شعر ہیں:

مجھے نعت نے شادمانی میں رکھا
کہ مصرفِ شیریں زبانی میں رکھا
میں لکھتا رہا نعت اور حق نے شب بھر
قمر کو مری پاسبانی میں رکھا

کوثری اپنی نعت گوئی پر نازاں ہیں۔ دیکھیے انھوں نے اپنا مقابلہ حسان بن ثابتؓ سے کس طرح کیا ہے:

نبی ﷺ کے ہوئے نعت گو دو برابر
کہ دونوں کو اک مدح خوانی میں رکھا
ہے حسان پہلا تو میں دوسرا ہوں!
نہیں فرق اوّل میں ثانی میں رکھا

ہندو شعرا اور بھی بہت سے ایسے ہیں جن کے ہاں نعتیہ کلام موجود ہے اور بلند پایہ ہے۔ اور اس لحاظ سے قابلِ داد ہے کہ انھوں نے اختلافِ مذہب کے باوجود جنابِ رسالت مآب ﷺ کے مرتبے کو جانا اور پہچانا۔

ہمارے زمانے میں تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، بال مکند عرش ملسیانی اور دوسرے ہندو شعرا نے نعتیں کہی ہیں، مگر ان میں سب سے اونچا مقام پنڈت ہری چند اختر مرحوم و مغفور کا ہے۔ ان کی وہ نعت بڑی مشہور ہے جس کا مطلع ہے:

کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

اور اس کا آخری شعر تو نعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا:

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

اس میں کسے شک ہو سکتا ہے کہ حضور کی بعثت کا مقصد خود انسانیت کے معیار کو بلند کرنا تھا، مگر اس غیر مسلم کی سعادت کا کیا کہنا جس کی بصیرت نے ہم مسلمانوں سے بڑھ کر حضور کی

سیرت کے اس پہلو کو دیکھا، سمجھا اور سمجھایا۔

ہماری نئی نسل کے شعرا کا کلام بھی نعت کی دولت سے خالی نہیں ہے اور یہ ہمارے اور اُن کے لیے باعثِ سعادت ہے۔ اُن کی نعتوں میں رسم و روایت کی وضع داری کی بجائے ایک دلی خلوص نظر آتا ہے، اور یہ اُردو زبان کے لیے ایک درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

اب تک میں نے اُردو نعت کا ذکر کیا ہے، لیکن اُردو کے شاعروں کی نعت گوئی کے مقام کا اندازہ کرنے کے لیے بہتر ہوگا کہ فارسی اور عربی کی نعت پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ یہ اس لیے بھی مفید ہے کہ اُردو نعت پر عربی اور فارسی دونوں کا اثر ہے۔ عربی کا کم اور فارسی کا زیادہ۔ فارسی شاعری میں سعدی، خسرو، جامی اور اقبال کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ سعدی کہتے ہیں:

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور دیکھیے:

کریم السجایا جمیل الشیم
نبی البرایا شفیع الامم
امامِ رسل پیشوائی سبیل
امینِ خدا مہبطِ جبرئیل
شفیع الوریٰ خواجہ بعث و نشر
امام الہدیٰ صدر دیوانِ حشر
یتیمی کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست
تو اصلِ وجود آمدی از نخست
وگر ہرچہ موجود از فرعِ تست

ان کے نزدیک حق و باطل کی تمیز کا معیار بھی محض رسول ﷺ کی تعلیم اور اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی ہے:

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پی مصطفیٰ

خلافِ پیمبر کسی رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

یہی بات ہمارے زمانے میں اقبال نے کہی:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونر سیدی تمام بولہبی است

سعدی کے ہاں شاید فارسی سے بھی بڑھ کر ان کے عربی اشعار کا درجہ ہے۔ اور ان کے یہ شعر تو زندۂ جاوید ہیں:

بلغ العلیٰ بکمالہٖ
کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیعُ خصالہٖ
صلوا علیہ وآلہٖ

جتنی شہرت ان شعروں کو ہوئی ہے وہ غالباً کسی بھی زبان میں نعت کے کسی اور شعر کو نہیں ہوئی۔ خسرو سراپا سوز ہیں اور جس انداز سے حضور کا تذکرہ ان کی زبان پر آتا ہے وہ ان کی سوختہ جانی کا آئینہ دار ہے:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہ ہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم
خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

ان کی ایک مشہور غزل بھی اصل میں نعت ہے اور کس درجے کی نعت:

اے چہرۂ زیبای تو رشکِ بتانِ آزری
ہر چند وصفت می کنم در حسن ازاں بالاتری
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
آفاقہا گر دیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیارِ خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری
خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہر شما

باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

رہے اقبالؔ تو انھوں نے بہ راہِ راست نعت اُردو سے زیادہ فارسی میں کہی ہے۔ ''رموزِ بے خودی'' کے آخر میں ''عرضِ مصنف بہ حضورِ رحمۃ للعالمین'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ جوشِ عقیدت کا مرقع ہے:

اے ظہور تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمینِ بار گاہت ارجمند
آسمان از بوسہ بامت بلند
شش جہت روشن ز تاب روی تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوی تو

محمد عربی ﷺ کی شخصیت اور ان کے پیغام کی آفاقی اہمیت کو اقبالؔ کے سوا اور کون ایسے مختصر اور سیدھے سادے لفظوں میں بیان کرسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس کا حق تھا اُسی کو ملا۔

اقبالؔ کے فارسی کلام میں جابجا جو اشارے ملتے ہیں وہ ایک مستقل نعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً مصطفےٰ کمال پاشا کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

امئی بود کہ ما از اثر حکمت او
واقف از سرِ نہاں خانہ تقدیر شدیم

وہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد حجازی عربوں کی دُنیائے اسلام کے مفاد سے بے وفائی کا گلہ کرنا چاہتے ہیں، مگر اپنے آپ کو روک دیتے ہیں اور کیوں؟

متاعِ قافلۂ ما حجازیاں بردند
ولی زباں نہ کشائی کہ یارِ ما عربی است

اک اور شعر میں یہی دل کی بات اور انداز سے کہی ہے:

درقبای عربی خوشترک آئی بہ نگاہ
راست بر قیامت تو پیرہنی نیست کہ نیست

اقبالؔ جہاں ذاتِ خداوندی سے مخاطب ہیں وہاں بھی ان کے لیے نعت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے:

تو بر نخل کلیمی بی محابا شعلہ می ریزی
تو بر شمع یتیمی صورتِ پروانہ می آئی

عبد اور معبود کے فاصلے کے باوجود خدا اور رسول ﷺ اقبالؔ کے لیے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں:

باخدا پوشیدم گویم باتو گویم آشکار
یارسول اللہ او پنہاں و تو پیدای من

''اسرارِ خودی'' میں جہاں ارتقائے خودی کا بیان ہے وہاں اس ارتقا کی منزل بھی صاف دکھائی دیتی ہے:

شعلہ ہای او صد ابراہیم سوخت
تا چراغِ یک محمد ﷺ بر فروخت

مسلمان کا جو تعلق رسول ﷺ کی ذات سے ہے اسے اقبالؔ ہی بیان کر سکتے ہیں:

در دلِ مومن مقامِ مصطفیٰ است
آبرو ماز نامِ مصطفیٰ است

اگر کہیں یہ خیال آتا ہے کہ اپنے اعمال کی وجہ سے قیامت کے دن رسول ﷺ کے سایے میں پناہ نہ ملی تو کیا ہوگا:

است منی گویدت مولای ما
وای ما اے وای ما اے وای ما

جاوید نامے میں اقبالؔ نے جنت کی بزم سجائی ہے اور بہتوں کو جمع کر دیا ہے۔ اس محفل میں بہت کچھ ہے اور جو کچھ ہے بہت خوب ہے، میں صرف تین اشعار پر اکتفا کروں گا:

غالبؔ کی زبان سے اقبال نے کہلایا ہے:

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃ للعالمینی انتہا است

یہ غالب کی اسی شعر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمتہ للعالمینی ہم بود

پھر وہ حلاج کی زبان سے کہلاتے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یاز نورِ مصطفیٰ اور ابہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

ان چند شعروں میں حقیقت اور معرفت، عشقِ رسالت اور عرفانِ محمد ﷺ سورج کی طرح تاباں اور درخشاں ہیں۔ اقبال کے لیے تخلیقِ کائنات کی ساری غرض و غایت ذاتِ مصطفوی ﷺ ہے۔ اور سارا عالمِ امکاں اسی ایک محور کے گرد گھوم رہا ہے۔

اقبال نے نعت میں بہت کچھ کہا ہے، اور اپنی انفرادیت کی شان پورے طور سے برقرار رکھتے ہوئے کہا ہے، لیکن ذیل کے اشعار میں پوری سیرت النبی ﷺ بیان کر دی ہے:

طور موجی از غبارِ خانہ اش
کعبہ رابیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنون خواب راحتش
تاجِ کسریٰ زیر پائے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محروم نوم
تابہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز
دیدۂ او اشک بار اندر نماز
در دعای نصرت آمیں تیغِ او
قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغ او
از کلیدِ دین در دُنیا کشاد
ہمچو او بطنِ امِ گیتی نہ زاد
در نگاہ او یکی بالا و پست
با غلام خویش بریک خوان نشست

اس سے بڑھ کر ''ارمغانِ حجاز'' کی رُباعیوں پر نظر ڈالیے تو وہاں سوزِ عشق کی کچھ اور ہی

کیفیت ہے، سرکارِ دوعالم ﷺ کے خوف سے اقبالؔ خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کے اعمال کا سرکار کو علم نہ ہو:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شو دبی پردہ ہر پوشیدہ تقریر
مکن رسوا حضورِ خواجہ مارا
حسابِ من زچشمِ اونہاں گیر

ان کی وہ رُباعی بھی دیکھیے جہاں وہ عالمِ تخیل میں حج کو گئے ہیں اور مکے سے مدینے جانے کا قصد رکھتے ہیں:

تنم واماند و جانم درتگ و پوست
سوئے شہری کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و باخاصاں بیامیز
کہ من وارم ہوای منزلِ دوست

فارسی میں غالباً اقبالؔ کی بہترین نعت ''جوی آب'' ہے جو جرمن شاعر گوئٹے کی مشہور نظم ''نغمۂ محمد ﷺ'' کا آزاد ترجمہ ہے۔ گوئٹے اسلام، قرآن اور جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات سے گہرے طور پر متاثر ہے۔ ''نغمۂ محمد'' ایک غیر مسلم کی تصنیف ہونے کے باوجود دُنیا کی بہترین نعتوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اقبالؔ کا فارسی ترجمہ اقبال اور گوئٹے دونوں کے روحانی بصیرت اور شاعرانہ عظمت کا آئینہ دار ہے:

در راہِ او بہار پری خانہ آفرید
نرگس و میدو لالہ مید و سمن و مید
گل عشوہ دار و گفت یکی پیشِ ما بایست
خندید غنچہ و سرِ دامانِ و کشید
ناآشنائی جلوہ فروشانِ سبز پوش
صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید
زی بحر بےکراں چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

صد جوی دشت و مرغ و کہستان و باغ وراغ
گفتند ای بسیطِ زمیں باتو سازگار
مارا کہ راہ از تنک آبی نہ بردہ ایم
از دستبرد ریگِ بیاباِ نگاہدار
واکردہ سینہ را بہ ہوا ہای شرق و غرب
در برگرفتہ ہم سفرانِ زبوں و زار
زی بحرِ بےکرانہ چہ مستانہ می رود
باصد ہزار گوہر یک دانہ می رود
دریای پُر خروش ز بند و شکن گزشت
از تنگنای وادی و کوہ و دمن گزشت
یکساں چوسیل کردہ نشیب و فراز را
از کاخِ شاہ و بارہ وکشت و چمن گزشت
بےتاب و تیز و تند و جگر سوز و بے قرار
در ہر زباں بتازہ رسید از کہن گزشت
زی بحرِ بےکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ مہ رود

جس وضاحت اور خوب صورتی سے یہ نظم جناب رسالت مآب ﷺ کی سیرت کی یکسوئی، انسانیت نوازی اور ایک مسلسل اور مستقل تخلیقی جدوجہد کی عکاسی کرتی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ آخری بند کا تیسرا شعر خود حضور کے اس قول کا آئینہ دار ہے کہ من اسویٰ یوماہُ فھو مغبون۔ جس شخص کے دو دن ایک ہی جیسے گزر جائیں وہ بڑے گھاٹے میں ہے۔

فارسی کے سارے نعت گوشعرا کا تذکرہ کرنا میرے محدود علم اور وقت سے باہر ہے، مگر ایک آدھ اور شعر کے ذکر کے بغیر تسلی نہیں ہوتی۔ حافظؔ نے کوئی مستقل نعت نہیں کی، مگر غالبؔ کی طرح غزل میں چلتے چلتے ایک آدھ نعتیہ شعر کہہ جاتے ہیں تو بڑے بڑے نعت گویوں کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں:

نگارِ من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

یا

اگرچہ عرض ہنر پیشِ یاربی او بیست
زباں خموش و لیکن وہان پُر از عربیست

جامی کا پایہ نعت میں بلند ہے۔نمونے کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

نسیم الصّبحِ زُو منّی ربی نجدِ و قبّلها
کہ بوی دوست می آید ازاں پاکیزہ منزلہا

اور یہ شعر بھی غالباً انھی کا ہے:

لایمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جامیؔ کے دو اور شعر سنیے:

خوشا مسجد و منزل و خانقاہی
کہ دروی بود قیل و قالِ محمد
بہ صدق و صفا کشتہ بی چارہ جامیؔ
غلامِ غلامانِ آلِ محمد ﷺ

جامیؔ کی فریاد بھی سننے کے قابل ہے، اور آج بھی حسبِ حال ہے:

اے بہ سرا پردۂ یثرب بہ خواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب
دیدۂ عالم بہ تو روشن شود
گلخنِ گیتی بہ تو گلشن شود

اور یہ فریاد کرنے والا شاعر اپنے رسول سے کیسے دل میں کُھب جانے والے انداز میں خطاب کرتا ہے:

بندۂ تو ہم عجم و ہم عرب
اے عربی نسب و اُمی لقب
گردِ سرت ابطحی و یثربی
خاکِ درت مشرقی و مغربی

فیضیؔ کے افکار اور کردار کے بارے میں لوگوں کی جو رائے بھی ہو، اس میں شبہ نہیں کہ اس کا دل حُبِ رسول ﷺ سے معمور تھا۔اس نے جو نعتیہ اشعار کہے ہیں وہ محض الفاظ کی صنعت گری نہیں، وارداتِ قلبی ہیں۔

فیضیؔ کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

اُمی و دقیقہ دانِ عالم
بی سایہ و سائبانِ عالم

اور ذیل کے اشعار تو تاریخِ نعت کا قابلِ فخر حصہ ہیں:

ما طائرِ قدسیم نوا رانہ شناسیم
مرغِ ملکو تیم ، ہوا رانہ شناسیم[☆۱]
برہانِ ثبوتیم زما نہی نیا ید
از ما نعم آموز کہ لا رانہ شناسیم
با اہلِ جدل نکتۂ توحید نہ گوئیم
در وحدتِ حق چون و چرا رانہ شناسیم
در کشف حقائق سبق آموز ضمیریم
ترتیبِ دلیلِ حکما رانہ شناسیم
اصحابِ یقینیم گماں رانہ پسندیم
اربابِ صوابیم خطا رانہ شناسیم

اور آخر میں یہ کہ:

بردانش ما انجم و افلاک بہ خندید
گر صاحبِ لولاک لما رانہ شناسیم

غالب کے ہاں فارسی میں بھی نعتیہ کلام موجود ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

ہر کس قسم بہ آنچہ عزیز است می خورد
سو گندِ کردگار بہ جانِ محمد است
تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ آں زکمانِ محمد است

اور مقطع کیا خوب کہا ہے:

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشیتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

☆۱۔ اس مصرع کے نقل کرنے میں کچھ سہو ہوا ہے۔ افسوس کہ صحیح مصرع مجھے نہیں مل سکا۔ حمید احمد خان

گرامی، فارسی زبان کے مایۂ فخر شاعر تھے۔ متاخرین میں اقبال کے علاوہ ان سے بڑا کوئی شاعر برِصغیر میں پیدا نہیں ہوا۔ ان کے دو شعر ہیں:

خاور دمداز شبم بہ ایں تیرہ شبی
کوثر چکد از لبم بہ ایں تشنہ لبی

اے دوست، ادب کے در حریمِ دلِ ماست
شاہنشۂ کونین رسولِ عربی ﷺ

اور قدسی کی نعتیہ غزل کس کو یاد نہ ہوگی، جس کا مطلع ہے:

مرحبا سیّدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کسی اور کا شعر ہے۔ یاد نہیں کس کا:

موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبمی

ایک اور شاعر نے دیکھیے کیا نکیلا شعر کہا ہے:

دل از عشقِ محمد ریش وارم
رقابت با خدای خویش دارم

فارسی کے نعتیہ اشعار کا تذکرہ ایسا ہے کہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اُردو کی وہ نعتیں، جن میں سے بعض کا تذکرہ میں نے کیا ہے اور جنھیں میں اُردو کی بہترین نعتیں سمجھتا ہوں، ایک مجموعے کی صورت میں خوش نما انداز سے چھاپی جائیں تاکہ ہم ان کے ذریعے ازسرِنو محمد عربی ﷺ کی شخصیت سے آشنا ہو سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ موجودہ مجموعے کی اشاعت سے میری یہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ اس مجموعے میں کوشش کی گئی ہے کہ اُردو کی قابلِ قدر نعتیں یک جا کی جائیں۔ غیر مسلم شعرا کا کالم خاص طور پر شامل کیا جائے۔ مسلمان شعرا کا کلام جس حد تک حاصل ہو سکا اس کا انتخاب مجموعے میں شامل ہے۔ البتہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ایسے نعتیہ کلام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس میں خدا اور بندے کا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس مجموعے میں ان نعتوں کو جن کا تعلق یا تو کردارِ رسالت اور ختمی مرتبت کے اسوۂ حسنہ سے ہے یا ذاتِ رسالت سے گہری دل بستگی کا اظہار ہے، عام روایتی غزل نما نعتیں جو ذاتِ رسالت کو زیب نہیں دیتیں، انھیں حتی الامکان منتخب نہیں کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب ایک ذاتی نوعیت کا ہے جس کی

بنیاد لازماً میرے ذاتی ذوق پر ہے۔ اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور میری تو یہ تمنا ہے کہ ایسے اور انتخاب بھی چھپیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے اس سے بہتر ہوں گے۔

یہی کام اب فارسی، بنگالی اور پاکستان کی دوسری زبانوں میں بھی انجام پانا چاہیے۔ بنگالی اور قدما کے علاوہ خود ہمارے زمانے میں قاضی نذرالاسلام نے یادگار نعتیں لکھی ہیں، اور ان میں کہیں کہیں ایسے شعرا بھی ہیں جنھیں اُردو بھی کہا جا سکتا ہے اور بنگالی بھی۔ ایک نعت کا پہلا مصرع ہے:

نام محمد ﷺ بول

اسی طرح پنجابی، سندھی اور پشتو میں بھی ایسی نعتیں موجود ہیں جن کی سادگی اور بے ساختہ پن کا تقاضا ہے کہ انھیں یک جا کیا جائے۔

عربی میں غالباً سب سے پہلی نعت حضرت ابوطالب بن عبدالمطلب کی ہے جس کا ایک شعر بہت مشہور ہے:

وعرضت دیناً لا محالة انه

من خیرا دیان البریه دُنیا

اور غالباً سب سے بے ساختہ وہ اشعار ہیں جو مدینے کی لڑکیوں نے حضور ﷺ کی آمد پر گائے:

طلع البدر علینا

من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا

مادعی لِلّٰہ داع

نعتیہ اشعار حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب جناب خدیجۃ الکبریٰؓ، جناب سیّدۃ النسا، جناب ابوبکر صدیقؓ، جناب علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام، جناب عائشہ صدیقہؓ اور بہت سے اصحاب کبار اور ائمہ اطہار سے بھی منسوب ہیں۔

عربی میں چند نعتیہ قصیدے زبان زد خلائق ہیں یا تھے۔ ان میں بوصیری کا قصیدہ بردہ:

امن تذکر جیران بذی سلم

اور کعب بن زہیر کا ''بانت سعاد'':

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول

سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ مگر ان کے علاوہ بے شمار اشعار اور قصیدے نعت کے مضمون میں موجود ہیں۔ اگر ان کا انتخاب ایک مجموعے کی صورت میں چھپ سکے تو بہت اچھا ہو۔

میں لکھتے لکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لازم ہے کہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے اس ذکرِ جمیل کو مختصر کروں۔ البتہ جی یہ ضرور چاہتا ہے کہ حسانؓ بن ثابت کا ایک شعر اور پیش کروں جس سے بڑھ کر آج تک کسی زبان میں نعت کا کوئی شعر نہیں کہا گیا ہے۔ حسانؓ فرماتے ہیں:

خلقت مبّراً من کلِّ عیب

کانّک قد خلقت کما تشآءُ

یعنی اے محمد ﷺ تو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے، گویا تو بعینہٖ ایسا پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ تو خود چاہتا تھا۔

اس شعر کے کیا کہنے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ اجازت ہوتی کہ اللہ میاں سے یہ کہہ سکیں کہ ہمیں کیسا بنایا جائے، تو خدا معاف کرے، بہت سی فرمائشیں کرتے۔ اپنی جسمانی، دماغی اور روحانی کوتاہیوں اور کم زوریوں کا کس کو احساس نہیں ہے، اور ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کسی نہ کسی وقت یہ خواہش نہ کی ہو کہ کاش خدا نے مجھے یوں نہیں یوں بنایا ہوتا۔ مگر یہ تو ہم عام آدمیوں کی باتیں ہیں۔ دُنیا کے سب سے بڑے انسان نے اپنے متعلق کیا سوچا، یہ کون جان سکتا ہے اور پھر یہ تصور کہ اس انسان کو خدا نے اس کی اپنی خواہش اور معیار ہی کے مطابق بنا دیا۔ تو اس کو اور اس کی ذات کے کمالات کو کون پہنچ سکتا ہے۔

جمال پانی پتی

نعت گوئی کا تصورِ انسان

یہ بنیادی بات کم و بیش ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام مندرجہ ذیل چار چیزوں کا مجموعہ ہے:

۱۔ ایمان

۲۔ عقائد

۳۔ عبادات

۴۔ اخلاقیات و احکام

ان چاروں میں ایمان کی اہمیت بنیادی ہے۔ ایمان کے بعد عقائد کا درجہ ہے جس کا مطلب ہے دل کی تصدیق کے ساتھ توحید، رسالت اور آخرت کو ماننا۔ اس کے بعد عبادات، یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا نمبر ہے۔ اور آخری درجہ اخلاقیات اور احکام کا ہے جن کا دائرہ انسان اور انسانی رشتوں کے گرد گھومتا ہے۔ ان تمام باتوں کو ماننے اور ان پر عمل کرنے کا مقصد ہے رضائے الٰہی اور سعادتِ اُخروی کا حصول۔ لیکن عہدِ جدید میں مغربی اثرات کے تحت مذہب کا جو نیا تصور ہمارے ہاں پیدا ہوا اور پروان چڑھا ہے، اس میں عقائد اور عبادات کی اہمیت ثانوی ہوگئی اور مذہب کا مقصد اخلاق کی درستی قرار پایا۔ مذہب کے اس نئے تصور کو قبول کرنے کا منطقی نتیجہ اس سوال کی صورت میں برآمد ہونا لازمی تھا جو تھوڑے ہی دنوں میں پیرویِ مغربی کرنے والوں میں سے بہت سوں کی زبان پر آنے لگا۔ سوال یہ تھا کہ اگر ایک شخص سچ بولتا ہے، ایمان دار ہے، کسی کو دھوکا نہیں دیتا، دکھ تکلیف نہیں پہنچاتا، پڑوسیوں کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے، اپنے پرائے کے کام آتا ہے اور اعزہ و اقربا کے حقوق بھی ادا کرتا ہے تو ایسے شخص کے لیے نماز پڑھنا یا روزہ رکھنا کیوں ضروری ہے؟ دوسرے لفظوں میں اصل سوال یہ تھا کہ اخلاق کے ہوتے ہوئے عقائد اور عبادات (یعنی مذہب) کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سوال جو عہدِ جدید میں لفظ بدل کر بار بار مختلف

انداز سے پوچھا گیا، جواب دینے والوں کی طرف سے اس کے دو مختلف جواب دیے گئے۔ ایک یہ کہ مذہب کا مقصد ہی اخلاقیات کی درستی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اخلاقیات کو درست کرنے کے لیے مذہب کی کوئی ضرورت نہیں، اس کام کے لیے تنہا عقلِ انسانی ہی کافی ہے۔ سر سیّد احمد خاں پہلے جواب کے قائل تھے۔ یعنی مذہب کو اخلاق کی درستی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' اسی نقطۂ نظر کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف تھا۔

سر سیّد کی طرح مولانا الطاف حسین حالی بھی مذہب کو اخلاق سدھارنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ:

> تمام ادیان کا خاص مقصد تہذیب الاخلاق کے سوا اور کوئی شے نہ تھی۔
> (کلیاتِ نثرِ حالی، جلد اوّل، ص ۱۵)

چناں چہ مولانا حالی نے ''مسدس مدوجزرِ اسلام'' میں رسولِ کریم ﷺ کی جو تعریف ''خطاکار سے درگزر کرنے والا'' اور ''اپنے پرائے کا غم کھانے والا'' جیسی صفات بیان کر کے کی، اس کے پیچھے بھی یہی اخلاقی نقطۂ نظر کارفرما تھا۔ محمد حسن عسکری نے جو روایتی اسلام کے ماننے والے تھے اور اخلاقیات کو ایمان، عقائد اور عبادات کے بعد چوتھے درجے پر رکھتے تھے، رسولِ کریم ﷺ یہ تعریف سن تو فقرہ کسا کہ خیر اتنا کام تو مولانا حالی خود بھی کر لیتے ہوں گے۔ مولانا حالی اخلاقی آدمی ضرور تھے مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کے اخلاق پر مذہب کا سایہ تھا۔ بعد میں آنے والوں نے مذہب کے دُم چھلّے کو غیر ضروری سمجھا اور صاف اعلان کر دیا کہ اخلاقیات کے لیے عقلِ انسانی ہی کافی ہے۔ یہ سیکولر اخلاق کا نقطۂ آغاز تھا۔ مگر ہمیں یہاں اخلاقیات سے نہیں اس تصورِ انسان سے غرض ہے جو نعت گوئی کی روایت کے قدیم و جدید ادوار میں تمام نعت گو شعرا کا موضوعِ سخن رہا اور جس کے محامد و محاسن کا تذکرہ ہر نعت گو شاعر کا سرمایۂ دین و ایماں ہے۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ نعت گوئی کے دورِ قدیم کا خاتمہ محسن کاکوروی پر اور جدید دور کا آغاز مولانا حالی سے ہوا۔ لہٰذا میں نے بھی محض اپنی آسانی کی خاطر نعت گوئی کے تصورِ انسان پر اپنی معروضات پیش کرنے کے لیے بنیادی حوالہ انھی دونوں کو بنایا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے محسن کاکوروی پر محمد حسن عسکری کے اس مضمون کو پیشِ نظر رکھا ہے جس میں انھوں نے مولانا حالی کی نعت گوئی کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

محمد حسن عسکری نے محسن کاکوروی پر اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ حالی کے زمانے سے بہت پہلے رسولِ کریم ﷺ کے پہلوئے بشریت پر زور دینے والے لوگ پیدا ہو چکے تھے۔ ان

لوگوں کا کہنا تھا کہ رسولِ کریم ﷺ کی عزت بس اتنی ہی کرنی چاہیے جتنی کہ بڑے بھائی کی۔ اس کے بعد آگے چل کر سرسید کے زیرِ اثر اور پیرویِ مغربی کے شوق میں ابھرنے والے لارڈ میکالے کے عقیدت مندوں کے نزدیک نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ آنحضرت ﷺ محض پیغمبر نہیں، بلکہ مصلح اور ریفارمر سمجھے جانے لگے۔ مولانا حالی، سرسید کے زیرِ اثر بھی تھے اور ہمارے ادب میں پیرویِ مغربی کے مبلّغ بھی۔ انھوں نے ایک طرف تو اپنی ''مسدس'' میں آنحضرت ﷺ کے پہلوئے بشریت و عبدیت کو ابھار کر پیش کیا ہے اور دوسری طرف بقول محمد حسن عسکری ان فوائد کی فہرست بنائی ہے جو آنحضرت ﷺ سے انسانیت کو اور بالخصوص عرب کو پہنچے۔ یا پھر اخلاقی محاسن گنوائے ہیں۔ حالی کی نعت کے سوز و گداز، اس کی مٹھاس اور کسک کے تو خیر عسکری صاحب بھی قائل تھے مگر انھوں نے حالی اور محسن کاکوروی کو ایک دوسرے کے تقابل میں رکھ کر دیکھتے ہوئے بتایا کہ محسن کاکوروی کی نعت کا تصورِ انساں کچھ اور ہے، اور حالی کی نعت کا کچھ اور۔ اس لیے کہ محسن کاکوروی کے ہاں رسولِ کریم ﷺ کی حقیقت ''انسانی'' نہیں، انسانی حقیقت تو حالی کی نعت میں ظاہر ہوئی ہے جنھوں نے انسانی خوبیوں کا بہی کھاتا لکھا ہے۔ اس کے برعکس محسن کاکوروی کے ہاں رسولِ کریم ﷺ کی حیثیت کا تعلق ماورائی حقیقت کے اس مقام سے ہے جسے حقیقتِ محمدیہ کہتے ہیں۔ مولانا حالی نے ''مسدس'' میں رسولِ کریم ﷺ کو یتیموں کا والی اور غلاموں کا مولا کہہ کر آپ ﷺ کی تعریف کی تھی، عسکری صاحب کہتے ہیں کہ خیر اتنی بات تو محسن کاکوروی بھی مان لیتے کہ رسولِ کریم ﷺ یتیموں کے والی اور غلاموں کے مولا ہیں، لیکن ان کی نظر میں آنحضرت ﷺ کی شان دراصل یہ تھی کہ وہ ''با میم احد اور احمد بلا میم'' ہیں۔ عسکری صاحب کا کہنا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی بنیادی صفت یہی ہے، خطاکار سے درگزر کرنے والا نہیں۔ ان کے بقول یہ وہی تصورِ انسان ہے جو رسولِ کریم ﷺ کے بارے میں مغرب پرستی، عقل پرستی اور خود پرستی سے پہلے تمام مسلمانوں کا تھا۔

گویا عسکری صاحب کے نزدیک حالؔی اور محسؔن دونوں ہی کو حضور نبیِ کریم ﷺ کی صرف ایک جہت سے سروکار رہا۔ حالؔی نے آپ ﷺ کی بشری یا انسانی جہت کو لے لیا، ماورائی یا نوری جہت کو چھوڑ دیا۔ محسؔن نے ماورائی یا نوری جہت کو لے لیا، بشری یا انسانی جہت کو چھوڑ دیا۔ حالاں کہ بشری جہت ہو یا نوری دونوں ہی جہتیں، آپ کی جہتیں ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو نور بھی کہا ہے اور بشر بھی۔ بشری جہت کے بارے میں جہاں حق تعالیٰ نے آپ سے کہلوایا کہ:

''کہہ دو کہ میں تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں۔''

وہاں نوری جہت کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

''بے شک آچکا ہے تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور، اور واضح کتاب۔''

علاوہ ازیں آپ ﷺ کے اسمائے مبارکہ میں سے آپ کا ایک نام ''نور'' بھی ہے جو ہماری توجہ آپ ﷺ کی اسی معنوی اور ماورائی جہت کی طرف مبذول کراتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کی نوری جہت ہو یا بشری، دونوں ہی برحق ہیں اور دونوں ہی نعت کا موضوع ہیں۔ لہٰذا نعت کہنے والا آپ کی کسی ایک جہت کو بھی اپنی نعت کا موضوع بنا سکتا ہے اور دونوں جہتوں کو بھی۔ محض اس بنا پر کہ اس نے ایک جہت کو لیا اور دوسری کو چھوڑ دیا، کسی بھی نعت گو کو دوسرے سے کم تر یا برتر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاوقتے کہ وہ ایک ہی جہت کو کُل سمجھ کر دوسری کو نظر انداز نہ کرے۔ اور پھر دیکھنے کی بات تو دراصل یہ ہے کہ کس نعت گو کے جذبے میں کتنی سچائی، محبت میں کتنی گہرائی اور فکر میں کتنا خلوص ہے۔ کوئی آپ ﷺ کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور آپ ﷺ کے کن اوصاف کو اپنی نعت کا موضوع بناتا ہے، یہ تو اپنی اپنی فکر وفہم اور اپنے اپنے زاویۂ نظر کی بات ہے۔ ورنہ سوائے خدا کے آپ ﷺ کی تعریف کا حق تو آج تک نہ کسی اور سے ادا ہوسکا ہے نہ آئندہ ہوسکے گا۔ سب اپنی اپنی فکر وفہم اور اپنے اپنے قیاس و ادراک ہی کے مطابق آپ ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔

ترا چنانکہ توئی ہر نظر کجا بیند
بقدرِ دانشِ خود ہر کسے کند ادراک

سلیم احمد نے اپنی کتاب ''محمد حسن عسکری... آدمی یا انسان'' میں بتایا ہے کہ عسکری صاحب اپنے ادبی سفر میں ایک عمر تک ''آدمی اور انسان'' کے مسئلے سے الجھے رہے۔ روسو کے فطری انسان، جوئس کے نامکمل انسان اور مغربی ادب کے مطالعے کے دوران اپنے تجربے میں آنے والے ہر قسم کے تصورِ انسان سے غیر مطمئن ہونے اور اسے رد کرنے کے بعد وہ جس نئے تصورِ انسان کی تلاش میں تھے، اس کا سراغ انھیں بالآخر محسن کاکوروی کے ہاں جا کر ملا۔ عسکری صاحب اس سے پہلے انسان کی تلاش کسی ماورائی تصور کے بغیر انسانی سطح پر کر رہے تھے۔ محسن کاکوروی کے نعتیہ کلام کے مطالعے کے دوران وہ اچانک جس تصورِ انسان سے دوچار ہوئے اس کی ماورائی جہت میں انھیں اپنے مسئلے کا حل مل گیا۔ انھیں یہ تصورِ انسان اپنی ماورائی جہت کے ساتھ اس قدر پسند آیا کہ وہ اس کا تقابل بار باران تصوراتِ انسانی سے کرنے لگتے ہیں جو ہمارے ہاں مغرب پرستی، عقل پرستی اور خود پرستی کے دور میں پھیلے۔ محسن کاکوروی کی نعت کے تصورِ انسان میں ماورائی جہت کی اس

پسندیدگی کے باعث وہ حالؔی کو انسانی خوبیوں کا بہی کھاتا لکھنے کا طعنہ دیتے ہیں۔ لیکن اوّل تو آپ ﷺ کی انسانی جہت کے حوالے سے آپ کے اوصاف کے بیان کو انسانی خوبیوں کی بہی کھاتا قرار دینا بجائے خود محلِ نظر ہے، دوسرے حالؔی کی ''مسدس'' سے قطعِ نظر کر کے دیکھیں تو ہمیں ان کے دیوان میں قدیم رنگ کے کم از کم دو نعتیہ قصائد اور ایک نعت ایسی ضرور ملتی ہے جس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی کی نظر آپ ﷺ کی دونوں ہی جہات پر تھی۔ چناں چہ اتنی بات تو ہمیں ان کی نعت کا یہ مطلع ہی بتا دیتا ہے کہ وہ صرف آپ ﷺ کی کسی ایک جہت کو نہیں، بلکہ دونوں ہی جہات کو مانتے تھے:

یاملکی الصفات یا بشری القویٰ
فیکَ دلیلٌ علیٰ انک خیر الوریٰ

اس طور پر دیکھیے تو حالی کے بارے میں عسکری صاحب کی رائے مبنی برانصاف نہیں معلوم ہوتی۔ مگر قدیم رنگ کی یہ نعت اور ان کے دونوں نعتیہ قصائد سرسید کے زیرِ اثر آنے سے پہلے کی چیزیں ہیں۔ سرسیّد کے ہاتھ پر بیعت کرنے اور مغرب کو دل دے بیٹھنے کے بعد حالی نے کوئی باقاعدہ نعت لکھی ہی نہیں۔ قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے ''مسدس مدوجزرِ اسلام'' البتہ لکھی۔ مگر اس ''مسدس'' کے بعض نعتیہ بندوں کے باوجود یہ کوئی باقاعدہ نعت نہیں۔ اس لیے حالی نے اگر اس نظم میں اپنے موضوع کی مناسبت سے آنحضرت ﷺ کے پہلوئے بشریت ہی کو ابھار کر پیش کیا تو اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس نظم کے نعتیہ اشعار میں حضور نبیِ کریم ﷺ کی بشریت اور عبدیت کا رنگ ایسا غالب ہے کہ یقین نہیں آتا، حالؔی جیسا آدمی رسولِ کریم ﷺ کو عام انسانوں کی سطح پر لا کر خود آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اپنی بندگی بے چارگی کا اعتراف اس طرح بھی کرا سکتا ہے:

سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی اک اس کا بندہ
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم
کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم

حالؔی کی ''مسدس'' کی دل میں کھب جانے والی سادگی، اس کی بے پناہ تاثیر اور سب سے بڑھ کر وہ خلوص اور دردمندی جو پوری نظم میں شروع سے لے کر آخر تک ایک برقی رو کی طرح دوڑی ہوئی ہے، اس نظم کی یہ سب خوبیاں تسلیم۔ مگر جو لوگ اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اردو

میں کوئی نعت حالی کی ''مسدس'' کے برابر موجود نہیں، انھوں نے غالباً اس بات پر غور نہیں کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بے مثل بشریت اور عبدیتِ کاملہ کو ہم آپ جیسے عام انسانوں کی سطح کے برابر لانے سے نعت گوئی کا حق ادا کرنا تو رہا درکنار، خود ایمان کی سلامتی بھی خطرے میں پڑسکتی ہے۔ اس لیے کہ جہاں آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے مرتبے سے بڑھا کر الوہیت کے درجے پر فائز کرنا شرک ہے وہاں آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے مرتبے سے گرانا بھی تو نقصِ ایمانی کی دلیل ہے۔

اب یوں کہنے کو تو حالی بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ان اشعار میں کوئی بات ایسی نہیں کہی، جو قرآن و حدیث میں پہلے سے مذکور نہ ہو۔ مگر بندگی بے چارگی کے اس اعتراف میں جو انھوں نے حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے کرایا ہے، حضور نبی کریم ﷺ کی مدح و ثنا کا کون سا پہلو نکلتا ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

حالی نے اردو ادب کو پیرویِ مغربی کی راہ پر ڈال کر جدیدیت کا سبق تو بے شک پڑھایا، اور بہت خوب پڑھایا۔ مگر ہمارا کہنا یہ ہے کہ باقاعدہ نعت انھوں نے قدیم روایتی رنگ ہی میں لکھی۔ اس کے باوجود اگر نعت گوئی میں جدید حسیّت کے حوالے سے ہونے والی تبدیلیوں کا نقطۂ آغاز بھی ''مسدسِ حالی'' کو قرار دے کر نعت گوئی کے جدید رجحان کا سہرا بھی انھی کے سر باندھا جاتا ہے تو ہمارے خیال میں اس کا کریڈیٹ حالی سے کہیں زیادہ ہمارے ان نقادانِ کرام کو جانا چاہیے جو نہ صرف یہ کہ ان کی ''مسدس مدو جزرِ اسلام'' کو ایک مکمل نعت قرار دیتے ہیں، بلکہ نعت گوئی کے دورِ قدیم کا اختتام محسن کاکوروی پر کرتے ہوئے اس کے دورِ جدید کا آغاز بھی حالی ہی سے کرتے ہیں۔

خیر آپ کے بشر ہونے میں تو کس صاحبِ ایمان کو کلام ہوسکتا ہے کہ اس پر تو قرآن کریم کے یہ الفاظ خود بھی شاہد ہیں کہ ''میں تو بس تمھی جیسا ایک بشر ہوں۔'' مگر اس کے ساتھ یہ بھی تو خود آپ ﷺ ہی کا ارشاد ہے کہ:

> میں تم میں سے کسی کی طرح نہیں ہوں، بلکہ اپنے رب کے پاس رہتا ہوں، وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے (البخاری)

بظاہر ان دونوں باتوں میں ایک تضاد محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے مختلف فرقے بن گئے ہیں۔ کوئی ایک بات کو پکڑ کر بیٹھ گیا ہے، کوئی دوسری کو۔ خود عسکری صاحب نے بھی ''مسدسِ حالی'' کے تصورِ انسان اور محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری کے تصورِ انسان کا جو تقابلی موازنہ اپنے مضمون میں پیش کیا ہے اس سے بھی آپ ﷺ کی انسانی جہت اور ماورائی جہت کے باہم مختلف اور متضاد ہونے کا تأثر ابھرتا ہے۔ لیکن یہ ہمارا ہی قصورِ فہم ہے جو ہمیں ایسا سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ورنہ ان دونوں جہات میں

کوئی ایسا تضاد نہیں کہ ان کا ایک ہی محل میں جمع ہونا ممکن نہ ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ یوں تو انسان بھی بنیادی طور پر ایک حیوان ہی ہے جو ذی حیات ہونے میں دوسرے حیوانات کے ساتھ برابر کا شریک ہے، لیکن وہ اپنے نطق کی وجہ سے دوسرے حیوانات سے ممتاز بھی ہے۔ تو جس طرح ایک فرق نطق کی بنا پر انسان اور حیوان کے درمیان ہے، اسی طرح ایک فرق آنحضرت ﷺ اور دوسرے انسانوں کے درمیان بھی ہے۔ اس لیے کہ آپ دوسرے انسانوں کے ساتھ انسان ہونے میں تو بے شک برابر کے شریک ہیں مگر جس طرح انسان اپنے نطق کی وجہ سے دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے اسی طرح آپ ﷺ بھی باوجود اشتراکِ انسانیت، اس نورِ نبوت کی بنا پر جس کی وجہ سے آپ کو حق تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا، دوسرے انسانوں سے ممتاز بھی ہیں۔ قرآنِ کریم میں جہاں آپ کی بشریت کے لیے ''بشر مثلکم'' آیا ہے وہاں ''یوحیٰ الیّ'' سے اس امتیاز کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کا دوسرے انسانوں کے مثل ہونا اور نہ ہونا، ان دونوں باتوں میں کوئی ایسا تضاد نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی محل میں جمع نہ ہوسکیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جوشِ عقیدت میں آپ ﷺ کی عبدیت کو الوہیت سے جاملانا، ممکن کو واجب اور واجب کو ممکن قرار دینا، کھلا ہوا کفر ہے۔ اور نعتیہ شاعری کی تنقید میں نعت گو شعرائے کرام کی توجہ اس جانب مبذول کرا کے انھیں اس قسم کی خطرناک لغزشوں سے خبردار رہنے کا مشورہ دینا بہت اچھی بات ہے۔ مگر آپ کی بشریت کو عام انسانوں کی بشریت پر قیاس کر کے آپ کو زیادہ سے زیادہ بڑے بھائی یا کسی بڑے مصلح اور رہبر کا درجہ دینا بھی تو آپ کی شانِ اقدس کے سراسر منافی اور دین و ایمان کے تقاضوں کے یکسر خلاف ہے۔ نعت گوئی کے جدید رجحان کا نقطۂ آغاز خواہ آپ حالی کو قرار دیں یا کسی اور کو، مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ رجحان جہاں اپنے جلو میں بہت سی ایسی قابلِ قدر اور خوش آئند تبدیلیاں لے کر آیا ہے جن سے نعت گوئی کا اسلوب و آہنگ خوب سے خوب تر اور اس کا افق وسیع سے وسیع تر ہوا ہے، وہاں بعض ایسی چیزیں بھی اس رجحان کے ساتھ ہماری نعت گوئی میں درآئی ہیں جو نعت گوئی کی اسلامی روایت کے بنیادی مزاج کے سراسر خلاف، بلکہ اس کی نفی کرنے والی ہیں۔ سرسیّد کے زیرِ اثر اور پیرویِ مغربی کے بڑھتے ہوئے شوق کی بدولت رسولِ کریم ﷺ کے پہلوئے بشریت پر زور دینے والے ایسے لوگ تو بقول محمد حسن عسکری ہمارے ہاں پہلے ہی پیدا ہوچکے تھے جو آپ ﷺ کو بڑے بھائی یا ایک بڑے مصلح اور ریفارمر کا درجہ دیتے تھے۔ پھر شوق کی یہی لے جب اور آگے بڑھی تو ہمارے ہاں ترقی پسند تحریک اور مغرب کی جدید ادبی تحریکات کے دورِ عروج میں نعت گوئی کا چلن ایسا متروک ہوا کہ اِکادُکا

مُستثنیات سے قطعِ نظر مجموعی طور پر ہمارے شعرائے کرام کا نعت گوئی سے کوئی واسطہ ہی باقی نہ رہا۔ رہتا بھی کیسے؟ جب کہ ادب کے بنیادی دھارے میں ایسے لوگوں کے قدم مضبوطی کے ساتھ جم چکے تھے جو حمد و نعت تو رہی الگ، خود مذہب ہی کو ایک آؤٹ ڈیٹڈ چیز سمجھنے لگے تھے۔ چناں چہ ہمارے ہاں بعض ایسے اہلِ نظر بھی اسی دور میں پیدا ہوئے جن کے نزدیک نورِ سحر ہی نورِ رسالت کا قائم مقام بن چکا تھا۔ چناں چہ یہ انھی کا ارشاد ہے کہ:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی

اب بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے ادب کا رشتہ اپنی روایت، اپنے دین اور اپنے مرکزی نظامِ فکر سے یکسر منقطع ہو کر رہ جائے گا، لیکن ہمارے اجتماعی شعور کے باطن میں ردِ عمل کی جو مثبت قوتیں اندر ہی اندر کام کر رہی تھیں، ان کے زیرِ اثر بہت جلد ایسی تبدیلی نمودار ہوئی جس کی بدولت ہمارے شعرائے کرام ہی کی صفوں میں سے بعض لوگ انھی مثبت قوتوں کی علامت بن کر نکلے اور انھوں نے اپنی نعت گوئی کے ذریعے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر سے جوڑنا شروع کر دیا۔ پھر تو آہستہ آہستہ کم و بیش سارے ہی بھولے بھٹکے اپنے مرکز کی طرف واپس لوٹ آئے اور اس ذاتِ گرامی کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے لگے جس کے دامنِ رحمت میں پناہ لینے کے سوا، اب انھیں اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا تھا۔ مگر انھی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو شاید مارے باندھے یا بر بنائے مصلحت لوٹ تو ضرور آئے اور نعت گوئی کے جدید دھارے میں شامل بھی ہو گئے مگر ان کا دل ان کی زبان کا ساتھ نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں انھی میں کچھ لوگ وہ بھی شامل ہیں جو اب بھی حضور نبیِ کریم ﷺ کو ایک بڑا مصلح یا رہبر مان کر آپ ﷺ کی شان میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ چوں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر جدید مغربی تہذیب کے لادینی اور غیر روایتی اثرات کی زد میں آنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح یہ بھی وہی لوگ ہیں جو انسان کے بارے میں جدید مغرب کے مادی اور عقلی فلسفوں اور انسان پرستی (Humanism) جیسی تحریکات کے زیرِ اثر کائنات میں انسان سے اوپر کسی چیز کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے یہ بات کہ پیغمبر انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی فطرت میں ایک ایسے ماورائی عنصر کا حامل بھی ہوتا ہے جو اسے دوسرے تمام انسانوں سے ممتاز کر کے ان سے اوپر اٹھا دیتا ہے، ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی ۔یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے نعتیہ کلام سے نعت گوئی میں ایک ایسی روش بھی چل نکلی ہے جو نعت کے بنیادی مزاج اور روایت کی نفی کرتی ہے۔ اس روش کو بعض لوگوں نے سیکولر نعت کا نام دیا ہے۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ نعت کی تنقید کا جو سلسلہ ہمارے ہاں ''نعت رنگ'' اور بعض دوسرے رسائل میں شروع ہوا ہے، اس میں نعت گوئی کے اس انداز پر گرفت بھی کی جارہی ہے۔ اس کے باوجود اوّل تو ہمارے لیے اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ حضور ﷺ کے پہلوئے بشریت پر زور دینے کا جدید رجحان اس حد تک نہ بڑھنے پائے کہ ساری توجہ حضور ﷺ کی اسی ایک جہت پر مرکوز ہوکر رہ جائے اور اس کے نتیجے میں آپ ﷺ کی ماورائی جہت نظروں سے اوجھل ہوکر رہ جائے۔ دوسرے آپ ﷺ کے بشری اوصاف کی تعریف وتوصیف کے ضمن میں بھی ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ بشر ہونے میں بھی آپ ﷺ عام انسانوں کے برعکس بشریت کے انتہائی درجۂ کمال پر فائز تھے۔ دیکھیے سحر انصاری نے یہی بات کس قدر تیقن اور اعتماد کے ساتھ دوٹوک انداز میں کہی ہے:

انساں کی کیا مجال کہ وہ ہمسری کرے
گو آپ کہہ چکے ہیں کہ انسان آپ ہیں

مختصر یہ کہ آنحضرت ﷺ ہم آپ جیسے بشر نہیں، افضل البشر ہیں۔ عام انسانوں جیسے انسان نہیں، انسانِ کامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی بشریت کو عام انسانوں کی بشریت پر قیاس کرنے میں ایک بہت بڑی قباحت یہ بھی ہے کہ اس سے بشری کم زوریوں کا تصور قدرتی طور پر ذہن میں آتا ہے۔ دوسرے اس تصور کے نتیجے میں آپ ﷺ کی عصمت کا عقیدہ بھی دھندلا پڑسکتا ہے۔ وجہ یہ کہ بشری کم زوریوں کے ساتھ اس عقیدے کو قائم رکھنا کہ آپ ﷺ معصوم عن الخطا ہیں اور خدا آپ سے ہم کلام ہوتا ہے، عقلِ انسانی کے نزدیک بہت دشوار ہے۔ آخر وہ لوگ جنھوں نے ہر زمانے میں ہر نبی سے بشریت اور مثلیت کا دعویٰ کیا، یہی تو کہتے تھے کہ ہم جیسا بشر، رسول کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ لوگ انکارِ رسالت پر عقلاً مجبور اور اس انکار میں اپنے نفس کی حالت کے ترجمان تھے۔ چناں چہ قرآنِ کریم نے بھی کافروں کا یہی مقولہ بیان کیا ہے کہ وہ نبیوں کو اپنے جیسا بشر کہتے تھے۔ اسی طرح کفارِ عرب نے بھی حضور نبیِ کریم ﷺ کو بشریت کا طعنہ دیا تھا۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے فرمایا کہ:

انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ
(میں تم جیسا بشر ہوں، مگر میری طرف وحی کی جاتی ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا خود کو بشر فرمانا اور بات ہے اور کافروں کا آپ کو بشر کہنا بالکل دوسری بات۔ گویا وحیِ الٰہی کے عظیم الشان فیضانِ الٰہی کا حامل ہونے کے اعزاز کے ساتھ

آپ کا یہ فرمانا کہ میں بشر ہوں، بشر کی رفعتِ شان اور علوئے مرتبت کی دلیل تھی۔ جب کہ کفارِ عرب کا آپ کو بشر کہنا، بشریت کے ادنیٰ تصور کی بنا پر تھا۔ اس لیے کہ انھوں نے آپ ﷺ کی بشریت کو اپنی بشریت پر قیاس کر کے کہا تھا کہ:

وقال الذین الکفرون بشر مثلنا یھدوننا

(یعنی کافروں نے کہا کہ کیا ہم جیسا بشر ہم کو راستہ دکھائے گا)

کفار کے انکارِ رسالت کا سبب ان کی ظاہر بینی تھی۔ وہ حضور کے ظاہر کو دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا، پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس ظاہر بینی نے ابو جہل اور ابولہب کو دولتِ اسلام سے محروم رکھا۔ حضرت مجدد الف ثانی اپنے مکتوبات میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> کوتاہ بینوں اور محجوبوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو بشر کہا اور باقی انسانوں جیسا تصور کیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ آپ کی رسالت کا انکار کر بیٹھے۔ مگر جن خوش قسمت لوگوں نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رسالت کے رنگ میں دیکھا، رحمتِ عالم و عالمیاں جانا، اور آپ کو تمام انسانوں سے ممتاز سمجھا، وہ ایمان جیسی متاعِ عزیز سے مشرف ہوئے اور ان کا شمار نجات پانے والوں میں ہوگیا۔ (مکتوباتِ امام ربانی، دفتر سوئم، مکتوب ۶۴)

چناں چہ قرآن کریم میں جہاں آپ کو بشر کہا گیا ہے وہاں یوحیٰ الی کا استثنا بھی ساتھ ہی لگا ہوا ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ بشر ہونے کے باوجود آپ من کل الوجوہ ہم آپ جیسے بشر نہیں تھے۔ وجہ یہ کہ ایک طرف تو آپ دوسرے تمام انسانوں کے برعکس گناہ و خطا اور عیوب و نقائص جیسے بشری لوازم سے پاک تھے، اس کے بغیر آپ وحیِ الٰہی کے فیضان کے لیے منتخب نہیں ہو سکتے تھے۔ دوسرے:

> آپ کی پیدائش بھی عام انسانی افراد کی پیدائش سے بلکہ افرادِ عالم میں سے کسی بھی فرد کی پیدائش سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے کہ آپ ﷺ عنصری پیدائش کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں۔ خلقت من نور اللہ (میں اللہ ے نور سے پیدا کیا گیا ہوں)۔ (مکتوباتِ امام ربانی، دفتر سوئم، مکتوب ۱۰۰)

ظاہر میں تو بے شک آپ عام انسانوں ہی کی طرح تھے۔ عام انسانوں ہی کی طرح

رہتے سہتے، چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے تھے۔ مگر تھے پیکرِ نور۔ ایک خاکی غلاف تھا جو بشریت کے نام سے اس نورِ یزدانی پر پڑا ہوا تھا۔ اہلِ نظر آپ کے کالبدِ خاکی میں اس نورِ یزدانی کی تجلیوں کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اور یہ تو عوام و خواص سبھی دیکھتے تھے کہ دوسرے انسانوں کے برعکس آپ کے جسمِ اطہر کا سایہ نہ تھا؟ ہوتا بھی کیسے۔ آپ سرتاپا نورِ مجسم جو تھے:

امّی و دقیقہ دانِ عالم
بے سایہ و سائبانِ عالم

حضرت مجددالف ثانی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے جسمِ خاکی اور پیدائشِ عنصری کی مصلحت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اس جہان میں آپ کی عنصری پیدائش کو آپ کی ملکی پیدائش پر غالب کیا ہوا تھا تاکہ مخلوق کے ساتھ جن میں بشریت زیادہ غالب ہے، وہ مناسبت پیدا ہو سکے جو افادہ اور استفادہ کا سبب بنے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو اپنی بشریت ظاہر کرنے کے لیے بڑی تاکید سے امر فرمایا کہ **قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی** ۔ لفظ **مثلکم** کا لانا تاکیدِ بشریت کے لیے ہے۔ مگر وجودِ عنصری سے رحلت فرمانے کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب روحانیت غالب ہوگئی اور بشریت کی مناسبت گم ہوگئی۔ (مکتوباتِ امام ربانی، دفترِ اوّل، مکتوب ۲۰۹)

مجدد صاحب کے اس مکتوب کی یہ عبارت اور اس عبارت کی آخری سطریں خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں جو ہمیں آج کے مادی دور کی ظلمتوں میں حضور نبی کریم ﷺ کے نورِ نبوت کی روحانی قندیل سے اجالا کرنے کا پیغام دے رہی ہیں۔ شاید یہ اس پیغام کا غیر محسوس اثر ہے کہ اب ہمارے بعض نوجوان شاعر جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مادی دور کے اندھیروں کے قدم ان کی وادیِ جاں تک بھی آپہنچے ہیں تو وہ اس دورِ ظلمت نژاد کے تمام فکری نظاموں کو رد کر کے بے اختیار نورِ سرکارِ دو عالم کو پکارنے لگتے ہیں:

نور سرکارِ دو عالم کو پکارا میں نے
جب اندھیروں کے قدم وادیِ جاں تک پہنچے

یقیناً آپ بشر ہیں۔ اس سے کسی مسلمان کو انکار کی مجال نہیں۔ مگر ہمارے لیے غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ وہ بشر کیسا ہوگا جس سے خود خدا ہم کلام ہوتا ہو۔ بے شک آپ عبد ہیں،

رب نہیں۔ مگر ہمارے سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ عبد کیسا ہوگا جس کی عبدیت سے شانِ رب آشکار ہوتی ہو۔ آخر غالبؔ نے یوں ہی تو نہیں کہا تھا کہ:

آئینہ دار پرتوِ مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکار زشانِ محمد است

آپ ﷺ کی بشری جہت پر گفتگو کرتے کرتے اب ہم آپ ﷺ کی ماورائی جہت تک آپہنچے ہیں۔ غالبؔ کا یہ خوب صورت شعر جس میں اس نے آپ کی بشری اور ماورائی دونوں جہات کے باہمی تعلق کو آفتاب و ماہتاب کی خوب صورت تمثیل کے ذریعے بیان کیا ہے، اب ہمیں آپ ﷺ کی ماورائی جہت پر غور کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ لہٰذا آئیے اب یہ بھی دیکھتے چلیں کہ آپ ﷺ کی ماورائی جہت کا تصور ہماری دینی روایت میں کیا ہے اور اس کا اظہار ہماری نعتیہ شاعری میں کس طور پر ہوا ہے۔

آپ ﷺ کی ماورائی جہت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد حسن عسکری نے لکھا ہے کہ حالیؔ کے لیے آنحضرت ﷺ کچھ اور تھے، محسنؔ کاکوری کے لیے کچھ اور۔ حالیؔ کے برعکس محسن کاکوروی کی نظر میں آنحضرت ﷺ کی شان یہ تھی کہ آپ ﷺ ''با میم احد اور احمد بلا میم'' ہیں۔ عسکری صاحب کے بقول یہ تصور جس سے حقیقتِ محمدیہ کی طرف اشارہ مقصود ہے، کٹھ ملاؤں کے نزدیک تو شرک کے برابر ہے، مگر ہمارے ہاں مغرب پرستی، عقل پرستی اور خود پرستی کے دور سے پہلے تک عام مسلمان رسولِ کریم ﷺ کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ چناں چہ محسنؔ کاکوروی کی نعتیہ شاعری کا موضوع بھی یہی عقیدہ ہے جس کی بنا پر عالمِ نور میں شوشے چھوڑنے کو عسکری صاحب نے ان کا خاص امتیاز قرار دیا ہے۔

اب اگرچہ حقیقتِ محمدیہ بنفسہٖ تو اظہار و بیان کی گرفت میں نہیں آسکتی، پھر بھی مختصر ترین لفظوں میں اس کی جو تعریف کی گئی وہ یہ ہے کہ ذاتِ حق کی تجلیِ اوّل کو حقیقتِ محمدیہ کہتے ہیں۔ اس عقیدے کی رُو سے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کا وہ نور ہیں جو اسما و صفات کے ظہور سے پہلے چمکا، اور زمان و مکاں کی تخلیق سے پہلے درخشاں ہوا۔ آپ ﷺ نے اپنی حدیث:

اوّل ماخلق اللہ نوری

میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ میرا نور ہے۔ چناں چہ بہ اعتبارِ خلق آپ اوّل ہیں اور بہ اعتبارِ ظہور آخر۔ آپ ہی کے نور سے کل کائنات کی تخلیق ہوئی۔ آپ وجہِ وجودِ کائنات ہیں۔ آپ ہی دیباچۂ کونین ہیں۔ آپ ہی حقیقت ہیں آدم علیہ السلام کی۔ آپ ہی اصل ہیں جملہ

انبیا علیہم السلام کی۔ آپ ہی عقلِ اوّل ہیں۔ آپ ہی تعینِ اوّل ہیں۔ آپ ہی وسیلہ و واسطہ ہیں عبدو رب کے درمیان۔ آپ ہی ربط و رابطہ ہیں حق وخلق کے بیچ۔ آپ کی اسی شان کا اظہار ان اشعار میں ہوا ہے:

اوست ایجادِ جہاں را واسطہ
درمیانِ خلق و خالق رابطہ
شاہباز لامکانی جانِ او
رحمت اللعالمیں در شانِ او
عارف اطوار سرِجزو و کل
خلقِ اول، روحِ اعظم، عقلِ کل
علتِ غائی ز امرکن فکاں
نیست غیر از ذاتِ آں صاحب قراں
رہنمائے خلق و ہادیِ سبل
مقتدائے انبیا ختم رسل

آپ برزخِ کبریٰ ہیں، رابطہ بین الظہور و البطون ہیں، آپ ہی اللہ سے لینے والے ہیں۔ آپ ہی اللہ سے لے کر بندوں کو دینے والے ہیں جیسا کہ آپ نے اپنی حدیث میں ارشاد فرمایا:

انّما انا قاسم و اللّٰہ یعطی

غالبؔ کی نظر میں شاید آپ کی یہی حدیث رہی ہوگی جب انھوں نے کہا کہ:

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است
اما کشاد آں زکمان محمد است

غرض کہ آپ ہی نورِ نبوت ہیں۔ آپ ہی کے نور سے شمس وقمر روشن ہوئے۔ آپ ہی کے نور سے لوح وقلم اور عرش وکرسی کو قیام ملا اور اسی نور سے بزمِ گیتی سجائی گئی۔ مختصر یہ کہ آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا اِستادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

چناں چہ یہ آپ ہی کا نور تھا جو قلبِ آدم میں امانت بن کر اترا، اور یہی نور جس کا دوسرا نام حقیقتِ محمدیہ ہے صلبِ آدم میں خیر البشر بن کر ٹھہرا۔ پھر پشت در پشت ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتے ہوئے بالآخر پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہو کر صورتِ محمدی میں جلوہ گر ہوا۔ سو جب یہ نور آپ کی صورتِ بشری میں نمایاں ہوا تو گویا ایک آفتاب تھا جس پر ابر آگیا، اور اس ابر کے سبب دیکھنے والوں کے لیے آپ کا دیکھنا آسان ہوگیا۔ بقول کسے:

ان کے جلووں کی طرف کس کی نظر اٹھ سکتی
بشریت کے جو سانچے میں نہ ڈھالا ہوتا

اس سے ظاہر ہے کہ آپ کی حقیقت نوری ہے اور صورت بشری۔ ایک جہت میں آپ حق سے واصل ہیں اور دوسری میں مخلوق سے وابستہ۔ غلام علی شہید نے آپ کی دونوں جہات کو نظر میں رکھتے ہوئے کیا اچھا شعر کہا ہے:

اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شامل
خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا

اور غالب نے بھی آپ کی دونوں جہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

نبی را دو وجہ است دلجوئے خلق
یکے سوئے خالق یکے سوئے خلق
بداں وجہ از حق بود مستفیض
بدیں وجہ برخلق باشد مفیض

اب خواہ آپ کی جہتِ حق ہو یا جہتِ خلق، ایک مسلمان کے لیے آپ کی دونوں ہی جہتوں کو ماننا ضروری ہے۔ جس نے آپ کی ایک جہت کو دیکھا اور دوسری سے محجوب رہا، وہ آپ کے دیکھنے کا حق کما حقہٗ ادا نہ کر سکا، چناں چہ عسکری صاحب کے بقول اگر حالؔی نے صرف آپ کی انسانی خوبیوں کا بہی کھاتا لکھا ہے تو محسؔن کے نعتیہ کلام کے لیے عسکری صاحب کی تمام تر پسندیدگی کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ محسؔن نے بھی آپ کی ایک ہی جہت کو نظر میں رکھتے ہوئے سارے شوشے عالمِ نور ہی میں چھوڑے۔ اور یوں آپ کی صرف ایک ہی جہت تک محدود رہ کر آپ کی مدح و ثنا کا حق تو وہ بھی پوری طرح ادا نہ کر سکے۔ علاوہ ازیں حقیقتِ محمدیہ کے عقیدے پر کچھ ایک محسؔن

کاکوروی ہی کا تو اجارہ نہیں، بلکہ ولی و سودا سے لے کر غالب و اقبال اور حفیظ جالندھری کے دور تک کم و بیش سب ہی شعرا اپنے مضامینِ نعت کے لیے اسی عقیدے سے اخذ و استفادہ کرتے چلے آئے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جس مکاں میں ہے تمھاری فکرِ روشن جلوہ گر
عقلِ اوّل آکے واں اقرارِ نادانی کرے
(ولی)

حدیثِ من رآنی دال ہے اس گفتگو اوپر
کہ دیکھا جس نے اس کو، اس نے دیکھی شکلِ یزدانی
(سودا)

آئینہ دارِ پرتوِ مہراست ماہتاب
شانِ حق آشکار زشانِ محمد است
(غالب)

تیر قضا ہر آئنہ در ترکش حق است
اما کشاد آں ز کمانِ محمد است
(غالب)

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی
(غالب)

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
(اقبال)

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار
(اقبال)

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ
(اقبال)

پھوٹا جو سینۂ شب تارِ الست سے
اس نورِ اوّلیں کا اجالا تمھی تو ہو
سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تمھی تو ہو
جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھی تو ہو
(ظفر علی خاں)

اے زہے تقدیر یہ نکلا محمد کا مقام
کوئی انسان و خدا کے درمیاں درکار تھا
(احسان دانش)

ظہورِ نورِ ازل کو نیا بہانہ ملا
حرم کی تیرہ شبی کو چراغِ خانہ ملا
(حفیظ ہوشیارپوری)

سلام اے ظلِ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی
بہ صورت نورِ سبحانی بہ معنی ظلِ روحانی
نشانِ رحمتِ حق مظہرِ تائیدِ ربانی
(حفیظ جالندھری)

وہ جس کو فاتحِ ابوابِ اسرارِ قدم کہیے
بنائے عرش و کرسی باعثِ لوح و قلم کہیے
(حفیظ جالندھری)

حالؔی سے شروع ہونے والے نعت گوئی کے دورِ جدید میں غالباً حفیظ جالندھری وہ آخری شاعر ہے جس کے ہاں حقیقتِ محمدیہ کے عقیدے کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ اس کے بعد آج کل کی نعت گوئی کے دور میں بھی اگرچہ اس عقیدے کو یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مگر اِکا دُکا مستثنیات سے قطعِ نظر آج کل زیادہ تر زور آپ کے پہلوئے بشریت پر ہے۔ بہرحال چند مثالیں آج کل کے نعت گو شعرا کے ہاں سے بھی دیکھتے چلیے:

رخِ پاک ہے پرتوِ نورِ یزداں
جمالِ خدا ہے جمالِ محمد
(ستار وارثی)

محمد کی صورت میں حق جلوہ گر ہے
حقیقت ہے یا میرا حسنِ نظر ہے
(شاہ انصار الٰہ آبادی)

وہ سرِ تخلیق ہے مجسم کہ خود ہی آدم ہے خود ہی عالم
وجود کی ساری وسعتوں پر محیط ہے جو وہ دائرہ ہے
(سلیم احمد)

وہ نورِ جبیں سارے زمانوں کا اجالا
وہ نقشِ قدم سایہ فگن ہست و عدم پر
(حنیف اسعدی)

حقیقتِ محمدیہ کے عقیدے پر مبنی ان اشعار سے آپ کی ذاتِ گرامی کی جو ماورائی جہت ہمارے سامنے آتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی اسی جہت کی بنا پر دوسرے تمام انسانوں سے ممتاز ہو کر ان سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ سو اب ہمارا سوال یہ ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح ہوتے ہوئے بھی دوسرے تمام انسانوں سے ممتاز ہو کر ان سے اوپر اٹھ جانے والا یہ انسان اپنی دونوں جہات کے ساتھ اپنے بنیادی جوہر میں کیا ہے؟ یعنی ہم اسے انسان سمجھیں یا کچھ اور۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسا آسان سوال تو ہے نہیں جس کا کوئی حتمی اور تسلی بخش جواب ہمیں کس ملّائے مکتبی سے مل جائے۔ اس کے جواب کے لیے تو ہمیں کسی ایسے مستند عالمِ دین سے رجوع کرنا پڑے گا جس کا پایہ صرف علمِ دین ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ فہم و فراست اور علم و دانش کے اعتبار سے بھی بلند ہو۔ مگر ایسے عالمِ فاضل اوّل تو آج کے زمانے میں ملتے ہی کہاں ہیں۔ اور اگر بالفرضِ محال ملتے بھی ہوں تو ان تک ہماری رسائی کہاں۔ پھر کیا کریں اور کہاں جائیں۔ ہم ایسے بے علموں کو تو اس معاملے میں لب کشائی کی مجال نہیں۔ تو کیا پہلے ہی قدم پر مایوس ہو کر بیٹھ جائیں۔ اس سے بہتر تو یہی تھا کہ ہم یہ سوال ہی نہ اٹھاتے، لیکن اب اٹھایا ہے تو کہیں نہ کہیں سے تو اس کا جواب ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ تسلی بخش نہ سہی غیر تسلی بخش ہی سہی۔ سو ایسے جواب کے لیے ہمارے شعرائے کرام ہی کیا بُرے ہیں، بلکہ ممکن تو یہ بھی ہے کہ انھی کے توسط سے ہمیں صحیح جواب

کی طرف چلنے کا کوئی راستہ مل جائے۔ تو آیئے دیکھیں ہمارے نعت گو شعرا اس سوال کے جواب میں کیا فرماتے ہیں؟

۱۔ ایک شاعر نے اس سوال کے جواب میں آپ ﷺ کو ایسا بشر قرار دیا ہے جو بشر ہونے کے ساتھ ساتھ خدا نما بھی ہے:

وہ ابتداؤں کی ابتدا ہے وہ انتہاؤں کی انتہا ہے
ثنا کرے اس کی کوئی کیوں کر بشر ہے لیکن خدا نما ہے

ایک اور جواب اسی شاعر کا یہ ہے کہ:

ہے حدِ فاصل کہ خطِ واصل کہ قوس کے قوس ہے مقابل
سلیم عاجز ہے فہمِ کامل کہاں بشر ہے کہاں خدا ہے

۲۔ دوسرے شاعر کا جواب یہ ہے کہ آپ خدا نہیں، مگر خدا سے جدا بھی نہیں:

تم ذاتِ خدا سے نہ جدا ہو نہ خدا ہو
اللہ ہی کو معلوم ہے کیا جانیے کیا ہو

۳۔ ایک اور جواب شاعروں کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ:

ترا چناں کہ توئی ہر نظر کجا بیند
بقدرِ دانشِ خود ہر کسے کند ادراک

شاید یہ سب جواب اپنی اپنی جگہ جزوی طور پر ٹھیک ہیں، مگر ہمیں ادھورا نہیں پورا جواب چاہیے۔ اس لیے آگے بڑھتے ہیں۔

۴۔ اگلا جواب ایک شاعر کی طرف سے یہ ملتا ہے کہ:

نورِ احد ہے میم کے پردے میں جلوہ گر
رتبہ مرے حضور کا سمجھے گا کیا بشر
اہلِ خرد یہ کہنے پہ مجبور ہوگئے
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس جواب سے ظاہر ہے کہ اہلِ خرد شریعت ہی کے ڈر سے آپ کو ''بعد از خدا بزرگ'' کہنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ یہ خوف نہ ہوتا تو شاید میم کا پردہ اٹھا کر صاف صاف بھی کہہ سکتے تھے۔ یہ سب کچھ کہہ کر کچھ نہ کہنے کی ایک اچھی مثال ہے۔

۵۔ اس کے برعکس غالبؔ نے تقریباً صاف صاف ہی کہا ہے کہ:

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مرتبۂ غیب ہویت سے پہلی تجلی اپنے آپ پر فرمائی تو نورِ محمدی ظہور میں آیا۔ اور یوں اللہ تعالیٰ کا نورِ ذاتی ہی نورِ محمدی سے موسوم ہوا۔ (اسی کو حقیقتِ محمدیہ، تعینِ اوّل، اور تجلیِ اوّل کہتے ہیں۔) اب یہی نورِ محمدی جب آپ کی صورتِ بشری میں نمودار ہوکر چمکا تو آپ کے قد و رخ کا ظہور ہوا۔

اسی طرح سفرِ معراج کے اختتام پر جب حضور نبیِ کریم ﷺ حق تعالیٰ کے رو بہ رُو ہوتے ہیں تو غالبؔ کہتا ہے:

نماند اندر احمد زمیمش اثر
کہ آں حلقۂ بود بیرونِ در
احد جلوہ گر باشیون و صفات
نبی محوِ حق چوں صفت عینِ ذات

مگر اس طرح کے اشعار پر آج کل یہ اعتراض شدت کے ساتھ وارد کیا جارہا ہے کہ میم کا پردہ اٹھا کر احد اور احمد کے امتیاز کو ختم کرنا کفر و شرک کا مرتکب ہونے کے برابر ہے۔ اب عسکری صاحب کے بقول محسنؔ کاکوروی کی نظر میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہی یہ تھی کہ آپ ''با میم احد اور احمد بلا میم'' ہیں، بلکہ ان کا کہنا تو یہ بھی ہے کہ سو پچاس سال پہلے تک (یعنی ان کے مضمون کی تحریر کے وقت سے سو پچاس سال پہلے تک) عام مسلمانوں کا عقیدہ بھی یہی تھا۔ خیر، عام مسلمانوں میں سے تو ہم آج اتنی مدت بعد کس کس کو پکڑتے پھریں گے مگر جہاں تک غالبؔ اور محسنؔ کاکوروی کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دونوں شاعر آج ہمارے نزدیک کفر و شرک کے مرتکب گردانے جائیں گے، بلکہ غالبؔ اور محسنؔ کاکوروی بے چارے تو پھر بھی شاعر ہیں۔ یہ تو جو چاہیں کہہ دیں مگر امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کے بارے میں ہم کیا کہیں گے جن کا قول بھی یہی ہے کہ:

محمد (صلی اللہ علیہ آلہ وسلم) احمد بلا میم ہیں۔

اور مجدد صاحب نے اپنے پیر و مرشد کے اس قول کا جو مطلب اپنے رسالے ''شرح رباعیاتِ حضرت خواجہ باقی باللہ'' میں لکھا ہے اس میں بھی آپ نے یہی فرمایا ہے کہ اس قول سے اشارہ حقیقتِ محمدیہ کی طرف ہے، لیکن رشید وارثی صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

اگر چہ تنزلاتِ ستہ یا مراتبِ وجود کے اعتبار سے احمد بلامیم کا کنایہ درست ہے، لیکن یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ذاتِ محمدی اور حقیقتِ محمدی دو مختلف حقائق ہیں۔ ان دو حقائق کو ایک قرار دینا ممکن کوواجب اور واجب کوممکن قرار دینے کے مترادف ہے۔

(''نعت رنگ'' کتابی سلسلہ نمبر۲،ص۵۹)

حقیقتِ محمدی اور ذاتِ محمدی کی باہمی نسبت کے حوالے سے یہ ایک اہم اعتراض ہے جس کی طرف ہماری توجہ رشید وارثی صاحب نے مبذول کروائی ہے۔ میں اس سلسلے میں اپنی معروضات پیش کرنے سے پہلے یہ اعتراف کرتا چلوں تو بہتر ہے کہ آج کل ''نعت رنگ'' کے صفحات میں نعتیہ شاعری کی تنقید کا جو سلسلہ چل رہا ہے اس میں سید ابوالخیر کشفی، رشید وارثی، عزیز احسن اور عاصی کرنالی جیسے صاحبانِ نقد ونظر جس دقّتِ نظر اور تدقیق کے ساتھ نعت کی تنقید کا حق ادا کررہے ہیں وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ نعتِ رسول کا موضوع ہے ہی ایسا نازک کہ ذرا سی بے احتیاطی سے بات بننے کی بجائے بگڑ بھی سکتی ہے۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ نعت لکھنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ مگر اس میں صرف شاعر ہی کی کوئی تخصیص نہیں۔ شاعر ہو یا نقاد اور تبصرہ نگار، لغزش تو کسی سے بھی ہوسکتی ہے۔ بہر حال جہاں تک رشید وارثی صاحب کی بات کا تعلق ہے تو میری گزارش ان کی خدمت میں یہ ہے کہ انھوں نے تو خود ہی ''حقیقتِ محمدیہ'' اور ''ذاتِ محمدیہ'' دونوں کو حقائق قرار دے کر ایک ہی مرتبہ میں رکھ دیا۔ جب کہ حضرت باقی باللہ کے قول کی تشریح میں مجدد صاحب کی جو عبارت انھوں نے نقل کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

آنحضرت ﷺ کی حقیقت جس سے عبارت حقیقتِ محمدیہ ہے، وحدت اور احدیتِ جامعہ کے نام سے موسوم ہے۔ احمد بلامیم کااشارہ اسی احدیتِ جامعہ کی طرف ہے۔ (''نعت رنگ'' کتابی سلسلہ نمبر۲،ص۵۹)

اس سے ظاہر ہے کہ ذاتِ محمدیہ اور حقیقتِ محمدیہ، دونوں حقائق نہیں۔ ان دونوں میں حقیقت تو بس ایک ہی ہے، یعنی حقیقتِ محمدی۔ یہی ذاتِ محمدی کی حقیقت ہے اور ذاتِ محمدی اس حقیقت کی مظہر، بلکہ مظہرِ اتم ہے، خود حقیقت نہیں۔ اور دوسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ اگر بفرضِ محال رشید وارثی صاحب کے بقول یہ مان لیا جائے کہ ذاتِ محمدیہ اور حقیقتِ محمدیہ دو مختلف حقائق ہیں تو پھر یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ ان دونوں کے درمیان باہمی نسبت کیا ہے؟ دونوں کے مختلف حقائق ہونے کی صورت میں تو ذاتِ محمدی کی مدح وثنا کے سلسلے میں حقیقتِ محمدیہ کے حوالے

کا کوئی جواز فراہم نہ ہو سکے گا۔ یہ جواز صرف اس لیے فراہم ہوتا ہے کہ ذاتِ محمدیہ حقیقتِ محمدیہ کی مظہرِ اتم ہے اور چوں کہ کسی مظہر کی تعریف کا پورا پورا حق اس حقیقت سے قطعِ نظر کر کے ادا کرنا ممکن نہیں جس کا ظہور (یا تجلّی) اس مظہر میں ہوئی ہے اس لیے ذاتِ محمدیہ کی تعریف کا حق بھی حقیقتِ محمدیہ کے حوالے کے بغیر کماحقہٗ ادا نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ نعتِ رسول میں حقیقتِ محمدیہ کا حوالہ اسی اعتبار سے آتا ہے۔ ورنہ ذاتِ محمدیہ اور حقیقتِ محمدیہ ان دونوں کو ایک تو کوئی بھی نہیں کہتا۔ اب یہ بات الگ ہے کہ جوشِ محبت اور وفورِ عقیدت میں احتیاط کا دامن ہی شاعر کے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ یا وہ خود اپنی ہی بے خبری کے سبب شانِ رسالت اور شانِ الوہیت میں حفظِ مراتب کا خیال نہ رکھ سکے۔ سو ایسی لغزشوں کی نشان دہی نعتیہ شاعری کی تنقید میں ضرور ہونی چاہیے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک غلط فہمی نعتیہ شاعری کے اس اسلوب کی وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے جو حقیقت کے نقطۂ نظر سے مظہر کی تعریف کرنے میں خود مظہر ہی کو حقیقت کا قائم مقام بنا دیتا ہے، مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عارف اطوار سرِ جزوِ کُل
خلق اوّل ، روح اعظم، عقلِ کُل

اب اگرچہ اس قسم کے اشعار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف باعتبار آپ کی حقیقت کے بیان ہوتی ہے، مگر الفاظ میں براہِ راست آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے خطاب یا آپ ﷺ کی طرف اشارہ ایسے لوگوں کے لیے غلط فہمی کا سبب بن سکتا ہے جو اردو اور فارسی نعت گوئی کے اس اسلوب کے ادا شناس نہیں۔ مگر یہ اسلوب صرف نعتیہ شاعری ہی تک محدود نہیں۔ اس لیے کہ اس کی متعدد مثالیں نثر سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں، بلکہ دور کیوں جائیے، خود رشید وارثی صاحب ہی کے مضمون سے ایک مثال دیکھیے۔ فرماتے ہیں:

> یہ حقیقت نصوصِ صریحہ سے ثابت و معروف ہے کہ رسول اکرم ﷺ اصلِ کائنات اور خلاصۂ موجودات ہیں۔ آپ خلقِ اوّل، تعینِ اوّل، برزخِ کبریٰ اور رابطۂ بین الظہور والبطون ہیں۔ (''نعت رنگ'' کتابی سلسلہ نمبر ۲، ص ۴۳)

اب اس بات سے تو یقیناً وہ بھی بے خبر نہیں ہوں گے کہ خلقِ اوّل، تعینِ اوّل، برزخِ کبریٰ اور رابطۂ بین الظہور والبطون، یہ سب کے سب حقیقتِ محمدیہ ہی کے دوسرے نام ہیں۔ لہٰذا

ان کا اطلاق رسولِ کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر کر کے ذاتِ محمدیہ اور حقیقتِ محمدیہ کو ایک قرار دینا خود انھی کے بقول ممکن کو واجب اور واجب کو ممکن قرار دینے کے مترادف ہوا۔ لیکن حیرت انگیز بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ ذاتِ محمدیہ اور حقیقتِ محمدیہ کا ایک ہونا خود ان کے بقول نصوصِ صریحہ سے ثابت و معروف بھی ہے۔ اب یہ تو بالکل وہی بات ہوئی کہ:

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

بہر حال۔ اگر ان کی دوسری بات صحیح ہے تو حقیقتِ محمدی اور ذاتِ محمدی کو ایک کہنے میں اعتراض کا کوئی محل باقی نہیں رہتا۔ اور اگر اس کے برعکس پہلی بات درست ہے تو دوسری کو کس اعتبار سے درست مانا جائے گا؟

اب میں رشید وارثی صاحب کو کیا کہوں جب کہ خود بھی اس سے پہلے اسی مضمون میں آپ ﷺ کے لیے تعینِ اوّل، برزخِ کبریٰ اور رابطۂ بین الظہور والبطون جیسی اصطلاحیں استعمال کر آیا ہوں۔ سو کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بہت سے دوسرے بزرگوں کی طرح میں نے بھی یہ بات آپ ﷺ کی حقیقت ہی کے اعتبار سے کہی ہے، آپ کے تعین و تشخصِ ذاتی کے اعتبار سے نہیں۔ اور یہ طرزِ کلام ہمارے اکثر بزرگانِ دین کی نثر اور نعتیہ شاعری، دونوں میں عام ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک تو رشید وارثی صاحب نے بھی اپنی عبارت میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی طرزِ کلام کو اپنایا ہے۔

شاعروں کے ذکر میں حضرت خواجہ باقی باللہ کے قول کو لانے سے بات کہیں سے کہیں جا پہنچی، ورنہ ہم تو شاعروں کی مدد سے اپنے سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خیر یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ اس لیے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے قول اور مجدد صاحب کی شرح کی مدد سے جہاں غالبؔ اور محسنؔ جیسے شاعر کفر و شرک کے الزام سے بچ گئے وہاں ہمیں بھی اپنے سوال کے جواب کی طرف بڑھنے کی راہ سجھائی دی۔ یہ راہ اب ہمیں اقبال کے ''جاوید نامہ'' تک لے آئی ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ سیرِ افلاک کے دوران زندہ رُود ہمارا یہی سوال حلاج کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اب زندہ رُود کا سوال اور حلاج کا جواب دونوں ملاحظہ کیجیے:

زندہ رود

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطاست
سرِّ آں جوہر کہ نامش مصطفیٰ است
آدمے یا جوہرے اندر وجود
آں کہ آید گاہے گاہے در وجود

حلاج اس کے جواب میں جو کچھ کہتا ہے، اسی میں ہمارے سوال کا جواب بھی پورا پورا موجود ہے، ملاحظہ کیجیے:

حلاج

پیش اوگیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہ فرمودہ است
عبدہ از فہم تو بالاتر است
زانکہ اوہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب نے اعجم است
آدم است وہم ز آدم اقدم است
عبدہ صورت گرِ تقدیر ہا
اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبد دیگر، عبدہ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہ با ابتدا بے انتہا است
عبدہ را صبح و شام ما کجاست
کس زسّرِ عبدہ آگاہ نیست
عبدہ جز سرّ الا اللہ نیست
لا الہ تیغ و دمِ او عبدہ
فاش تر خواہی، بگو ہُو عبدہ
عبدہ چند و چگونِ کائنات
عبدہ رازِ درونِ کائنات
مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تانہ بینی از مقام مارمیت

اچھا! اگر مجدد صاحب کی شرح سے غالبؔ اور محسنؔ کا کوروی پر عائد ہونے والا اعتراض رفع ہوسکتا ہے تو اسے کسی ایسے صوفی یا شیخِ طریقت کی بات نہ سمجھی جائے جو طریقت کی راہ پر چلنے میں جادۂ شریعت کا پاس ملحوظ نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ مجدد صاحب کی طریقت اور معرفت کا تو تمام تر

مقصود ہی شریعت کا تحفظ تھا۔ لہٰذا یہ کسی ایسے ویسے آدمی کی نہیں، بلکہ اس امامِ ربانی، شیرِ یزدانی کی بات ہے جس کی غیرتِ دینی اور حمیتِ ایمانی اپنے دور کے کفر و شرک اور بدعت و ضلالت کے سامنے پہاڑ کی طرح جم کر کھڑی ہوگئی۔ جس نے شریعتِ اسلامی کو اکبری دور کے کفر والحاد سے بچانے، دینِ اسلام کو مختلف قسم کی بدعات اور مشرکانہ رسوم سے پاک کرنے اور وجودی تصوف کی انتہا پسندانہ تعبیر کے زیرِ اثر لوگوں پر شریعت کی ڈھیلی ہوتی ہوئی گرفت کو ازسرِ نو مضبوط کرنے کے لیے وہ تجدیدی کارنامہ انجام دیا کہ شاہ ولی اللہ جیسا امامِ عرب و عجم اس کے اعتراف میں یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ اگر مجدد صاحب یہ کارنامہ انجام نہ دیتے تو نہ مسجدوں میں اذانیں ہوتی نہ مدارس دینیہ میں قرآن وحدیث وفقہ اور دیگر علومِ دینیہ کا درس ہوتا۔ چناں چہ اگر مجدد صاحب ہی نے حضور نبیِ اکرم ﷺ کو احمد بلامیم کہنے میں اعتراض کا کوئی پہلو نہ دیکھا تو پھر ہمارے آپ کے لیے ایسی باتوں پر گرفت کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

اسی طرح اقبال نے بھی اپنے مندرجہ بالا اشعار میں آپ ﷺ کی دونوں جہات کا بیان کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ہمارے سوال کا جواب بڑی عمدگی سے دے دیا، بلکہ ''عبدہ جز سرِّ الا اللہ نیست'' جیسی باتوں کی تفہیم کے لیے ''مقامِ مارمیت'' سے دیکھنے کی شرط بھی عائد کردی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اقبال کے لیے یہ تو قطعاً ضروری نہیں تھا کہ وہ مقامِ مارمیت کی تفسیر بھی خود ہی بیان کرتے۔ لہٰذا ہمیں اگر ان کی بات کو سمجھنا ہے تو یہ شرط ہمیں خود ہی پوری کرنی پڑے گی۔

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی

نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم

سخنِ مختصر تحریر اور تقریر کا کمال ہے۔ میں اپنے تمام عجزِ کلام و تحریر کے باوصف اختیار پر نظر رکھتا ہوں، لیکن یہ تحریر طویل تر ہوگی (نسبتاً)۔ پہلا سبب یہ ہے کہ میں اپنے عنوان سے فائدہ اُٹھا کر کئی مسائل کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی کوششوں کی قباحتوں سے بے خبر نہیں، لیکن کیا کروں، مدتوں سے کئی موضوعات و مسائلِ نعت پر لکھنے کا ارادہ کرتا رہا ہوں، مگر سچ تو یہ ہے کہ ''عرفت ربی بسخ العزائم''۔ میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے رب پہچانا:

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

اس تحریر میں کئی ادبی مسائل چھیڑنا چاہتا ہوں جو ''نعت رنگ'' کے قارئین کے لیے اجنبی تو نہ ہوں گے، لیکن رویہ (approach) میں مختلف ہوں گے۔ ادبی اور لسانی مسائل، وہ جن پر محفلوں میں اختلافی گفتگو ہوتی ہے۔ بعض صاحبان تحریروں میں بھی ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں مگر تفصیل سے گریزاں رہتے ہیں۔ شاید ان کے خیال میں نعت پر کچھ لکھنے سے ان کی تنقیدی حیثیت مجروح ہوگی۔ میں نے نعت کے موضوعات کو اپنا موضوع نہیں بنایا ہے، مگر اسلوب اور موضوع کے درمیان لکیر نہیں کھینچی جا سکتی، اسی لیے موضوعات کا ذکر بھی آئے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک صنفِ سخن پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے موضوعات سے یکسر اجتناب نہیں برتا جا سکتا۔ اس مطالعے کے پہلے اور دوسرے حصے کے بعض مباحث کا شاید نعت میں الفاظ کے استعمال سے راست تعلق نہ ہو، لیکن راقم الحروف نے سوچا کہ معنیہ، لغویہ اور فہمیہ کے بارے میں بھی چند باتیں مختصراً پیش کر دینا مفید ہوگا، بس یہی خیال ان مباحث کی طرف اشاروں کا محرک ہے۔

(۱)

زبان، زندگی اور اظہار

(اطراف و جوانب کا جائزہ)

''کُن فیکون'' میں تخلیقِ کائنات کی ساری کہانی سمٹ آتی ہے۔ زبان انسان کے لیے اللہ کا سب سے بڑا عطیہ ہے اور اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو خدا کو انسان کے معاملے میں شامل کرنے سے گریز کرتے ہیں تو آپ زبان کو انسان کی سب سے بڑی اور اہم ایجاد تعبیر کریں گے۔ اور زبان کیا ہے؟ یہ بنیادی طور پر لفظوں کا مجموعہ ہے۔ مگر اللہ سے گریز کر کے ہم کہاں جائیں گے؟ اور کتنی دور جا سکتے ہیں۔ شاید والٹیئر نے کہا تھا کہ اگر کوئی خدا نہ ہوتا تو انسان کو خدا ایجاد کرنا پڑتا۔ یہ اثبات، وجودِ خداوندی کی بڑی بلیغ دلیل ہے۔ بشرطے کہ پڑھنے والے زبان اور انداز و اسالیبِ کلام سے واقف ہوں۔

کیا آپ زبان کے بغیر انسانی زندگی اور سرگرمیوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟ مشینوں کی آواز شہروں میں ہر طرف گونجتی ہے، گاڑیوں کی آوازیں زندگی کے رواں دواں ہونے کا استعارہ ہیں، لیکن اگر دس منٹ کے لیے بھی ساری دُنیا یا کسی ایک انسانی بستی میں خاموشی ہو جائے تو ہم میں سے کتنے لوگ ایسی خاموشی کو سہار سکیں گے؟ ہوا کی طرح تکلم کی دولت اتنی عام ہے کہ ہم اس کی اہمیت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔

زبان انسانی زندگی کا لازمی اور ''ناگزیر'' حصہ ہے۔ ہم اوسطاً ایک گھنٹے میں چار پانچ ہزار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کانفرنسوں، دفتروں، تعلیمی اداروں اور دکانوں سے لے کر خواب گاہوں تک زبان کے استعمال کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ زبان کے استعمال کا اعلیٰ ترین مرحلہ ادب ہے۔ ادب میں انسانی روح کی بلندیاں جذبات کا ارتعاش، اشتعال اور تہذیب سبھی کا اظہار نظر آتا ہے۔ زبان کے ذریعے ہی انسان اپنے اُن جذبات و افکار کا اظہار کرتا ہے جن سے اس کی رفعت، بے غرضی، آفاق گیر محبت اور اس کی انسانیت کا اندازہ ہوتا ہے اور زبان کے ذریعے ہی انسان دوسروں کے خلاف اپنی نفرت کا زہر اُگلتا ہے۔ طلاق کے مقدموں میں فریقین کا ایک دوسرے کو اخلاقی طور پر عریاں کرنا، ہڑتالوں اور سیاسی مظاہروں میں مخالفین کی کردار کشی، عالمِ جنوں میں ذہن کے بے ربطی کا اظہار۔ ان میں سے ہر چیز کا تعلق زبان سے ہے۔ زبان کے ذریعے ہی ہم ماضی سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں، حال کے مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور مستقبل کے خاکے کو نئی نسل کے سامنے

پیش کرتے ہیں۔ زبان ہی کے ذریعے ہم اپنے فکری سفر کو جاری کرتے ہیں۔ ایک نسل جس مرحلے تک انسانی فکر کو پہنچاتی ہے، اگلی نسل وہیں سے اس کو زبان کے ذریعے آگے بڑھاتی ہے۔ لکھے ہوئے حرف کی مدد سے ہم اپنے کتب خانوں اور اپنے گھر میں سقراط، ارسطو، غزالی، رومی، البیرونی اور ابنِ خلدون سے لے کر اقبال، ٹیگور، جوش، فیض، ٹی ایس ایلیٹ، فاکنر تک کتنے ہی لوگوں سے کلام کرتے ہیں۔ کتاب خوانی بھی یک طرفہ معاملہ نہیں۔ ہم بڑے مصنفوں اور مفکروں سے مکالمہ کرتے ہیں۔ سرسیّد، حالی اور شبلی جیسے اکابر ہمارے ہاں ماضی کے نام نہیں، بلکہ ایک اعتبار سے ہمارے ساتھی اور دوست ہیں۔ ہم سے باتیں کرتے ہیں، ہم میں حوصلہ پیدا کرتے ہیں اور جہاں اندھیرا گہرا ہوتا ہے، وہاں ہمارے ساتھ وہ مشعل بہ دست راہ طے کرتے ہیں۔

الفریڈ کورزبسکی (Alfred Korzybaski) نے دوسرے جانوروں کے ساتھ انسان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> انسان چیزوں کو بہتر بنا سکتا ہے، جانور یہ نہیں کر سکتے۔ انسان ترقی کر سکتا ہے، جانور نہیں کرتے۔ انسان پیچیدہ سے پیچیدہ تر آلات ایجاد کرتا ہے، جانور نہیں کرتے۔ انسان مادی اور روحانی دولت و تجربات کا خالق ہے، دوسرے حیوان نہیں ہیں۔ انسان تہذیب کا معمار ہے، دوسرے حیوان نہیں ہیں۔[☆1]

انسان اور دوسرے حیوانوں میں یہ فرق زبان اور صرف زبان کی وجہ سے ہے۔ انسان نے اپنے تجربات کو زبان کے ذریعے محفوظ کیا، اپنی ایجادات کے طریقِ کار اور تکنیک کو زبان کے ذریعے دوسری نسل تک پہنچایا۔ انسان کی تمام روحانی اور مادی فتوحات اور ترقیوں کا سرچشمہ اس کا ذہن اور زبان ہے۔ تہذیب کی تعمیر زبان کی بنیاد پر قائم ہے۔ ایک نسل کے کمالات، دانش اور فنی مہارت زبان کے ذریعے آنے والی نسلوں تک منتقل ہوتی ہے۔ زبان نے انسان کو کیا کچھ عطا کیا ہے اور انسان کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ اس پھیلی ہوئی اور انتہائی وسیع داستان کو اورنگ جے لی نے ایک چھوٹے سے جملے میں سمیٹ لیا ہے:

"It has given him the Earth."[☆2]

زبان نے زمین کو انسان کے زیرِ نگیں بنا دیا۔ زبان نے انسان کو جہاں گیر بنا دیا۔ یہ

☆1. Al-fred Korzybski, "Manhood of Humanity", New York. 1921,P.186 (quoted by Lee 1.j in Human Habits in Human Afairs).

☆2. Irving J.Lee, "Language Habits in Human Affairs", Hader and Brothers Publishers, New York, 1941, P.6

زمین، اس کے خزانے، اس کے اسرار، اس کے امکانات سب کچھ انسان کے دائرۂ علم میں زبان کے وسیلے ہی سے آئے ہیں۔

زبان نے انسان کے تجربوں اور ترقیوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کسی بھی زبان کی لغت سے لگا سکتے ہیں۔ ایسی لغت جو تاریخی اصولوں پر مرتب کی گئی ہو اور جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کون سے الفاظ زبان میں کب داخل ہوئے۔ ''قمر نورد'' اور ''خلانورد'' کے الفاظ گزشتہ تیس برسوں کے اندر ہماری زبان کا حصہ بنے ہیں۔ Cloning کا لفظ تو اپنے نئے معانی، امکانات اور خطرات کے ساتھ ۱۹۹۶ء کا لفظ ہے۔ اب اس کے لیے ہمیں کوئی لفظ اور اصطلاح تخلیق کرنی ہوگی۔ ایک مختصر اصطلاح تو ''ہم زادگی'' ہو سکتی ہے اور یہ نئے مفاہیم کا بڑی حد تک احاطہ بھی کر رہی ہے۔ پھر ''ہم زاد'' کے پرانے لفظ کو نئے معانی مل گئے ہیں۔ اب ''ہم زاد'' لغوی اور حیاتیاتی سطح پر بھی ''ہم زاد'' بن گیا ہے۔

انسانی زبان کی سب سے بڑی صفت اور خصوصیت اس کی باز آفرینی ہے۔ یہ جملے جو میں نے اس تحریر میں لکھے ہیں، اس سے پہلے اس طرح کبھی نہیں لکھے تھے۔ اگرچہ یہ مضمون میں نے پہلے بھی ادا کیا ہوگا۔ اسی طرح زبان سے متعلق یہ باتیں آپ نے مختلف الفاظ اور اسلوب میں پہلے بھی پڑھی ہوں گی یا سوچی ہوں گی، لیکن ان الفاظ اور سیاق و سباق میں پہلی بار آپ کے سامنے آئی ہیں، لیکن ان کی تفہیم میں آپ کو کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ اس کا سبب زبان کی باز آفرینی کی صفت ہے۔ محدود معانی میں کہا جاتا ہے کہ دوسرے جانور بھی اپنی زبان رکھتے ہیں۔ کتا بھونکتا ہے اور اس کے بھونکنے میں صورتِ حال کے مطابق تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ اپنے مالک کا استقبال کرتے ہوئے کتے کا بھونکنا، کتیا کے ساتھ اظہارِ محبت کے لیے کتے کا آواز نکالنا، کسی اجنبی کو دیکھ کر کتے کا بھونکنا، حملہ کرتے ہوئے اس کی غراہٹ اور ''بھونک'' وغیرہ۔ آپ کتے کے ہر صوتی اشارے کو کسی لفظ کی طرح سمجھ لیجیے، لیکن یہ صوتی اشارے چند ہیں۔ بہت محدود — دس بارہ — اور ان میں بھی ہزاروں سال سے کوئی تبدیلی نہیں آئی، لیکن انسانی زبان میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے۔ ذخیرۂ لغت بدلتا رہتا ہے۔ الفاظ کے معانی بدلتے رہتے ہیں۔ خواص عربی کا لفظ ہے۔ عوام اور خواص، دوا کے خواص اور پھر ''خواص آ گئی'' — خواص کے اور مفہوم بھی ہوں گے، لیکن ان کی تلاش کا یہ موقع نہیں۔ صرف تیسری صورت پر غور کیجیے۔ ''خواص آ گئی'' یہاں خواص خالص اُردو کا لفظ ہے جسے کوئی عرب نہیں سمجھ سکتا۔ ہم نے جمع کو واحد بنا لیا اور پھر اسے ''تانیث'' کے مرتبے سے مشرف کر دیا۔ ''اخبار'' کہاں ہے؟ خبر کی جمع کو ہم مجلّہ (Newspaper) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

زبان کی تاریخ میں مختلف مرحلے آتے رہتے ہیں۔ ایسے دور جن میں اسالیب میں تبدیلیاں آتی ہیں، لفظوں میں معانی بدلتے ہیں اور ایسے دور میں جن میں اسالیب میں استحکام رہتا ہے اور لفظوں کے معانی میں استحکام رہتا ہے۔ سرسیّد تو ''جدید دورِ زبان'' سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ان کی زبان آج کی زبان سے خاصی مختلف ہوگئی ہے۔ تذکرہ اولیاؤں کا، ذکر دلّی کا، اب مضاف، مضاف الیہ کی ترتیب مختلف ہے۔ مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ قدیم ترتیب بھی خصوصی اثرات پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ شاعروں کے دامن میں بالخصوص قدیم اسالیب کو پناہ مل جاتی ہے۔ ''تک'' کی جگہ ''تلک'' آج بھی شاعری کا حصہ ہے۔ اسی طرح مضارع کا استعمال:

دل ہے کہ فراق اب تک دامن کو چھڑائے ہے

کلیم عاجز اور کئی شاعروں نے مضارع کو اپنے اسلوب کا حصہ بنا لیا ہے:

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اسی طرح لفظ ''تو'' پر غور کیجیے۔ اب روزمرہ کی گفتگو میں ''تو'' نے ''تم'' اور ''آپ'' کی لیے جگہ خالی کر دی ہے، مگر ادب اور شاعری کی دُنیا میں یہ ایک زندہ اور توانا لفظ ہے۔ ایسا لفظ جو روایات اور معانی کی دُنیا ہے۔ اس لفظ کے بارے میں قدرے تفصیلی گفتگو آنے والی سطور میں کی جائے گی۔

زبان کی نحوی ترتیب اور اس کا تنوع اور معانی سے اس ترتیب کا رشتہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم بنیادی طور پر اپنے آپ کو لفظ تک محدود رکھیں گے، اگرچہ ترتیب کا ذکر بھی اشارتاً آ جائے گا۔

لفظ کا رشتہ معنی سے ہے اور لفظ کی دُنیا عجائبات اور طلسمات کی دُنیا ہے۔ لفظ کسی بھی زبان کی اساس ہوتے ہیں۔ اشیا کا علم انسان کو لفظ اور بالخصوص ''اسم'' کے ذریعے ملا ہے۔ ''ریڈیو'' ایک چھوٹا سا لفظ ہے، لیکن یہ لفظ ہمیں انجینئر نگ، طبیعیات، لسانیات کی وسیع دُنیا تک لے جا سکتا ہے۔ ''شیر'' کہتے ہی انسانی ذہن میں کتنی تصویریں آ جاتی ہیں۔ کسی سننے والے کے ذہن میں کوئی مردِ جری آ جائے گا:

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے

ضیغم کے لفظ کو رد کرنے کی ضرورت نہیں۔ نثر میں کہہ لیجیے کہ پھر شیر میدانِ جنگ میں آگے بڑھا۔ کسی کے ذہن میں شیر کے لفظ سے چڑیا گھر کا تصور آ سکتا ہے۔ ''قیدی شیر''، کس کا تلازمۂ خیال اسے شیر کے کسی مجسمے تک لے جا سکتا ہے۔

ہر لفظ کے ساتھ معنوی مضمرات ہوتے ہیں اور ہر لفظ ہمارے تلازمۂ خیال کے وسیع سلسلے کا حصہ بن جاتا ہے۔ ''سرخ'' کا لفظ ہمیں انقلاب اور خون کی یاد دلا سکتا ہے یا پھر ہمارے

ذہن کو گلاب کے پھولوں سے مہکا سکتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں بھی لفظ کے یہ پہلو اور امکانات نظر آتے ہیں۔ انسان کی اس صفت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ وہ ہر چیز کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ یہی بات ''کلام'' کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ہر آدمی اپنی بات وضاحت اور قوت کے ساتھ کہنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں محنت بھی کرتا ہے۔ آپ ہر دن گداگروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کس قوت اور فصاحت کے ساتھ اپنی محتاجی اور ضرورت کو بیان کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں ککڑی بیچنے والے اپنی ککڑیوں کو ''لیلیٰ کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں'' کہہ کر اور یہی آواز لگا کر خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ کراچی میں بھی یہ حسنِ گفتار، مختلف انداز و اسلوب اور مختلف لسانی پس منظر کے ساتھ نظر آتا ہے۔

''لال لال تربوز۔ لے لو لے لو۔ مٹیار کے ہونٹوں کی سرخی لیے۔''

''بڑا میٹھا آم۔ شربت کا جام۔''

مثالیں میں کیوں دوں، آپ اپنے حافظے کو آواز دیجیے۔ دکان داروں، فقیروں اور دوسرے پیشہ وروں سے کیسے کیسے جملے، کیسے استعارے آپ نے سنے ہیں۔ الفاظ ادب سے فصاحت کے اصولوں پر گفتگو نہ کر سکے مگر وہ یہ اصول اپنی زندگی میں عملی طور پر برتتا ہے۔ اسے قافیہ کا لفظ، ممکن ہے نہ معلوم ہو، مگر وہ ہم صورت الفاظ کی قوت، حسن اور استعمال کو خوب جانتا ہو، سیاسی نعروں میں بھی لسانی پہلو اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ عام بولنے والا لفظوں کے معانی کے ساتھ ان کی آوازوں کی گرفت کو خوب جانتا ہے:

''قرض اتارو، ملک سنوارو''

۱۹۹۸ء گندم کا سال

ملک خوش حال

''کسان خوش حال''

''خود اُگاؤ، خود کھاؤ''

''ربِ کعبہ نصرت بھیج، رحمت بھیج''

''قاضی کی پکار، لشکر کی للکار''

''وفاق کی زنجیر، بے نظیر بے نظیر''

''نواز شریف اپنا شیر، باقی سب ہیر پھیر''

شیکسپیئر کے عظیم ڈرامے ''ہیملٹ'' میں پولینس اپنے آقا سے پوچھتا ہے:

''میرے آقا! آپ کیا پڑھتے ہیں؟''

اور ہیمٹ جواب دیتا ہے:

''لفظ۔لفظ۔لفظ۔''

میں نے لفظوں کے معنوی مضمرات کا ذکر کیا۔ اب ایک اور مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے مترادفات و مرادفات کا مسئلہ۔ ادبی مطالعے میں تو یہ ایک نازک اور اہم مسئلہ ہے، عام زندگی اور عام گفتگو میں بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر لفظ معنویت کا ایک دائرہ رکھتا ہے۔ ''مرادف'' بالکل ہم معانی الفاظ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی دو لفظ ہم معنی نہیں ہوتے مگر اُردو کا معاملہ مختلف ہے۔ اس میں ایک ہی چیز کے اسم مختلف زبانوں سے آتے ہیں۔ ''ان کے ہم معانی ہونے میں کسے شبہ ہوسکتا ہے؟'' آپ یہ سوال کر سکتے ہیں اور بجا طور پر، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے الفاظ بھی اب اپنے اپنے محورِ معنوی پر رقص کرتے ہیں۔ ''اوس'' اور ''شبنم'' پر تو مولانا شبلی نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' میں گفتگو کی ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

یہ دونوں مصرعے آپ کے سامنے ہیں۔ ''اوس'' کی جگہ ''شبنم'' اور ''شبنم'' کی جگہ ''اوس'' کرکے دیکھیے اور پھر خود ہی ہنس پڑیے— پھر معاملہ اور آگے بڑھتا ہے۔ ''اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی''۔ ذرا ''اوس'' کی جگہ اُمیدوں پر ''شبنم'' ڈال کر دیکھیے۔ محاورے میں ادنیٰ ترین تحریف کی اجازت آپ کی زبان آپ کو نہیں دے گی۔

''آسمان''، ''فلک''، ''چرخ''، ''آکاش''، ''سما'' اور ''سماوات'' یہ سب ایک معنی کے لیے اسم ہیں اور مکمل طور پر ہم معنی، لیکن کیا یہ سچ مچ، مرادف اور ہم معنی ہیں؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ ان الفاظ میں فلک کے ساتھ ہی مصائب اور آفات کا سلسلہ ذہن میں آجاتا ہے۔ ''بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ'' ہندی میں ''آکاش'' کا معنوی شیڈ (shade) یعنی ظل لونی اُردو سے مختلف ہے۔ اُردو والے جب یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں تو آسمان کے حسن کے اظہار کے لیے: ''آکاش پہ تاروں کا جال'' (مجاز)۔ سما اور سماوات تقابل اور فرق یا زمین و آسماں کے رشتے کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ ''از ارض تا سما''۔ ان الفاظ میں سب سے نیوٹرل ((لا، لونی) لفظ آسمان ہے:

''آج آسماں ابر آلود ہے''

''بارش ہوئی تو آسمان دھل کر نکھر گیا''

ویسے آسمان بھی فلک کے معانی میں استعمال ہوتا ہے:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

جس طرح ہم میں سے کوئی غیر ضروری بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھانا پسند نہیں کرے گا، اسی طرح زبانیں بھی مترادفات میں سے کچھ کو ترک کر دیتی ہیں، یا پھر ان کو، معنوی فرق کے ساتھ استعمال کرنے لگتی ہیں۔ علامہ دتاتریہ کیفی نے اپنی مشہور کتاب ''کیفیہ'' کے تیسرے باب کا عنوان ''مرادفات یا مترادف الفاظ'' قائم کیا ہے اور لفظوں کے کئی جگہ (گروپ) درج کر کے ان کے معنوی فرق پر گفتگو کی ہے۔

(الف)۔ رنج۔ غم۔ افسوس۔ تأسف

(ب)۔ خوش۔ شاد۔ بشاش۔ باغ باغ

(ج)۔ اُنس۔ الفت۔ محبت۔ عشق

(د)۔ دبدا۔ جھجک۔ سانسا۔ کھٹکا۔ بچک۔ دھڑکا۔ سہم۔ سناٹا۔ ڈر

یہ بحث ''کیفیہ'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ایسے مرادفات و مترادفات کی طویل فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ علامہ کیفی نے فیصلہ ذوقِ سلیم پر چھوڑ دیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں ایسے قریب المعنی الفاظ کا فرق بڑے ادیبوں اور بالخصوص شاعروں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بجنوری مرحوم نے سچ کہا ہے کہ بڑے شاعر کا کلام الفاظ کے باب میں میدانِ حشر و نشر ہے۔ ''صرف''، ''فقط''، ''بس''، ''خالی''، ''محض'' اور ''نرا'' یہ قریب المعنی الفاظ ہیں جو استثنیٰ یا حصر کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اب ''نرا'' کا استعمال سمجھنا ہو تو اکبر سے رجوع کیجیے:

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

الفاظ کے کتنے ہی اور پہلو ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ کیا لفظ کی آواز اور معنی کے درمیان کوئی فطری تعلق ہوتا ہے؟ جن الفاظ کے مختلف معانی ہوتے ہیں، انھیں ایک ہی لفظ سمجھا جائے یا وہ مختلف الفاظ ہیں؟ مستعار الفاظ کا تلفظ اصل زبان کے مطابق ہوگا یا دوسری زبان میں آنے کے بعد بدلا ہوا تلفظ اس زبان کا معیاری تلفظ ہوگا؟ کیا ہم مستعار الفاظ میں معنوی تصرف کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ سب مسائل اس مطالعے سے تعلق نہیں رکھتے۔ ایک مسئلے کی طرف مختصر اشارے مناسب ہوں گے (لیکن ''گنجینۂ معنی'' کے طور پر ہی لفظ کا مطالعہ، اس تحریر کا مقصد ہے)۔ جس

بات کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اب جدید لسانیات کی روشنی میں لفظ، معنی کی پہلی یا بنیادی اکائی نہیں ہے، بلکہ یہ حیثیت معنیہ (phoneme) کو حاصل ہوگئی ہے۔ بول چال اور آواز کی پہلی اکائی صوتیہ ہے، مثلاً ''آ'' ایک صوتیہ ہے، لیکن یہ صوتیہ، معنیہ بھی ہے۔ ''آ'' کسی کو بلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ ایک لفظ بھی ہے۔ آنا، کا فعل امر اور یہ ایک جملہ بھی ہوسکتا ہے جس میں ''تو'' محذوف ہے۔ اب ہم ''لفظ'' کا مطالعہ معنیہ اور لغویہ (lexeme) کی تین سطحوں پر کرتے ہیں، بلکہ چار سطحوں پر۔ چوتھی سطح فہمیہ (sememe) کی ہے۔ لفظ شیر کی مثال دی جا چکی ہے کہ اس ایک لفظ سے ایک ہی معنی کی کتنی شکلیں ذہن میں آتی ہیں، ان میں ہر شکل ایک فہمیہ ہے۔ (لغویہ اور فہمیہ دونوں اصطلاحیں، راقم الحروف کی وضع کردہ ہیں)۔

لغویہ لفظ وہ شکل ہے جو لغت میں اختیار کی جاتی ہے۔ ''چور'' ایک معنیہ بھی ہے، لفظ بھی اور لغویہ بھی۔ ''بازار'' ایک معنیہ بھی ہے، لفظ بھی اور لغویہ بھی۔ ''چور بازار'' ایک لغویہ ہے اور یوں لغت کی ایک اکائی ہے۔ یہ لغویہ دو معنیوں اور لفظوں کا مجموعہ ہے۔ ''بازاری'' ایک لفظ ہے جو دو معنیوں پر مشتمل ہے۔ ''بازار'' ایک آزاد معنیہ ہے اور ''ی'' پابند معنیہ کیوں کہ اس کے الگ سے کوئی معنی نہیں۔ ''چور بازاری'' ایک لغویہ ہے جو تین معنوں کا مجموعہ ہے۔ جدید لسانیات کے اس انداز سے لفظ و معنی کا مطالعہ زیادہ سائنسی اور گہرا بن گیا ہے۔ اب سابقہ اور لاحقہ کی جگہ ہم معنیہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ''آزاد'' اور ''پابند'' کے فرق سے معنیہ کے مطالعے میں کچھ اور وسعت آ گئی ہے۔

اور آخری بات یہ ہے کہ ''ادائیگی'' یا ''طرزِ ادا'' کو بھی ایک معنیہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے شاعر نے اس بڑی لسانی حقیقت اور لسانی مطالعے کے اس گہرے نکتے کو بہت پہلے پیش کر دیا تھا:

تأمل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی؟

ہم ایک ہی جملے یا شعر یا مصرعے کو مختلف انداز سے ادا کر سکتے ہیں اور طرزِ ادا کے اختلاف سے معانی بدل جاتے ہیں۔ یوں طرزِ ادا کو معنیہ کی حیثیت حاصل ہے۔ کیا وہ لاہور گیا تھا؟ — ''کیا'' حرفِ استفہام ہے اور اس کی مدد سے اس سوالیہ جملے کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے، مگر آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں (لہجے میں سوال پیدا کر کے، گیا تھا کی ادائیگی کو بدل کر) وہ لاہور گیا تھا؟ اسی جملے کو اُتار چڑھاؤ کے بغیر مستقیم انداز میں کہیے تو یہ بیانیہ جملہ ہو جائے گا۔ مشہور شعر ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

پہلے مصرعے کو استفہامیہ انداز میں بھی پڑھا جا سکتا ہے اور بیانیہ انداز میں بھی۔ معانی میں جو فرق پیدا ہوگا اس تک رسائی مشکل نہیں۔ افسوس! ہمارے ہاں شعر خوانی کی روایت اور فن ختم ہوگیا۔ ادب، بالخصوص شعر کی قرأت کے مسئلے سے ہم نے لاتعلق ہو کر کیا کچھ کھویا ہے، اس کا حساب اور اندازہ کون کرے گا؟

(۲)

زبان اور شعر و ادب

عام زندگی میں زبان کی اہمیت اور اس کے رول کو اس مقالے کے تمہیدی حصے میں پیش کیا گیا ہے۔ ''زبان'' کے لفظ کو ہم ''لفظ'' سے بدل سکتے ہیں۔ اب آداب کے حوالے سے لفظ کی اہمیت پر غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ لفظ ادب ہے۔ بالخصوص شاعری کے سلسلے میں یہ بات اور بھی درست ہے۔

شاعری اور ادب کی بہت سی تعریفیں بیان کی گئی ہیں، مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی۔ قدیم ہندوستان، یونان، روم، عرب دُنیا میں شعر و ادب کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرنے والوں میں فلسفی بھی شامل ہیں، شاعر اور نقاد بھی۔ ان تعریفوں میں بہت سی تعریفیں اعلیٰ ترین شاعری کا حسن رکھتی ہیں۔ یہ تعریفیں اُس بڑی صداقت کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کرتی ہے جس کو ہم شعر کہتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی تعریف جامع و مانع نہیں ہے، اور ہو بھی نہیں سکتی کیوں کہ عظیم صداقتیں گرفت میں نہیں آتیں۔ ہم ''زندگی'' کی کیا تعریف بیان کر سکتے ہیں؟ اب تو جسمانی اور مادی سطح پر بھی زندگی اور موت کی تعریفیں بدل گئی ہیں۔ اب تک تو دل کے ٹھہر جانے کو موت کہا جاتا تھا، لیکن اب دماغ کی موت، موت ہے۔ دل تو پندرہ بیس منٹ ٹھہرنے کے بعد بھی اپنا سفر شروع کر دیتا ہے۔ پھر کوئی زندگی کو پیمانۂ امروز و فردا (وقت) سے ناپنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ زندگی کو ایک جاری لہر قرار دیتا ہے:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا ہے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

کسی کے نزدیک زندگی مقاصدِ جلیلہ کی تجسیم ہے، کے خیال میں زندگی ایک مسلسل امتحان کا نام ہے۔

یہ بڑی حقیقتیں عظیم اور پھیلے ہوئے سلسلۂ کوہ کی طرح ہوتی ہے۔ اس سلسلۂ کوہ کو کوئی مکمل طور پر نہیں دیکھ سکتا۔ جو جہاں سے دیکھتا ہے اسی کو بیان کر دیتا ہے۔ ان میں سے ہر بیان سچا ہوتا ہے مگر کوئی بیان مکمل نہیں ہوتا۔ آیئے، شاعری کی چند تعریفوں کی دُہرالیں۔ ان میں تکنیکی تعریفیں بھی ہیں اور ایسی تعریفیں بھی جو اچھے شعر کی طرح ہمیں فکر، خیال اور جذبے کی ان وادیوں میں پہنچا دیتی ہیں جہاں انسانی روح کا حسن اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ جگ مگ جگ مگ کرتا نظر آتا ہے، جہاں انسانی فکر کے سارے امکانات اپنی تمام تر تہ داری کے ساتھ اپنے آپ کو ہمارے سامنے منکشف کرتے ہیں اور جہاں سکوت گویائی میں اور گویائی سکوت میں بدل جاتی ہے۔ ایسا سکوت جو ایک نئے اندازِ تکلم کا نام ہے۔

''شعر اس کلامِ موزوں کو کہتے ہیں جو بالقصد موزوں کیا گیا ہو۔''

علم معنی و بیان کی کتابوں میں شعر کی تعریف:

''شاعری مسرت کو سچ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا فن ہے۔''

''شاعری طاقت ور جذبات کے برجستہ بہاؤ کا نام ہے۔''

''شاعری انسانی تجربوں کے اس اظہار کا نام ہے جس میں تصورات اور انسانی اقدار اور ان کی قدر و قیمت کے عناصر موجود ہیں۔''

''شاعری محض صداقت کا اظہار نہیں ہے، بلکہ اس صداقت کو ہمارے لیے زیادہ حقیقی بنانے کی کاوش ہے۔''

''شعر ہماری روح کا نغمہ ہے۔''

''شاعری زندگی کی اندھیری رات میں شاعر کی روح کا نغمہ اور گریہ ہے۔''

ایسی قابلِ لحاظ اور معقول تعریفوں کو اگر جمع کیا جائے اور اختصار کے ساتھ ان کا جائزہ لیا جائے تو کئی سو صفحات کی کتاب مرتب کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مختلف ادوار میں ادب کی بہت سی ایسی تعریفیں پیش کی گئیں جنھوں نے ادبی، تنقیدی اور فکری طور پر ہمیں متاثر کیا۔ ''ادب تنقیدِ حیات ہے''، ''ادب برائے زندگی''، ''ادب انسانی فکر اور تخیل کی معراج''، ''ادب برائے ادب''، ''ادب حسن، خیر اور صداقت کا نام ہے''، ''ستم، شیوم، سندرم''۔

ان میں سے آپ کس تعریف کو رد کریں گے؟ بعض تعریفیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی نظر آتی ہیں، مثلاً ''ادب برائے ادب'' اور ادب برائے زندگی''، لیکن اگر آپ وسیع تر نقطۂ نظر سے غور کریں تو یہ دونوں تعریفیں ایک دوسرے کا ضمیمہ بن جاتی ہیں۔ ادب برائے ادب کے کسی علم

بردار نے کوئی ایسی بڑی تحریر نہیں لکھی جس کا علاقہ زندگی سے نہ ہو، اسی طرح ادب برائے زندگی پر یقین رکھنے والے کسی ادیب نے عملی طور پر ادبی مسرت، ادب میں اظہار کے حسن اور ادب کے فنی تقاضوں سے انکار نہیں کیا۔ ادب ہمیں مسرت بھی عطا کرتا ہے اور ہماری راہوں کو منور بھی کرتا ہے۔

مجرد، ذہنی اور فکری انداز کی اہمیت اپنی جگہ (اور ہم اسی کے قائل ہیں) لیکن ادب کی جامع و مانع اور قابلِ قبول تعریف ہمیں دوسرے انداز سے کرنی ہوگی۔

''ادب لفظوں کا فن ہے''۔ یہ ایک عملی اور قابلِ قبول تعریف ہے۔ الفاظ ادب کا ذریعۂ اظہار ہیں اور یوں وہ ان فنونِ لطیفہ سے مختلف ہے جن میں بصری علامتیں استعمال کی جاتی ہیں، مثال کے طور پر مصوری اور سنگ تراشی۔

مصور رنگوں اور موقلم کا سہارا لیتا ہے، موسیقار آلاتِ موسیقی کے وسیلے سے اپنے فنی کمالات پیش کرتا ہے۔ سنگ تراش چھینی کے ذریعے اُس حسن کو مشہود شکل دیتا ہے جو پتھر میں خوابیدہ ہوتا ہے۔ ادیب اور شاعر کا وسیلۂ اظہار اور متاعِ ہنر لفظ ہیں۔ یہ ایک بہت پیچیدہ ذریعۂ ابلاغ ہے۔ ایک ہی لفظ کے مختلف اور ممیّز معانی ہو سکتے ہیں۔

''کم بخت تو کہاں مرگئی؟''

''ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں''

''ہائے اس جسم کے کم بخت، دل آویز خطوط''

ان تینوں مثالوں میں ''کم بخت'' کا لفظ ہر جگہ ایک بالکل ہی مختلف ''تجربے'' کا اظہار کرتا ہے۔ ادب کے سلسلے میں ہمیں اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ کسی ادب پارے میں الفاظ کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ بعض لوگ اپنی ذاتی اور تہذیبی سطح سے بلند نہیں ہو پاتے یا وہ زبان کی پیچیدگی اور ابہام کو نہیں سمجھ پاتے۔ ان کا ذہن ''اکہرا'' ہوتا ہے، مثال کے طور پر ''تو'' کے لفظ سے ان کے ذہن میں ان کی لڑاکا ہمسائی یا جاہل کنجڑا ہی آتا ہے کیوں کہ انھوں نے خلوت میں اس لفظ کی قربت اور شدت کا کبھی تجربہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی خاموش راتوں میں جب سنسار سوتا ہے، انھوں نے بیدار ہو کر اپنے رب کے ساتھ وہ مکالمہ نہیں کیا ہے جس میں بندے کی عاجزی اور رب کی توحید اسی لفظ کے ذریعے گویائی میں بدلتی ہے۔ وہ اس نکتے سے بھی پوری طرح باخبر نہیں ہیں کہ زبان فرد اور معاشرے کے تعلقات کے ہر پہلو کا بوجھ سہارتی ہے۔ لفظوں کے معانی کا تعین اسی وسیع معاشرتی، عمرانی پس منظر میں کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی مکمل طور پر نہیں۔

لفظوں کی دُنیا عجب طلسمات ہے۔ الفاظ کی معنوی سطحیں، درجے اور رنگ بدلتے

رہتے ہیں۔ بازاری زبان کے بعض الفاظ وقت گزرنے کے ساتھ مستند زبان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح ماضی کے بہت سے الفاظ کا تہذیبی و تمدنی پہلو اور تراش خراش محض تصنع معلوم ہونے لگتی ہے۔ کبھی حالات، الفاظ اور زندگی کے باہمی رشتے اور ذہنی تلازمے اس درجہ بدل جاتے ہیں کہ ان کی شدت لغوی معانی پر غالب آ جاتی ہے۔

الفاظ کے معانی کا تعین ایک مشکل مسئلہ ہے۔ ہم صنف کے الفاظ میں اپنے تجربات کا عکس بھی تلاش کرتے ہیں۔ پھر پڑھنے والوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے جو ادبی تحریروں کو اپنی غلط تاویلات سے مسخ کر دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غلط اور صحیح تاویلات اور مطالب کے درمیان فرق کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ذاتی اور اوٹ پٹانگ تاویل سے آگے بڑھ کر ادب اور لفظ کی معنویت کو صحیح بنیادوں پر سمجھنے کی سنجیدہ کوشش تو کی جا سکتی ہے، مثلاً اگر ہم کسی دوسرے دور کے مصنف یا کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے الفاظ کے وہ معانی معلوم کرنے ہوں گے جو مصنف کے دور میں مروّج تھے۔ میر امن نے ''باغ و بہار'' میں ''رنڈی'' کا لفظ عام عورت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ غالبؔ کا یہ مصرع ملاحظہ ہو:

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا

یہاں سیاست کا لفظ سرزنش، تنبیہ، غصے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مفرد الفاظ کے علاوہ محاورے، اظہار اور روزمرہ کی تبدیلیوں کا لحاظ بھی ضروری ہے:

اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

انتظار کھینچنا جو انتظار کشیدن کا لفظی ترجمہ تھا، اُردو کا محاورہ تھا، جواب متروک ہو گیا ہے۔

لفظوں سے متعلق تمام مسائل چھیڑنے کا یہ موقع نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ لفظ کی اہمیت کا قاری کو اندازہ ہو سکے۔ ادب، بالخصوص شاعری لفظوں کے ذریعے زندگی کے تجربوں کی تخلیقِ نو کا نام ہے، جس طرح مصوری خطوط، اشکال اور رنگوں کے ذریعے زندگی کی مختلف شکلوں، مناظر اور مظاہر کو ایک نئی تخلیق کے طور پر پیش کرتی ہیں☆۳

ہم نے ادب میں لفظ کی اہمیت اور اساسی کردار کے بارے میں جو کچھ عرض کیا ہے اور جو کچھ عرض کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ سب کچھ غالبؔ نے ایک شعر میں سمیٹ کر بیان کر دیا:

☆۳۔ سیّد ابوالخیر کشفی، ہمارے عہد کا ادب اور ادیب، قمر کتاب گھر، کراچی، ۱۹۷۱ء۔ لفظ اور ادب کے بارے میں یہ گفتگو، اس کتاب کے پہلے مضمون ''ادب کا سب سے بڑا مسئلہ ادب'' سے لی گئی ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

اور ہم نے اس مضمون کا عنوان غالبؔ کے اسی شعر سے مستعار لیا ہے۔ لفظ ہی معنی کے خزانے تک پہنچنے کے لیے ''کھل جا سم سم'' کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی طلسم سے معنی کے مقفل دروازے کھلتے ہیں اور آدمی روح، فکر اور تخیل کے اس خزانے تک پہنچ جاتا ہے جسے شعر و ادب کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اِدھر آپ نے کچھ کہا اُدھر وہ ماضی کا حصہ بن گیا۔ یہ لمحۂ موجود، جسے حال کہتے ہیں، کتنا مختصر ہوتا ہے مگر شعر تو ایک دوام کا نام ہے۔ سراج الدین ظفر نے مے کشی کے حوالے سے کہا تھا:

وقت اپنا زر خرید تھا ، ہنگامِ مے کشی
لمحے کو طول دے کے ابد ہم نے کر دیا

شاعر لفظ کے ذریعے لمحے کو ابد بناتا ہے۔ یونان اور قدیم ہندوستان سے آج کے عالمی گاؤں (Global Village) تک سفر کر لیجیے، لفظ کی فتح کی یہی کہانی آپ کو محرابِ وقت پر لکھی نظر آئے گی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں:

لفظ مر گیا
اور میرا کہنا ہے
کہ وہ اپنی ادائیگی کے لمحے سے
اپنی زندگی شروع کرتا ہے (ایملی ڈکنسن)

مگر بات لفظ پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ الفاظ کی ترتیب بھی ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کولرج اُن اہلِ فن میں سے ہے جنھوں نے نقدِ ادب کو تخلیقِ ادب کی سطح تک پہنچایا۔ اس نے لفظ کے حوالے سے نثر و نظم کو یوں گرفت میں لیا ہے:

نثر = الفاظ، بہترین ترتیب کے ساتھ
شاعری = بہترین الفاظ، بہترین ترتیب کے ساتھ

بہترین الفاظ، بہترین ترتیب کے ساتھ۔ اس بہترین ترتیب میں وہ عناصر چھپے ہوئے ہیں جو ادب، بالخصوص شاعری کو شرارِ معنوی بنا دیتے ہیں۔ رقص کناں شرارِ معنوی۔

غزل کیا ، اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغرؔ

لفظ کی آغوش میں معانی بھی ہوتے ہیں اور لفظ کی آواز بھی ہوتی ہے۔ لفظ جسم بھی رکھتا ہے اور روح بھی۔ جسم رقصاں رقصاں۔ بحر، شاعری میں موسیقی کا درجہ رکھتی ہے، لیکن یہ موسیقی

اور گردشِ رقصاں لفظ میں بھی ہوتی ہے۔ بہترین لفظ کو بہترین ترتیب جگمگا دیتی ہے۔ کیا لفظوں پر الگ سے گفتگو کی جا سکتی ہے؟ یا لفظ ترتیب اور شعری فضا کے حوالے سے موضوعِ مطالعہ بنتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ لفظ اور فضا دونوں مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ شاعر کا استعمال لفظ کو برگزیدہ بنا دیتا ہے۔ خود برگزیدہ کے لفظ پر غور کیجیے۔ کیا اس لفظ کے بغیر میں شاعری کے بارے میں یہ بات عرض کر سکتا ہوں؟

بہترین الفاظ بہترین ترتیب کے ساتھ۔ ایک لفظ کی مثال پیش کرتا ہوں۔ مرزا یگانہ کراچی آئے تھے اور بہت بیمار تھے۔ ذوالقار علی بخاری صاحب کو انھوں نے بلا بھیجا۔ بخاری صاحب ان سے ملنے رشیدہ ترابی کے دولت کدے پر پہنچے۔ بخار کی شدت سے ان کا بدن پھنک رہا تھا۔ بخاری صاحب کی آمد کی خبر سنی تو اُٹھ بیٹھے۔

آگے کا حال بخاری صاحب سے سنیے:

میں نے ان کا دل بہلانے کے لیے ان ہی کے شعر ان کو سنانا شروع کیے مگر سناتے سناتے شعروں کی کیفیت میں ایسا کھو گیا کہ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ مرزا صاحب کے بھی آنسو نکل آئے۔ مجھے گلے لگایا اور روتے روتے کہا، ''بھائی تم ایسا شعر دوست پھر کب پیدا ہوگا''۔ میں بولا:

تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

یہ شعر سن کر مرزا صاحب کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ روتے جاتے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔ ایک ایک لفظ پر سر دھنتے تھے۔ ''تبرک'' کے لفظ پر تو بہت دیر تک سینہ پیٹتے رہے۔ ہائے ظالم کیا لفظ رکھا ہے۔ تبرک ہائے تبرک۔ آنسوؤں کا تار تھا کہ ٹوٹنے میں نہ آتا تھا۔ روتے روتے نحیف آواز میں پوچھا، بھائی یہ شعر تمھارا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ پوچھا، کس کا ہے؟ میں نے کہا، اقبال کا۔ فرمایا، تعجب ہے اور پھر رونے لگے اور میں روتے روتے ہنس پڑا۔[☆۴]

شاعری میں لفظ صرف مفہوم کی ادائیگی کے لیے استعمال نہیں ہوتا، بلکہ لفظ کے ذریعے شاعر اپنی کیفیات، اپنے فکر، اپنے تخیل اور اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے۔ لفظ، شاعر کی زبان سے شعر و ادب کی

☆۴۔ سیّد ذوالفقار علی بکاری۔ ''سرگزشت''۔ غالب پبلشرز لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۴۷۔۲۴۸

تمام روایات کو تخلیقی انداز میں قاری تک پہنچاتا ہے اور یہ قاری صرف حال کا قاری نہیں، بلکہ مستقبل کا قاری بھی ہے۔ شاعری بھی ہماری طرح مکمل وجود ہوتی ہے۔ جسم اور روح کا امتزاج۔ لفظوں کو ادب اور شاعری کا جسم کہا گیا ہے اور خیال کو روح کا درجہ دیا گیا ہے۔ یہ بحث تنقید میں بہت پرانی ہے کہ لفظ یا اظہار کو اوّلیت حاصل ہے یا خیال کو۔ بزرگوں نے لفظ و خیال کے رشتے کو لباس اور جسم کے رشتے کے مماثل سمجھا۔ زیادہ گہرائی میں جانے والوں نے اسے جسم اور روح کے رشتے سے تعبیر کیا۔

قاعدہ ہے کہ جہاں نیا خیال پیدا ہو وہاں نیا لفظ خود بہ خود پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہے۔☆۵

اپنی بات کی وضاحت اور ثبوت کے لیے ڈاکٹر بجنوری نے غالبؔ کی تراکیب کی ایک فہرست دی ہے۔ تراکیب کو مرکب لفظ ہی قرار دیا جائے گا۔ ''خمارِ رسوم''، ''جوہرِ اندیشہ''، ''گل بانگِ تسلی''، ''غبارِ وحشت''، ''دعوتِ مژگاں'' اور ''جیبِ خیال'' وغیرہ۔ شاعر ان تراکیب کے ذریعے دو چیزوں یا دو خیالوں کے درمیان رشتہ قائم کرتا ہے اور جہاں کہیں اس رشتے میں مماثلت کا پہلو ہوتا ہے وہاں یہ مرکب لفظ ایک نیا استعارہ بن کر اُبھرتا ہے۔ اس پہلو سے شاید اب تک تراکیبِ لفظی کا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ ترکیبیں زبان کے تازہ ہونے اور زبان کو ''تازہ'' رکھنے کی ایک صورت ہیں۔ زبان کی تازگی خیال کی تازگی کا اشاریہ ہے۔ تازہ ترکیبیں اس بات کا ثبوت بھی ہیں کہ:

تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

یہ کائنات لاکھ کہنہ سہی اور ہمارے واردات لاکھ تازہ سہی (کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات۔ اقبالؔ) شاعر مختلف اشیا اور مظاہر کے اسما میں پیوند کاری کر کے الفاظ پیدا کرتا رہتا ہے اور یہ الفاظ تازہ تر واردات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ''سگ گزیدہ'' اوپری سطح پر ایک ''لفظ'' تھا۔ شاعر کے انسانی تجربے نے ''مردم گزیدہ'' کی ترکیب کو جنم دیا اور پھر ایک اجتماعی تجربے سے ہم ''شب گزیدہ سحر'' سے آگاہ ہوگئے۔ ''چاند کا بجھنا''، ''ستاروں کے کھیت کا اُجڑنا'' اور ''درد کا شجر'' یہ سب لفظ بازارِ سخن کی تازگی کے آثار ہیں اور رہیں گے۔ ''زبان ارتقا کی پابند ہے۔ الفاظ بے جان نہیں، بلکہ زندہ ہیں۔ گو منطق کے قواعد لاتبدّل ہیں لیکن تصورات بہ مرورِ وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور چوں کہ تصور کے زبان سے ادا کرنے کا نام ہی لفظ ہے، الفاظ بھی تغیر

☆۵۔ عبدالرحمٰن بجنوری۔ ''محاسن کلام غالب''۔ فخری ایڈیشن، کراچی۔ ص ۱۱

کا تقاضا رکھتے ہیں۔ اگر یہ تجدید عہد بہ عہد نہ ہوتو زبان کہنہ اور پارینہ ہو جائے۔''☆۶

حالی کی مقدمۂ شعر و شاعری میں بھی لفظ و خیال کے رشتے اور تعلق کی بحث ملتی ہے۔ مولانا نے مکان کی مثال سے یہ گفتگو کی ہے۔ اگر خیال بہت خوب صورت ہے، مگر زبان مناسب اور خوب صورت نہیں تو شعر اس مکان کی طرح ہوگا جو اندر سے بہت وسیع، کشادہ اور اچھا ہے، لیکن باہر سے ویران نظر آتا ہے۔

حالی نے تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحصِ الفاظ کو شاعری کے اجزائے ثلاثہ قرار دیا ہے۔ الفاظ کی تلاش اور جستجو شاعر کے فنی فرائض میں داخل ہے۔ وہ مناسب الفاظ ڈھونڈتا ہے اور الفاظ کے معنی کے امکانات اور پہلوؤں کا کھوج لگاتا ہے۔ ان سب پہلوؤں کے پیشِ نظر حالی نے ''تفحص'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ت ف ح ص، کے معانی ہیں تفتیش کرنا، کھود کر نکالنا۔ تیز بارش مٹی کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ یہ عمل تفحص ہے۔ بھید اور راز کی تلاش و جستجو بھی تفحص ہے۔ یہ عناصر سچ مچ نفسِ شاعری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ تخیل اور مطالعۂ کائنات کی بحث ہمارے دائرے سے باہر ہے مگر اس خیال کا اظہار ضروری ہے کہ تخیل ہی روحِ شعر ہے۔ مطالعۂ کائنات تکیل کے لیے مہمیز کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک اور بات کہ تفحصِ الفاظ کے ساتھ شاعر کا کام ختم نہیں ہو جاتا، بندشِ الفاظ اس کے کارِ منصبی کا لازمی حصہ ہے:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

اور یہ مرصع سازی، محض کاری گری نہیں، جگر صاحب کا شعر ہے:

کاری گرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے کلام میں لیکن اثر بھی ہے

''کاری گری'' الفاظ سے کھیلنے اور اس کی نمائش کا نام ہے۔ اچھا شاعر اظہار کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق الفاظ کی تلاش کرتا ہے۔ ہماری تنقید کا ایک تکیہ کلام یہ بھی رہا ہے کہ ''وہ زبان کا شاعر ہے'' یا ''یہ زبان کا شعر ہے''۔ شاعری میں زبان اور خیال ہم قدم رہتے ہیں، دونوں ''ہم رشتہ'' ہیں۔ شاید رشید صاحب (رشید احمد صدیقی) نے کہیں لکھا ہے کہ زبان نٹ کا رسہ نہیں جس پر نٹ چلنے کا کرتب دکھا رہا ہو اور دیکھنے والے تالیاں بجا رہے ہوں۔ زبان کا مقصد تو خیال کا اظہار ہے (جسم و روح)۔ محض زبان کے سہارے شاعر بہت آگے نہیں جا سکتا۔ اس کی سطح بس یہی رہے گی:

☆۶۔ عبدالرحمٰن بجنوری۔ ''محاسن کلام غالب''۔ فخری ایڈیشن، کراچی۔ ص ۱۰

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذری آپ کو زحمت ہوگی

خزاں جائے ، خزاں جائے ، خزاں جائے گلستاں سے
بہار آئے ، بہار آئے ، بہار آئے گلستاں میں

جب ''بہترین الفاظ بہترین ترتیب'' کے ساتھ ''بہترین اور بلند ترین خیالات'' کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو ایسی شاعری وجود میں آتی ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا
(میرؔ)

اور حمد میں غالبؔ کا یہ شعر:

اے بخلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا
باہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا

مولانا شبلی نے ''شعر العجم'' کی چوتھی جلد میں شاعری میں الفاظ کی اہمیت پر ایسی گفتگو کی ہے جو آج بھی اس موضوع پر ہماری رہنمائی کرتی ہے اور جو اس موضوع پر کسی بھی مذاکرے کا مناسب ترین نقطۂ آغاز ہے۔ حالی اور شبلی کے احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے عربی اہلِ فن کے تنقیدی خیالات اُردو میں منتقل کر دیے۔ شاید یہ بات ان پر منکشف ہوگئی تھی کہ آنے والی نسلیں اپنے فکری ورثے سے محروم ہو جائیں گی اور اس کا سبب عربی و فارسی سے ہماری دوری ہوگی۔ شبلی نے ابنِ رشیق کی کتاب ''العمدۃ'' کے باب فی اللفظ والمعنی کا ایک اقتباس پیش کیا ہے:

> لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے۔ دونوں کا ربطِ باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط کہ وہ کم زور ہوگا تو یہ بھی کم زور ہوگی۔ پس اگر معنی میں نقص نہ ہو اور لفظ میں ہو تو شعر میں عیب سمجھا جائے گا، جس طرح لنگڑے یا لُنجے میں روح موجود ہوتی ہے، لیکن بدن میں عیب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر لفظ اچھے ہوں، لیکن مضمون اچھا نہ ہو، تب بھی شعر خراب ہوگا اور مضمون کی خرابی الفاظ پر بھی اثر کرے گی۔ اگر مضمون بالکل لغو ہو اور الفاظ اچھے ہوں تو الفاظ بھی بے کار ہوں گے، جس طرح مردے کا جسم کہ یوں

دیکھنے میں سب کچھ سلامت ہے، لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح
مضمون گو اچھا ہو، لیکن الفاظ اگر برے ہوں تب بھی شعر بے کار ہوگا،
کیوں کہ روح بغیر جسم کے پائی نہیں جاسکتی۔☆[۷]

شبلی نے خود بھی لفظ کی بحث خاصی تفصیل سے پیش کی ہے۔ ان کے خیال میں ''شاعری کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے— اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی چاہیے اور معنی سے بالکل بے پروا ہونا چاہیے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو، لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر نہ پیدا ہو سکے گی۔'' پھر شبلی نے الفاظ کی قسموں سے گفتگو کی ہے۔ غزل کے لیے نرم و نازک الفاظ مناسب ہیں۔ ''بلند اور پُرشوکت الفاظ رزمیہ مضامین اور قصائد وغیرہ کے لیے موزوں ہیں۔'' عشقیہ مثنویوں میں بھی ''غزل کی زبان استعمال کرنی چاہیے۔''☆[۸]

شبلی بہترین الفاظ کے ساتھ بہترین ترتیب کے بھی قائل ہیں اور انھوں نے اس نکتے کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اسے انھوں نے ''الفاظ کے باہمی تعلق اور تناسب'' کا نام دیا ہے۔ ''لفظوں کی انفرادی حیثیت'' پر گفتگو کے بعد شبلی لکھتے ہیں:

یہ تمام تر بحث الفاظ کی انفرادی حیثیت سے تھی، لیکن اس سے زیادہ مقدم
الفاظ کا باہمی تعلق اور تناسب ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شعر میں جس قدر
لفظ آئیں الگ الگ دیکھا جائے تو سب موزوں اور فصیح ہوں، لیکن ترکیبی
حیثیت سے ناہمواری پیدا ہو جائے، اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ جو
الفاظ ایک ساتھ کسی کلام میں آئیں ان میں باہم ایسا توافق، تناسب اور
ہم آوازی ہو کہ سب مل کر گویا ایک لفظ ایک ہی جسم کے اعضا بن
جائیں۔ یہی وصف ہے جس کی وجہ سے شعر میں موسیقیت پیدا ہو جاتی
ہے اور شاعری اور موسیقی کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔☆[۹]

لفظ، اس کی معنویت، موزونیت اور تناسب و موسیقی کے حوالے سے کئی نکات ہمارے سامنے آئے۔ فن کار اپنے طلسمی لمس سے لفظوں کو ''چیزے دیگر'' بنا دیتا ہے۔ لفظ کبھی ساز اور نغمہ

۷۔ ابن رشیق بہ حوالہ علامہ شبلی نعمانی ''شعر العجم''، جلد چہارم، فرمان علی اینڈ سنز، لاہور۔ ص ۵۲

۸۔ حوالہ بالا۔ ص ۵۳ تا ۵۷

۹۔ حوالہ بالا۔ ص ۵۸

بن جاتے ہیں اور کبھی رنگ اور خطوط۔ فنونِ لطیفہ میں سے ہر اک کا دائرہ مخصوص اور متعین ہے، مگر شاعری ان سب کی قائم مقام بن سکتی ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی نے اس نکتے کو اُٹھایا ہے اور اس پر کلام کیا ہے۔ ذرا یہ تصویریں دیکھیے:

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشمِ مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ مے خانہ دیکھتے
(اصغر)

ہلالِ ابروئے پُر خم سے اک تصویر پیدا ہے
ذرا تم سامنے آنا کہ ہم نے چاند دیکھا ہے
(آغا شاعر دہلوی)

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کو
تصویریں کھینچیں آج تمھارے شباب کی
(ریاض خیرآبادی)

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے، اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
(اقبال)

ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہی چلمن رنگین
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہی وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں
آج پھر حسن دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
(فیض احمد فیض)

یہ چند مثالیں جس ترتیب سے ذہن میں آئیں درج کر دی گئیں۔ اکبرالٰہ آبادی کی مترجمہ نظم ''پانی چلا'' تصویر کشی اور صوتی آہنگ کی مکمل مثال ہے۔ مجاز کی نظم ''رات اور ریل'' کو

بھی ایک عمدہ نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ جوشؔ کی نظم ''یہ کون اُٹھا ہے شرماتا'' کو ذرا ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اسی طرح ''موسیقیت'' کی مثالوں کی ہماری شاعری میں کمی نہیں۔ اعلیٰ شاعرانہ موسیقی تو اچھی شاعری میں ہر جگہ سنائی دے گی۔ اس موسیقی کی تشکیل کبھی مترنم بحروں کی مدد سے کی جاتی ہے، کبھی تکرارِ الفاظ سے لفظوں کو سازوں کی سطح تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ میرؔ صاحب تکرارِ الفاظ سے جس خلاقی سے کام لیتے ہیں اس میں ان کا کوئی مقابل نہیں:

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کبھی ہم کیفیت و ''ہم جنس'' حروف (آوازوں) کے استعمال سے تصویر اور نغمے کی کیفیت پیدا کی جاتی ہے:

وہ تو شب کو سر بہ سجدہ، ساکت و مدہوش تھے
(اصغرؔ)

ش، س، م کی آوازوں کے اجتماع سے شاعر نے ایک آرکسٹرا تخلیق کیا ہے:

چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
(فیضؔ)

لفظوں کے علاوہ طویل ٹکڑوں کی تکرار سے شعر کو تصویر اور نغمے کی کیفیت عطا کرنا ہماری شاعری کی روایت ہے:

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے
(جذبیؔ)

شاعری میں لفظوں کا جادو کس طرح جگایا جاتا ہے؟ اس سلسلے میں جو چند باتیں ذہن میں آئیں، وہ آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔ اب اہم تر نکتہ یہ ہے کہ یہ تصویر سامانی، یہ موسیقی خارجی صفات نہیں ہیں، بلکہ شاعری اور شعر کا جز ہیں اور انھیں کی بنیادوں پر لفظ گنجینۂ معنی بنتا ہے۔ یہ صفات معنی کا حصہ ہیں، معنی سے الگ نہیں۔ شعری معنویت، فلسفے کی معنویت سے مختلف چیز ہے۔ شعری تصویر اور شعری موسیقی میں گہرے معنی بھی ہوتے ہیں۔ شعر میں معنویت سے کون انکار کرے گا، مگر یہ عین ممکن ہے کہ شاعرانہ آہنگ خود ہی معنوی تجربہ بن جائے۔ نظم کے معانی صرف اس کے موضوع اور مرکزی خیال میں تلاش نہ کیجیے، نظم کا آہنگ اپنا مفہوم آپ ہو سکتا

ہے۔ ہماری نسل کے بیشتر بچوں کے لبوں پر اقبال کے شعر رقص کرتے اور گونجتے ہیں۔ ہمارا بھیانک ترنم اور بد آوازی بھی ان بولوں سے ان کے حسن کو چھین نہ سکتی تھی۔ چھ سات سال کی عمر میں یہ شعر ہماری شخصیتوں کا حصہ بن گئے تھے، اسی طرح جیسے کے بچے ایسے گیتوں اور بولوں کو دہراتے ہیں:

''اساں تو جانا بلو دے گھر''

''ایک لڑکی مرا دل لے گئی''

دل دل پاکستان ، جان جان پاکستان''

''اے جذبہ جنون تو ہمت نہ ہار''

(جذبۂ جنوں نہیں، جذبہ جنوں)

ظاہر ہے کہ یہ دور بلند آہنگی اور شور کا دور ہے جب ساز، آواز اور لفظ پر غالب آ گئے ہیں اور ہم اپنے تہذیبی وراثت کے سایے میں ان لفظوں کے امین تھے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر ، نظر آ ، لباسِ مجاز میں
کہ ہزار سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ ناز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئنہ ساز میں

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا ، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری ، تو قتیلِ شیوۂ آزری
میں نوائے سوختہ در گلو ، تو پریدہ رنگ ، رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو ، تو حدیثِ ماتمِ دلبری
دمِ زندگی ، رمِ زندگی ، غمِ زندگی ، سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر ، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

ظاہر ہے کہ جب آج بھی ''حقیقتِ منتظر'' کی حقیقت تک ہم نہیں پہنچ سکے تو اس وقت کیا جان سکتے تھے اور آئنۂ شکستہ کی قدر و قیمت آج بھی نہیں معلوم، مگر یہ لفظ ہمارے دل میں مقیم

تھے اور خانۂ دل میں لفظوں کا قیام لا حاصل نہیں تھا، یہ لفظ ہماری ذات کی فضا بن گئے۔ دم، رم، غم اور سم کی نغمگی سازِ ذات بن گئی اور قاعدہ بغدادی کی مدد سے ''یمِ زندگی، خمِ زندگی، غمِ زندگی، رمِ زندگی'' جیسے لفظ ہماری زبان میں ڈھلنے لگے، ویسے بڑے ہو کر یہ معلوم ہوا کہ خم زلفوں میں پڑتا ہے یا کمر میں۔ ''یم'' کے معنی بڑے ہو کر معلوم ہوئے اور آج بڑھاپے میں اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ ہم اور ہمارے فن کار ابھی تک ''یمِ زندگی'' تک نہیں پہنچے۔

تو صاحبو! یہ نکتہ ہمیں اپنے بڑے شاعروں کی مدد اور اپنے زندہ ماحول سے مل گیا کہ شعر، اپنے معانی سے جدا ہو کر بھی بے معنی نہیں ہوتا۔ معنی معلوم نہیں، نہ سہی۔ لفظوں کے دائرے، خم، قوسیں، تصویریں اور رقص، اپنا انعام آپ ہیں۔ لفظ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں، لبوں سے ادا ہوتے ہیں، اپنا مفہوم ذہنوں میں منتقل کرتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ لفظ دکھائی بھی دیتے ہیں۔ لفظ جلوہ بھی ہیں، پیکر بھی اور آواز بھی۔ ان میں انسانی رشتوں کی دُنیا بھی آباد ہے اور ان میں لامکاں کے منظر بھی ہیں۔

(۳)

لفظ اور نعت

حرف راز۔ سجدۂ لفظ۔ درگہِ اُمّی لقب

لامحدود کی تلاش۔ حرف کی معراج

حضرت احسان دانش کی وفات سے دس بارہ دن پہلے ان سے لاہور میں بڑی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ میرے ساتھ میری بیوی، ان کی بہن فہیم فریدہ اور ہماری عزیزہ اکادمی ادبیات پاکستان کی نسیم خواجہ بھی تھیں۔ ہم میں سے کوئی اس ملاقات کو نہیں بھول سکے گا۔ حضرت احسان دانش نے شعر سنایا:

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
ترا نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے کو

میں نے کہا، ''چچا! یہ نعت کا بہت خوب صورت شعر ہے۔'' مرحوم نے فرمایا، ''نہیں، میں نے نعت میں یہ شعر نہیں کہا ہے۔'' گفتگو کا سلسلہ کسی اور طرف مڑ گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد احسان دانش مرحوم نے کہا، ''تم نے سچ کہا، یہ نعت ہی کا شعر ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ تخلیقی عمل بڑی پیچیدہ چیز ہے۔ ضروری نہیں کہ فن کار پر تخلیق کا ہر مرحلہ پوری طرح روشن ہو۔ بڑی شاعری ایک چار سمتی مخاطبہ اور مکالمہ ہے۔ آدمی کا مکالمہ اپنی ذات سے، آدمی کا مکالمہ انسانیت سے، آدمی

کا مکالمہ اس کائنات اور آدمی کا مکالمہ اپنے رب سے۔ مسلمان شاعر کے سلسلے میں یوں کہنا چاہیے کہ اپنے رب اور اپنے رسول سے۔ جس طرح اطاعت اللہ اور اطاعتِ رسول ہم ردیف ہیں۔ آدمی جب بھی محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے، اللہ کے تصور اور خیال سے ہم کنار ہو جاتا ہے، اسی سفر میں وہ جوارِ رحمۃ اللعالمین میں بھی پہنچ جاتا ہے:

نگاہے یارسول اللہ نگاہے

اس کے سینے میں آہ اور آرزو ہے۔ یہ آواز یہ تمنا بے ساختہ پیدا ہوتی ہے۔ اور لامحدود کی طرف سفر، لامحدود میں اپنے محدود وجود کو گم کرنے کی آرزو، اور یوں خود لامحدود ہونے کی تمنا ہر حقیقی فن کار کی تمنا ہوتی ہے۔ فکر اور فن کی دُنیا میں عالمِ حقیقی اور عالمِ مجازی کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ وہ شعر جسے بہت سے صاحبان ''بازاری'' شعر قرار دیتے ہیں، ذرا اس کے امکانات پر غور کیجیے:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں ، سامنے آتے بھی نہیں

ہمارے اساتذہ بالخصوص ہائی اسکول کے اساتذہ تقریباً ہر شعر کے حقیقی اور مجازی معانی بتاتے تھے اور ہم لوگ زیرِ لب مسکراتے تھے، لیکن زندگی کا بڑا حصہ شعر و ادب کے ایوانوں میں گزارنے کے بعد ان کی حکمت اور نظر کا قائل ہونا پڑا ہے۔ فراق گورکھپوری نے ''اُردو کی عشقیہ شاعری'' میں اس نکتے پر بہت اچھی گفتگو کی ہے۔ اگر کبھی ممکن ہوا تو اس مضمون کو زیادہ تفصیل سے لکھا جائے گا اور ضمیمے کے طور پر اہم اقتباسات شامل کر دیے جائیں گے۔

فراق صاحب نے مثال کے طور پر اپنا شعر پیش کیا تھا:

کیا ہے سیر گہِ زندگی میں رُخ جس سمت
ترے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہوں میں

یہ شعر ''دو رُخا'' ہے۔ اس کا ایک رُخ حقیقت ہے اور دوسرا رُخ مجاز کی طرف۔ یہ بات خالقِ کائنات کے ساتھ ساتھ محبوب سے بھی کہی جا سکتی ہے اور لطف یہ کہ شرک کے ارتکاب کے بغیر، لیکن قرینۂ اظہار نے اس شعر کو رنگِ حقیقت سے زیادہ قریب کر دیا۔

میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں اور ان تینوں کی عشقیہ شاعری میں بیشتر مقامات پر یہ کیفیت موجود ہے۔ اقبال نے ہمارے عہد میں ایک نئی غزل کی تخلیق کی۔ فراق صاحب نے غزل کو ایک مختصر، لیکن ہمہ گیر اور ہمہ بیں آئینۂ کائنات کہا تھا (الفاظ کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا، ہاں خیال ان کا ہی ہے)۔ غزل کو ہمارے عہد میں یہ حیثیت اقبال نے دی:

تو ہے محیطِ بے کراں ، میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہم کنار کر ، یا مجھے بے کنار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اب آیئے اس وسعت اور لامحدود کے سفر کے اُس رُخ کی طرف جہاں مسلمان شاعر یا مرتبۂ انسانیت سے باخبر غیر مسلم شاعر بھی دیارِ محمدِ عربی ﷺ میں پہنچ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی شعر اپنے مصداق، ممدوح یا موضوع سے بڑا ہو جاتا ہے تو وہ نعت کا شعر بن جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام معراجِ انسانیت ہیں۔ عظمتِ آدمی کا آخری نشان۔ غالب نے اپنی مدحیہ غزل میں تجمل حسین خاں کے لیے کہا:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

یہ شعر تجمل حسین خاں کی ذات سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، اسی لیے زبانِ خلق اور اجتماعی سخن فہمی نے اس شعر کو اس کے حقیقی مصداق کی طرف لوٹا دیا کہ وہی ذات حقیقت و مجاز کا سنگم ہے۔ وہ حق سے واصل ہے اور مخلوق میں شامل ہے۔

ان دنوں ایک سوال یہ بھی ''پیدا'' کیا جا رہا ہے کہ کیا نعت ایک صنفِ سخن ہے؟ بعض صاحبان نعت کو صنف نہیں مانتے۔ ان کا ''فرمان'' یہ ہے نعت ایک شعرِ عقیدت ہے۔ اب اس قول پر کیا اور کیسے تبصرہ کیا جائے۔ شعرِ عقیدت کا تعلق بھی تو کسی صنف سے ہوگا یا اسے صنف قرار دینا پڑے گا۔

اصناف کی تقسیم دو طرح سے کی جاتی ہے۔ صورت کے اعتبار سے اور موضوع کے اعتبار سے۔ یہ دونوں قسمیں مروج ہیں اور ادبی مطالعات میں ملتی ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے جب ہم اصنافِ سخن کا تعین اور تقسیم کرتے ہیں تو ''عشقیہ شاعری''، ''رزمیہ شاعری''، ''صوفیانہ شاعری''، ''صوفیانہ ادب''، ''مذہبی ادب''، ''فلسفیانہ ادب''، ''رثائی ادب'' جیسی تقسیم سامنے آتی ہے اور ان میں سے ہر ایک کو ''صنفِ ادب'' قرار دیا جاتا ہے۔

مولانا شبلی نے ''مصوری کے لحاظ سے شعر کے اقسام'' (شعر العجم میں) مرتب کیے ہیں۔ ''شعر العجم'' جلد چہارم میں وہ اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

عالم میں جو کچھ ہے اس کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں: مادیات مثلاً، زمین، آسمان، چاند، ستارے، باغ، جنگل، کوہ، بیاباں، گرمی، سردی، بہار، خزاں

وغیرہ۔ کفیاتِ باطنی یعنی انسان کے دل میں جو گونا گوں جذبات ودیعت
کیے گئے ہیں، مثلاً رنج و مسرت، محبت و بغض، حسرت و غم، غیظ و غضب
وغیرہ۔ اس تقسیم کے لحاظ سے شعر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں
مادیات اور اس کے متعلقات کی تصویر کھینچی جائے۔ دوسری قسم جذبات کی
شاعری جس میں جذباتِ انسانی کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔☆۱۰

شبلی نے ''تخئیلی شاعری'' کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کا خیال یہ ہے کہ یہ جذبات کی شاعری کی ایک صورت ہے۔ ''اس قسم کی شاعری کو واقعیت سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے۔ متأخرین کی شاعری زیادہ تر اسی قسم میں شامل ہے۔''☆۱۱

شبلی نے تو مثنوی، قصیدہ اور غزل وغیرہ کو اسی تقسیم کے تحت کر دیا ہے۔ اصناف کی صوری تقسیم معروف ہے۔ فرد، رُباعی، قطعہ، غزل، قصیدہ، ترجیع بند، ترکیب بند، مستزاد، مسمط، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، متسع، معشر، نظمِ معریٰ، نظم آزاد وغیرہ۔

اصنافِ سخن کی تقسیم میں تقسیم کے دونوں طریقوں کو ملا دیتے ہیں، لیکن نعت کے سلسلے میں ہم اپنے اصولوں اور ضابطوں کی تردید آپ کرتے ہیں، مثلاً مرثیے کو مسدس میں شامل کرنے کی جگہ اسے الگ سے ایک صنفِ سخن قرار دیتے ہیں، اور جو شخص موضوع کے اعتبار سے مرثیے کو الگ صنف قرار دیتے ہوئے یہ کہے کہ مرثیہ کسی بھی ہیئت اور فارم میں لکھا جا سکتا ہے، اس پر ''مداخلت فی الدین'' کا الزام لگاتے ہیں۔ یہی معاملہ سلام اور واسوخت کا ہے۔

یہ بات واضح ہوگئی کہ بعض اصناف کا رشتہ ان کی ہیئت سے نہیں، بلکہ موضوع سے ہے۔ یوں نعت ایک مستقل صنفِ سخن ہے۔ نازک تر اور نہایت قیمتی نکتہ یہ ہے کہ نعت ہر ہیئت یا فارم (form) میں لکھی جا سکتی ہے۔ یوں ہر صنف، صنفِ نعت کے حکم میں داخل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی مدح و ستائش کے کتنے ہی پہلو ہیں اور ہر صنف اپنی خصوصیات کی بنا پر کسی ایک پہلو اور مدح کے کسی ایک رُخ کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ شدید شخصی تعلق اور محبت کے رفیع ترین جذبے کے اظہار کے لیے غزل کی ہیئت سب سے مناسب ہے۔ جہاں آپ ﷺ کے علوئے شان اور رفعت کا بیان مقصود ہو وہاں قصیدہ اس بارِ امانت کو ادا کر سکتا ہے۔ جہاں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے واقعات پیش کرنے ہوں وہاں مثنوی آگے بڑھ کر اس

☆۱۰۔ ابن رشیق بہ حوالہ علامہ شبلی نعمانی ''شعر العجم''، جلد چہارم، فرمان علی اینڈ سنز، لاہور۔

☆۱۱۔ حوالہ بالا

فریضے کی ادائیگی کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتی ہے۔ جہاں طول کی ضرورت ہو تا کہ مختلف پہلوؤں اور معاملاتِ سیرت کو روانی اور آسانی کے ساتھ پیش کیا جائے وہاں نظم معریٰ اور نظم آزاد اپنے بخت پر ناز کرتی ہے اور جہاں کسی ایک تأثر کو پوری قوت اور جامعیت کے ساتھ پڑھنے اور سننے والوں تک پہنچانا ہو وہاں رُباعی کے چار مصرعے اس تأثر کو نقشِ معنی بنا دیتے ہیں۔

مختلف اصنافِ ادب، اُس صنف کے گوشے ہیں جسے ہم نعت کہتے ہیں۔ ان اصناف کے فنی تقاضوں کے تحت ان کے اسالیب بھی مقرر اور متعین ہیں۔

غزل کیفیات سے علاقہ رکھتی ہے۔ پھر اس کا سجل پیکر نرم و نازک الفاظ کا متقاضی ہے۔ غزل بیانیہ الفاظ سے چنداں علاقہ نہیں رکھتی۔ وہ تو علامات و اشارات کا فن ہے۔ غزل وہ آبگینہ ہے جو بہ قول غالب تندیِ صہبا سے پگھل جاتا ہے۔ غالب نے غزل کے فن کو دو شعروں میں جس طرح سمیٹ لیا ہے، ہمارے سارے نقاد مل کر بھی شاید یہ کام اس خوبی سے نہیں کر سکتے:

مقصد ہے ناز و غمزہ ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غزل ایک حرفِ شیریں اور استعارۂ رقصاں ہے۔ غزل کے پہلے اہم شاعر سعدیؒ نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا اور انھوں نے غزل میں ''رقیق، نازک، شیریں اور پُر درد الفاظ استعمال کیے ہیں'' (شبلی)۔ اُردو کے نعت گو شعرا کی اکثریت نے نعت کے لیے غزل کی ہیئت کا انتخاب اسی بنا پر کیا ہے کہ ان کی نعت حدیثِ دل بن جائے۔ شاید بلکہ یقیناً کسی بھی مذہب کے ماننے والوں میں سے انفرادی طور پر ہر ایک فرد کا رشتہ اپنے رسول کے ساتھ وہ نہیں ہے جو ہر مسلمان کا رشتہ ہادیِ برحق اور انیسِ بے کساں حضرت محمد ﷺ سے ہے۔ غزل کے آہنگ میں لکھی ہوئی نعتیں اس ذاتی اور شخصی رشتے کو بڑی حد تک پیش کرتی ہیں۔ غزل کا عشقیہ لہجہ بڑا امتحان ہے اور یہ تلوار کی دھار پر سفر ہے۔ مبارک ہیں وہ لفظ شناس جو اپنے سلیقہ و ادب کی بنا پر سلامتی سے اس رہ سے گزر جاتے ہیں۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دُنیا تمھی تو ہو
(ظفر علی خاں)

سبوئے جاں میں چھلکتا ہے کیمیا کی طرح
کوئی شراب نہیں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی طرح
(سراج الدین ظفر)

اس نام پہ دل دھڑکا ، پھر گھر میں کہاں ٹھہرے
ہم کو یہ اشارے بھی آوازِ اذاں ٹھہرے
سرکار ﷺ کے قدموں سے اُٹھ کر دل دیوانہ
جائے تو کہاں جائے ٹھہرے تو کہاں ٹھہرے
(سرشار صدیقی)

وہ ایک نام جو کون و مکاں کا محور ہے
میانِ دائرۂ جسم و جاں لکھا دیکھا
(حنیف اسعدی)

میرے ہاتھوں سے اور ہونٹوں سے خوشبوئیں جاتی نہیں
میں نے اسمِ محمد ﷺ کو لکھا بہت اور چوما بہت
(سلیم کوثر)

مرے طاقِ جاں میں نسبت کے چراغ جل رہے ہیں
مجھے خوف تیرگی کا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا
(صبیح رحمانی)

نظمِ ہستی میں توازن کے لیے
ساری دُنیا اور تنہا مصطفیٰ ﷺ
(تابش دہلوی)

سیرت ہے تری جوہرِ آئینۂ تہذیب
روشن ترے جلووں سے جہانِ دل و دیدہ
(حفیظ تائب)

غزل کے پیکر میں لکھی گئی نعتوں کے چند اشعار جو یاد آئے، آپ کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔ ان کے الفاظ غزل کی روایت کے مطابق نرم آہنگ ہیں۔ حریر و پرنیاں کی یاد دلانے والے الفاظ اور اسی کے ساتھ ساتھ معنی زا اور مکشوف (suggestive)۔ یہ ''غیر محتشم''

لفظ ہیں۔ گنجینۂ معانی کے وہ طلسم ہیں جو شور مچائے بغیر قفل کو کھول دیتے ہیں۔ ایسے الفاظ کے ذریعے معانی ذہن میں یوں آہستگی سے اُتر آتے ہیں کہ برگِ گل پر شبنم کے نزول کی یاد دلاتے ہیں۔

اور جب شاعر حضرت ختم المرسلین، امام اوّلین و آخرین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی علوئے شان کو پیش کرنے کی تمنا کی تکمیل کے لیے اپنے فن کو صرف کرتا ہے، قصیدے کی صورت میں بلند آہنگ ترکیبوں سے رفیع الشان در و دیوار کی تعمیر کرتا ہے، جگمگاتے الفاظ سے قندیلیں روشن کرتا ہے، آہنگ خیز الفاظ سے مزین اور رنگین چھت بناتا ہے۔ تخیل شاعر، زمین و آسمان کے درمیان سفر کرتا ہے۔ اور ہر منظر، ہر متاع کو، رسول کے قدموں پر لاکر نچھاور کرنے کی کوشش کرتا ہے:

جو صورت اس کی ہے لاریب وہ ہے صورتِ امر
جو معنی اس میں ہیں بے شک وہ ہیں معنی ربانی
حدیثِ ''من رآنی'' دال ہے اس گفتگو اوپر
کہ دیکھا جس نے ان کو ان نے دیکھی شکلِ یزدانی
(سوداؔ)

باغِ تنزیہ میں سر سبز نہالِ تشبیہ
انبیا جس کی ہیں شاخیں، عرفا ہیں کونپل
مہرِ توحید کی ضو، اوجِ شرف کا مۂ نو
شمعِ ایجاد کی لو، بزمِ رسالت کا کنول
(محسن کاکوروی)

وہ نساخِ مذاہب جس کے مقدم نے کیا باطل
فروغِ کیشِ زر دشتی، شکوہِ دینِ نصرانی
(اقبال سہیلؔ)

قصیدے کی اس بلند آہنگی، الفاظ کے در و بست اور تخیل کی پرواز میں بھی ایک حسن ہے، مگر بسا اوقات لفظ ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' بننے کی جگہ لغت کا باب معلوم ہوتا ہے۔ شاعری ''ڈکشنری'' نہیں بلکہ ''ڈکشن'' ہے۔ اُردو کے نقادوں نے ڈکشن کا ترجمہ ''شاعرانہ لغت'' کیا ہے۔ ہر شاعر کی اپنی لغت ہوتی ہے۔ اس کے کلام میں چند بنیادی الفاظ ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی شعری حسیت و کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ شاعر یقیناً بڑا شاعر ہے جو اپنی زبان کے چند الفاظ پر اپنا نام لکھ دے، لیکن عرب نقاد اور اہلِ ادب ڈکشن کو اسلوب، بیان، القا (خطاب میں) اور ادا

(ادب موسیقی) کہتے ہیں۔ جدید اُردو تنقید میں ڈکشن کے لیے ''لفظیات'' کی اصطلاح رائج ہو چلی ہے، گویا خاص اسلوب اور نہج ڈکشن ہے۔ وہ جو فن کی شناخت ہو، ہمارے خیال میں صداقت یہی ہے۔ یہی فنی ریاض شاعر یا کسی بھی فن کار کو منزل آشنا اور بامراد کرتا ہے۔

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
مے خانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد
(اقبالؔ)

چند الفاظ پر خلاقانہ تصرف اور قدرت پوری لغت کے الفاظ کو تقلیداً پیش کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ اقبال نے جو بات دین کے حوالے سے کہی ہے وہ ادب کے حوالے سے بھی اہم ہے۔

قلندر جز دو حرفِ لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے مجازی کا

اور جب الفاظ کی طنابیں کھینچ کر معانی کے مشرق و مغرب کو ایک نقطے پر جمع کرنا مطلوب ہو تو رُباعی کا سہارا لیجیے۔ مرثیہ گو شعرا منبر پر مرثیہ پڑھنے سے پہلے رُباعی سے سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے تھے۔ انیس و دبیر کے ہاں بہت سریع الاثر رُباعیات ملتی ہیں۔ ان میں سے کئی نعتیہ رُباعیاں ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی بھی رُباعی کے فن کو برتنا خوب جانتے تھے۔ ہمارے عہد میں جوش ملیح آبادی نے رُباعی کو خمریات و سرمستی کا پیمانہ بنایا اور امجد حیدرآبادی نے رُباعی کو معرفت کے مے خانے کی حیثیت دی۔ مولانا حامد حسن قادری بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے، لیکن انھوں نے اپنے ذوقِ معرفت کے ساتھ بہت خوب صورت حمدیہ اور نعتیہ رُباعیاں کہیں:

دُنیا میں محمد ﷺ سا شہنشاہ نہیں
کس راز سے خالق کے یہ آگاہ نہیں
باریک ہے ذکر قرب معراجِ رسول ﷺ
خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں
(انیس)

جھولی بندے کی ، بندہ پرور بھر دے
کشکول میں مقصود کے گوہر بھر دے

صدقہ ترے مے خانے کے مے خواروں کا
اے ساقیِ کوثر! مرا ساغر بھر دے
(امجد حیدرآبادی)

کیا بحر کرم ، حضور ﷺ کا سینہ ہے
دل ، رافت و رحمت کا گنجینہ ہے
انوارِ خدا دیکھ لو اس کے اندر
قامت نہیں ، قدِ آدم آئینہ ہے
(حامد حسن قادری)

تمام شعری پیکر اس نورِ کائنات ﷺ کے ذکر سے منور ہیں اور جگمگا رہے ہیں۔ مثنوی، ترکیب بند، مسمّط سے لے کر ہائیکو اور نظمِ آزاد تک، تمام اصناف پر گفتگو کی جائے اور مثالیں پیش کی جائیں تو اس تحریر کا سمیٹنا مشکل تر ہو جائے گا۔ صرف محسن کاکوروی کی دو مثنویوں ''چراغِ کعبہ'' اور ''صبحِ تجلی'' کے جائزے کے لیے دفتر درکار ہوگا۔ جو صاحبان نعت کو برکت کی چیز اور محض حقیقت کا اظہار سمجھتے ہیں، ذرا اُردو مثنوی کے ذخیرے میں ان مثنویوں کی مثال تو تلاش کریں۔ مذہبی موضوعات اور جذباتِ عقیدت کو شعر بنانا بہت مشکل مرحلۂ فن ہے اور نعت کے وابستگانِ دامن نے اسے آسان اور ممکن کر دکھایا ہے۔ تعجب ہے کہ مرثیے کے بارے میں ان خیالات کا کوئی اظہار نہیں کرتا، ہاں نعت ہدف ٹھہرتی ہے۔ اسی طرح کربلا کو انقلاب کی علامت قرار دینے والے بدر و حنین کے ذکر کو رجعت پسندی قرار دیتے تھے۔ ویسے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان کی سرزمینِ انقلاب اور تصورِ انقلاب کو زمانے کی ہوا اُڑا لے گئی ہے، اور ماسکو کی توسیع پسندی کا ستارہ افغانستان میں ڈوب گیا۔ اس گریز کے لیے معذرت خواہ ہوں، لیکن عصری حقائق کی چھوٹ تو افکار و تحریر پر پڑتی ہے۔

مثنوی ''چراغِ کعبہ'' سے سراپا کے چند اشعار پیش کرنے کے بعد ان شاء اللہ دوسرے پہلوؤں کا مختصراً احاطہ کیا جائے گا۔ نعت کے بعض نقادوں نے سراپا پر اعتراض کیا ہے اور وہ اسے حدودِ نعت میں شامل نہیں کرنا چاہتے، لیکن دیکھیے کہ محسن نے سراپائے محمد کو کس طرح لازمانی بنا دیا ہے۔ سراپا کے یہ اشعار حسنِ رسولِ عربی ﷺ کا ادنیٰ سا پرتو ہیں۔ اُس حسن کا پرتو جس نے اس کائنات کو آئینہ خانہ بنا دیا۔ اور اگر ''سراپا'' کا ذکر اہم نہ ہوتا تو شمائل ''ادبیاتِ حدیث'' کا حصہ نہ ہوتے۔

خیر البشر ﷺ کی وفات کے وقت حضرت حسنؓ کی عمر سات سال تھی۔ اس راکبِ دوشِ نبوت کو آپ ﷺ سے بے حد وابستگی تھی۔ وہ اپنے نانا کی باتیں اپنے بزرگوں سے کرتے۔ ایک مرتبہ

حضرت حسنؓ نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے فرمائش کی کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کا حلیہ مبارک بیان کریں۔ انھوں نے حلیہ بیان کرتے ہوئے کہا:

> آپ ﷺ اپنی ذاتِ والا صفات کے اعتبار سے بھی شان دار تھے اور دوسروں کی نظر میں بڑے رُتبے والے تھے۔ آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک بدر کی طرح چمکتا تھا۔ آپ ﷺ کا قد متوسط القامت آدمی سے قدرے زیادہ اور طویل القامت آدمی سے قدرے کم تھا۔ آپ ﷺ کا رنگ نہایت چمک دار تھا اور پیشانی مبارک کشادہ۔ آپ ﷺ کے ابرو باریک اور گنجان تھے۔ دونوں ابرو جدا جدا تھے، ایک دوسرے سے پیوستہ نہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو (حق کے معاملے میں) غصے کے وقت اُبھر آتی تھی۔ آپ ﷺ کی بینی مبارک بلندی مائل تھی جو حسن و تابانی کی وجہ سے بلند معلوم ہوتی تھی۔ ریشِ مبارک بھرپور اور گنجان تھی۔ آنکھ کی پتلی نہایت سیاہ تھی۔ رخسارِ مبارک ہموار تھے۔ دہنِ مبارک اعتدال کے ساتھ فراخ تھا۔ دندانِ نبوی باریک اور آب دار تھے۔ سامنے کے دانتوں میں ہلکا سا خوب صورت فصل تھا۔ گردن ایسی خوب صورت اور باریک تھی جیسے تراشی گئی ہو۔ رنگ میں چاندی کی سی صفا تھی۔ آپ ﷺ کے تمام اعضا معتدل اور پر گوشت تھے۔ پیٹ اور سینہ ہموار اور سینہ فراخ تھا۔ بدن کا وہ حصہ جو کپڑوں سے باہر ہوتا، چمکتا تھا۔[☆۱۲]

یہ ہند بن ابی ہالہ کی طویل روایت کا ایک اقتباس ہے۔ دوسرے صحابہ کرام سے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرۂ مبارک اور حلیۂ مبارک کی احادیث مروی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ حسنِ سیال تھے جو نظر کے مطابق نئے سانچوں میں ڈھل جاتا۔ ہر ایک اپنی تابِ نظر اور قوتِ دید کے مطابق اس حسن کو دیکھ پاتا۔ ایسے نقشِ جمال اور شاہکارِ الٰہی کو چودہ صدیوں کے فاصلے سے محسن نے دیکھا اور کس طرح دیکھا:

حقا کہ جسم ہے سرتا پا
شاید غیب کا سراپا

☆۱۲۔ امام ترمذی، شمائل ترمذی (ترجمہ و شرح مولانا محمد زکریا) کراچی۔ ص ۱۶۔۱۵

ابرو پہ جبیں مہِ شمائل
ہوئی رحل پر حمائل
پیشانی ہے جزو مصحف رو
اس پارے کے دو رکوع ابرو
واللیل کا ترجمہ ہے گیسو
تفسیرِ اذا سجیٰ ہے گیسو
جوہر کا بھرا ہوا خزینہ
آئینہ بے مثال سینہ
اُس گردنِ صاف کی بلندی
تکبیر فریضۂ سحر کی
رعنائیِ قامتِ مناسب
روزے میں اذانِ وقتِ مغرب

محسن نے رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین اور ان پر نازل ہونے والی کتاب کے اشاروں کے حوالے سے سراپا مرتب کیا۔

اب ہم اس گفتگو سے آگے بڑھتے ہوئے ایک دوسرے پہلو کی طرف سفر کرتے ہیں۔ غزل کی صنف ہماری سب سے مقبول صنف ہے۔ اس کی مقبولیت کی وجہ سے اس میں کہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر کوئی ادبی مجدد آ کر اس کی تجدید کرتا ہے۔ غالب کے بعد غزل اپنی سطح بلند سے گر کر ''چوما چاٹی'' میں مشغول ہوگئی تھی۔ اسی دور میں حالی نے مقدمے میں غزل کے کم زور پہلوؤں کی نشان دہی کی۔ حالی غزل کے خلاف نہیں تھے۔ انھوں نے غزل کے اس رُجحان پر تنقید کی ہے کہ کم درجے کے غزل گو شعرا کے ہاتھوں غزل اپنی اشاریت، ایمائیت اور امکانات سے محروم ہو جاتی ہے۔ ''قاتل'' کی اصطلاح اپنے معانی کھو بیٹھتی ہے اور کوچۂ محبوب سچ مچ قصاب خانہ بن جاتا ہے۔ شاد عظیم آبادی نے غزل کو اس کا کھویا ہوا کردار عطا کرنے کی کوشش کی اور پھر حسرت، فانی، اصغر، جگر، یاس اور فراق نے اُردو غزل کو ایک بار پھر ہماری شاعری کی ابرو بنا دیا۔ اقبال دیدۂ بیدارِ غزل بن کر آئے، لیکن اسی کے ساتھ روایتی انداز کی غزل سرائی بھی ہوتی رہی۔ اس روایتی غزل کا سایہ ہماری نعت گوئی پر پڑتا نظر آتا ہے۔ ہجر اور وصل کو تو چھوڑیے، ''شبِ اسریٰ کا دولھا'' بھی نعت میں ملے گا اور وہ ربِّ محمد ﷺ بھی جو غمِ ہجر میں تڑپ رہا ہے۔ معاذ اللہ۔

بہت سی نعتوں میں غزل کا مروّجہ لہجہ، عام الفاظ اور وہ اسلوب ملتا ہے جس کا رومانی لہجہ، اعلیٰ عشقیہ شاعری کی کوئی صفت اپنے دامن میں نہیں رکھتا۔ اس اسلوب کا نامناسب ہونا بیّن اور واضح ہے۔ اس پر اضافہ کیجیے اس حقیقت کا کہ بہت سے حضرات نے ''سیکولر'' نعتیں کہی ہیں۔ وہ رسولِ کریم و عظیم ﷺ کو بھی دوسرے انسانی رہبروں اور ''لیڈروں'' میں سے ایک سمجھتے ہیں اور بس۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کیسی نعتیں ایسے لوگوں کے قلم سے سامنے آئیں گی۔ سرشار صدیقی کے مجموعے ''اساس'' کے مقدمے میں ایسی نعتوں کے چند حوالے راقم الحروف نے پیش کیے تھے۔ شاعروں کے نام دانستہ درج نہیں کیے گئے تھے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

تمھیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں
مرے چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں
وہ عہدِ گل، وہ لب جو، وہ بزمِ سرو و سمن
وہ قمریوں کی صدائیں سلام کہتی ہیں

———

یہ مرا اضطراب شوق، رشکِ جنونِ قیس ہے
جذبہ بہ جذبہ، دل بہ دل، شیوہ بہ شیوہ، خو بہ خو

———

جس میں ہو ترا ذکر، وہی بزم ہے رنگیں
جس میں ہو ترا نام، وہی بات حسیں ہے

اب بتایئے کہ اپنے موضوع، اس کے سیاق و سباق، اس کی وسعتوں اور پہلوؤں سے دور ہو کر شاعری کس حد تک گر سکتی ہے اور الفاظ اپنے معانی سے محروم ہو کر کس طرح خزف ریزے ہو جاتے ہیں۔ ان ٹھیکروں سے تو کوئی آواز بھی نہیں نکلتی۔ صدائے گل بھی نہیں۔ ایک خیال بار بار میرے ذہن میں آیا ہے اور آتا رہتا ہے کہ نعت کا شعر وہی شعر ہے جس کو پڑھتے ہی سرورِ کون و مکاں ﷺ کا خیالِ مبارک ذہن میں آجائے، اور جو آپ کے مرتبۂ عظیم کے شایانِ شان ہو۔ ویسے بہت سے شعر خوب صورت ہونے کے باوجود نعت کے شعر نہیں کہے جا سکتے:

لٹائی جائے گی زمیں پہ موج موج نور کی
رکی ہوئی ہے رات جوئے کہکشاں لیے ہوئے

———

ترے تکلم پہ ہے تصدق ، ہزار جاں سے یہ تیرا صادق
کچھ ایسی تاثیر ہے زباں میں ، ادا کچھ ایسی خطاب میں ہے

لب کشائی کی بھلا مجھ میں کہاں تھی جرأت
کر دیا ان کی عنایات نے بے باک مجھے

اب ذرا آخری شعر پر غور فرمایئے کہ سرورِ کائنات کی عنایات نے شاعر کو ''بے باک'' کر دیا۔ غالباً بے باک کا لفظ حوصلۂ اظہارِ صدق کے لیے استعمال کیا گیا ہے، مگر اس سے فیضانِ نبوت کے تصور پر کیسی ضرب لگتی ہے۔ نعتیہ شاعری میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ ''ارے توبہ''، ''معاذ اللہ''، ''اے میں قربان'' جیسے تکیہ ہائے کلام یا تکیہ ہائے عجز سے شعر نعت کی فضا سے رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ اسی طرح اس ذاتِ گرامی سے رشتے کا اظہار حسی بن جاتا ہے اور اس حد تک کہ (بات ادا کرنی میرے لیے مشکل ہے) محاورہ اپنی جگہ، مگر اندازِ بیاں کی نسوانیت حد درجہ غیر مناسب معلوم ہوتی ہے۔ دو تین شعر پیش کر کے اس باب کو ختم کرتا ہوں۔ خط کشیدہ ٹکڑوں کو نظر میں رکھیے:

یہ کہہ کے ترے حلقۂ گیسو سے چلا دل
ہے آج ہمارے لیے معراج کی یہ رات
اللہ رے شوخی تری اک چشم زدن میں
طے تو نے کیے ہیں حجبِ عرش و سماوات

کعبہ دلھن ہے ، تربت اطہر نئی دلھن
یہ رشکِ آفتاب ، وہ غیرت قمر کی ہے
دونوں بنیں سجیلی انیلی بنی مگر
جو پی کے پاس ہے وہ سہاگن کنور کی ہے

ایک ہی وجہِ جواز اسرا کی ہوتی ہے بہم
تھی کسی کو خواہشِ وصلِ حبیبِ محترم

یہ شاعری ایک طرف تو غزل کے روایتی انداز کی عکاس ہے اور دوسری طرف بھگتی شاعری اور ہندی عناصر بھی اس پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ آدمی اپنے دفاع میں بڑی حد تک آگے جا

سکتا ہے۔ وہ وصل کے سلسلے میں لغت اور تصوف دونوں کا سہارا لے کر اسے جائز قرار دے گا۔ یہ ہمیں بھی معلوم ہے کہ وصل اور وصال تعین کے اُٹھنے اور اپنی خودی کے وہم سے بیگانہ ہو جانے کو کہتے ہیں، بلکہ اربابِ تصوف تو یہاں تک کہہ اُٹھتے ہیں کہ ''واصل حق مخلوق نہیں رہتا اور مخلوق کے اثرات اس پر سے زائل ہو جاتے ہیں۔''[۱۳] لیکن جسمانی یک جائی کو شبِ اسریٰ سے ملانے کو کیا کہا جائے گا اور اگر معاملہ صرف خواہشِ وصل کا تھا تو رسول اللہ ﷺ کا رب ان سے حیاتِ طیبہ کے کس لمحہ میں دور رہا۔ کاش ہمارے شاعر کو معراج کے معانی اور امکانات کا علم ہوتا۔ اقبال نے ایسے صاحبان سے پہلے ہی کہہ دیا ہے:

تو معنیِ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

گنجینۂ معنی کے طلسم کے سلسلے میں ایک اور مسئلے کو بھی پیش کرنا چاہتا تھا، اور وہ ہے ''جدت کا شوق''۔ جدید اسلوب اگر آپ کی ذات اور ذہن وفکر کا حصہ بن کر اُبھرے تو اس سے شاعری کے لیے امکانات پیدا ہوتے ہیں، نئے اُفق پر نئے ممکنات کے چاند طلوع ہوتے ہیں لیکن اوپری کوششوں سے شاعری مجروح ہوتی ہے۔ معاملہ نعت کا ہو تو بے ادبی کے پہلو بھی اُبھرتے ہیں۔ پھر شاعری کا ادعا اور نعت میں۔ اللہ محفوظ رکھے۔

آج کا حسان بن ثابت مظفر وارثی
ملکِ حمد و نعت میں بے تاج سلطانی کرے

کیا اس عجب پر کسی تبصرے کی ضرورت ہے؟

ایک طرف تو کبر کا یہ عالم (عام شاعری میں تو اسے تعلّی کہہ کر بات بنا لیجیے مگر نعت میں اس رعایت کی گنجائش نہیں) اور دوسری طرف شاعرانِ نعت کو اپنے قاری کی فہم پر اعتماد نہیں ہوتا اور اس عدم اعتماد اور بے اعتباری سے لفظ گنجینۂ معنی نہیں رہتا، بلکہ اخبار کا لفظ بن جاتا ہے:

زہے نصیب انھیں ربطِ حالِ زار سے ہے
مری مراد مدینے کے تاج دار سے ہے

اب ذرا دوسرے مصرعے پر غور کیجیے، یہ مصرع ہے یا وضاحتی نوٹ اور حاشیہ۔ شاعری میں اس کی گنجائش کہاں؟ پھر یہ نعت کا شعر بلکہ نعت کا مطلع ہے۔ نعت تو ایک وحدت ہوتی ہے، کیا اس نعت کے دوسرے شعر قاری تک یہ بات نہ پہنچا دیتے کہ شاعر کی مراد مدینہ کے تاج دار (ﷺ) سے ہے؟

☆۱۳۔ سیّد محمد ذوقی شہ۔ سرِ دل براں، کراچی۔ طبع چہارم، ۱۴۰۵ھ۔ ص ۳۳۵

جدت کی شعوری اور اوپری کاوش کے نتائج کیا اور کیسے برآمد ہوتے ہیں؟ ان شاء اللہ اس موضوع پر پھر کبھی لکھوں گا۔ اس تحریر کے اختتامی حصے میں ایک ایسے معاملے پر گفتگو مقصود ہے جسے بعض صاحبان نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے اور یہ مسئلہ ہے نعت میں لفظ ''تُو'' کے استعمال کا۔ اس مضمون کے ابتدائی حصے میں، میں نے عرض کیا ہے:

''اب روزمرہ کی گفتگو میں ''تُو'' نے تم اور آپ کے لیے جگہ خالی کر دی ہے
مگر ادب اور شاعری کی دُنیا میں یہ ایک زندہ اور توانا لفظ ہے۔ ایسا لفظ جو
روایات اور معنی کی دُنیا ہے۔''

کوئی پانچ سات سال پہلے جب ''تُو'' کے خلاف ایک تحریک چلی تو میں نے عرض کیا تھا کہ جن صاحبان کے خیال میں اس لفظ میں گستاخی ہے ان کے لیے ''تُو'' کا استعمال ممنوع بلکہ حرام ہے، لیکن جو لوگ اس لفظ کی وسعت اور پھیلاؤ سے آگاہ ہیں انھیں اس کے ترک پر کیوں مجبور کیا جائے؟ مگر بعض لوگوں کا مزاج آمرانہ ہوتا ہے۔

لفظوں کی اہمیت اور معنویت پر غور کرنے کی ایک صورت اور معتبر صورت یہ ہے کہ آپ یہ دیکھیں کہ وہ لفظ متروک ہو گیا یا نہیں؟ اور اگر استعمال ہو رہا ہے تو کیا اس کے احاطۂ استعمال میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ''تُو'' نے عام زندگی میں ''تم'' اور ''آپ'' کی جگہ خالی کر دی، لیکن شعر کی دُنیا میں آج بھی استعمال ہو رہا ہے۔ ''تُو'' کا لفظ آج بھی محبوب کے لیے استعمال ہوتا ہے:

وہی میری کم نصیبی ، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا ، یہ کمالِ بے نوازی
(اقبالؔ)

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ''تیری'' کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چشمِ ما روشن دلِ ماشاد، اللہ آپ کو خوش رکھے۔ یہ تو اور اچھا ہوا۔ سب سے محترم ذات صاحبِ تخلیق (جو ہمارا محبوب بھی ہو سکتا ہے) کے لیے یہ لفظ استعمال ہو سکتا ہے تو پھر — اگر اقبال کے سامنے ''تُو'' پر اعتراض کرتے تو شاید وہ یہ کہہ اُٹھتے:

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ

میں نے ''تو'' کو ''تُو'' نہیں پڑھا ہے۔ مگر ''بیٹھ'' پر نظر ضرور رکھی ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ ''آپ'' کے علم بردار نمازوں کے بعد اللہ سے کس صیغے میں دُعائیں مانگتے ہیں۔ ''**ایاک نعبد و ایاک نستعین**'' کا ترجمہ ہم نے تو یوں ہی پڑھا ہے:

''تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔''

(ترجمہ: شیخ الہند مولانا محمود حسن)

''ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں۔''

(مولانا احمد رضا خاںؒ)

''اے پروردگار ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

(مولانا فتح محمد جالندھری)

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

(مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)

شاہ عبدالقادر سے لے کر مولانا مودودی تک قرآنِ حکیم کے کم و بیش تمام مفسروں نے، مولانا اشرف علی تھانوی کے استثنیٰ کے ساتھ اللہ کے لیے ''تُو'' کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ کیا معاذ اللہ ان علما اور مترجموں کو گستاخی اور ''تو تکار'' کا مرتکب قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ ذوق اور لسانی معاملہ ہے۔ اللہ کی وحدت تقاضا کرتی ہے کہ اس کے لیے ''تُو'' کی ضمیر استعمال کی جائے، اسی لیے بہت سے صاحبانِ ''اللہ'' کے لفظ پر اصرار کرتے ہیں اور خدا کے لفظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں کیوں کہ خدا کی جمع خداؤں استعمال ہوتی ہے۔

جناب حنیف اسعدی بھی ربّ محمد ﷺ کے لیے ''تُو'' کی ضمیر استعمال کرتے ہیں اور بار بار۔

جز تیرے ہم کو اب
کس کی ہوگی طلب
اے محمد ﷺ کے رب
صرف تیرا خیال
چارۂ ہر ملال
اے حیات آفریں
تو کسی سے نہیں
ہر جبیں ''بیش و کم''
تیرے در پر ہے خم
تیرا دستِ کرم
جھولیوں کا بھرم

تیری سب پر نظر
سب کو تیری طلب
اے محمد ﷺ کے رب

ہم نے صرف ایک نظم سے یہ چند مصرعے پیش کیے ہیں۔ معاذ اللہ کون کہہ سکتا ہے کہ جنابِ اسعدی نے اللہ تعالیٰ کی توہین کی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون محترم تر ہے ربِ کائنات، یا اس کی تخلیقِ اکمل و اجمل و اعظم ﷺ؟ — یہ وہ سوال ہے جس کے جواب کی ضرورت نہیں۔

پھر یہ نکتہ فراموش نہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور وحدت پر ہمارا ایمان ہے، لیکن اسی طرح نبوت کے سلسلۂ عظیم کی کڑی ہوتے ہوئے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی وحدت اپنی جگہ ہے۔ وہ جو سب سے آخر میں آیا، اور سب سے پہلے تخلیق کیا گیا — ﷺ۔

ہم توحید کے ساتھ ساتھ نبوت کے بارے میں بھی شرک سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں جس طرح اللہ کے اختیارات و منصب میں ہم کسی کی شرکت کے بارے میں نہیں سوچ سکتے، اسی طرح حضور ﷺ اپنے مرتبے میں تنہا ہیں، اگرچہ نبوت و رسالت کے باب میں ہم رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تمھی تو ہو
دُنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھی تو ہو

لفظ ''آپ'' کے بارے میں جناب سحر انصاری نے حنیف اسعدی کی تضمینوں پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے نعتیہ مجموعے ''آپ ﷺ'' میں لکھا ہے:

کتاب کا نام ''آپ'' شاید میں نے تجویز کیا تھا۔ سامنے کا لفظ ہے۔ حضور ﷺ کے لیے ہمیشہ استعمال ہوتا رہا ہے، لیکن کسی مجموعے کا نام ''آپ'' نہ رکھا جا سکا۔ یہ سعادت حنیف اسعدی کے حصے میں آئی اور غالباً یوں آئی کہ انھوں نے نعت گوئی میں یہ التزام رکھا ہے کہ حضور ﷺ کے لیے ''تُو تڑاق'' کے صیغوں کو ترک کر دیا۔''[☆۱۴]

جیسا کہ عرض کیا گیا ''تُو'' کا لفظ ربّ العزت کے لیے ہماری زبان میں بنیادی طور پر

☆۱۴۔ سحر انصاری، مشمولہ آپ (نعتیہ مجموعہ حنیف اسعدی)، اقلیم نعت کراچی، ۱۹۹۶ء۔ ص ۱۱۲۔۱۱۱

استعمال ہوتا ہے۔ پھر یہ لفظ صرف اللہ اور رسول ﷺ کی نسبت سے ہماری زبان کا سب سے زیادہ محترم لفظ ہے۔ عشقیہ شاعری میں بھی یہ اپنا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ خاصانِ محمد ﷺ نے اپنے رسول، اپنے آرامِ جاں اور اپنے محبوب کے لیے مسلسل یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظوں کے معنی محض لغت یا اپنے وہم اور مذاق میں تلاش نہ کیجیے۔ زندگی اور زبان کے عام اور زندہ استعمال میں تلاش کیجیے۔ سحر صاحب ذمہ دار اہلِ قلم ہیں، لیکن ''تُو تڑاق'' کا لفظ استعمال کر کے انھوں نے خاصانِ محمد ﷺ کی بھی توہین کی ہے اور ایک نعتیہ مجموعے کو سوقیانہ لفظ کے استعمال سے داغ دار کیا ہے۔ اور ذرا یہ بھی دیکھیے کہ جو لفظ (آپ) سحر صاحب، میرے لیے استعمال کریں اور میں ان کے لیے، وہ بارِ عظمت محمد ﷺ کو کیسے سہار سکتا ہے؟

اقبال کی نظم ''ذوق و شوق'' میں ہمیں یہ نعتیہ شعر ملتے ہیں:

لوح بھی تو ، قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا ، تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجرؒ و سلیمؒ ، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو ، میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقلِ غیاب و جستجو ، عشقِ حضور و اضطراب

یہ پانچ شعر ایک طرف اور آج کے اکابر کے بہت سے مجموعے ایک طرف۔ اور پھر آپ خود انصاف کیجیے کہ کون سا پلڑا بھاری ہے۔

اقبال صاحبِ طلسمِ گنجینۂ معنی تھے۔ ان کا ہر لفظ علامت بہ کنار اور گنج ہائے معانی در کنار ہے اور ہم محض لفظوں کی سیپیوں کے بیوپاری ہیں۔ ہم پر تو یہ شعر صادق آتا ہے:

خزفے بود کہ از ساحل دریا چیدیم
دانۂ گوہر یکتا نہ تو داری و نہ من

لفظ ''تُو'' دانۂ گوہرِ یکتا ہے۔ ذرا اس کی چھوٹ اور قائم رہنے والی چمک کچھ اور شعروں

میں ملاحظہ کیجیے تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ صاحب یہ تو اقبال کا کمالِ فن ہے۔ بات یہ ہے کہ رسولِ عربی ﷺ کی نسبت سے جس نے بھی ''تُو'' کی یکتائی کو سمجھا، اسے عشقِ یکتا سے نواز دیا گیا:

نغمۂ حق ادھر ہوا ، تیرے رباب سے بلند
رک گئے دفعتہً ادھر ساز و نوائے کافری
کیسے کہوں شہِ رسل ، میں بھی ترا غلام ہوں
قبلۂ بندگی مرا ، تیرا حریمِ سروری
(علی اختر حیدرآبادی)

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری
رعشۂ خوف بن گیا ، رقصِ بتانِ آزری
تیرے قدم پہ جبہ سا ، روم و عجم کی نخوتیں
تیرے حضور سجدہ ریز ، چین و عرب کی خودسری
(جوش ملیح آبادی)

اسی امید پہ ہم طالبانِ درد جیتے ہیں
خوشا دردِ کہ تیرا درد ، دردِ لادوا ہوگا
(جگرمرادآبادی)

اے سبک سیرِ جادۂ اسریٰ
روک دی تو نے وقت کی رفتار
(حفیظ ہوشیار پوری)

اے مرے شاہِ شرق وغرب ، نانِ جویں غذا تری
اے مرے بوریہ نشیں ، سارا جہاں گدا ترا
(احمد ندیم قاسمی)

ہے تری ذات پہ سو ناز گنہ گاروں کو
کیسے بے ساختہ کہتے ہیں کہ ہم تیرے ہیں
(حفیظ تائب)

محض وعظ ہو یا سیرت کی کتاب ہم نبی کریم ﷺ کی ذاتِ فلک مرتبت کے لیے ''آپ'' کا لفظ اور بہت سے القاب و آداب استعمال کرتے ہیں۔ ''سرورِ کونین''، ''ختمی مرتبت''،

''سیّدِ کل''، ''خیر البشر''، ''رسولِ اعظم''، ''ہادیِ برحق''، ''صاحبِ کوثر'' وغیرہ وغیرہ، لیکن جب تخلیقی لمحوں میں ہمارا جذبِ دروں ہمیں عشق کے پر لگا کر اُڑاتا ہے اور جب یہ بزمِ کائنات ہمارے لیے بدل جاتی ہے تو یہ سارے القاب، یہ سارے لفظ ایک لفظ میں بدل جاتے ہیں۔ ''تُو'' میں — یہ ایک چھوٹا سا یک رکنی لفظ کائنات کا سب سے محترم اور مقدس لفظ بن جاتا ہے۔ یہ ہمارے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ یہ ہماری خلوتوں کا آئینہ بن جاتا ہے۔ وہ خلوت جس میں جمالِ مصطفیٰ ﷺ ہوتا ہے اور ہماری حیرانی۔ یہ ہمارے اختیار کی نہیں، بلکہ سپردگی کی منزل ہوتی ہے۔

شمیم احمد

نعت گوئی اور جدید شعور

یہ عجیب بات ہے کہ سیّارہ ڈائجسٹ کے لیے اچانک مجھ سے اسی موضوع پر مضمون لکھنے کی فرمائش کر دی گئی ہے جس پر عرصے سے میں خود لکھنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ مجھے کوئی موضوع اس وقت تک متوجہ نہیں کرتا جب تک وہ مجھے کسی تفتیش یا تلاش پر آمادہ نہ کر دے۔ نعت گوئی پر مجھے لکھنے کے لیے جو چیز اُکسا رہی تھی، وہ ایسے شعرا کا نعت گوئی کی طرف راغب ہونا تھا جو تخلیقی تجربے کے بغیر، شاعری تو بڑی چیز ہے، شاعری پر گفتگو بھی ناروا سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میری اس بات کا مطلب تو کوئی بھی نہیں لے گا کہ اُردو شاعری سے نعت گوئی کا چلن اُٹھ گیا تھا یا شاعروں کے ایمان میں کوئی خلل پڑ گیا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی چیز نہ بدلی تھی۔ شاعری کا سارا نظام ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، یعنی ہمیشہ کی طرح ہمارے یہاں نعت پڑھتے ہیں اور اب بھی اکثر شعری مجموعے حمد اور نعت کا التزام رکھتے ہیں، گو کہ اس کا دستور پہلے کی طرح لازمی نہیں رہا ہے کہ ہر دیوان یا کلیات بہرصورت حمد اور نعت سے یا نعتیہ منقبتیہ قصائد سے ضرور مزین ہوتے تھے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے زمانے میں دو تین ایسے شاعر موجود نہ ہوں جن کا موضوع ہی نعت اور منقبت نہ رہا ہو۔ یہ سب کچھ اب بھی موجود ہے، لیکن آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں ہماری روایتی شاعری سے وابستہ ہیں۔ اُردو کے قدیم شعری نظام کا لازمہ ہیں۔ روایتی شاعری اب بھی ہو رہی ہے۔ مشاعرے، طرحی نشستیں، مشقِ سخن کے استادی اور شاگردی والے گروہ اب بھی موجود ہیں۔ گو کہ وہ اپنا اعتبار اور احترام کھو چکے ہیں۔ اب قلمروے شاعری میں ان کا سکہ رائج الوقت نہیں رہا ہے۔ نعت گوئی بھی اس کا لازمہ ہے اور بالکل اسی طرح اس سے کام لیا جاتا ہے جیسے حالّی سے پہلے لیا جاتا تھا۔ یعنی وہ شاعری کا باقاعدہ موضوع نہیں تھا، جس کو شاعر اپنے شعری یا تخلیقی محرکات کا سبب گردانتا بلکہ ضرورتاً، مذہبی نوعیت کے مواقع

پر حصولِ ثواب اور ذائقہ بدلنے کے لیے تھوڑی سی فضا اور سہی کے مصداق نعت گوئی بھی کر لیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا، حالؔی سے قبل اس کے کچھ اور معنی تھے۔ یعنی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس وقت شاعری روایتی شاعری نہیں ہوتی تھی، بلکہ حقیقی تھی اور اس پر ہماری ہیئتِ اجتماعیہ اور تخلیقی انفرادیت اظہار میں آتی تھی۔ روایاتی شاعری تو حالؔی کے بعد سے ہوگئی اور معاشرے کے اظہار کا سانچہ بدل گیا اور اتنا بدلا کہ اُردو شاعری میں وہ دور کی آواز معلوم ہونے لگا۔ اور شعر و ادب ایسے سانچے میں منقلب ہوگیا جہاں موضوعات، اسالیب لب و لہجہ اور مضامین سب بدل گئے۔

ہمیں اپنی بات پھر سے پکڑنے کے لیے تھوڑی سی وضاحت اور کرنی ہوگی۔ اور وہ یہ ہے کہ حالؔی سے پہلے غالبؔ آتا ہے۔ اس کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں سب کچھ بدل جاتا ہے جس کی فضا، اقدار، عقیدے، ماحول اور تہذیبی آثار سب جداگانہ سمت، معنویت اور اعتبار رکھتے تھے۔ غالبؔ سے پہلے کا معاشرہ چند اقدار پر کلّی ایمان رکھتا تھا۔ جس کے حیطۂ خیال میں بھی اس کے علاوہ دوسرا تصورِ حیات ممکن نہیں تھا۔ وہ معاشرتی زوال کے باوجود ایک اکائی اور ایک مکمل دائرے پر ایمان رکھتا تھا۔ غالبؔ کے آتے آتے تہذیبی زوال بھی مکمل ہوگیا اور ۱۸۵۷ء میں مکمل شکست بھی ہوگئی۔

یہ وضاحت میں نے اس لیے بھی کر دی ہے کہ آپ اپنے ذہن میں ایک ایسے نظامِ خیال اور معاشرے کا تصور تازہ کر سکیں، جو باوجود فصلِ زمانی اور مکانی بعد کے، باوجود مختلف تمدنی روایات اور زبانوں کے، باوجود مختلف جغرافیائی خصوصیات اور مختلف قوموں کی صلاحیت اور اہلیت کے ایک ہزار سال تک ایک وحدتِ فکر میں جڑا رہا تھا اور یہی اس تہذیبی، تاریخی، معاشرتی اور قومی ورثہ کا شعور ہمیں دیتا ہے، جس کو ہم ہند اسلامی ایرانی تہذیب کہہ سکتے ہیں، جو ہمارا تخلیقی اور شعوری سرمایہ ہے۔ اس وحدتِ فکر کے زمانے میں ہماری زبانوں عربی، فارسی اور اُردو میں جو ادب پیدا ہوا، وہ سارا کا سارا مسلم شعور کی چھاپ کے بغیر وجود میں نہ آ سکتا تھا اور نہ آیا۔ یہ معاشرہ اور شعور جس جگہ بھی ہے، ایک فکری اور تہذیبی اکائی کا مظہر ہے۔ جس میں عظمتِ کبریائی اور حُبِ رسول ﷺ ایک حقیقت ہی نہیں، بلکہ ایمان ہے۔ لیکن اگر ہم اس پورے دور کے ادب و شعر میں سے ایسا ادب الگ کرنا چاہیں، جس کا موضوع حمد اور نعت ہو تو مقدار کے لحاظ سے وہ کافی نظر آنے کے باوجود رسمی نظر آئے گا جس کو زیادہ سے زیادہ عقیدے کے اظہار یا حصولِ ثواب سے زیادہ کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ کیا ہم اس کو مذہب سے بے نیاز سمجھیں؟ خلوص کی کمی قرار دیں، یا جذبہ کی سردمہری خیال کریں؟ حالاں کہ ان میں سے ایک چیز بھی درست نہیں ہے۔ اوّل تو دُنیا بھر کی شاعری میں مذہبی شاعری کا یہی حال ہے، چند گنتی کے شعرا کو چھوڑ کر جنھوں نے کسی نظامِ فکر کی

روح کو گرفت میں لے کر اس سے کوئی بڑا کام لینے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے یہاں اس کی مثال رومؔی اور اقبالؔ ہیں، جن کی شاعری کو مذہبی شاعری اس لیے قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس میں روحِ شاعری مذہبی تشخص نہیں، بلکہ اس کا وہ انسانی، تہذیبی اور فکری شعور ہے جس نے دُنیا کو ایک نئے موڑ اور جہتِ عمل سے آشنا کیا ہے جس کی معنویت پوری انسانی فکر اور معاشرت کے لیے اتنی ہی اہم ہے، جتنا انسان کا پیدا ہونا۔ ظاہر ہے کہ اس کی مثالیں بار بار پیدا نہیں ہوا کرتیں، لیکن اس معیار کی شاعری کو مذہبی شاعری قرار بھی نہیں دیا جا سکتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم ایک انسان کے پورے خلوص، ایمان اور جذبے کی توانائی کے باوجود یہ سوچ سکتے ہیں کہ شاعری کا یہ رویہ کیوں اور کیسے ہے؟

اس سلسلے میں پہلے تخصیص سے زیادہ تعمیم کی بات کی جائے گی۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ شاعری کا موضوع انسان اور آدمی کے وہ تجربات اور جذباتی واردات ہیں، جن سے وہ بہ حیثیت ایک آدمی کے دوچار ہوتا ہے اور اس میں عمومیت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے مذہبی شاعری ایک مخصوص گروہ، نسل یا قوم تک محدود ہوسکتی ہے، جب کہ شاعر انسانی جذبات اور اس کے تجربات کی تعمیم کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ اپنے عقیدے اور خلوص کا اظہار کھل کر کرتا ہے مگر اسے اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنانا چاہتا، جس سے تخصیص پیدا ہوتی ہے۔ تعمیم کے اس پہلو میں ایک بات یہ پیشِ نظر رکھی جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ شاعری کی انسانی قدر کی وسعت اور جہت کی عمومیت کے باوجود کسی شاعر کی شاعری میں جو تہذیبی روح جلوہ گر ہوتی ہے، اس کا تعلق اس کے اپنے عقیدے، مذہبی شعور، دینی اقدار اور اس کے نظامِ فکر کے آثار سے اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اس کے بغیر آپ شاعری کی انفرادیت کا تعین ہی نہیں کر سکتے۔ اسی لیے میرؔ، عیسائی روحِ ادب سے مختلف نظر آئے گا اور دانتؔے رومؔی سے الگ تشخص قائم کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کا موضوع عام انسانی تجربات ہوتے ہیں۔

دوسری بات جو پہلی بات سے بھی زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ ماورائے کائنات کی حقیقت کو شاعری کا موضوع بنانا ممکن نہیں ہے۔ شاعری جس تجربے کا اظہار اور بیان ہے، اس میں اس کا شخصی تجربہ ہی اس کے اس جوہر کو اظہار میں لاتا ہے۔ نفسِ انسانی کا کوئی تجربہ ہو یا کسی مادّی حقیقت کا اظہار، شاعر نے جب تک اس سے شخصی سطح پر کوئی تعلق نہ قائم کیا ہو، وہ اس کو اپنا تجربہ نہیں کہہ سکتا۔ یکسر غیر مادّی تصور کا اظہار وہ کس شکل اور کس رنگ میں کرے گا۔ جب اس کی کوئی متعین جہت اس کے تجربے ہی میں نہیں ہے؟ یہی وہ مجبوری ہے کہ جب تک شاعر اس کو کوئی مجاز کا لباس نہ دے دے، اس سے یہ کام چلتا ہی نہیں۔ چناں چہ:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

ظاہر ہے کہ اُردو شاعری کی اس دوگونہ تہہ داری کا قائل ہوتے ہوئے بھی، میں ایسے اشعار کو مذہبی شاعری یا حمد تو نہیں مانوں گا۔ اور اگر اجازت ہو تو اس تعلق سے یہ دل کا چور بھی نکال دوں کہ اُردو غزل کی اعلیٰ شاعری میں جو ماورائیت، تہ داری اور گہرائی آئی ہے وہ اسی رمز و کنایہ کی بہ دولت ہے، جس کے مجازی پیکر میں ہمیں حقیقی روحانی محسوسات کا پرتو محسوس ہوتا ہے۔ یہ کچھ یونہی بے شعوری سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اُردو شاعری کے ابتدائی اساتذہ نے غزل کو ان علامات اور آثار کا پوری شعوری کوشش اور سعی کے ساتھ عادی بنایا ہے جن کی بہ دولت مجازی اصطلاحیں حقیقت کا پرتو اپنے اندر ہی سمیٹ لیتی ہیں۔ میں مثالوں سے شعوری طور پر گریز کر رہا ہوں کیوں کہ پھر یہ مضمون میرے قابو میں نہیں رہے گا۔ اگر آپ کو یہ شعوری عمل دیکھنا ہے تو شاہ حاتم اور ولی کی شاعری میں ایسی غزلوں کو دیکھیے، جہاں تصوف اور روحانیت کی اصطلاحوں کو عاشقانہ موضوعات کے ساتھ استعمال کرنے کی ہدایات تک دی گئی ہیں۔

خیر، بات اپنے موضوع سے دور چلی گئی ہے۔ اب ہمیں اس تخصیص کی طرف آنا چاہیے جس کا ہماری نعتیہ شاعری کو سامنا کرنا پڑا ہے۔ مذہبی شاعری کے سلسلے میں جن عام رکاوٹوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان سے قطعِ نظر حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس ان معنوں میں غیر طبعی نہیں کہی جاسکتی جس طرح ذاتِ باری تعالیٰ، لیکن مسلمان ہندوؤں کی طرح اپنے اوتاروں کو خدائی صفات کا حامل قرار دے کر اُن کے انسانی اور بشری پہلوؤں سے کسی طرح کا ایک شخصی اور ذاتی رشتہ قائم نہیں کر سکتے۔ وہاں کرشن سے ان کے اپنے تجربات کا اظہار ممکن ہی نہیں۔ آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک کی صحیح تعریف صرف معبودِ حقیقی ہی کر سکتا ہے۔ اس عقیدے کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' چوں کہ حضور ﷺ کی ذاتِ مقدس، مسجودِ ملائک آدمؑ کی غایتِ اولیٰ ہے، اور آپ ﷺ کے خالق نے آپ ﷺ کے احترام اور ادب کے مدارج مقرر کر کے آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین فرمایا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کی ذات منبعِ عزت و احترام ہوگئی ہے اور یہ مقولہ مسلمانوں کا جزوِ ایمان بن گیا ہے:

باخدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار

اس اعتبار سے نعت گوئی کا شرف کوئی آسان مرحلہ نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نعت گوئی کا کوئی باقاعدہ فنی التزام بھی نہیں رکھتے ہیں۔ وہ مرثیہ گوئی کی طرح کوئی ادبی اور فنی صنف

نہیں اور نہ اس کے لیے کوئی فنی اسلوب مخصوص ہے۔ دوسرا اسلوب جو سب سے زیادہ مقبول ہے، یہ ہے کہ کوئی شاعر کسی بھی صنف میں حضور ﷺ کی ذات سے اپنی والہانہ شیفتگی کی بنیاد پر ایسے پُرخلوص انداز میں عقیدت کا اظہار کرے جس میں اس کے جذبات بھی اسی سرمستی کا اظہار بن جائیں جیسا شاعر کا خلوص ہے۔ ان مثالوں میں جامیؔ کے علاوہ خسروؔ کی یہ غزل ایک مثالی مقام رکھتی ہے:

محمد شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

اُردو شاعری میں اس پایے کا تو ہرگز نہیں، مگر خلوص او رجذبے کے لحاظ سے امیرؔ مینائی، حسرتؔ موہانی اور بعض شعرا کا نعتیہ کلام پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک تو اُردو شاعری میں نعت گوئی کے اُن بنیادی خطوط کی نشان دہی تھی جو ہمارے نظامِ فکر کی وحدت اور اکائی کے دور اور اس کے مابعد اثرات میں ملتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں جب اسلامی ہند کا یہ نظامِ عمل شکست و ریخت سے دوچار ہو کر مغرب کے سامنے سپر انداز ہوتا ہے تو حالیؔ کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس کی طرف میں اس سے قبل اشارہ کر چکا ہوں۔ اس دور میں نعت گوئی نے ایک بالکل مختلف انداز اختیار کر لیا۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا

یہ حالیؔ کی آواز تھی، اس آواز میں خلوص بھی تھا اور درد بھی، لیکن اس میں نہ وہ والہانہ شیفتگی ہے، جو خسروؔ کی غزل میں نظر آتی ہے اور نہ وہ عقیدت کا تصور، جس کا مرکزِ نور یں حضور ﷺ کی ذات ہے۔ جس کو تکوین کا باعث مان کر آپ ﷺ کی ذات و صفات کے ان پہلوؤں پر توجہ دی ہے جن سے ان بنیادی فوائد اور انسانی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے جو آپ ﷺ کی بعثت سے عالمِ انسانیت کو پہنچیں۔ یہاں آپ کی ذات ایک بڑے مصلح اور رفارمر کی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کا کوئی روحانی تصور وہ نظام نہیں رکھتا تھا، جو مسلمانوں پر غالب آیا تھا۔ خدا جانے حالیؔ دل سے بھی اس حد پر اکتفا کرتے تھے یا نہیں؟ مگر بہت جلد برصغیر میں ایسی نسلیں پیدا ہو گئیں جو حضور ﷺ کی نبوت کی منکر تھیں اور آپ ﷺ کو ایک زمانے کا سب سے بڑا مصلح قرار دے کر مطمئن ہو جاتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حالیؔ کے بعد کی نسل تک تو نعت گوئی میں ایک اجتماعی تجربہ شامل تھا۔

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

یہ مولانا ظفر علی خان تھے، مگر اس دور کے بعد نعت گوئی صرف ان شعرا تک محدود ہو گئی جن کا تعلق

ہماری روایتی شاعری یا قدیم اسالیب کی شاعری سے تھا، لیکن ادب کے بنیادی دھارے میں ایسے شعرا نے قدم جما لیا جو ایک سرے سے مذہب ہی کو لعنت سمجھتے تھے۔ یہ ترقی پسند تحریک اور مغرب کی جدید ادبی تحریکات کے زیرِ اثر چلنے والی ان تحریکات کا زمانہ تھا، جسے اُردو شاعری کے جدید دور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب اُردو شاعری کے بنیادی اسالیبِ بیاں روایت بن جاتے ہیں، اور ان کے نام لیوا نظر انداز ہونے لگتے ہیں۔ اور جدید ادب اور شاعری کے علم بردار حقیقی اور ادب کے مدعی قرار پاتے ہیں۔ اُرد شاعری کا یہ دور اپنی پوری قوت اور ہمہ ہمی سے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۸ء تک جاری رہتا ہے جس میں نعت گوئی شاعری کا مسئلہ نہیں رہ جاتی۔ گویا ہمارا تعلق اپنے شعری اسالیب اور نظامِ فکر سے بالکل کٹ کر رہ جاتا ہے۔

ذہنی سطح پر یہ خلا یقیناً ایک ہول ناک واقعہ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتِ احوال یہ ہے کہ اجتماعی طور پر ہمارا شعور اپنے مرکزی نظامِ فکر سے ازسرِ نو رشتہ جوڑتا ہے۔ جس وقت قلمروے ادب میں رشتے توڑے جا رہے تھے، سیاسی اور معاشرتی طور پر اسلامیانِ ہند مسلم لیگ کے ذریعے ۱۸۵۷ء سے قبل کی اجتماعی وحدت کی تلاش میں دوبارہ نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ عمل بادی النظر میں خواہ کیسا ہی غیر منطقی نظر آتا ہو، مگر مسلمانوں کی زندگی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ اگر سیاسی اور معاشرتی سطح پر اسلام کے مرکزی نقطے سے جدائی کا عمل شروع ہوا ہے تو ان میں ذہنی طور پر ایسی کوئی تحریک پیدا ہوئی ہے جس نے ان کو اپنے نظامِ فکر سے دوبارہ ملا دیا ہے۔ اور اگر ذہنی طور پر پسپائی عمل میں آئی ہے تو سیاسی اور معاشرتی سطح پر کوئی ایسی جنبش پیدا ہوئی ہے جس نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اور غالباً اس مسلسل حیاتِ نو کا مرکزی جوہر حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ جو ایک مثالی اور باعمل معاشرتی نصب العین کا وہ واحد مینارِ روشنی ہے جو پوری انسانی تاریخ میں آئیڈیل معاشرے کو خود تعمیر کرتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے مثالی معاشرے کو عمل میں لاتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب مسلم لیگ کا طرزِ عمل اپنے ہی نصب العین کے خلاف حرکت کرتا ہے اور اس سے مایوسی اور شکست خوردگی پیدا ہوتی ہے تو ادب کے ایک طالبِ علم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ادب کے جدید علم برداروں کی صفوں سے مختار صدیقی، یوسف ظفر، قیوم نظر نکل کر اس ذاتِ گرامی ﷺ کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں، جس کا پرتو بھی چند سال قبل تک ان کی شاعری پر نہیں پڑا تھا۔ نعت گوئی نے اُردو شاعری کے جدید اسلوب میں اس طرح اپنی لازوال قوت کا ثبوت دیا ہے۔

یہ سب شاعر حلقۂ اربابِ ذوق سے تعلق رکھتے تھے۔ آج جب میں الطاف گوہر کو

تفسیرِ قرآن کے ترجمے پر کام کرتا ہوا دیکھتا ہوں تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حلقۂ ارباب ذوق کے زیادہ تر شاعروں اور ادیبوں میں اپنے مرکز کی طرف واپس آنے کا ایک نکتہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔

شاید جب ہمارے اجتماعی قومی مزاج میں کوئی ایسی تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے جس سے اس اکائی یا وحدت پر کوئی ضرب پڑنے لگتی ہے، جس سے ہمارا اسم قائم ہے، ہمارا وجود اپنی انفرادیت قائم رکھتا ہے تو اس باغی اور لامرکزی ذہن کا توڑ از خود ہونے لگتا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے اپنی اکائی سے الگ ہونے اور ٹوٹنے کا جو عمل ملک میں ہمارے بنیادی نظامِ فکر پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا، اور جس نے بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کر لی تھی، اسے روکنے کا اس سے مدافعت کرنے کا وہ جوہر جو ہماری قومی زندگی کا وصف ہے، پھر بروئے کار آرہا ہے۔ آج پاکستان کے نئے لکھنے والوں کی صف سے بغیر کسی تحریک کے جو پُرقوت ذہن اس عمل کے سامنے سدِ سکندری بنے کھڑے ہیں، وہ سب نعت کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنا رہے ہیں۔

اور یہی وہ تجسّس تھا جو مجھے نعت گوئی پر لکھنے کے لیے اُکسا رہا تھا۔ یہ کیسا تخلیقی عمل ہے جو خود بخود ہمارے نئے لکھنے والوں میں اُبھرتا آرہا ہے، جس نے سلیم احمد، جعفر طاہر، رحمٰن کیانی، مجید امجد اور متعدد جدید تر لکھنے والوں کو اس ہستی کا دامن پکڑنے پر مجبور کر دیا ہے جس نے اپنی اُمت کو تاقیامت زندہ قوم کی صورت برقرار رکھنے کی نوید سنائی تھی۔ اُردو کے جدید تر شاعروں کی نعتیہ شاعری کوئی رسمی چیز نہیں۔ روایتی شاعری کا ایسا اسلوب ہے جو غالباً حالی کے دور تک کو پھلانگ کر پھر اپنی اس کائی، اس وحدتِ فکر کی تلاش میں ہے، جس کو اس نے ۱۸۵۷ء کے بعد کھو دیا تھا۔ جس سے نعت گوئی کے سرمایے میں اب جدید تر اسالیبِ بیاں کا وہ بھرپور تجربہ بھی شامل ہوگیا ہے جو اب نعت گوئی کو باقاعدہ فن کی شکل دے گا۔

احمد ہمدانی

جدید اُردو نعت اور علامت نگاری

نعت گوئی صرف ہماری شاعری کی ایک صنف ہی نہیں بلکہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک منفرد عنصر بھی ہے۔ تہذیب و ثقافت کا عنصر ہونے کی حیثیت سے اس میں تہذیبی و ثقافتی تبدیلیوں کے ساتھ مسلسل تبدیلیاں بھی آتی رہی ہیں۔ ان مسلسل تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے ہم نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ نعت گوئی ایک زندہ صنف ہے جو اسلامی تعلیمات کی طرح زندگی کے ہر موڑ پر بھرپور معنویت کے ساتھ ہمیں اپنی طرف متوجہ رکھتی ہے۔

اگر ہم نعت گوئی کے سفر پر ایک نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک زمانہ تھا جب نعت گوئی میں کنہ رسالت ﷺ کو اُجاگر کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اُردو شاعری میں محسن کاکوروی اس دبستان کے نہایت معتبر نمائندہ ہیں کنہ رسالت ﷺ کے علاوہ عشقِ رسالت ﷺ سے سرشار شاعری کا سرمایہ بھی ایک مدت تک ہماری تخلیقی کاوشوں کا باعثِ افتخار مظہر رہا ہے اور آج بھی اس میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، مستقبل میں بھی عشقِ رسالت ﷺ ہی ہماری سب سے بڑی پہچان رہے گا۔ عشقِ رسالت ﷺ کے گہرے جذبات کے ساتھ ساتھ بالخصوص مولانا حالی کی مسدس کے بعد سے سرکارِ رسالت ﷺ کو اُبھار کر اُمتِ مسلمہ کو تعلیماتِ اسلامی پر عمل پیرا ہونے کی دعوت کا سلسلہ بھی نہایت مؤثر انداز سے شروع ہوا جسے ہم افادی و مقصدی ادب کا حصہ بھی کہہ سکتے ہیں موضوعات کی یہ تبدیلی اس امر کی واضح شہادت ہے کہ نعت گوشعرا نے اطراف کے حالات کو موضوع بنانے کی ضرورت کے تقاضوں کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا ہے، جن حالات میں حضور ﷺ کی ذات اقدس کو موضوع بنانے کی ضرورت تھی تو کنہ رسالت ﷺ اُجاگر کرنے پر زور دیا گیا اور جب ہمارے اجتماعی احساس کی پہچان حضور ﷺ سے عقیدت و محبت کی سرشاری تھی عشقِ رسالت ﷺ ہی ہماری نعتیہ شاعری کا مقبول ترین موضوع بنا رہا، لیکن جب امتِ مسلمہ

زوال کا شکار ہوئی تو سرکار رسالت ﷺ اور تعلیماتِ اسلامی کو نعت کا موضوع بنایا گیا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ موضوعات ایک دوسرے سے الگ کر کے برتے گئے ہوں اور ہر زمانے کے لیے کوئی ایک موضوع ہی اختیار کیا گیا ہو بلکہ ہر زمانے میں یہ سب موضوع ایک ساتھ برتے جاتے رہے ہیں، تاہم مخصوص حالات میں کسی ایک موضوع پر زور اس زمانے کے حالات کی مطابقت میں دیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نعت گو شعرا نے اطراف کے حالات پر ہمیشہ گہری نظر رکھی ہے۔

موضوعات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ طرزِ اظہار اور اسالیبِ بیان میں بھی مسلسل تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ ہمیں اپنی نعتیہ شاعری میں سادگی و پرکاری کے ساتھ تشبیہات و استعاروں، تلمیحات اور کنایوں کا استعمال نہایت دل آویز انداز کے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ تشبیہات، استعاروں اور کنایوں کے سلسلے میں ہم نے حضور ﷺ کے اسمائے صفات سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے جب کہ تلمیحات کے سلسلے میں حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے واقعات اور قرآنِ پاک میں آپ کے ذکر مبارک سے ممکنہ حد تک فائدہ اُٹھایا ہے، لیکن پچھلے دنوں ہماری شاعری میں آزاد و معرا نظموں اور علامت نگاری کی تکنیک کا رواج بھی خاصے بڑے پیمانے پر مقبولیت حاصل کر رہا ہے، لہٰذا ہماری نعتیہ شاعری میں بھی ان جدید ترین اصناف و اسالیب سے آراستہ تخلیقات کی کوئی کمی نظر نہیں آتی آزاد و معرا نظموں سے تو ہم پوری طرح مانوس ہو چکے ہیں البتہ علامتی طرزِ اظہار کے بارے میں ابھی کچھ اُلجھنیں باقی ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم علامت و استعارے کے فرق کو سمجھ لیں اور پھر اپنی نعتیہ شاعری میں علامتوں کا جائزہ لیں۔

علامت نگاری دراصل ایک شعوری اور ارادی تکنیک ہے۔ علامت نگار شعرا کہتے ہیں کہ خارجی اور معروضی عالمِ گزراں اصل میں حقیقت نہیں ہے، لہٰذا اس کے مناظر اور اس کی اشیا میں مشابہتیں بھی غیر حقیقی ہیں۔ چناں چہ یہ لوگ اپنے احساس میں جنم لینے والے ہیجانات ہی کو حقیقی تصور کرتے ہیں اور ان ہیجانات کی مماثلتوں کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہم اس وقت علامت نگاری کی ماہیت کی بحث میں پڑے بغیر ہی اپنی نعتیہ شاعری میں علامتوں کے استعمال کا جائزہ لینے پر اکتفا کریں گے۔

نذیر قیصر ایک عیسائی نعت گو شاعر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ صرف مسلمانوں کے لیے رحمت نہیں تھے بلکہ رحمت للعالمین ہونے کے ناتے وہ تمام انسانوں کے لیے رحمت تھے۔ لہٰذا وہ عیسائی ہونے کے باوجود ثنائے رسول پاک ﷺ کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی نعتیہ شاعری میں علامتوں کا استعمال بڑی خوب صورتی سے ہوا ہے مثلاً: ان کے اشعار دیکھیے۔

دن سے پہلے سورج آئے رات سے پہلے شام
صبحیں تیرے نقشِ قدم ہیں خوش بو ترا قیام
دھرتی پر پھیلائے کس نے روشنیوں کے کھیت
تیرے پاؤں کو چومنے والی پاک مقدس ریت
خوش بو اسم بنے اور اسم سے آگے نور کا ہالا
آج کی رات اس ہالے کو میں تنہا دیکھنے والا
پہلی شام مدینہ کی اور دھند سے لپٹے باغ
سایہ سایہ دیکھ رہا ہوں صورت اور چراغ
کوئی درد پھول بنے
کبھی تیرا درشن ہو
اڑ رہی ہے دوش پر صحرا کی شال
ہاتھ میں کھلتا ہوا کرنوں کا پھول

آیئے ان اشعار میں جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں ان پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ چند علامتیں دیکھیے۔ قیام خوش بو، نام خوش بو، روشنیوں کے کھیت، دھند میں لپٹے باغ، صورت اور چراغ، درد کا پھول، صحرا کی شال، اور ہاتھوں میں کرنوں کا پھول یہ سب نہایت فکر انگیز علامتیں ہیں۔ مثلاً خوش بو ترا قیام سے مراد حضور ﷺ کی ولادت سے پردہ کرنے تک کا زمانہ ہے جسے شاعر نے پوری نوع انسانی کے لیے فرحت و شادمانی کا سبب بتایا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کا نام نامی اسم گرامی اپنی جگہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فرحت و شادمانی کا اشاریہ ہے۔ روشنیوں کے کھیت کی بلاغت قابلِ داد ہے، روشنیوں سے مراد حضور ﷺ کی تعلیمات ہیں جب کہ کھیت ان تعلیمات کے بڑھنے اور پھیلنے کا اشارہ ہے۔ دھند میں لپٹے باغ سے ذہن ایام جاہلیت کا منظر آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ یہاں کے باغ سے مطلب عالمِ انسانیت ہے اور دھند میں لپٹنے کا مطلب گم راہی اور تاریکی میں گھرا ہونے سے ہے یعنی حضور ﷺ کی آمد سے پہلے عالمِ انسانیت تاریکی میں گھرا ہوا تھا۔ صورت اور چراغ سے مراد حضور ﷺ کی ذات اقدس اور آپ کی تعلیمات ہیں۔ درد پھول بنے یعنی حضور ﷺ کی زیارت سے دردِ فرقت اپنی جگہ فرحت و شادمانی بن جائے۔ صحرا کی شال سے مراد ریگستاں کا طرزِ حیات ہے اور ہاتھوں میں کرنوں کا پھول کا مطلب ہے قرآن پاک ان علامتوں میں ظاہری مشابہتیں نہیں ہیں، لیکن تاثرات و احساسات میں موجود مماثلتوں سے انکار ممکن نہیں۔

نذیر قیصر کی نعتیہ شاعری کے سلسلے میں ان کی ایک نظم سے اقتباس ملاحظہ ہو:

وہ ریگِ تشنہ کی شال اُڑاتا
وصال و ہجر کے موسموں کا رسول
قصوا کے پاؤں سے بہتی دھول
میں کھلتے پھول

ریگِ تشنہ کی مثال سے مراد بعثت سے پہلے سرزمینِ عرب کے حالات میں وصال و ہجرت کے موسموں سے مراد بعثتِ مکہ سے مدینہ ہجرت کے بعد ہجرتِ قیامت تک کا زمانہ ہے۔ قصوا حضور ﷺ کی اونٹنی کا نام ہے۔ مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار کو کر جدھر جدھر سے بھی گزرے وہاں زندگی میں نکھار اور سنوار پیدا ہوگیا۔ عرض یہ کہ ان چار مصرعوں میں حضور کی ذات اور تعلیمات کو جس بھرپور انداز سے اُجاگر کیا گیا ہے اس کی مثال علامتی اسلوب میں مشکل ہی نظر آتی ہے۔ نذیر قیصر کی دوسری نظمیں بھی علامت نگاری کی کامیاب مثالیں ہیں ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر علامت نگار مہملیت، بے معنویت اور چیستاں گوئی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

رشید قیصرانی علامت نگار شاعر ہیں۔ ان کی نعتیہ نظم جس میں علامتوں کا نہایت خوب صورت استعمال ہوا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

اک دیپ جلا اندھیاروں میں
ظلمت کے بپھرے سینوں سے
اک چیخ اُٹھی
اک شور مچا
یہ روپ سروپ اندھیاروں کا
برسوں سے قائم دائم ہے
یہ کس کی جرأت ہے
یہ کس کا دم
یہ کون ہماری نگری میں
ظلمات کا دم یوں نوچتا ہے
صدیوں کی سوکھی دھرتی پر
یہ کون اُجالے چھینکتا ہے

بے خوف و خطر
چپکے چپکے
وہ دیپ مگر جلتا ہی رہا
یہ دیکھو ظلمت گاہوں سے
کچھ زہر بھرے اژدر نکلے
کچھ سانپ سنپولے در آئے
کچھ تند ہوائیں چیخ اُٹھیں
کچھ تیز بگولے لہرائے
ظلمات کی ساری سینائیں
اک تنہا دیپ پہ ٹوٹ پڑیں
اتنے میں کچھ پروانوں نے
اس دیپ پہ گھیرا ڈال لیا
یہ پروانے لاچار بھی تھے
کم زور ضعیف و نزار بھی تھے
ہر دیپ کی رکشا کی خاطر
وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر
طوفان کے منہ میں کود پڑے
کچھ پار لگے
کچھ ڈوب گئے
یلغار سے پروانوں کی مگر
طوفان کی چھکے چھوٹ گئے
اتنے میں کچھ بیراگی بھی
قندیل جلائے آپہنچے
وہ دیپ جو تنہا جلتا تھا
اس دیپ سے لاکھوں دیپ جلے

طوفان کا سینہ چاک ہوا
دم ٹوٹ گیا اندھیاروں کا

یہ نظم بعثت سے فتحِ مکہ اور پھر خلافتِ راشدہ کے پورے دور کی تاریخ ہے بلا سبہ اس طرح کی علامتی نظمیں ہماری نعتیہ شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتی ہیں۔ علامت نگاروں سے ہٹ کر ہمارے روایتی انداز کے نعت گو شعرا کے ہاں بھی کہیں کہیں علامتوں کا استعمال نظر آتا ہے۔

عہدِ حاضر کے نعت گو شعرا میں جناب حفیظ تائب کو نہایت نمایاں و ممتاز مقام حاصل ہے، انھوں نے اپنی ذات کو ثنائے رسول ﷺ کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ان کے نعتیہ کلام کے ایک ایک مصرعے میں بلکہ ایک ایک لفظ میں ان کے دل کی دھڑکنوں کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ حضور ﷺ سے گہری عقیدت و محبت کے ساتھ تعلیماتِ رسول ﷺ کو نہایت احتیاط سے واضح کرنا ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ نعت گوئی کے سلسلے میں آدابِ رسالت پر پوری طرح نظریں جمائے وہ رسولِ پاک ﷺ کے اسمائے صفات کے ساتھ نہایت پاکیزہ استعارات و تشبیہات سے کام لیتے ہیں، لیکن ان کے ہاں غیر شعوری طور پر کہیں کہیں کچھ علامتیں بھی استعمال ہوئی ہیں جو ان کے احساسات کی لطافت و نزاکت کا نتیجہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ان کی خوش بو سے مہک جائے مشامِ عالم
میرے دامن میں جو گل ہائے کرم تیرے ہیں

لب کھلے جب نبی کی مدحت میں
پھول کھلنے لگے طبیعت میں

گلوں سے دل کی زمینوں کو بھر دیا تو نے
ضمیر تیرہ کو گلنار کر دیا تو نے

ہوائے تازہ سے مہکا دیا زمانے کو
مسافروں کو یہ برگ سفر دیا تو نے

لفظ کو جب بھی نارسا پایا
پھول مژگاں کے رنگ لانے لگے

ان اشعار میں ــــ ”پھول کھلنے لگے طبیعت میں“، ”ان کی خوش بو سے مہک جائے مشامِ عالم“ دل کی زمینوں کو گلوں سے بھر دیا، ہوائے تازہ سے جہاں کو مہکایا، اور مژگاں کے پھولوں کا رنگ لانا ایسی علامتیں ہیں جن کو حضور ﷺ کی تعلیمات کا اشاریہ کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ

کسی ہیئت کے تجربہ یا کسی شعوری اور ارادی تکنیک کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ جناب حفیظ تائب کے احساسات کی لطافت و نزاکت سے وجود میں آتی ہیں۔

سرشار صدیقی کی قسمت پر مجھے رہ رہ کر رشک آتا ہے۔ اس کی نعت گوئی اس کے حال پر خود سرکارِ دو عالم ﷺ کے کرم کا نتیجہ ہے ۱۹۸۴ء میں اسے ارضِ مقدس کی زیارت نصیب ہوئی جہاں رحمت للعالمین کی چشمِ توجہ سے اس نے اپنے کھوئے ہوئے وجود کو دریافت کیا۔ روضۂ رسول ﷺ کی ضیا بار فضاؤں میں جب اس نے اپنی روح یا اپنے حقیقی وجود سے آنکھیں چار کیں اور اپنی پچھلی زندگی پر نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں شرم و ندامت سے زمین میں گڑی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اور اشکوں کا ایک دریا کچھ اس انداز سے بہنا شروع ہوا جیسے پچھلی زندگی کی تمام تر کم زوریاں ڈھل کر اس کے لہو میں اُجالے بکھیر رہی ہوں۔ اس کی نعتیہ شاعری ان اُجالوں کی صوتی تصویر ہے۔ اس صوتی تصویر میں کہیں کہیں فکر انگیز علامتیں بھی نظر آتی ہیں، لیکن یہ علامتیں کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے اس کی گہری عقیدت کی مظہر اور حضور ﷺ کی توجہ و التفات کا اظہار سپاس ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اُفق تیرہ پہ پڑنے لگی کرنوں کی کمند
صبح کی چہرے سے تاریکی کے آنچل ڈھلکے

ان فضاؤں میں کھلا یہ مجھ پر
سانس لیتی ہے اب بھی سچائی

ایک لمحے میں دھندلکوں کا فسوں ٹوٹ گیا
سانولے ذروں میں جاگ اُٹھی جبین سحری

یا اس کی نظم کے یہ مصرعے:

کیا یہ میں ہوں
شاید میں ہوں
لیکن سوکھے پیڑ کی
ٹوٹی شاخ سے آخر
کونپل کیسے پھوٹی ہے

یہ تمام اشعار اور نظم کا اقتباس اس کے مجموعۂ کلام ''اساس'' سے لیے گئے ہیں۔ یوں تو پورا مجموعہ سرشار کے جذبے کا مظہر ہے لیکن ہم نے یہاں ان اشعار میں اور نظم کا اقتباس اپنے موضوع کے لحاظ سے صرف علامتوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ذرا ان علامتوں پر غور فرمائیں ''اُفقِ تیرہ''، ''تاریکی کی آنچ''، ''دھندلکوں کا فسوں'' وغیرہ حضور ﷺ کی آمد سے پہلے کی تاریک فضا کو آنکھوں کے سامنے لاتی ہیں جب کہ ''کرنوں کی کمند'' حضور ﷺ کی تعلیمات کا اشاریہ ہے۔ ''سوکھے پیڑ کی ٹوٹی شاخ''، ''کیسے پھوٹی'' علامات خود شاعر کی اپنی کیفیت کی ترجمان ہیں سوکھے پیڑ کی ٹوٹی شاخ سے مراد خود شاعر کی اپنی ذات اور ماضی کی زندگی ہے۔ اس ٹوٹی شاخ سے کونپل کیسے پھوٹی سے مراد یہ ہے کہ ماضی کی تمام تر خامیوں اور کم زوریوں کے باوجود معرفتِ حق کی توفیق کیسے ہو؟ اس سوال میں حضور ﷺ کی چشمِ کرم کی طرف اشارہ ہے۔ آیئے اب چند دوسرے شعرا کی کچھ علامتوں پر نظر ڈالتے ہیں:

زنجیر پا ہیں فکر و نظر بھی پسِ غبار
خنجر بہ کف ہیں قصرِ جہالت کے لشکری
(ریاض حسین چودھری)

اُتارے جسم و جاں پر اس ﷺ نے موسم شادمانی کے
بدل دی شہرِ ہستی کی فضا اوّل سے آخر تک
(صبیح رحمانی)

بجھ رہی ہیں نئی تہذیب کی قندیلیں بھی
روشنی پھر تیرے قدموں کی ضیا مانگے ہے
(خاور اعجاز)

ان اشعار میں ''پسِ غبار''، ''جہالت کے لشکری''، ''موسم شادمانی کے'' اور ''قدموں کی ضیا'' نہایت معنی خیز علامتیں ہیں۔ راقم الحروف حد سے زیادہ ذاتی اور اشاریت سے خالی علامتوں کا بالکل قائل نہیں ہے، لیکن اشاریت سے آراستہ علامتیں جدید ترین اسلوب کی قابلِ قدر خصوصیت ہیں۔ ہر چند ابھی ہماری نعتیہ شاعری میں علامتوں کا استعمال بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر ہماری نعتیہ شاعری میں بھی علامتی طرزِ اظہار کے رواج پانے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

✡

ڈاکٹر ریاض مجید

نعت: ''موضوعِ محض'' سے ''معجزۂ فن'' تک

میر تقی میر کا معروف شعر ہے:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

بات کو ''شعر'' اور ''سخن'' کو ''فن'' کے درجے تک لے جانا ہی وہ عمل ہے جو لفظوں کے انداز، جذبے کی گرمی اور تاثیر کا جادو بھر دیتا ہے۔ یہ پراسرار عمل لفظوں کو گویا کرتا ہے، جب کوئی ماہرِ فن خونِ جگر سے اپنے جذبوں کو آمیز کر کے کاغذ پر اُتارتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کی تحریر میں سوز و سرور کا اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ اس کی تاثیر بھی دوام آشنا ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال کا یہ مصرع:

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔

اُردو زبان میں نعتِ رسول اکرم ﷺ آغاز ہی سے ہمارے شاعروں کا پسندیدہ موضوع رہی ہے۔ مختلف زبانوں اور علاقوں کے شاعروں نے اپنے اپنے طور پر اس موضوع کو فن بنانے کے لیے مقدور بھر کوشش کی ہیں، لیکن جیسا کہ فارسی کا مشہور ضرب المثل مصرع ہے:

کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد

اپنی تمام تر صلاحیتوں کے اظہار اور فنی استعداد کے استعمال کے باوجود نعت گوئی اور ثنا گری کا فن ہر زمانے میں اپنے تشکیلی مراحل میں رہے گا۔ یہ ہر دور میں تکمیل رو ضرور رہا ہے مگر اسے فکری کمال اور فنی معراج تک پہنچانے کا دعویٰ کبھی کسی نے نہیں کیا۔ کوئی یہ دعویٰ کر بھی نہیں سکتا اور نہ کسی کو یہ دعویٰ زیب دیتا ہے۔ اسی حوالے سے مرزا غالب نے کیا خوب صورت اور حقیقت زاد مقطع لکھا ہے:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کآں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

نعت کے باب میں اظہارِ عجز کے باوجود ہر نعت نگار کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور محسوسات سے حاصل ہونے والے نتائج، تجربے، زبان و بیان کی بہترین صلاحیتوں سے، اپنی نعت گوئی کے تخلیقی ماحول کو پر تاثیر بنانے کی کوشش کرے اور نعت نگاری کے فکری و فنی پہلوؤں کو ہر زاویے سے نکھارنے اور سنوارنے کے لیے نہ صرف تخلیقی صلاحیت اور دستیاب لسانی و اسلوبیاتی وسائل کو پوری توجہ اور اخلاص سے بروئے کار لانے کی کوشش کرے بلکہ اپنی سعی مشکور خواہ سے اپنے نعت پارے کو ایک معجزۂ فن بنا دے۔ مگر ایسا ہوا کم کم ہے، ہماری نعت میں زیادہ تر رسمی تذکارِ سیرت و روایتی اظہارِ محبت کی تکرار محسوس ہوتی ہے۔

تذکارِ سیرت اور اس کی تکرار بھی ایک مبارک وظیفہ ہے۔ اس کے اثرات و برکات بعض صورتوں میں نعت خوانی اور نعت گوئی سے بھی زیادہ مسلم، مؤثر اور یقینی ہیں کہ تذکار میں سادگی اور اخلاق زیادہ ہوتا ہے، فن کی طرف آنے میں جو محنت و مہارت ضروری ہوتی ہے اس میں بعض اوقات ان سچے جذبوں (سادگی و اخلاص)، میں نام و نمود کے عناصر بھی غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر شامل ہو جاتے ہیں جو بہرحال نہ پسندیدہ ہوتے ہیں اور نہ ان کے نتائج اتنے مؤثر ہوتے ہیں جتنے اخلاص سرشت ان اوراد و مشاغل کے ہوتے ہیں جنھیں سادگی سے ادا کیا جائے۔

کچھ باتیں اس لیے نہیں کی جاتیں کہ وہ ہوتی نہیں بلکہ اس لیے بھی کی جاتی ہیں کہ وہ ہماری توجہ میں رہیں اور سننے والوں کے ساتھ کہنے والا بھی ان کو دہراتا رہے۔ ہم سب نعت نگاروں کو یقیناً یہ خواہش ہے کہ ہم نعت کے فن میں بہتر سے بہتر تخلیقی کارکردگی کا مظاہرہ کریں اور حضور اکرم ﷺ سے محبت و عقیدت کے ہر اظہاریے کو "معجزۂ فن" کے کمال تک لے جائیں مگر اس 'خواہش' کے حصول کے لیے ہم میں سے کئی شاعروں کے ہاں اس کے مطابق کوشش نظر نہیں آتی۔ اس ضمن میں ہم سے غیر محسوس طور پر ایک کوتاہی ہو رہی ہے۔ مجھے اخبارات و رسائل میں چھپنے والی کئی نعتوں میں کہیں کہیں غیر ارادی طور پر ہی سہی، روا رکھے جانے والے ایک سرسری پن کا احساس ہمیشہ رُلاتا ہے۔

نعت کے فن پر ملنے والے تنقیدی جملوں، مضمونوں مقالوں اور تاثرات سے شروع ہی میں اس بات کو بہ تکرار بیان کیا جاتا رہا ہے کہ نعت محض ایک موضوع نہیں ایک فنی کل (whole) ہے ایک ایسی تخلیقی اور نامیاتی وحدت، جس میں خیال، لفظ، اسلوب، ہیئت آہنگ اور دوسرے اسلوبیاتی وسائل اور شعری محاسن، ایک مؤثر فنی اکائی کی طرح تخلیق یاب ہوتے ہیں نعتِ رسول اکرم ﷺ کا مرکزی و محوری موضوع آپ کی ذاتِ گرامی سے محبت کا اظہار اور آپ کی شخصیتِ ستودہ صفات کا تذکار ہے۔ اس موضوع سے ہزاروں مضامین نے جنم لیا آپ کے پیغام، اسلامی شعائر، دینی

اقدار سبھی کچھ نعت کے فکری نظام کا حصہ بنے اور اس کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی طور پر اُمتِ مسلمہ کے افراد اور مملکتوں کو درپیش امور و سائل بھی شعری قرینے اور تخلیقی انداز سے نعت کے مضامین میں شامل ہوتے گئے، خصوصاً حصولِ ثواب اور برکت طلبی کے جذبے کے ساتھ ساتھ مشکلات و آلام اور مصائب و آشوب میں آپ ﷺ کی ذات والا تبار سے استغاثہ اور استمداد کے موضوعات بھی عقیدت کے اس اظہار اور سیرت طیبہ کے اس تذکار میں شامل ہوتے گئے۔

ورڈز ورتھ نے شاعری کو تمام علمِ انسانی کی جان اور اس کی لطیف ترین روح سے تعبیر کیا ہے نعت کی شاعری اہلِ ایمان کے لیے اس سے بھی آگے کی چیز ہے کہ انسانی علوم کے ماحصل کا تخلیقی اظہار اپنے لطیف ترین تلازمات کے ساتھ جملہ فکری و فنی محاسن سے آمیز ہو کر اس صنف میں ظہور کرنے کے جتنے امکانات رکھتا ہے دوسری اصناف میں نہیں۔ ایسا اکثر نہ ہو، مگر عربی، فارسی اور اُردو کے علاوہ پاکستان کی دوسری زبانوں میں کہیں کہیں ایسے نمونے ضرور مل جاتے ہیں جو ان امکانات کا راستہ سجھاتے ہیں۔ علامہ اقبال کی معروف نعتیہ نظم ''ذوق و شوق'' ایسے امکانی اور (ادبیاتِ عالیہ کے حوالے سے) آفاقی عناصر سے لبریز ہے جس میں جذبات و عقیدت کے ساتھ تہذیبی، تمدنی اور تاریخی حوالوں کی لو جھلکتی ہے۔ اس نظم کی عمدہ ڈرافٹنگ، بند وار فکری محاسن، ٹیپ کے (باردیف) اشعار کی بلیغ معنی آفرینی جو اوپر کے (غیر مردف) اشعار کے سلسلہ ہائے خیالات کو مربوط اور منضبط (sizeable) کرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ نظم کے مخصوص آہنگ (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن) جس میں مسجدِ قرطبہ کے (مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن) کے جلالی آہنگ کے برعکس! جمالی پہلو نمایاں ہے۔ 'ذوق و شوق' کو معجزۂ فن کے درجہ پر فائز کر دیتا ہے۔

علامہ اقبال ہی کی نعتیہ عناصر پر مشتمل نظموں میں ''حضورِ رسالت مآب ﷺ میں'' اپنے ڈرامائی اسلوب اور مکالماتی انداز کی حامل ایسی نظم ہے جو مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنی معنویت اور تکنیک کے لحاظ سے بہت مؤثر نظم ہے خصوصاً اس کا آخری شعر جس میں نظم کی بلیغ تہ داریت کو ایک بے اظہار مگر واضح استمداد اور استغاثہ کی صورت دی گئی ہے۔ اُردو نعتیہ شاعری میں یہ مؤثر جذباتی تحرک (emotional vibration) کی ایک عمدہ مثال ہے جو اپنی استعاراتی بہاؤ اور تلازماتی وسعت میں قاری کو اُمتِ مسلمہ کے ایک اہم تاریخی منظر نامے میں لے جاتی ہے۔

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

طرابلس کے مکانی ماحول سے ''حضور رسالت مآب ﷺ کی ماورائے زمانہ تک وسیع فضا تک

جہاں اقبال یہ مکالمہ کر رہے ہیں، ایک جہانِ محسوسات پھیلا ہوا ہے، جس کی معنویت یک سطحی (Flat) انداز کی نہیں، تلازمہ در تلازمہ بلیغ تہہ داریت کی حامل ہے۔ یہ نعتیہ نظم مختصر ہونے کے باوجود اپنے فکری و فنی محاسن اور سیاسی و تاریخی تلازموں کی اہمیت کے سبب ایک جداگانہ مضمون کی متقاضی ہے۔

علامہ اقبال کی یہ نظم اُردو نعتیہ شاعری کے تخلیقی تناظر میں بلاشبہ ایک عمدہ اور مثالی نظم (Vintage Poem) ہے جس کا مطالعہ، نعت کے قاری کو مدتوں ایک تجیدی اداسی (celestial pathos) میں محصور رکھتا ہے۔ دیکھیے اقبال نعت کے موضوع کو فن کے کس مقام پر لے گئے ہیں؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ماڈی طور پر بہت ترقی کرنے کے باوجود بھی نہ اپنی مرضی سے کوئی شے یا خیال سوچ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی سوچوں کے خدوخال میں حسبِ خواہش کوئی منفرد ردوبدل کر سکتا ہے۔ یہ ایک جبلی اور نفسیاتی جبر ہے کہ وہ وہی کچھ سوچ سکتا ہے جو سوچ رہا ہوتا ہے جس طرح کا مزاج اور ذہنی استعداد اسے قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے، اس کے فکر و فن کا سارا سفر اسی عطا شدہ تخلیقی و اسلوبیاتی وسائل کے دائرے میں طے ہوتا ہے۔ علامہ اقبال جیسے بڑے شاعروں اور فن کاروں کا فن عطائے خداوندی میں شمار ہوتا ہے، محسوسات اور اظہار کے جس مقام پر اقبال کھڑے ہیں وہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ مگر یہ بات بھی درست ہے کہ ریاضت، مہارت، زبان و بیان کے محاسن کے حصول کے لیے مسلسل تگ و دو اور فکر و فن میں تازہ کاری کے لیے کوشاں رہنے کا اپنا صلہ اور اجر ہے جو تخلیق کو کچھ حد تک نکھارتا اور اظہار کو تھوڑا سا سنوارتا ضرور ہے۔ میرزا سوداؔ کے لفظوں میں پتھر کو صیقل کرنے سے پتھر زیادہ سے زیادہ آئینہ بن جائے گا مگر جوہر یا موتی نہیں کہ اس کی اصل اس کی فطرت سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہنر سے دور ہے بد اصل کی فطرت کہ آئینہ
خمیرِ سنگ سے بنتا ہے تو جوہر نہیں ہوتا

نعت کے باب میں ہمیں کس انداز سے کوشاں رہنا چاہیے؟ اس کے لیے کوئی باقاعدہ نظامِ تخلیق تو وضع نہیں کیا جا سکتا ہر نعت نگار کا اسلوب اور اس کی تخلیقی استعداد دوسروں سے مختلف ہوتی ہے مگر یہ بات کبھی کبھار اداس کرتی ہے کہ نعت کے معاصر منظرنامے میں کئی نعت نگار ایک جیسے موضوعات کے بیانیہ دائرے میں سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ خیالات، تراکیب، ردیف و قوافی کی تکرار، بحور و اوزان کی یکسانیت نے بہت سی نعتیہ شاعری کو ایک جیسا کر دیا ہے نعت کے فن میں موضوعات و مضامین کی یہ یکسانیت کچھ فطری بھی ہو سکتی ہے کہ نعت کا فکری دائرہ جتنا بھی وسیع ہو جائے نعت نگار کا مائل بہ مرکز ہونا اور رہنا اس صنف کا لازمۂ فن ہے۔ یہ مرکز وہ نسبتِ طیبہ ہے جو

اس صنف کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ کے تذکارِ مبارک سے جوڑے رکھتی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کی نعت میں سچے تخلیقی تجربوں کی نادرہ کاری کم کم نظر آتی ہے۔

نعتیہ مضامین کے اظہار میں تازہ کاری کے لیے مقدور بھر کوشاں رہنا ہم سب کے لیے ضروری ہے تازہ تراکیب نئے نئے اسمائے مبارکہ کی تخلیق اور تلاش، آہنگ و اوزان کے تجربے، بلیغ اور پُرتاثیر شعری زمینوں کی دریافت، جدید شعری اصناف کو نعتیہ مضامین کے لیے رواج دینے کی کوشش دوسری زبانوں کے نعتیہ کلام کے تعارف و تراجم اور طویل یک کتابی نعتیہ نظموں کی منصوبہ بندی، سیرتِ طیبہ کا تذکارِ مبارک کے ساتھ جدید دور میں اُمتِ مسلمہ کو درپیش مسائل اور ان کے حل کے لیے اس صنف میں ایک پُرتاثیر قرینے سے استغاثہ و استمداد کے مضامین کی آمیزش، ذاتی کردار سازی سے جہاں بانی تک کے پھیلے ہوئے مضامین و موضوعات کو اسلوبیاتی محاسن کے ساتھ نعت سے منسلک رکھنے کی کوشش تخلیقِ نعت کے مراحل میں ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ نعت کی صنف آج ہم سب سے ہمہ جہت توجہ چاہتی ہے۔

محسن کاکوروی، امیر مینائی، مولانا احمد رضا خاں، ظفر علی خاں، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، حافظ لدھیانوی، صوفی محمد افضل فقیر، حفیظ تائب، عبدالعزیز خالد، ابوالخیر کشفی، مظفر وارثی، عاصی کرنالی۔ کیسے کیسے نعت کاروں نے خونِ جگر سے اس صنف کی آبیاری کی ہے۔ نعتیہ مضامین کے اظہار کے حوالے سے ان اکابرینِ نعت کے فکر وفن کا گہرا اور مستقل مطالعہ ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔

محبت کے جذبے ازلی و ابدی ہوتے ہیں۔ غیر مبدل، مگر ان کا اظہار سچا تخلیقی تجربہ اور تازہ کاری چاہتا ہے کہ اس سے تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ نعت میں احترام رسالت مآب کا جذبہ ہمہ پہلو اور مسلسل توجہ طلب مسئلہ ہے۔ نعت کے مضامین و موضوعات کے اظہار میں ترجیحات نظر انداز نہیں ہونی چاہییں۔ جذبے کا انہماک مبارک مگر جذبۂ اطاعت نژاد اور محبت تقلید سرشت ہونی چاہیے۔ عقیدت کا اظہار جس بھی والہانہ پن سے ہو اس کا وفور اگر عقیدے کو مسخ کر جائے تو یہ ایسی کوشش اور محنت کس کام کی؟ گفتار و کردار اور قول و عمل کی مغائرت کسی شعبۂ حیات میں کبھی بھی پسندیدہ نہیں رہی۔ نعت کے نازک اور مبارک فن میں اچھے ثمرات کیسے پیدا کرسکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہم نعت کاروں کو اخلاص کی نعمت اور تخلیقی نادرہ کاری کی صلاحیت سے نوازے۔ آمین!

مبین مرزا

نعت اور اُردو کی شعری تہذیب

انسانی اظہار و ابلاغ کی تاریخ کا مطالعہ دل چسپ بھی ہے اور دل کشا بھی۔ اس باب پر اک نگاہ کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ محض مادی ضرورتوں کے بیان سے لے کر احساس کی عمیق اور خیال کی ارفع کیفیتوں تک انسان کی خواہشِ اظہار نے خود کو کس کس طرح پیش کیا ہے — یہی نہیں، ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اظہار کی صلاحیت اور تخیل کی طاقت عطا کرنے والے نے انسانی اظہار کو جلال و جمال، حزن و انبساط اور فکر و احساس کے کیسے کیسے رنگوں سے مالا مال کیا ہے۔ اہلِ کلام ہوں کہ اہلِ فکر یا اہلِ دانش و بصیرت، اس بات پر کسی نہ کسی انداز سے کم و بیش سبھی اتفاقِ رائے رکھتے ہیں کہ اظہار کی بلیغ تر اور مؤثر ترین صورتوں میں ایک شعر بھی ہے۔ اسی لیے کہنے والوں نے اسے جزویست از پیغمبری اور نغمۂ سروش اور شاعر کو لسان الغیب اور تلمیذ الرحمٰن کہا ہے۔

کئی ہزار سال کی معلومہ تہذیبی تاریخ کو زمانوں اور خطوں سے قطعِ نظر کرتے ہوئے دیکھا جائے تو شعری اظہار میں ایک عنصر بہت نمایاں نظر آتا ہے، یہ ہے مذہبی عنصر۔ فرد کے ذاتی احساس سے لے کر اُس کے اجتماعی یا تہذیبی رویے کے بیانیہ تک، جن صورتوں اور جیسے اسالیب میں مذہبی فکر اور مذہبی جذبے کا اظہار ہمیں شعر و سخن کی جن نو بہ نو صورتوں اور معانی کے جن درجوں میں جلوہ گر ملتا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ بات ان معاشروں اور افراد کی بابت بھی بڑی حد تک درست ہے جن کی عمومی ذہنی شناخت غیر مذہبی یا سیکولر رُجحان کے تحت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اگر یہ کہا جائے کہ شعر و سخن میں مذہبی رُجحان کا جس طور سے اظہار ہوتا ہے، فنونِ لطیفہ یا ادب کے کسی دوسرے شعبے میں ایسی کوئی اور مثال باید و شاید تو یہ کوئی دعویٰ نہیں، امرِ واقعہ کا اعتراف ہوگا۔ اس حقیقت کی توثیق کے لیے دُنیا کے قدیم ادبی ماخذات سے لے کر آج کے سائنسی دور کی ترقی یافتہ تہذیبوں کے شعر و سخن تک محض چند ایک مقامات پر سرسری نگاہ ڈالنا ہی کافی ہوگا۔

برِصغیر پاک و ہند کی ادبی تاریخ خصوصاً اردو کے سرمایۂ سخن پر اک نظر کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس باب میں ابتدا ہی سے ایک نمایاں رُجحان مذہبی افکار اور روحانی احساسات کا رہا ہے۔ اس ضمن میں شعرا نے حمد، نعت، منقبت، سلام، نوحہ اور مرثیہ جیسی اصناف میں تو اظہار کیا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ غزل، نظم اور گیت تک میں بھی ہمیں مذہبی رُجحان کا اظہار فکر و فن کی اعلیٰ سطحوں پر اس انداز سے ملتا ہے کہ معنویت کے ابلاغ اور اظہار کے قرینے، ہر دو اعتبار سے مثال کے درجے میں رکھا جائے۔ سوچنا اور دیکھنا چاہیے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا اس لیے کہ اردو زبان و ادب پر اسلامی تہذیب و فکر کے اثرات شروع ہی سے غالب رہے ہیں؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ خود تہذیبِ ہند اپنے قدیم دور سے نمایاں طور پر ایک مذہبی تہذیب رہی ہے، لہٰذا اس خطے میں تشکیل و نمو کے عمل سے گزرنے والی نئی زبان (اردو اور اس کے ادب) نے اس اثر کو قبول کیا؟ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ ہندوستان میں اردو کی ترویج میں جن مقتدر حلقوں یا اشرافیہ کے طبقوں نے نمایاں کردار ادا کیا، ان میں اکثریت مسلمان تھی، اس لیے اردو زبان پر یہ اثرات ہوئے؟ اردو کے فروغ میں مسلمان علما اور صوفیہ کا بھی بے حد مؤثر کردار رہا ہے تو کیا یہ اثرات ان کی وجہ سے تو نہیں ہوئے؟ اس حوالے سے جب بھی غور کیا جائے تو یہ اور ایسے ہی کچھ اور سوالات توجہ طلب ہوتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے مطالعاتی دورے میں ایسے سوالوں کی اہمیت کا انحصار کئی ایک پہلوؤں پر ہے جو سیاسی، سماجی، اخلاقی، تہذیبی اور جغرافیائی عوامل سے تعلق رکھتے ہیں۔

سطورِ بالا میں جو سوالات اُٹھائے گئے، ممکن ہے کہ ان سب کا جواب اثبات میں ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس امر کا قیاس کہ ان میں سے کسی عنصر نے اُردو زبان و ادب کے مزاج کی اس تشکیل میں کس تناسب سے اثرات مرتب کیے، یہ تہذیب اور زبان کے محققین کی کارگزاری پر منحصر ہے، اور یہ ایک الگ نوعیت کا دقّت طلب کام ہے۔ تاہم اتنی بات تو ادب کا مجھ جیسا ادنیٰ طالبِ علم بھی قدرے ذمہ داری سے کہہ سکتا ہے کہ چاہے ان عناصر کا جو بھی اثر اردو کے مزاج پر رہا ہو، مگر یہ طے ہے کہ ان کے علاوہ بھی کوئی فیکٹر ہے جو اردو زبان کے اس مزاج کا موجب بنا ہے۔ اس لیے کہ زبانوں، تہذیبوں اور قوموں کے مزاج کی تشکیل کا عمل اتنا سادہ نہیں ہوتا کہ اس کو صرف خارجی عناصر کے ذریعے اس طرح دو جمع دو مساوی چار کے سادہ سے حسابی کلیّے سے سمجھ لیا جائے۔ اس کے برعکس ایسی تمام تشکیلات کے عمل کا سروکار بہ یک وقت کئی ایک عوامل سے ہوتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ان عوامل کے باہمی تفاعل کا تناسب بھی قدرے پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس کام میں کچھ داخلی عوامل بھی لازمی اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور بالعموم یہ داخلی عوامل زیادہ گہرے، دیرپا اور ماہیت ساز اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ ان عوامل میں

بالعموم کوئی ایک اساسی نوعیت کا ہوتا ہے اور وہ زبان اور تہذیب کے اظہاری سانچوں اور فکر و خیال کی ساختوں پر کچھ ویسا ہی اثر رکھتا ہے جیسا کسی عملِ کیمیا میں catalyst کا ہوتا ہے۔

سطورِ گزشتہ میں جس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا، وہ زبان و تہذیب کے سلسلے میں ایک عمومی سطح پر ضابطے کا درجہ رکھتا ہے۔ تاہم اب اگر خصوصیت کے ساتھ دیکھا جائے تو اردو زبان کا معاملہ ذرا مختلف یا منفرد نظر آتا ہے۔ اسے صرف ایک زبان سمجھنا کافی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر اس کا مطالعہ صرف ایک زبان کی حیثیت سے کیا جائے تو اس کے جملہ اوصاف اور خصائص کو اُن کی وسعت اور گہرائی میں مکمل طور سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ ہندوستان کے جغرافیائی تناظر میں اردو کی تشکیل اور نمو کا سارا عمل زبان کے ساتھ ساتھ دراصل ایک تہذیب کے ظہور اور اُس کی تعمیر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لیے اس زبان کے مزاج اور اسلوب کو سمجھنے کے لیے لابدی ہے کہ اُس تہذیب کے قوام کو دیکھا اور پرکھا جائے جو اس زبان کے ساتھ نمو پاتے ہوئے ثقافتی مظاہر کے مختلف اوضاع میں اپنے نقوش مرتب کر رہی تھی۔ یہ ہند اسلامی تہذیب ہے۔ اردو زبان اور ہند اسلامی تہذیب کو جامعیت کے ساتھ سمجھنے کے لیے ایک لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ دونوں کو بہ یک وقت پیشِ نظر رکھا جائے اور اُس اصولِ حیات کو فوکس کیا جائے جو زبان اور تہذیب دونوں کے لیے یکساں نمو پذیری کا باعث تھا۔ اس لیے کہ اس اصولِ حیات نے ایک طرف زبان کو وسعت بخشی تو دوسری طرف تہذیب کو صلابت عطا کی۔ خاطر نشان رہے کہ یہاں تہذیبی صلابت سے مراد سیاسی مقتدرہ کا استحکام نہیں ہے، بلکہ وہ قوتِ اظہار ہے جو عامتہ الناس کی زندگی اور ثقافتی مظاہر میں روحِ عصر کی صورت جلوہ نما رہی ہے اور جس کے ذریعے ہم برصغیر میں ایک نیا ادبی ڈسکورس قائم ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہی ڈسکورس اپنی سطح پر برصغیر کی تہذیبی زندگی کا ابلاغ کرتا ہے۔ ہندوستان کے جغرافیائی نقشے میں اردو زبان کا فروغ اور ہند اسلامی تہذیب کے نقوش کی جلوہ گری دونوں باہمی طور سے ایک عجب انداز کا توازن اور ہم آہنگی رکھتے ہوئے جو نظر آتے ہیں اُس کا بنیادی سبب یہی ہے☆۔

☆۔ یہاں ایک دل چسپ حوالہ پیشِ نظر ہے۔ راقم کا یہ مضمون تکمیلی مراحل میں تھا کہ ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا ایک کالم شائع ہوا جس میں انھوں نے امریکی مصنف ڈاکٹر بی کیو سلور (Dr. Brian Quelye Silver) کی کتاب The Noble Science of the Ghazal کا تفصیلی اور مطالعے کی تحریک دینے والے انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ یہ کتاب اصلاً غالب کی اردو شاعری کا مطالعہ و تجزیہ ہے، تاہم ڈاکٹر سلور نے اس کے ساتھ ساتھ اردو غزل اور ہند اسلامی تہذیب کے ضمن میں بھی بہت مفید اور فکر افروز گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہند اسلامی تہذیب کے مطالعے اور اس کی جامع تفہیم کے لیے اردو غزل کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ وہ اردو ثقافتی حسیت کا سب سے ارفع مظہر ہے۔

چناں چہ یہ جو اردو زبان میں ہم آغاز ہی سے دلوں تک پہنچنے کی تاثیر پاتے ہیں اور مذہب وملت کے ضابطے سے بالاتر ہو کر اہلیانِ ہند کو اس کی طرف کھنچتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس اثر آفرینی کا منبع کہیں اور ہے۔ اردو شعر و سخن کے سانچے اور ادبی قرینے اسی منبع سے منسلک ہونے کے باعث مستنیر نظر آتے ہیں۔ رنگ و روشنی کے اس ماخذ پر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اثرات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ عام آدمی کے احساس سے لے کر اہلِ فکر تک اور زندگی کے روزمرہ عناصر سے لے کر اعلیٰ ترین تہذیبی مظاہر تک اور سماجی آئین اور امورِ سلطنت سے لے کر ادب و ثقافت کے لطیف پیرایوں تک ہر ایک سطح پر یہ منبع اپنی روشنی پہنچاتا اور ہر درجے میں اپنا نقش قائم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ نقش ایسا گہرا اور اتنا پائیدار ہے کہ زمانے کے تغیرات اس کو متاثر کرتے ہیں اور نہ ہی سیاسی حالات کی تبدیلی اور اقتدار کے عروج و زوال کا نقشہ اس کے لیے کوئی معنی رکھتا ہے۔ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبی ابتلا اور سماجی ادبار کے زمانے میں افراد ہی نہیں، پورے معاشرے کے لیے یہ منبع عافیت اور تحفظ دینے والے اسمِ اعظم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح یہ منبع افراد اور سماج کی بقا اور شناخت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے کچھ اور گفتگو ہم ذرا آگے چل کر کریں گے جو دلیل اور مثال کا محل ہوگا۔

برصغیر کی گزشتہ تین سو سال سے زائد عرصے کو محیط تہذیبی تاریخ کا مطالعہ اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس زمانے میں ہمیں اس خطے میں جو بڑے بڑے تہذیبی مظاہر نظر آتے ہیں اُن کے پس منظر میں فکر و احساس کا وہی محرک کارفرما ملتا ہے جسے ہم اردو کے لسانی اور ادبی اوضاع کی تشکیل وتعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ محرک ہے اسلامی فکر کا زائیدہ طرزِ احساس— اور اس طرزِ احساس کا مبدا ہے عشقِ رسول ﷺ۔ ممکن ہے یہ خیال اور اس کے تحت اُٹھائے جانے والے سوالات اور اُبھرنے والے مباحث ایسے ہوں کہ جنھیں سیکولر ذہن رکھنے والے دوستوں کے لیے سمجھنا اور تسلیم کرنا ذرا دشوار ہو، لیکن یہ بات تمام تر ذمہ داری اور ہند اسلامی تہذیب کے جملہ ثقافتی و ادبی مظاہر کے فکری اثرات ہی نہیں، بلکہ امکانات تک کو پیشِ نظر رکھ کر کہی گئی ہے کہ اردو شعریات اور اس کی جمالیات کے پس منظر میں سیرتِ مطہرہ کی تفہیم اور عشقِ رسول ﷺ کا جذبہ بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یوں تو یہ بات قدرے وسیع تناظر میں پوری اردو تہذیب کے ضمن میں اصول کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا اطلاق اردو زبان و ادب ہی پر نہیں، بلکہ اس تہذیب کے زیرِ اثر فروغ پانے والے دوسرے فنون مثلاً مصوری، خطاطی اور فنِ تعمیر وغیرہم پر بھی من حیث المجموع ہوگا، لیکن اس وقت چوں کہ ہم بالخصوص بات کر رہے ہیں اپنی شعری روایت کی، لہٰذا حوالوں اور

مثالوں کے لیے ہماری توجہ اظہار کے اسی دائرے (یعنی شعری روایت) پر مرکوز رہے گی۔

توجہ اس طرف مرتکز رکھنے کا ایک سبب اور بھی ہے۔ یہ بات اس سے قبل بھی اشارتاً ہمارے اہلِ نقد کی طرف سے کہی گئی ہے کہ ہمارے ادب پر مذہبی جذبہ بہرحال اثر انداز ہوا ہے۔ اس ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف برصغیر کی تہذیب و معاشرت میں صوفیہ کے افکار، طرزِ محبت اور اسلوبِ حیات، رنگِ کلام اور وسیع المشربی کا حوالہ دیا جاتا ہے تو دوسری طرف مذہبی مدارس نے اس کام میں جو حصہ لیا ہے اور اردو زبان و ادب اور ان کے اسالیبِ اظہار کی وسعت اور اثر پذیری میں جو کردار ادا کیا ہے، اس کی طرف بھی واضح انداز سے اشارے ملتے ہیں۔ بالخصوص جن لوگوں نے تفسیرِ قرآن کے حوالے سے کام کیا ہے، اُن کے ہاں زبان نے کن امکانات کا اظہار کیا اور ابلاغ کی کن سطحوں تک رسائی پائی اور اظہار کے اس باب میں جو اسالیب وضع کیے گئے، وہ ہمارے ادب کے لیے کیا معنی رکھتے تھے، ان سب پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ اس ضمن میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا ایوب قادری اور مولانا عبدالحق قدوسی نے اپنی تحریروں اور کتابوں میں شرح و بسط کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ اِدھر محمد حسن عسکری نے تو صاف صاف لکھا ہے کہ ہمارے عہد میں اردو ادب اور اُس کی نثر نے جو اسالیب اختیار کیے ہیں، ان پر مولانا اشرف علی تھانوی کا نمایاں اثر ہے۔ اس ضمن میں ہمیں مزید حوالہ جات کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بحث ہماری گفتگو کے دائرے سے باہر ہے۔ بہرحال درجِ بالا حوالوں کی بنیاد پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے اہلِ علم وفکر نے اپنی زبان اور ادب پر مذہبی طرزِ احساس کے اثر کو نہ صرف محسوس کیا ہے، بلکہ علمی، تنقیدی اور تجزیاتی انداز سے اس کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔

اگرچہ اپنی شعری روایت کی بابت ایسے محاکے اور جائزے اس صراحت اور قطعیت کے ساتھ صاف انداز سے ہمیں دیکھنے کو نہیں ملتے، مگر اس ضمن میں بھی کسی نہ کسی سطح پر اس نوع کا ایک احساس بہرحال پایا جاتا ہے کہ مذہبی طرزِ احساس کے فروغ اور اثر پذیری کے عمل میں ہمارے شعرا نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے ایسے محاکے اور جائزے مرتب نہ ہونے کی ممکن ہے، وجہ یہ رہی ہو کہ ہمارے یہاں شعری جمالیات اور اسلوبیات کے مطالعے کا رُجحان بالعموم تنقید کے انھی اصولوں اور قواعد کی رُو سے کیا گیا ہے، جو مغرب سے درآمد ہوئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری جدید شاعری پر مغرب کے اسالیب کا جو اثر ہے، وہ تو اپنی جگہ، لیکن اس شاعری کے تنقیدی مطالعات کے بیشتر ضوابط بھی ہم نے ابتداً مغرب ہی سے لیے ہیں۔

تاہم اب اس ایک صدی سے زائد دورانیے کے سفر میں ہم نے شعریات اور تنقیدات دونوں ہی کے لیے اپنے فکر و نظر کا سرمایہ بہر حال اتنا بہم پہنچا لیا ہے کہ اپنے شعری اثاثے کو ہم اپنے انداز سے دیکھ کر اپنے تہذیبی تناظر میں پرکھ سکتے ہیں۔ چناں چہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اس معاملے کو حتمی طور پر سمجھ لیا جائے اور اس کا اظہار فیصلہ کن سطح پر کر دیا جائے کہ اردو کی شعری روایت کے بنیادی تصورات اور اسالیبِ بیاں پر مذہبی طرزِ احساس اور بالخصوص عشقِ رسول ﷺ کا عمیق اور بسیط اثر رہا ہے۔

اردو زبان و ادب کی ترویج، اس کی اثر آفرینی اور تہذیبی اظہارات کے اعلیٰ ترین درجوں میں اپنا نقش قائم کرنے والی عشقِ رسول ﷺ کی یہ روایت اس لحاظ سے بھی بے حد دل چسپ، معنی خیز اور فکر انگیز ہے کہ اس باب میں ہمیں جن شعرا کے نام ملتے ہیں وہ سب کے سب مسلمان نہیں ہیں، بلکہ اُن میں ہندو اور سکھ شعرا بھی نظر آتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ ایک طرف ہند اسلامی تہذیب کی اعلیٰ انسانی اقدار کی قوت کا اظہار ہے کہ جن کے اثر و نفوذ کا دائرہ اُن کی انسانی اپیل پر بنتا اور وسعت پاتا ہے۔ دوسری طرف یہ نکتہ اس تہذیب کے فروغ اور اصولِ نمو کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے کہ اس زبان اور اس کے ادب نے تعصّبات سے بالاتر ہو کر کس طرح انسانی دلوں تک رسائی حاصل کی۔ برصغیر کا سماجی منظر نامہ ماضیِ قدیم سے کثیر القومی اور کثیر المذہبی رہا ہے۔ ایسی صورت میں کسی ایک زبان اور کسی ایک تہذیب کے فروغ کی یہ صورت کہ اس میں مختلف قوموں اور جدا مذہبی شناخت رکھنے والے تخلیق کار یکساں ذوق اور جذبے کے ساتھ مصروفِ کار نظر آئیں، صرف اُسی وقت ممکن ہے جب اُس کے مرکز میں وہ جوہر کار فرما ہو، جو تمام عصبیتوں سے بالاتر ہو کر انسانی اقدار پر اصرار کرتا ہو اور انسانی کردار کی تشکیل کے لیے ایسا عملی نمونہ پیش کرتا ہو جس کی اپیل پوری قوت کے ساتھ جذب و انجذاب کے دوسرے تمام ضابطوں پر حاوی ہو کر دلوں تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ عشقِ رسول ﷺ کا یہ عنصر اردو زبان اور اس کی تہذیب کے فروغ میں غیر مسلم شعرا کے یہاں کس انداز سے اظہار پاتا ہے، اس کی ایک جھلک دیکھتے ہوئے ہم اپنی گفتگو کے اسی نکتے کو آگے بڑھائیں گے:

حمید و احمد و محمود تم ہو یا رسول اللہ
سعید و اسعد و مسعود تم ہو یا رسول اللہ
(راجا مکھن لال مکھنؔ)

عاشقِ زارِ محمد میں ہوا پیری میں
ہستیِ خضر سے کیا کم مری ہستی ہوگی

کچھ غرض جنت و دوزخ سے نہیں ہے ساؔقی
اُن کے مستوں کے لیے اور ہی بستی ہوگی
(منشی شنکر لال ساؔقی)

محمد ایک فرقے کے نہیں ہیں
محمد سب کے ہیں اور بالیقیں ہیں
ادبؔ لائے نہ کیوں ایمان ان پر
محمد رحمت اللعالمیں ہیں
(ادبؔ سیتاپوری)

حقیقت کی خبر دینے بشیر آیا، نذیر آیا
شہنشاہی نے جس کے پاؤں چومے وہ فقیر آیا
بھٹکتی خلق کو رستہ دکھانے رہنما آیا
سفینے کو تباہی سے بچانے ناخدا آیا
مبارک ہو زمانے کو ختم المرسلیں آیا
سحابِ رحم بن کر رحمت اللعالمیں آیا
(جگن ناتھ آزؔاد)

بہارِ ریاضِ ثنائے نبی نے
دہن کو مرے گل فشانی میں رکھا
(دلو رام کوثری)

کانِ عرب سے لعل نکل کر تاج بنا سرداروں کا
نام محمد اپنا رکھا، سلطان بنا سرکاروں کا
باندھ کے سر پر سبز عمامہ کاندھے پہ رکھ کر کالی کملی
ساری خدائی اپنی کر لی، مختار بنا مختاروں کا
(مہاراجا کشن پرشاد شاؔد)

کچھ کہے روس مگر میں تو یہی سمجھا ہوں
اے محمد ترے قدموں کے نشاں چاند میں ہیں
(کالکا پرشاد)

کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا
(ہری چند اختر)

تیری معراج کہ تو لوح و قلم تک پہنچا
میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا
(پنڈت نور بہار لکھنوی)

ہر تار میں پوشیدہ ہیں اسرارِ دو عالم
اللہ رے یہ وسعتِ دامانِ محمد
(سادھو رام آرزو سہارنپوری)

یہ مثالیں مشتے نمونہ از خروارے کہیے جو یہاں صرف اس غرض سے پیش کی گئی ہیں کہ قارئین کو اُس مقدمے کے دلائل فراہم ہو جائیں جو ہند اسلامی تہذیب اور اُس کے فروغ کی بابت اس مضمون کے آغاز میں قائم کیا گیا ہے۔ ان مثالوں کے لیے شعرا اور اشعار دونوں کے اخذ و انتخاب میں کسی گہری کدو کاوش کو دخل نہیں۔ اس لیے کہ منشا ان کے اندازِ نظر، اسلوبِ سخن یا مضامین پر بحث کا نہیں ہے، بلکہ صرف اس احساس کی ترجمانی مقصود ہے کہ عشقِ رسول ﷺ کا معاملہ اس تہذیب کے فروغ میں کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ انسان کے باطن کو نغمۂ سرمدی سے ہم آہنگ کرنے والے جذب و کیف کا ہوتا ہے۔ اس کی عقلی توجیہات ممکن نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ خارجی عوامل اور عقلی دلائل کی دوڑ جہاں پہنچ کر ختم ہوتی ہے، وہاں سے جذب کی اس کیفیت کا سفر آغاز ہوتا ہے۔ عشق اس کیفیت کا اعلیٰ درجہ ہے— اور عشقِ رسول ﷺ اعلیٰ ترین درجہ۔ اس راہ کے مسافر کی منزلیں قابلِ رشک بھی ہوتی ہیں اور احساس کی سطح پر قابلِ فہم بھی، مگر کسی مساوات یا کلیّے کے ذریعے اُن کے لیے کوئی عقلی جواز فراہم کیا جا سکتا ہے اور نہ تحلیل و تجزیہ ہی اس معاملے میں ایسا کچھ مفیدِ مطلب ہوتا ہے۔

برصغیر کے جغرافیائی تناظر میں ہند اسلامی تہذیب کی نمو اور فروغ کا یہ عمل جس طرح سماجی، سیاسی اور مذہبی اختلافات سے بالاتر ہو کر سامنے آتا ہے، وہ بجائے خود ایک جہانِ فکر و تدبر کی مثال ہے اور اس تہذیب میں عشقِ رسول ﷺ کا تو معاملہ ہی الگ ہے— ایک ایسا منفرد، دل کشا اور بصیرت افروز معاملہ کہ جس کی دوسری کوئی مثال تو رہی ایک طرف، محض ایسا کوئی کنایہ بھی تاریخ و تہذیبِ عالم کے باب میں ہمیں کہیں اور دکھائی تک نہیں دیتا۔ اس لیے کہ عشقِ رسول ﷺ

کا معاملہ بادی النظر میں اپنی ایک مذہبی اساس رکھتا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر کے سماج میں صرف مسلمان شعرا نہیں، بلکہ اُن کے ساتھ ہندو اور سکھ شعرا بھی اپنی طرز کے والہانہ پن کے ساتھ فکری اور تخلیقی سطح پر عشقِ رسول ﷺ کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے ہاں عشقِ رسول ﷺ کے inspiratiion کی بنیادیں کہاں اور کیسے قائم ہوئی تھیں؟ اس جذب و کیف کو ان کے یہاں اظہار کی سطح تک لانے میں کون سے نمایاں خارجی محرکات اس تہذیب کے سماجی دائرے میں کارفرما تھے؟ غیر مسلم شعرا کے اس رویّے نے اس عہد کی مخلوط معاشرت کو کیا پیغام دیا اور اس دور کے تہذیبی رویّوں کی صورت گری میں کیا کردار ادا کیا؟ یہ غور طلب سوالات ہیں اور ان کے جوابات سیاسی اور مذہبی تناظرات کو پیشِ نظر رکھے بغیر گہری معنویت کے حامل نہیں ہو سکتے۔ تاہم یہ بحث چوں کہ ہمارے موضوع سے علاقہ نہیں رکھتی، لہٰذا ہم اس کی تفصیلات سے احتراز کرتے ہوئے اس مسئلے کو محض شاعر کے احساس کی سطح پر دیکھتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔ یہاں جن ہندو اور سکھ شعرا کے اشعار نقل کیے گئے ہیں، اُن کو پڑھتے ہوئے یہ سمجھنے میں تأمل نہیں ہوتا کہ جس شاعر نے بھی نبیِ کریم ﷺ سے وابستگی کا اظہار کیا ہے، اُس نے آپ کی شخصیت کے ایک رُخ کو لازمی طور سے سامنے رکھا ہے اور وہ ہے آپ ﷺ کی محبوبیت کا رُخ۔ آپ کی ذاتِ گرامی کو باری تعالیٰ نے جب رحمت اللعالمین بنایا تو لازمی طور سے آپ کو جاذبیت کے اس جوہر سے نوازا کہ جس نے آپ کو تطہیرِ قلب کے ساتھ ایک بار دیکھ لیا یا سوچ لیا تو وہ کشش کے اس دائرے میں آئے بغیر نہ رہ سکا جو اُس کی روح کو متغیر کر دے — اور جو ایک بار اس کشش کے مرکز سے جُڑ گیا پھر اُس کے لیے ذہنی، سماجی اور ادبی کسی بھی سطح پر جذب و انجذاب کی اس کیفیت کے اظہار میں کوئی امر مانع نہیں رہا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا سبھی اشعار میں اسی کیفیت کا اظہار ہوا ہے۔

آیئے، اب ہم ایک بار پھر اپنی گفتگو کے اُس مرکزی نکتے کی طرف لوٹتے ہیں۔ عرض کیا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اپنے ادب و فکر کے تناظر میں اس معاملے کو حتمی طور پر سمجھ لیا جائے اور اس کا اظہار فیصلہ کن سطح پر کیا جائے کہ ہماری ادبی روایت اور خصوصاً شعری تہذیب کے بنیادی تصورات اور اسالیبِ بیاں پر عشقِ رسول ﷺ کا عمیق و بسیط اثر رہا ہے۔

ایک لمحے کے لیے اگر اس خیال کو دعویٰ باور کیا جائے تو دلیل کی فراہمی کا سوال ہوگا۔ اس لیے کہ دلیل کے بغیر دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس سے بھلا کیوں کر انکار ممکن ہے۔ سو آیئے آگے چلنے سے پہلے ذرا ایک نظر دلیل کے باب پر ڈالتے ہیں۔ اس دعوے کو مستحکم کرنے کے لیے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ حمد، نعت اور مرثیہ ایسی اصناف کو سامنے رکھا جائے اور اُن کے اوّلین

نقوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا جائے کہ فلاں زمانے سے اردو میں ان اصناف کی موجودگی سے ہمارے دعوے کو دلیل فراہم ہوتی ہے اور اس کا اثبات ہوتا ہے۔ تاہم ان اصناف کی طرف ہم کوئی اشارہ نہیں کریں گے، اس لیے کہ یہ تو یوں ہی مذہبی جذبے کے اظہار سے مخصوص اصناف، یعنی عیاں راچہ بیاں والا معاملہ ہے۔ سو ہم ان کے بجائے اُن اصناف کو دیکھتے ہیں جن کے بارے میں مذہبی احساس کا کوئی تاثر نہیں پایا جاتا، مثال کے طور پر مثنوی، قصیدہ، غزل اور نظم۔

مثنوی اور قصیدہ اپنے رومانی قصے اور شخصی اوصاف کے بیانیے سے موسوم ہیں، یعنی دونوں کا تعلق انسان کے اُن جذبات سے ہے جن پر مذہب کے اثرات بادی النظر میں نہیں ہوتے یا اگر ہوتے بھی ہیں تو اس درجہ کم کہ ان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ یوں یہ اصناف غیر مذہبی ہو جاتی ہیں۔ اب آپ مثنوی اور قصیدے دونوں کی روایت اور ان کے رنگِ سخن کا مطالعہ تاریخ کے تسلسل میں کیجیے تو یہ محسوس کرنے میں کچھ ایسا وقت صرف نہیں ہوگا کہ دونوں ہی اصناف میں کسی نہ کسی زیریں سطح پر ایک مذہبی طرزِ احساس بہرحال کارفرما ہے، جو شاعر کے یہاں کبھی آغازِ کلام میں اور کبھی اپنے کرداروں کی شخصیت سازی میں اور کبھی اُن کے ماجرے یا احوال کے بیان میں اس لحن کو پانے اور اختیار کرنے کی طرف مائل ہونے کا ثبوت دیتا ہے جو مذہبی احساس سے مخصوص ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جس کے بغیر اس لحن کی خواہش اور طرزِ فکر کا یہ انداز کسی بھی تخلیق کار کے یہاں ممکن ہی نہیں۔ اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچانے کے لیے اگر صرف یہ دیکھ لیا جائے کہ ہندوستان کے شعرا کے یہاں مثنویوں اور قصائد میں کیا ایسا کوئی نکتۂ فکر اُن کے فن میں کسی سطح پر مل سکتا ہے جو شاعر کے عقائد کی جانب اشارہ کرتا ہو تو دراصل وہ یہی نکتہ ہوگا۔

یوں اس بات سے انکار نہیں کہ اصلاً اپنی غایت میں ادب رنگ و نسل اور فکر و عقیدہ کی سرحدوں سے بھی اسی طرح بالاتر ہوتا ہے، جس طرح جغرافیائی سرحدوں سے، لیکن اس حقیقت کی شہادتوں سے بھی تاریخِ ادبیاتِ عالم بھری پڑی ہے کہ ادیب و شاعر کسی نہ کسی سطح پر اور کسی نہ کسی انداز سے اپنے عقائد سے وابستگی کا اظہار بہرطور کرتا ہے۔ تاہم اس نکتے پر بحث کی یہاں ضرورت نہیں، سو ہم اس اشارے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس کے لیے یونان، روم، مصر اور شمالی امریکا کے باشندوں کی قدیم شاعری سے لے کر گوئٹے، ملٹن، شیکسپیئر، ورجل، ایلیٹ اور رابرٹ فراسٹ تک کے شعری شاہکاروں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر اس بیان کی تصدیق کے لیے بہت آسانی سے دلائل اور ثبوت حاصل کیے سکتے ہیں۔ ہم اس گفتگو کو طوالت سے حتی الوسع بچانے کے لیے ضمنی مثالوں سے اجتناب کر رہے ہیں۔ یوں بھی زیرِ بحث نکتے کے حوالے سے اس وقت مقصود صرف

اس امر کی نشان دہی ہے کہ کسی ادیب و شاعر کا مذہب خواہ کچھ بھی ہو اور وہ اُس کی طرف کتنا ہی سرسری اور غیر عملی رویہ کیوں نہ رکھتا ہو، لیکن تخلیقی سطح پر وہ اُس کے طرزِ احساس پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ثبوت ہمیں برصغیر کے ان اردو شاعروں کے یہاں جنھوں نے مثنوی اور قصائد لکھے، کئی ایک سطحوں پر باآسانی اور نمایاں طور سے فراہم ہو جاتا ہے۔

اب رہی بات برصغیر کے اردو ادبی منظرنامے میں غزل اور نظم کی تو ان کے سلسلے میں بھی ایسی مثالیں اخذ کرنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آتی جن کے پس منظر میں سخن کا قرینہ اور ابلاغ کی سطح متعین کرنے میں صاف صاف کردار عشقِ رسول ﷺ کا نظر آتا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر کی غزل کا مصرع یا اُس کی نظم کی لائن، کوئی ٹکڑا، کوئی ترکیب، کوئی علامت، کوئی تلمیح یا کوئی استعارہ بہ سہولت و صراحت اُس ماخذ کی جانب اشارہ کرتا ہوا ملتا ہے، جہاں سے اُس کے اسلوب کی تہ داری اور معنی کی تابندگی مشتق ہے۔ ایسا صرف اُسی وقت ممکن ہے کہ جب شاعر نے کسی فکر یا عقیدے کو اپنے طرزِ احساس میں اس طرح ڈھال لیا ہو کہ وہ اس کے تحت الشعور میں سرایت کر جائے اور اُس کے رنگِ سخن میں معنویت کی ہر سطح اور اظہار کے ہر دائرے میں کسی اہتمام کے بغیر نظری طور سے، لیکن سراسر جذبے کی سطح پر بے ساختہ اپنا اثبات کرنے لگے۔ اظہار کی یہ سطح کسی فلسفے، نظریے یا عقیدے کے براہِ راست بیان سے متعلق نہیں ہوتی، بلکہ معنی کی اُس تہہ کے ساتھ ہوتی ہے جو احساس کے درجے میں ابلاغ کی راہ اختیار کرتی ہے۔ کسی تخلیق کار کے یہاں فکر و عقیدہ کے بیان کا یہ مرحلہ اُس وقت آتا ہے، جب وہ اُس کے ذہن اور اس کی نظر سے آگے بڑھ کر اُس کے خون کے ذرّات میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ شے ہے جسے ہم نے مذہبی طرزِ احساس کہا ہے۔ ہند اسلامی تہذیب میں یہ مذہبی طرزِ احساس بدیہی طور پر عشقِ رسول ﷺ کی صورت میں شعر و سخن کا حصہ بنی ہے اور اسی لیے اس نے غیر مسلم شعرا کے یہاں بھی اظہار کی راہ پائی ہے۔

اس مقام پر ایک لمحے کے لیے رُک کر ہمیں ایک اور نکتے پر غور کرنا ہے۔ دُنیا کی تمام وہ تہذیبیں جنھوں نے اپنے منفرد نقوش اور اسالیبِ اظہار کے ذریعے اپنی شناخت قائم کی، جب ادب کے میدان میں ان کی کارگزاری کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے تاریخی سفر میں ادب کی چاہے جتنی بھی اصناف کو اظہارِ ہنر اور تخلیقی وفور کے لیے بروئے کار لایا گیا ہو، لیکن ہر بڑی تہذیب کا مزاج، اُس کی فکر کے جملہ اساسی نکات اور اُس کے اظہار کا تمام تر جذبہ بنیادی طور سے ادب کی کسی ایک صنف سے موسوم رہا ہے۔ چناں چہ وہ صنف اُس سماج کی تہذیبی و ثقافتی اقدار سے لے کر مابعد الطبیعیاتی نظامِ فکر تک تمام اوصاف کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

اُس تہذیب کے مادی اور ارضی مظاہر سے لے کر اُس کے روحانی اور جمالیاتی امکانات تک کا دائرہ اسی صنف میں ظہور کرتا ہے اور اپنے انفرادی احساس کی تفہیم اور اجتماعی خوابوں کی تعبیر پاتا ہے۔ اس طرح افرادِ معاشرہ کے خوابوں سے لے کر اجتماعی آدرشوں اور تہذیبی امنگوں تک ایک طرف اُس صنف کے ابلاغ کی مختلف سطحیں قائم ہوتی ہیں تو دوسری طرف اُس کی فکری جہات اور ثقافتی اقدار کی معنویت کے مختلف دائرے بھی وضع ہوتے ہیں۔ یہی دائرے دراصل اس تہذیب کی دبازت، قوتِ نمو اور اس کی اجتماعی تخلیقی سکت کا نقشہ ترتیب دیتے ہیں۔ اور پھر یہی یہ نقشہ آگے چل کر تاریخ کے زندہ حوالوں کی صورت میں جریدۂ عالم پر اُس تہذیب کے نقش کو قائم اور تابندہ رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو برصغیر کی تہذیب (بالخصوص جسے ہم ہند اسلامی تہذیب کا نام دیتے ہیں) کا اظہار ہمارے ادب کی جس صنف میں بہ تمام وکمال ہوا، وہ ہے غزل۔

اس مرحلے پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ہندی سماج غزل کے پہنچنے سے پہلے اپنا ادبی اظہار بڑے امکانات کے ساتھ گیت اور رزمیہ کے اسالیب میں کر چکا تھا تو پھر غزل کو اس مقام پر کیوں کر فائز کیا جا سکتا ہے؟ یہ عامتہ الناس کی ذہنی سطح کا ایک اہم سوال ہے۔ اس لیے اس سے اغماز نہیں برتنا چاہیے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غزل کو اس مقام پر نہ صرف فائز کیا جا سکتا ہے، بلکہ یہ کام لازمی طور سے کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے ہی ہمیں اصل میں برصغیر کی تاریخی، سیاسی اور فکری قلبِ ماہیت کو سمجھنے کا سب سے اہم زاویہ فراہم ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد اس خطۂ ارض کی تاریخ وتہذیب کی drastic transformation کا اعلامیہ ہے تو اس فکری اور قدری تبدیلی کو ہم ادب کی سطح پر تاریخ کے اس دورانیے میں غزل کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ اور اس کی طرف مائل ہوتے ہوئے روز افزوں عوامی مزاج کے تناسب کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں۔ عوامی ذوق کی تشکیل اور تبدیلی کا عمل سیاسی تغیرات کی تباہ کن رفتار کے زیرِ اثر آہستہ رو چاہے اس قدر نہ رہا ہو، لیکن پھر بھی اس کی بنیادیں کسی تہذیب کے اعماق میں ہمیشہ بہت گہری ہوتی ہیں۔ ذوق کی تشکیل یا تبدل کا یہ عمل جب ایک بار واقع ہو جاتا ہے تو پھر اس تہذیب کی روحانی اور جمالیاتی قدروں کے جملہ امکانات ایک فطری اور ناگزیر ضابطے کے تحت از خود اُس صنف سے وابستہ ہو جاتے ہیں جو انھیں بروئے کار لانے کی سکت رکھتی ہے۔ برصغیر کے جغرافیائی نقشے کی حدوں میں غزل کے تہذیبی صنف بننے کا عمل دراصل خود ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس واقعے کی ماہیت پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پس منظر میں اصولِ نمو اور قوتِ اظہار کا وہی رنگ اور وہی جذبہ برسرِ کار ہے جسے اپنے شہرۂ آفاق مقدمے میں ابنِ خلدون نے تہذیب کا اصولِ نمو

قرار دیا ہے۔ ابنِ خلدون نے یہ بحث کسی تہذیب کے اثبات و استحکام کے ذیل میں عصبیت کے عنوان سے کی ہے اور تاریخ کے حوالے سے اس لفظ کے معنی بدل کر رکھ دیے ہیں۔

اردو کی ادبی اصناف میں غزل چوں کہ تہذیبی صنف کا درجہ رکھتی ہے چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی ہیئت، اس کا ڈھانچا، اس کے لوازم اور اس کے عناصر — سب کے سب اپنی اپنی سطح پر اور اپنے اپنے انداز سے اس کی حیثیت کا جواز قائم کرنے میں اپنا ایک کردار ادا کرتے ہیں۔ حیثیت کے یہ سارے جواز اُن milky tracks کی طرح ہیں جو نظامِ شمسی کے ہر سیّارے کے لیے اپنے مقام پر ہوتے ہوئے اُس کی گردش کو قائم رکھنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور اس پورے نظام کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہ غزل کی مابعد الطبیعیات کو بیان کرنے کا محل نہیں، محض یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس صنفِ اظہار نے اپنی ساخت اور ہیئت سے لے کر معنویت کی متنوع سطحوں تک اپنی تہذیبی حیثیت پر اصرار ہی نہیں کیا، بلکہ اس کا اثبات بھی پوری جواز جوئی کے ساتھ کیا ہے۔ اس کی بلاغت اور معنویت کا اعلیٰ ترین اظہار اُن اشعار میں ہوتا ہے جو عامتہ الناس سے لے کر اہلِ دانش و فن اور اہلِ فکر و بصیرت تک الگ الگ درجوں میں اثر آفرینی کا نقش قائم کرتے ہیں۔ یوں غزل کا ایک شعر عوامی سطح پر حیاتِ انسانی کی مادی جہت اور تجربے کی عمومیت سے اپنے معنی بیان کرتا ہے تو دوسری طرف یہی شعر اہلِ نظر کے لیے حقیقتِ اولیٰ کے کسی رُخ کو واضح کرتا ہے یا اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے معنی کی گہری تہ کو آشکار کرتا ہے۔ یہ الگ الگ سطحوں کی تفہیم سماج کے مختلف طبقاتِ خیال کو بہ یک وقت غزل کے اشعار سے حظ اُٹھانے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ علاوہ ازیں غزل کی برصغیر میں وسیع دائرے کی حامل اثر آفرینی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہمیں عوام و خواص کے حافظے میں محفوظ ہو جانے اور موقع بہ موقع استعمال ہونے والے غزل کے اشعار سے بھی ملتا ہے۔

سطورِ گزشتہ میں اس مضمون کی تمہید یا مقدمہ قائم کرتے ہوئے عرض کیا گیا تھا کہ ہمارے شعری اُفق پر جذبہ و فکر کی جو کہکشاں ضوفشاں دکھائی دیتی ہے، اُس میں سب سے نمایاں رنگ مذہبی طرزِ احساس کا زائیدہ ہے — اور ہمارے مذہبی طرزِ احساس کی تشکیل میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے عشقِ رسول ﷺ نے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو کیا ہماری غزل کی روایت اپنے عمومی اظہارات میں، یعنی مذہبی طرزِ احساس کے بغیر بھی عشقِ رسول ﷺ کی جہت کو اُجاگر کرتی ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کرتی ہے تو اس اظہار اور بیان کی سطح کیا بنتی ہے؟ کیا ایسا کوئی شعر جس میں یہ احساس اور یہ جذبہ نمایاں ہوتا ہے، بعد ازاں مذہبی شعر بن جاتا ہے یا پھر یہ اظہار اس شعر میں اضافی قدر کی حیثیت رکھتا ہے؟ اس ضمن میں تیسرا سوال بھی اہم اور بہت غور

طلب ہے اور وہ یہ کہ شعر میں اس جذبے کا اظہار کیا شاعر باضابطہ فکر کے ساتھ اور دانستہ یعنی شعوری سطح پر کرتا ہے یا تہذیبی لاشعور اس فکر کو اُس کے فن میں راہ دیتا ہے؟

ان سوالات پر گفتگو کرنے سے پہلے ایک حوالے کی طرف اشارہ کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی نے اپنے ایک مضمون ''غزل میں نعت کی جلوہ گری'' میں بعض نکات پر اچھی گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے کچھ ذاتی یا شخصی تاثرات کو پورے تنقیدی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے فیض صاحب کا جو واقعہ بیان کیا ہے، وہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ شاعر (فیض) کے انفرادی احساس کے ساتھ ساتھ اس پر اجتماعی تہذیبی رویے کے اثرات کے پہلو کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

اب آیئے مذکورہ بالا سوالوں کی جانب۔ پہلا سوال کہ غزل کی روایت اپنے عمومی اظہارات میں بھی عشقِ رسول ﷺ کو اُجاگر کرتی ہے، کا جواب یہ ہے کہ لازمی طور سے کرتی ہے، اور اسی اظہار سے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ عشقِ رسول ﷺ ہمارے تہذیبی و ثقافتی اوضاع کے لیے قوتِ نمو کا درجہ رکھتا ہے اور ہمارے اجتماعی طرزِ احساس کی تشکیل میں ایک مؤثر قوت کے طور پر شامل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہماری شعری روایت میں اُسے اظہارات کی یہ نوعیت اور کیفیت حاصل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرا سوال کہ اگر غزل عمومی اظہارات میں عشقِ رسول ﷺ کو بیان کرتی ہے تو اس کی سطح کیا بنتی ہے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ایسے تہذیبی احساسات اصولی طور سے یا تو فکر و فن کی اعلیٰ تر سطح پر معرضِ اظہار میں آتے ہیں یا پھر بالکل ہی بیان نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ انھیں اظہار کا موقع میسّر ہی اُس وقت آتا ہے جب وہ مجاز سے حقیقت تک کے تمام درجات میں ابلاغ کے حامل ہوتے ہیں اور قاری کی ذہنی سطح اور ذوق کے مطابق اُس پر اپنے معنی کی جہت کو عیاں کرتے ہیں۔ ان میں فکر و احساس خفتہ حالت میں تو نہیں ہوتے، لیکن ان کی نمود قاری کے لیے بہر حال مکاشفے کی صورت رکھتی ہے، یعنی وہ اُن کو پانے یا ان تک پہنچنے کا اہل ہے تو وہ معنی اس پر کھلیں گے ورنہ نہیں۔

تیسرا سوال یہ کہ آیا شاعر اس جذبے کا اظہار فکر کی صورت اور شعور کے ساتھ کرتا ہے یا تہذیبی لاشعور اسے اظہار کی راہ دکھاتا ہے؟ اس سلسلے میں اقوامِ عالم کے ادبِ عالیہ سے ہمیں ایک اصول فراہم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس نوع کا عمیق جذبہ اجتماعی تہذیبی آدرش کی حیثیت رکھتا ہے — اور وہ کسی تہذیب کے اُن بڑے شاعروں کے یہاں بھی راہ پاتا ہے جو فکری و نظری اعتبار سے شخصی

حیثیت میں اُس کے حامل نہیں ہوتے یا اس کی سہار نہیں رکھتے۔ چناں چہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کا ذہنی رویہ اور شخصی شعور بھی بے شک اہم ہوتا ہے، لیکن عشقِ رسول ﷺ کو بیان کرتے ہوئے وہ اپنی انفرادی فیکلٹی سے زیادہ اپنے تہذیبی لاشعور اور ثقافتی وجدان کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ چناں چہ ہم اس جذبے کو اُن شاعروں کے یہاں بھی راہ پاتے ہوئے دیکھتے ہیں جو مذہبی جھکاؤ نہیں رکھتے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں ایک تعداد ایسے شاعروں کی ہوتی ہے جو دراصل اپنی تخلیقی شناخت میں مذہبی حوالے سے بالالتزام گریزاں ہوتے ہیں۔ بنابریں اس بات کو ہمیں اصول کے طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اردو غزل نے عشقِ رسول ﷺ کا جب جب اور جس جس قرینے سے اظہار کیا ہے، اس میں شاعر کے شخصی رُجحان سے کہیں زیادہ ہمارے تہذیبی رُجحان نے اس کی کفالت کی ہے، لہٰذا یہ دراصل ہمارے اجتماعی لاشعور اور تہذیبی داعیے کا ظہور و اثبات ہے۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ غزل کا ایسا شعر کہتے ہوئے شاعر کو معلوم تک نہ ہو کہ وہ نعت کی سرحد میں داخل ہو رہا ہے، اور بعد میں وہ خود یا اُس کا کوئی قاری اس حقیقت کو شعور کی حدِ ادراک پر دریافت کرے۔ بہت زیادہ مثالوں کی تو گنجائش نہیں، لیکن چند ایک مثالیں اس حوالے سے بہر حال پیش کی جاتی ہیں، تا کہ اس نکتے کی وضاحت اور اس مؤقف کو مستحکم کیا جا سکے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
(میر)

میر کے یہاں انسانی عظمت کا یہ اظہار بار بار ملتا ہے۔ غور کیا جائے تو اس تفاخر کے احساس کے پس منظر میں نسبت کا اعزاز کارفرما نظر آتا ہے۔ میر کی شاعری میں بیان کی قدرت و لطافت کو ملحوظ رکھا جائے تو ایسے اشعار میں نسبت کے تفاخر کو سمجھنا دشوار نہیں۔ عام طور سے توجہ دینے والوں نے میر کے یہاں خودسری اور تنک مزاجی پر تو نگاہ کی ہے، لیکن اس کی انسانی قدر کے اصرار کے اس زاویے پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اب میر کے ان دو اشعار میں دیکھیے کہ محبوبیت کے بیان میں نعت کا قرینہ کس طرح اُبھرتا ہے:

آنکھ اُس سے نہیں اُٹھنے کی صاحب نظروں کی
جس خاک پہ ہوگا اثر اس کی کفِ پا کا
(میر)

نقشِ قدم سے اُس کے، گلشن کی طرح ڈالی
گردِ رہ اُس کی لے کر سروِ رواں بنایا
(میر)

اب غالب کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

ان اشعار میں بھی جس مدحت و محبت کا اظہار ہوا ہے، وہ کسی تاخیر کے بغیر اور بے ساختہ طور سے ذہن کو آپ ﷺ کی طرف لے جاتی ہے۔ غزل کے ان اشعار کو غالب نے تجمل حسین خاں سے منسوب کیا ہے، لیکن لطفِ سخن اور جذب و شوق کا عنصر انھیں کسی اور بڑی بارگاہ سے منسوب کرتا ہے۔ ابوالخیر کشفی نے بالکل ٹھیک کہا ہے ان شعروں کی بابت کہ بے چارے تجمل حسین خاں ان کا مصداق کب ہو سکتے تھے، اسی لیے ہمارا اجتماعی ذوقِ شعری ان کو حضور علیہ السلام کی خدمت میں لے آیا۔ حضورِ اکرم ﷺ سے محبت کے ساتھ ساتھ اس عمل میں ہماری ادبی تہذیب کے لیے سماجی دائرے میں پائی جانے والی سطحِ ادراک کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مصحفی کا یہ شعر دیکھیے:

خوب رُو دیکھے ہزاروں گرچہ اپنی عمر میں
آج تک ہم نے و لے تجھ سا نہ دیکھا آدمی

یہ شعر محبوبِ مجازی سے لے کر سرکارِ دو عالم ﷺ کے درجۂ اولیٰ تک معنی کی مختلف سطحیں رکھتا ہے۔ تاہم یہ صرف شاعر کے اندازِ بیاں کی داد نہیں ہے، بلکہ اس عمل میں قاری کے تربیت یافتہ ذوق اور اس کی بالیدہ تہذیبی نظر کی شرکت سے ہی یہ شعر اپنی معنویت کے اعلیٰ درجے پر پہنچ کر الگ انداز سے کھلتا ہے۔ مصحفی کا ایک اور شعر دیکھیے:

لوح و قلم و کرسی و عرش اور یہ افلاک
اونچے ہیں، پہ ہیں قوتِ ادراک کے نیچے

یہاں قوتِ ادراک کے بیان میں انسان کو ودیعت کی گئی اسی اہلیت اور استعداد کی طرف اشارہ ہے، جس کی بنا پر اسے اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے۔ یہ شعر کی عام فہم سطح کے معنی ہیں، لیکن اگر

اس نکتے کو معراج سے جوڑ کر دیکھا جائے تو بات اور انداز سے واضح ہوتی ہے۔ معراج کی معنویت کے فہم کا ایک رُخ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ انسانی قوتِ ادراک کے لیے تحریک کا سامان رکھتا ہے۔ اس زاویے کو پیشِ نظر رکھا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ واقعہ انسانی قوتِ ادراک کے لیے غور و فکر اور ایمان و یقین کے کیسے در وا کر رہا ہے۔ یہ تو ہوئی ایک عام مسلمان کے لیے ذہنی سطح پر اس واقعے کی معنویت۔ اب اس پہلو سے سوچا جائے کہ خود نبیِ کریم ﷺ کے لیے اس وجودی تجربے کی نوعیت کیا رہی ہوگی اور آپ ﷺ کی نسبت سے پوری اُمت کے لیے شرف کا یہ کیسا مقام ہے؟ اس نسبت کو دیکھیے اقبال نے کس طرح دیکھا اور سمجھا ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰی سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردُوں

دراصل یہی وہ معنویتِ معراج ہے جس کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اقبال کے یہاں تو غزل کے رواں دواں پیرایے اور ایسے صاف لب و لہجے میں نعت کے شعر آتے ہیں کہ شاعری سعادت کے اعلیٰ ترین درجے پر نظر آتی ہے:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

اقبال کے یہ اشعار ''بالِ جبریل'' کے حصہ دوم کی تیسری غزل میں ملتے ہیں۔ غزل اپنے رنگ اور مزاج کے مطابق چلتے چلتے اچانک اس کیفیت اور جذبے کے بیان پر آ جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری میں عشقِ رسول ﷺ ایک سیلِ رواں کی صورت رکھتا ہے اور وہ نعت کے جذب و کیف کو اپنے عمومی شعری اسلوب سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ نعتیہ جذب و کیف نے ایک طرف حالی کی اصلاحی اور مقصدی شاعری کا لہجہ اور اس کی راہ متعین کی ہے تو دوسری طرف اقبال کے فکر و نظر کی بالیدگی اور رنگِ سخن کی تشکیل میں بھی بنیادی کردار دراصل اسی عشقِ رسول ﷺ کا ہے، تو یہ اعترافِ امر اردو شاعری کے دو جداگانہ نوعیت کے دھاروں کو ایک مشترک فکری بنیاد فراہم کر کے اُن کے باہمی ربط اور اس کے تحت ہونے والی معنوی توسیع کو سمجھنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہاں یہ پہلو بھی غور طلب اور فکر افروز ہے کہ حالی نے ہماری شعری روایت میں ایک بنائے تازہ رکھی ہے اور اقبال نے اس تہذیب کے پورے نظامِ فکر کو

حسی پیکروں کی صورت قابلِ فہم بنا دیا ہے اور اظہار کا وہ قرینہ عطا کیا ہے کہ جو اپنی مثال آپ ہے—اور فکر و خیال کی یہ ساری دولتِ بے بہا ان دونوں شاعروں کو عشقِ رسول ﷺ سے بہم پہنچی۔
مضمون کی ضخامت کو جس قدر ممکن ہو، کم رکھنے کے لیے ہم چند ایک اساتذہ کی مثالوں کے بعد براہِ راست اپنے معاصر شعری منظرنامے یعنی بیس ویں صدی کے شعری سرمایے سے رجوع کرتے ہیں اور خالص غزل کی روایت میں نعتیہ رُجحان کی ایک جھلک دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں:

سیہ کار تھے با صفا ہوگئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہوگئے ہم
(حسرت)

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِ کریم ہے تو تری رہ گزر میں ہے
(فیض)

دلوں کو مرکزِ اسرار کر گئی جو نگہ
اُسی نگہ کی گدائی کا وقت ہے کہ نہیں
(عزیز حامد مدنی)

فروغِ اسمِ محمد ہو بستیوں میں منیرؔ
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو
(منیر نیازی)

یہ کون سوچ پہن کر گیا ہے سوئے فلک
کہ جس کا چاند پہ نقشِ قدم سا لگتا ہے
(شیر افضل جعفری)

بہار ہو کہ خزاں کار گاہِ ہستی میں
انھیں کسی سے غرض کیا جو تیرے ہو جائیں
(صہبا اختر)

مسافرانِ جنوں گرد ہوگئے لیکن
کھلا نہیں کہ تری رہ گزر کہاں تک ہے
(سلیم کوثر)

اضطرابِ خاکِ امجد میں کہیں رہتا ہے وہ
کائناتِ روحِ احمد میں کہیں رہتا ہے وہ
(اجمل نیازی)

اب تک کی گفتگو کو دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف اس مبحث کے سیاق و سباق فراہم کر لیے گئے ہیں، بلکہ صغریٰ و کبریٰ بھی طے ہو گئے۔ چناں چہ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے کہ جب نعت اور اردو کی شعری تہذیب (بحوالۂ خصوصی غزل) کے باہمی رشتے، اس کی نوعیت اور اثرات کے جائزے کے لیے ہمیں ایک الگ تناظر فراہم ہوگیا ہے۔ یہ تناظر اردو زبان، شاعری اور اُس کی تہذیبی اقدار اور اظہار کے سانچوں کو نئے رُخ سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہاں ہماری شاعری ہمارے تہذیبی وجود کا مکاشفہ بن جاتی ہے — ایک ایسا مکاشفہ جو افراد سے لے کر تہذیب تک ہر درجۂ احساس کو بے سمتی اور لایعنیت سے پاک کر دیتا ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا کہ جس تک ہمیں پہنچنا تھا، لہٰذا اب اس بحث کو سمیٹنے کا مرحلہ آ گیا ہے۔ چناں چہ گفتگو کے اس مقام پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہماری شعری روایت نے براہِ راست نعت میں جذبہ و فکر کے جن رنگوں کو سمیٹا ہے، وہ معاصر اسلوب میں کس طرح ظہور کرتے ہیں۔

عشقِ رسول ﷺ ایک مسلمان کی زندگی کا سراسر نجی مگر بے حد اہم معاملہ ہے۔ اس معاملے کی اہمیت کا انحصار اس امر پر نہیں کہ وہ مسلمان اپنے عقائد کے عملی رویوں پر کس حد تک کاربند ہے، بلکہ ایمان و یقین کے اس نکتے پر ہے کہ حُبِ رسول ﷺ کے بغیر اُس کے عقائد اس درجہ ناقص ہیں کہ باقی اعمال کی توفیق اور بجا آوری کے باوجود وہ کامل ایمان والا مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سراسر نجی معاملہ ہونے کے باوجود عشقِ رسول ﷺ کا اثبات و اظہار فرد کی ذاتی زندگی سے لے کر اُس کے سماجی اور تہذیبی وجود تک شعور کی ہر ممکنہ سطح پر ہوتا ہے۔ اسلام کی چودہ سو سال سے زائد عرصے کو محیط تاریخ پر ایک اجمالی نگاہ ڈال کر بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب، تہذیب، سیاست، قومیت اور دینی حمیّت کے جس میدان نے بھی اہلِ اسلام سے جب جب عشقِ رسول ﷺ کی گواہی طلب کی تو ادنیٰ سے ادنیٰ سطح پر سماجی اور اعمال کے معاملے میں برائے نام مذہبی زندگی گزارنے والے مسلمان نے بھی دامے درمے قدمے سخنے جی جان سے اس شہادت کو اپنے لیے اعزاز جانا۔ شاتمینِ رسول کی ذلت کا باب ماضی کے اوراق سے عصرِ حاضر کے تناظر تک جو نقشہ پیش کرتا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال ادب، تہذیب اور مذہب تینوں حوالوں سے تاریخِ عالم کے کسی باب میں اس طرح نہیں ملتی۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ

آخر ایسا کیا معاملہ ہے جو اس رویے اور جذبے کے اظہار کی بنیاد بنتا ہے؟ ہم اسے رسول اللہ ﷺ کے لیے مسلمانوں کا جذبۂ محبت بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم یہ جواب ناکافی ہوگا۔ اس لیے کہ حبِ رسول ﷺ کا اظہار تاریخِ اسلام نے محض عام آدمی کے یہاں ریکارڈ نہیں کیا، بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اذہان اور معاشرے کے اہم سنجیدہ شعبوں سے وابستہ افراد کے یہاں بھی اس کا وفور اسی سطح پر دیکھا گیا ہے۔ باور کیا جانا چاہیے کہ یہ جذبہ تو ہے ہی، لیکن اس کے سوا بھی کچھ ہے جو معاشرے کے مختلف طبقات میں یکساں کیفیت کے ساتھ اس ضمن میں جاذبیت اور وارفتگی کی بنیاد بنتا ہے— اور وہ ہے سیرتِ مطہرہ کی صورت اُبھرنے والا انسانی کردار۔ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

انا بشر مثلکم

(میں تمھاری ہی طرح کا انسان ہوں۔)

یہ بیان فکر انگیز ہے۔ قرآنِ کریم میں ہبوطِ آدم کا واقعہ، فرشتوں کا آدم کو سجدہ، آدم کی فضیلت اور انسانیت کے فوز و فلاح کے لیے انبیائے کرام علیہم اجمعین کی ضرورت سے لے کر خاتم النبیین ﷺ کی منزلت تک کے حقائق پر غور کیا جائے تو اس بیان کی معنویت کا انکشاف ہوتا ہے۔ نبوت کے باب کی تکمیل کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ باری تعالیٰ نے نبوت کا باب بند کر دیا اور اب رہتی دُنیا تک کوئی نبی نہیں آئے گا، یہ بات تو اپنی جگہ حقیقت ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خاتم النبیین کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اس صورت میں نبوت کو مثال کے اس درجے تک لایا گیا ہے کہ اس کے بعد کسی دوسرے نبی کی گنجائش یا ضرورت ہی نہیں رہے گی، یعنی نبوت کی تکمیل سے مراد نبوت کے کردار کا بلند ترین اظہار ہے، یعنی اس کردار کی معراج۔ چناں چہ ختمِ نبوت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ انسانی فوز و فلاح کے کام کو وہ حتمی صورت دے دی گئی اور اُس نکتۂ کمال تک پہنچا دیا گیا کہ اس منصبِ جلیلہ کی تکمیل ہوگئی۔ نبوت کا کردار اپنی اعلیٰ ترین صورت میں منصۂ شہود پر آ گیا، لہٰذا اس کے بعد کسی اور اظہار کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ یہاں فطری طور پر انسانی ذہن سوچتا ہے کہ پھر تو اس کردار کی بہت نزاکتیں ہوں گی اور اس کے راستے کو ایک عام آدمی کے لیے اختیار کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوگا۔ نہیں، ایسا نہیں ہے، بلکہ اسی خیال کو رد کرنے کے لیے باری تعالیٰ نے نبیِ کریم ﷺ کی زبانِ مبارکہ سے یہ بات کہلوائی کہ میں تم ہی جیسا ہوں، یعنی تم میرا راستہ آسانی سے اختیار کر سکتے ہو۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان کی زندگی میں کردار کا سب سے بڑا آئیڈیل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اپنی جگہ بڑی چیز ہے اور اس کے ساتھ ایک اور بڑی چیز اس آئیڈیل کے اتباع کی شدید آرزو ہے۔

یوں ایک عام مسلمان کا رسول اللہ ﷺ سے رشتہ دراصل انسانی رشتے کی معراج بن جاتا ہے۔ چناں چہ اس ضمن میں وہ عام آدمی بھی فعال کردار اور حساس رویے کے ساتھ سامنے آتا ہے، جس کے روزمرہ معمولات میں عملی مذہبی زندگی کا رُجحان کم کم دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں عام آدمی سے لے کر اہلِ نظر اور اہلِ فلسفہ ہی نہیں، بلکہ قلندروں اور خاص طور پر ملامتی فرقے اور ترک کی منزل کے صوفیہ تک کے یہاں ذاتِ الٰہیہ کے سلسلے میں تو بے احتیاطی یا بے نیازی دیکھی گئی ہے یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیکھی جاسکتی ہے، لیکن کیا مجال جو آپ کو محض نام کا ایک مسلمان بھی حرمتِ رسول ﷺ کے معاملے میں غافل یا بے لحاظ مل جائے۔ اصل میں:

باخدا دیوانہ باش و بامحمد ہوشیار

کے طرزِ احساس کا یہ معاملہ عجیب و غریب ہے۔ اور اس کی بنیاد وہی ہے، جس کی طرف سطورِ گزشتہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ چناں چہ اس کی توجیہات کا قصہ بھی عجب اور قدرے طولانی ہے۔ اس طوالت میں ایک طرف عقائد اور شریعت کے تقاضوں کا بیان ہے تو دوسری طرف اہلِ دانش کی نکتہ رس شرح اور اس کے ساتھ ساتھ شیوۂ وابستگی کی وہ تفہیم بھی جو ایک عام آدمی اپنے احساس کی سطح پر کرتا ہے۔ بالاختصار بس یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر مسلمان کا دل اُس گھر کے مانند ہے جس میں عشقِ رسول ﷺ کی روشنی کا سارا اہتمام قادرِ مطلق نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا ہے — اور اس طور سے رکھا ہے کہ ابدالآباد تک کے لیے دلوں کو اس اُجالے سے آباد کیا ہے۔ یہ اسی بیان کی تصدیق ہے جو ہمیں قرآن میں ملتا ہے جب خالق اپنے محبوب سے کہتا ہے:

ورفعنا لک ذکرک

(اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔)

اس نکتے پر گھڑی بھر رُک کر غور کیا جائے تو گواہی کا یہ معاملہ بھی واضح ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تفہیم کا یہ زاویہ بھی عقلِ انسانی کو میسر آتا ہے کہ باری تعالیٰ نے رسولِ کریم ﷺ کے ذکر کو بلند کرنے کا جو ارشاد فرمایا تو ہم دیکھتے ہیں کہ بلندی کی اس صورت میں عملاً وقت کی عمودی اور اُفقی دونوں جہتوں کو سمیٹ کر رکھ دیا۔ عمودی جہت سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ذکر کو اس طرح پھیلایا کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ جس کو ہم اس درجہ مذکور پاتے ہوں۔ اُدھر دوسری طرف یعنی اُفقی جہت سے دیکھیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر صدیوں سے اس طرح ہو رہا ہے کہ جیسے قرونِ اولیٰ میں ہوا ہوگا۔ گویا ذکر کی اس بلندی کو سمجھنے کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمودی جہت زمینوں کا اور افقی جہت زمانوں کا احاطہ کرتی ہے۔ چناں چہ ذکر

کی بلندی کے معانی کی نمود قدرتِ الٰہیہ کا تو بے شک اظہار ہے ہی، لیکن ذرا غور کیجیے کہ اس کے ذریعے ذہنِ انسانی کو ختمِ نبوت کا فہم اور اور مقامِ ختم النبیین کی بصیرت کس درجۂ اطلاق میں ودیعت کی جا رہی ہے۔ اللہ اکبر۔ کوئی ٹھکانا ہے محبوب کی منزلت کے اظہار اور پذیرائی کے اسرار کا۔ ذرا دیکھیے صبیح رحمانی کی نعت کا یہ سادہ سا مصرع یہاں عشقِ رسول ﷺ کو کن معنوں بیان کر رہا ہے:

کوئی مثل مصطفیٰ کا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

یہاں 'مثل' کے معنی فی الاصل نبیِ کریم ﷺ کے ذکر کی بلندی کے ہیں، یعنی ایسی بلندی کے جس سے نبوت کی یگانگت کا درجہ متعین ہوا۔

اب یہیں قرآنِ کریم کے اس بیان پر بھی ذرا توجہ دیجیے۔ باری تعالیٰ نے ارشادفرمایا:

وما ارسلنک الا رحمتہ اللہ العالمین

(اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔)

اللہ غنی! یہ خالقِ ارض و سما کی رحمتِ فراواں کا اظہار ہے کہ جس زمانے اور جس جہان میں محبوب ﷺ کو مبعوث فرمایا، بعثت کی رحمت و برکت کو اس تک محدود و مرتکز نہیں کیا، بلکہ علیٰ حالہ اس نعمت کی تعمیم کر دی۔ یوں انسانیت کو دائمی طور سے شرف کے گھر سے منسوب کر دیا۔ انسان کے اس دُنیا میں اشرف المخلوقات ہونے کا جواز واضح ہوا اور اُس کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا مفہوم سمجھ میں آیا۔ معلوم ہوا کہ اس کارخانۂ رنگ و بو اور نگار خانۂ فکر و عمل میں انسان ہونے سے مراد کیا ہے اور انسانیت کی قدر و منزلت کیا ہے۔ یوں انسانی زندگی میں خیر کی نعمت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مستقل کر دیا گیا۔ اُس کے حال کو مستقبل کی تہ در تہ وسعتوں تک پھیلا دیا گیا:

آپ ﷺ اُن کے لیے بھی رحمت ہیں
جو زمانے ابھی نہیں آئے

(حنیف اسعدی)

رحمت کی اس نوید سے حیاتِ انسانی کو وہ مفہوم میسر آتا ہے جو اُس کے خلیفہ فی الارض ہونے کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔ جود و سخا اور عطا و کرم کا یہ معاملہ اہلِ دانش نے اپنے انداز سے سمجھا ہے اور اہلِ فکر و بصیرت نے اپنے طریقے سے۔ اسے اپنی سطحِ ادراک سے علما نے بھی سمجھا اور بیان کیا ہے اور اہلِ فقہ و شریعت نے بھی۔ حال و قال والے صوفیہ نے بھی اس کا فہم اپنے کشف و عرفان سے پایا۔ تاہم ہماری شعری تہذیب کی روایت بتاتی ہے کہ ہمارے شعرا نے اس کا ادراک جس سطح اور جس انداز سے کیا، وہ کچھ انھی کا حصہ ہے۔ انھی کا حصہ اس لیے ہے کہ اُن کے ادراک و اظہار

میں فکر کے ساتھ جس طرح جذبے کی سطح قائم ہوتی ہے، وہ جاذبیت کا اپنا ایک الگ پہلو رکھتی ہے اور اس کی اثر آفرینی کا دائرہ بھی الگ ہوتا ہے۔ عشقِ رسول ﷺ میں وارفتگی کے رنگ اردو نعت نے کس طرح پیش کیے ہیں، اس کی وضاحت کے لیے ایک مضمون تو کیا ایک ضخیم کتاب بھی ناکافی ہے۔ اس لیے کہ یہاں ایک گل کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ نگارِ ہزار شیوہ کو بہ درجۂ شوق اور بہ رنگِ کمال معرضِ بیاں تک لانے کی آرزو نعت کے شاعر کی زندگی کا مقصد اور اُس کے فن کی معراج ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں سیرت و کردار کا بیان نعت بن گیا ہے تو کہیں آپ ﷺ کی تعلیمات کے بیان نے نعت کا پیرایہ اختیار کرلیا ہے اور کہیں کسی آیتِ قرآنی اور حدیث کے ٹکڑے سے نعت کا مضمون وضع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی حقائق اور اجتماعی تہذیبی احساس کے رنگوں سے بھی نعت کا بیانیہ آراستہ کیا گیا ہے۔ اس سے نعت کی معنوی وسعت کا ہی اندازہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ اس باب میں جذبۂ اظہار کی فراوانی کا بھی پتا چلتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

اُس کا پیامِ اُنس و مواخات، روحِ دیں
اس کا نظامِ عدل و مساوات، جانِ خیر
(حفیظ تائب)

اُسی کا عکس ہیں سارے جہاں کی تہذیبیں
کہاں نہیں ہے ضیائے محمدِ عربی ﷺ
(صبا اکبرآبادی)

جاں تری سر بسر جمال، دیں ترا آئنہ مثال
تجھ کو ترے عدو نے بھی دیکھا تو ہوگیا ترا
(احمد ندیم قاسمی)

شبِ زندگی کو سحر کرنے والے
ہر اک دور کی روشنی نام تیرا
عدالت، امانت، دیانت میں یکتا
حیات، آشتی، راستی نام تیرا
(ضمیر جعفری)

شوکتِ شاہانِ عالم اُس فقیری پر نثار
جس فقیری کو نبی کا آستاں بخشا گیا
(اقبال عظیم)

انسانیت کو اوجِ شرف ہے تمھاری راہ
رحمت تمھارا ذکر ، عبادت تمھارا نام
(سجاد باقر رضوی)

وہ جو حیراں ہے معراج کیا راز تھا ، طے ہوا کس طرح وقت کا فاصلہ
تیرے اقبال کی کیا خبر ہو اسے ، جو حرا میں محبت کی اُترا نہیں
(عرش صدیقی)

لمحے لمحے کی مٹھی میں جگنو ترے
ہر زمانے کی مشعل زمانہ ترا
(مظفر وارثی)

بس ایک آپ ﷺ کا دربار ہے پناہِ جہاں
بس ایک آپ ﷺ کا دربار خاص و عام کا ہے
(حافظ لدھیانوی)

تُو سطوتِ شاہاں کے لیے تیغِ مکافات
تُو مونس و ہم درد ہر اک جانِ حزیں کا
(ظہیر کاشمیری)

سب جہانوں میں اُسی نام کا جلتا ہے چراغ
سب جہانوں کا انھیں ہادی و رہبر لکھوں
(کلیم عثمانی)

میں جتنا بھی لکھتا ہوں شانِ نبی میں
یہ محسوس ہوتا ہے کم لکھ رہا ہوں
(اعجاز رحمانی)

سمو لے خود میں گر اُس خُلقِ کامل کے اُجالوں کو
تو دامانِ تمدن دامنِ زرتار ہو جائے
(اسلم انصاری)

وہ دشمنوں کو بھی اپنے نوازتے ہیں مگر
عدوِ حق کے لیے خنجر و سناں بھی وہی
(پیرزادہ قاسم)

اُسی سے اخذ کرو دشمنوں سے حسنِ سلوک
سزا کی بات نہیں، درگزر کی بات کرو
(پروین جاوید)

آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ایک مسلمان کے لیے ہر عمل اور ہر نکتۂ فکر کا بنیادی حوالہ اور معنویت کا وہ سرچشمہ ہے کہ نکتہ رسی کے سارے سوتے یہیں سے نکلتے ہیں یا پھر یہیں آ کے ملتے ہیں۔ چناں چہ نعت کے مضامین میں زماں کا حوالہ ہو یا مکاں کا، حرکت و تغیر کا نکتہ ہو یا سکون و ثبات کا یا پھر وصل و فصل کا سوال — ہر مضمون کی گہرائی اور ہر خیال کی وسعت دراصل آپ ﷺ سے شاعر کے جذبۂ دل کی وابستگی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ مطالعاتِ نعت میں یہ نکتہ کھلتا ہے کہ یہاں فلسفے میں دھڑکن سما جاتی ہے اور دل کی دھڑکن میں دقیق فلسفہ گونج اٹھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ محل ہی وہ ہے کہ جہاں دل و نظر ہی کی نہیں علم و فلسفہ کی بھی کایا پلٹ جاتی ہے۔ یہاں سکوت کلام سے بڑھ جاتا ہے اور اذن مل جائے تو کلام معجزہ ہو جاتا ہے:

پڑھو درود تو ہوتا ہے یہ خیال کہ اب
حجابِ فاصلۂ وقت اٹھنے والا ہے
(امید فاضلی)

اصل سے وصل کا احساس ہوا ہے کیا کیا
غیر کوئی نہیں، ہر شخص یہاں اپنا ہے
(شبنم رومانی)

ہر ایک سمت سے آتی ہے تیری ہی خوش بو
ہر اک زمانہ، زمانہ ترے جمال کا ہے
(شہزاد احمد)

دربار و محافل کو بھی ہو تجھ پہ سدا رشک
اے غارِ حرا کیا تجھے تنہائی ملی ہے
(سحر انصاری)

جنت ہے اُن کے قرب میں انجم کہ آدمی
ہے جتنا اُن سے دُور ہے اتنا عذاب میں
(انجم رومانی)

بابِ حرم پہ ہے کہیں لمس مرے بھی ہاتھ کا
فرشِ حرم پہ ہے کہیں میری جبیں کا بھی نشاں
(یاسمین حمید)

رحمتِ ربِّ دوعالم بھی ترا سرِّ وجود
تُو جدھر جائے اُدھر ابر کا سایہ دیکھوں
(امین راحت چغتائی)

ادا ہوا ہے نہ ہوگا حضور ﷺ قرضِ ثنا
تمام عمر چکاتی رہے اُدھار حیات
(سجاد سخن)

جو اہلِ فلسفہ کی عقل کی سرحد سے باہر تھا
عرب کے ایک اُمّی نے عیاں وہ راز فرمایا
(خالد بزمی)

سفر میں وقت کی رفتار رہ گئی پیچھے
ورائے عقل و گماں ہیں مسافتیں تیری
(انور جمال)

عزمِ سفر جو طیبہ کا ہو، نکلیں وقت سے ہم آگے
دل آنکھوں سے آگے، آنکھیں دل سے ایک قدم آگے
(حسن اکبر کمال)

اس میں کلام نہیں کہ عالمی ادب نے مذہبی فکر کے جو نقش ابھارے ہیں ان میں مذہبی تعلیمات سے اور اُن تعلیمات کے حامل پیغام بروں سے عقیدت کے جذبات کا اظہار بھی نمایاں

طور سے ہوا ہے، خاص طور سے اطراف کی تہذیبوں اور زمانوں میں یہودیت، عیسائیت، ہندومت اور سکھ مذہب کے ماننے والوں کے یہاں اس احساس کو صاف طور سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر مذہبی فکر کے تخلیق کاروں نے یہ کام اپنی استعداد اور جذبے کی فراوانی کے مطابق کیا ہے، لیکن تمام تر معروضیت کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کی نوعیت اور کیفیت ہی مختلف نظر آتی ہے، جسے ہم اردو شعر وسخن میں عشقِ رسول ﷺ کے سلسلے میں ابھرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ اُسی صداقت کا ثبوت ہے جس کی بابت ہم اس سے قبل ورفعنا لک ذکرک کے ذیل میں گفتگو کر آئے ہیں۔ اس ضمن میں یہ قابلِ لحاظ بات اپنی جگہ کہ جس کثرت سے ہماری شاعری نے آپ ﷺ کا ذکر کیا ہے، دُنیا کی کسی دوسری زبان کی شاعری میں ایسا اور اتنا ذکر کسی دوسری شخصیت کا کہیں نہیں ہوا۔ بایں ہمہ اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ ذکر جس والہانہ پن، وارفتگی اور وفورِ شوق کے ساتھ ہوا ہے، اُس کی کوئی مثال دُنیا کے شعر وسخن میں ہمیں نہیں ملتی۔ اس ضمن میں یہ نکتہ بھی بہت اہم ہے کہ اس وارفتگی اور وفور میں وابستگی کے قرینے اور معنی آفرینی کے پہلو تخلیق کار کی نظر سے ہرگز اوجھل نہیں ہوتے۔ ذرا یہ اشعار دیکھیے:

کوئی بھی جستجو ہو کوئی لگن
ذوقِ منزل وہیں سے ملتا ہے
(محشر بدایونی)

یہ اور راستے ہیں حدی خواں سنبھل کے چل
طیبہ کا ذرّہ ذرّہ مجھے دل دکھائی دے
(ادا جعفری)

کہاں ہو گر نہ ہو اس جا ہجومِ آرزو منداں
ہے اُس کا آستانہ قبلہ سارے آستانوں کا
(عبدالعزیز خالد)

نگاہ دیکھ کہ ہے رُو بہ رُو دیارِ جمال
ہے ذرّہ ذرّہ یہاں آفتاب، کیا دیکھوں
(عاصی کرنالی)

کاش یہ میری جبیں اور نقشِ پائے مصطفٰی
صرف روزِ حشر تک ہوجائیں ساکن ساتھ ساتھ
(ماجد خلیل)

تو سائبان کی صورت محیط عالم پر
کرن کرن کی ترے سامنے طناب کھلے
(محسن احسان)

یہ کس کی سمت پے بہ پے رواں دواں ہیں ساعتیں
یہ کس کے پائے بوس کا ہے اشتیاق دیکھنا
(جعفر بلوچ)

نظر میں رکھتا ہوں یوں بھی تری مثالوں کو
ترا ہی عکس سمجھتا ہوں میں اجالوں کو
(عزیز احسن)

ذکرِ نبی ﷺ سے چشم ہی روشن نہیں فقط
دل کا یہ آئنہ بھی کدورت سے دُور ہے
(شوکت عابد)

آپ کی رہ کے ذرّے ہیں شمس و قمر
گردشِ روز و شب نامہ بر آپ ﷺ کی
(محسن نقوی)

خاکِ صحرا بنی کہکشاں آپ ﷺ سے
یہ زمیں ہوگئی آسماں آپ ﷺ سے
(عنبریں حسیب عنبر)

عشقِ رسول کے اظہار میں والہانہ پن، وارفتگی، دل بستگی، وابستگی اور وفور کے ساتھ ایک قرینہ اس دولتِ بیدار پر ناز آفرینی کا بھی ہے۔ نسبت کا اعزاز اہلِ دل اور اہلِ صفا کے لیے کیسی ناز پرور شے رہی ہے، اس کا اندازہ صحیح معنوں میں اُسی وقت ہوسکتا ہے، جب اس اظہار کے مختلف شیڈز نظر میں ہوں۔ اس لیے کہ یہ معاملہ، کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے، والا ہے۔ اس بزمِ فخر و انبساط میں ہر ناز پرور کی اپنی ایک کیفیت ہے اور اس کے بیان کا اپنا ہی ایک قرینہ بھی۔ دیکھا جائے تو کہیں یہ

ادب و محبت کی معراج ہے تو کہیں حرفِ طمانیت و تشکر کے اظہار کا ذریعہ، کہیں سرشاری ہے تو کہیں شوق کی وسعت و بیداری کا احساس، اس میں کہیں جذبے کی فراوانی کلام پر مائل ہے تو کہیں پرحدِ ادب کا لحاظ خاموشی پر مصر، کہیں یہ نسبت انوکھا خواب ہے اور کہیں اس سے عقدۂ دل کھلتا ہے۔ اس کیفیتِ دیدہ و دل کے کچھ رنگوں کی جھلمل ملاحظہ کیجیے:

ترے ہی فیض سے ممتاز تھے جہاں بھر میں
جنوں شعار ترے صاحبِ خرد تیرے
(عارف عبدالمتین)

گماں تھے ایسے کہ آثار تک یقیں کے نہ تھے
حضور آپ نہ ہوتے تو ہم کہیں کے نہ تھے
(حنیف اسعدی)

تری عقدہ کشائی سے کھلے عقدے سبھی دل کے
ہوئیں سب مشکلیں آساں تری مشکل کشائی سے
(جمال پانی پتی)

اُس پیکرِ جمال کی پرچھائیں بھی جمال
اُس روشنی کے پیڑ کا سایہ بھی روشنی
(بیدل حیدری)

جسے چاہا در پہ بلا لیا، جسے چاہا اپنا بنا لیا
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے
(منوّر بدایونی)

طلوعِ اسمِ محمد ﷺ فقط نظارہ نہیں
ہماری صبحِ شرف کا کوئی کنارہ نہیں
(مشکور حسین یاد)

درود اُن پہ پڑھا اور سعادتیں پائیں
ہٹا گیا مرے سینے سے سب غبار درود
(خاطر غزنوی)

شان اُن کی سوچیے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے
(خورشید رضوی)

اُویسی نسبتیں دُوری میں بھی سرشار رکھتی ہیں
کہیں پر بھی رہیں سرکار کی خدمت میں رہتے ہیں
(ریاض مجید)

کتنی صبحیں ظہور کرتا ہے
جاگنا رات بھر مدینے میں
(عطاء الحق قاسمی)

ہم بھی آپ کی امت ہیں، ہم بھی آپ سے بیعت ہیں
اس خوش اقبالی پر اتنا کم ہے جتنا ناز کریں
(تحسین فراقی)

آنکھوں میں اُتر آئے کوئی خواب کا منظر
اور خواب بھی ایسا کہ نہ دیکھا نہ سنا ہو
(عباس رضوی)

مجھے اذن دے یہ عقیدتیں میں جبینِ دہر پہ لکھ سکوں
تری روشنی میں سفر کریں سبھی قافلے مہ و سال کے
(محمد فیروز شاہ)

حضوری کی تمنّا، حاضری کی خواہش، اپنی فردِ حیات پر ندامت کا احساس، خود احتسابی کا رویّہ، دُنیا میں دست گیری اور آخرت میں شفاعت کی آرزو کے مضامین نعت کی روایت میں آغاز ہی سے ملتے ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اہلِ نظر نے احساس کے ان رنگوں کو اردو سے قبل عربی اور فارسی شاعری کی نعتیہ روایت میں بھی دیکھا ہے۔ اردو نعت میں کیفیتِ دل کے یہ پہلو دورِ اوّل سے چلے آتے ہیں اور اب تک کسی نہ کسی صورت مضامینِ نعت میں اظہار کی راہ پاتے رہتے ہیں— لیکن توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ عشقِ رسول ﷺ میں دھڑکتے دلوں کا یہ آہنگ اب بھی جب کسی گہرے باطنی تجربے کی صورت میں ابھرتا ہے تو ایک الگ طرح کی اُمنگ اور ایک انوکھی ترنگ کو جگاتا چلا جاتا ہے۔ چناں چہ قاری محسوس کرتا ہے کہ بات سامنے کی ہے اور سنی ہوئی بھی ہے، لیکن

ہر نئے اظہار میں شاعر کی وارفتگی نے اسے پہلے انفرادی کیفیت کے طور پر نکھارا اور پھر تہذیب کے اجتماعی مافی الضمیر کے اعلامیے میں منقلب کر کے پیش کر دیا۔ نعت کا یہ قرینہ اپنی ہی ایک دل کشی اور اپنا ہی ایک اثر رکھتا ہے۔ ذرا دیکھیے:

نخلِ صحرا کی طرح خشک ہوں ، وہ ابرِ کرم
مجھ پہ برسے تو مجھے برگ و ثمر مل جائے
(سلیم احمد)

ایک ہی اشکِ ندامت ہے بہت
بس اسی زادِ سفر سے چلیے
(تابش دہلوی)

نئے لہجے میں بہ صد عجز و ندامت لکھوں
صرف اشکوں کی زباں میں تری مدحت لکھوں
(سرشار صدیقی)

کام بھی کوئی اُس طرح کا ظفرؔ
نام تو لے لیا محمد ﷺ کا
(ظفر اقبال)

نکل رہی ہے پھر اک بار حاضری کی سبیل
سو کچھ دنوں سے دل اپنی ہوا میں رہتا ہے
(افتخار عارف)

اے سیّدِ سادات عنایت کی نظر ہو
یہ عہدِ ہوس ڈوب چلا ظلمتِ شر میں
در پیش ہے بے سمت مسافت کی اذیّت
اس دور کا انسان ہے دانش کے بھنور میں
(انور مسعود)

اسی دہلیز پہ بیٹھا رہے میرا بڑھاپا
انھیں کوچوں میں گزرے میرے بچوں کی جوانی
(محمد اظہار الحق)

جو مدینے کے سفر میں کھو گیا
اس مسافر کا پتا ہی اور ہے
(شاہدہ حسن)

حضور آپ جو سن لیں تو بات بن جائے
حضور آپ جو کہہ دیں تو کام ہوجائے
(صبیح رحمانی)

اوراقِ گزشتہ میں ایک مقام پر عرض کیا تھا کہ نعت کا مطالعہ کسی بھی موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر یا کسی بھی عنوان کے تحت کیا جائے، اسے جامعیت کے ساتھ ایک مضمون میں تو کیا، پوری کتاب کی ضخامت میں بھی سمیٹ لینا آسان نہیں۔ کم سے کم راقم الحروف تو تجربے کی صداقتوں کے ساتھ اسی احساس سے دوچار ہے۔ خیر، سچ پوچھیے تو یہ وہم اس مضمون کے آغاز میں بھی دل کو نہیں تھا کہ مدحتِ رسول کے کسی نکتے کو اس تحریر میں بہ تمام و کمال پیش کردیا جائے گا۔ محض ایک بات ذہن میں تھی کہ ہماری ادبی و شعری تہذیب نے عشقِ رسول ﷺ کے مبدا سے جو فیض پایا اور جو اثر قبول کیا ہے، اسے سادہ لفظوں میں جس طور ممکن ہو بیان کیا جائے — حقیقت یہ ہے کہ اس مرحلے پر آکر بیان کرنے کی بات بھی سراسر دعویٰ معلوم ہورہی ہے۔ اس لیے کہ یہ کام اپنے برتے پر بھلا کیوں کر ہوسکتا ہے۔ یہ تو اصل میں توفیقِ ایزدی کا معاملہ ہے کہ ایک خیال، ایک بات دل میں آگئی اور پھر اپنے تئیں اُس کو سمجھنے اور قابلِ فہم بنانے کی کوشش نے اس مضمون کی صورت اختیار کرلی۔ یہ بابِ کرم ہے سو اس کی جانب نگاہ کا اٹھ جانا ہی فیض یابی کا آغاز ثابت ہوتا ہے۔ یہ مضمون اسی حقیقت کا ثبوت ہے۔

اس امر کا اظہار بھی چند در چند وجوہ کی بنا پر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس مضمون میں جن نکات اور مباحث پر توجہ دی گئی، وہ اپنی بہتر تفہیم کے لیے اس سے کہیں زیادہ شرح و بسط کے ساتھ مطالعے کے متقاضی ہیں۔ یہاں تو صرف اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ مضمون تفصیل کے دفتر کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی طرح جن شعرا کے اشعار حوالے کے طور پر درج کیے گئے، ان کے علاوہ بھی کتنے ہی اہم نام ایسے ہوسکتے ہیں جو یہاں درج ہونے سے رہ گئے ہوں گے، لیکن جن کے یہاں نعت کی روشنی اُن کے ذاتی سرمایۂ تخلیق ہی کو منور نہ کرتی ہوگی، بلکہ ہمارے شعر و ادب کی روایت میں بھی دور تک اُجالے بکھیرتی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ کائنات کی وسعتوں کو ایک گفتگو میں سمیٹنا اتنا دشوار نہیں، جتنا نعت کے موضوع، اُس کی لطافت، نکتہ آفرینی،

اُس کے جمالیاتی پیرایے، اسالیبِ اظہار، جذبہ و فکر کے امتزاج، بیان کی تہ داری، لہجے، قرینے، وسعت اور معنویت کے رنگوں کو بہ یک وقت ابلاغ کے دائرے میں لانا۔ یہی سبب ہے کہ اس موضوع کے نکتہ ور اور اہلِ کمال بار بار اپنی نارسی اور عجز کے احساس سے دوچار ہوتے ہیں۔ راقم الحروف کو اپنے محدودات کا بہ خوبی اندازہ ہے۔ تاہم سعیِ مشکور تو بڑی چیز ہے، اس باب میں اظہار کی ادنیٰ سی کاوش بھی لائقِ افتخار اعزاز سے کم نہیں۔

آخر میں بس یہ عرض کرنا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تہذیب کا سب سے بلیغ، مؤثر اور ارفع سطح پر اظہار غزل کے اسلوب میں ہوا ہے۔ عشق، وابستگی، جذب و شوق، سرشاری، مہجوری، نسبت، افتخار، انبساط، ذوقِ بیاں، عرضِ حال — غزل کے جتنے قرینے ہیں، انھیں مجاز کی سطح سے اٹھا کر حقیقت کے درجے میں دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ غزل اور نعت میں عجب امتزاج اور ارتباط پایا جاتا ہے۔ عشقِ رسول ﷺ کی ہماری تہذیب کے اس کنایے (غزل) پر ایسی چھوٹ پڑتی ہے کہ احساس کے منطقے اور اظہار کے خطّے دور تک مہکتے اور جگمگاتے محسوس ہوتے ہیں۔ غزل نے مجاز (کے باب میں جذباتی کیفیات) کا اور نعت نے حقیقت (کے باب میں روحانی احساسات) کا جس طرح احاطہ کیا ہے، وہ دونوں کی اپنی اپنی کامیابی کا ثبوت تو ہے ہی، لیکن ساتھ ہی اس تہذیب کا اختصاص بھی ہے کہ جو اپنے افراد کی زندگی میں فکر و احساس کے دونوں رُخ منور رکھتی ہے۔ غزل نے ہمارے دل کی دھڑکنوں کو گنا ہے تو نعت نے ہماری روح کے وجد آفریں نغمے سے انھیں ہم آہنگ کیا ہے۔ اس لیے کہ عشقِ رسول ﷺ ہمارے دل کی آواز اور ہماری روح کی پکار ہے۔ اسی صدا کا اُجالا ہماری تہذیب، زبان، ادب، سماج، فکر اور دل کے سارے گوشوں کو منور رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

نعت — کچھ روایتی اور کچھ غیر روایتی معروضات

نعت کا بنیادی موضوع، نبی پاک ﷺ کی عظیم المرتبت ذات والا صفات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعت کی صنفی شناخت بہ لحاظِ موضوع ہے، بہ لحاظِ ہیئت نہیں۔ یہیں نعت ادبی نقادوں کے لیے ایک بڑا چیلنج بنتی ہے۔ یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ جو اصناف اپنی ہیئت کی بنا پر پہچانی جاتی ہیں، وہ تخلیق کار کو موضوع لے کر، اسلوب و تکنیک کے انتخاب کی آزادی دیتی ہیں۔ واضح رہے کہ اس آزادی کے بغیر کوئی شخص مبلغ تو ہوسکتا ہے، تخلیق کار نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ آزادی ان اصناف میں بھی ہے جو متعین موضوعاتی شناخت رکھتی ہیں؟ اس سوال کا دائرہ اگرچہ نعت کے علاوہ، حمد، منقبت، شہر آشوب وغیرہ تک پھیلا ہوا ہے، مگر ہم اسے فی الوقت نعت تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔نعت کے اکثر نقاد اس سوال سے بچنا چاہتے ہیں، اور اس تصور میں پناہ لیتے ہیں کہ نعت ادب سے ماورا ایک مختلف قسم کا اور ممتاز اظہار ہے۔ اسی بنا وہ نعت کے لیے تنقید کو روا نہیں سمجھتے۔ اگر آپ نعت کا مطالعہ محض ایک مذہبی متن کے طور پر کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس کے ضمن میں کوئی بھی فنی، جمالیاتی، تنقیدی بحث بلا جواز محسوس ہوگی، لیکن اگر آپ اسے ادبی، فنی تخلیق قرار دیتے ہیں اور اس پر گفتگو کے لیے روایتی تنقید یا نئ تھیوری کی اصطلاحات استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تو پھر مذکورہ سوال پر تأمل ضروری ہے۔ ہماری رائے میں دونوں طرح کی اصناف (ہیئت یا موضوع کی بنیاد پر تشکیل پانے والی) میں آزادی ممکن ہے، مثلاً مخصوص ہیئت کی حامل اصناف جیسے غزل، مثنوی، آزاد نظم اور نثری نظم میں موضوعاتی تنوع کی آزادی ہے۔ جب کہ موضوعاتی اصناف میں ہیئت کے انتخاب کی آزادی ہے۔ اس آزادی کا خالص جمالیاتی مفہوم یا مضمرات اس وقت زیادہ واضح ہوتے ہیں، جب ہم ہیئت و موضوع کے پیچیدہ تعلق پر دھیان کرتے ہیں۔ تفصیل میں گئے بغیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ موضوع اور ہیئت کا رشتہ، ہم آہنگی کی تلاش کی آرزو سے عبارت ہے،

اور ہم آہنگی کی آرزو وہیں ہوتی ہے جہاں ثنویت اور فاصلہ موجود ہے۔ چناں چہ ایک ہی موضوع جب مختلف ہیئتوں میں ظاہر ہوتا ہے تو اس میں ہم آہنگی کی کوشش بھی نئے نئے طریقوں سے ہوتی ہے۔ نئی ہیئتوں اور موضوع و ہیئت میں ایک نئی سطح پر ہم آہنگی کی سعی کی بنا پر موضوعاتی یکسانیت کا جبر قائم نہیں ہو پاتا۔ علاوہ ازیں جہاں تک نعت کا تعلق ہے، اس کا موضوع، دیگر موضوعاتی اصناف کے موضوع سے مختلف ہے۔ نبی پاک ﷺ کی ذات و صفات، سیرت و عمل خود اپنے اندر غیر معمولی تنوع رکھتے ہیں۔ گویا صنفِ نعت کی یک موضوعی خصوصیت، ذات و صفاتِ نبی ﷺ کے تنوع سے، ڈی کنسرکٹ ہو جاتی ہے، اور اسی کے دوران میں نعت گو بہ طورِ تخلیق کار وہ آزادی حاصل کر لیتا ہے جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا ہے۔

تسلیم کہ ادبی تنقید اس بنیادی مفروضے کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتی کہ ادب، ایک انسانی اور ثقافتی سرگرمی ہے، لہٰذا اس کے مطالعے کے لیے وہ سب طریقے جائز ہیں، جو انسان کی ذہنی اور ثقافتی دنیا کی تفہیم و تعبیر کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ نعت کا محرک عام طور پر دو قسم کے جذبات ہیں: عقیدت اور عشق۔ ان دونوں کا محور ایک عظیم المرتبت ذاتِ گرامی ﷺ ہے، لیکن یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ دونوں جذبات انسانی دل میں موج زن ہوتے ہیں، اور اسی زبان میں ظاہر ہوتے ہیں جسے عام روزمرہ دنیا سے لے کر شعری اظہار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ نعتیہ شاعری کی زبان غزل و نظم کی زبان سے مختلف ہو سکتی ہے، مگر یہ انھی شاعرانہ وسائل کو بہ روے کار لاتی ہے، جو دیگر شعری اصناف سے مخصوص ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بالواسطہ طور پر دو باتوں کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اوّل یہ کہ غیر معمولی عقیدت و عشق کے جذبات، عام انسانی زبان اور رائج شاعرانہ وسائل کی نفی نہیں کرتے۔ دوم یہ کہ نعت لکھنا بھی ایک انسانی تخلیقی عمل ہے۔ چوں کہ یہ دونوں باتیں نعت میں موجود ہیں، اس لیے نعت کے معانی بھی ہیئتی تصور کیے جا سکتے ہیں۔ ہیئتی معنی سے مراد وہ معنی ہے جو کسی پہلے سے موجود موضوع کا عکس نہیں ہوتا، بلکہ متن کی تخلیق کے دوران میں وجود پذیر ہوتا ہے۔ کہنے کا مقصود یہ ہے کہ نعت کا موضوع متعین ہونے کے باوجود 'نئے معانی' کی تخلیق کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ اگر یہ نئے معانی نہ ہوں، اور صرف چند ایک موضوعات کی، یکساں اسلوب میں تکرار ہو تو اس کے ضمن میں ہم مذہبی عقیدت کے تحت خاموش احترام کا مظاہرہ کر سکتے ہیں، لیکن اس کے ادبی حسن کی داد کے جذبات محسوس نہیں کر سکتے۔ نعت میں ادبی حسن، معنی آفرینی ایک ساتھ ہوتی ہے۔ نعت کی معنی آفرینی کا خاص پہلو یہ ہے کہ ہر چند یہ ایک ہیئتی عمل کی پیداوار ہے، مگر یہ محض ایک لسانی کھیل نہیں، بلکہ اس کا دائرہ مذہب،

ثقافت، سماج اور انسانی نفسیات جیسے منطقوں میں اہم تبدیلیوں تک پھیلا ہے۔ ان سب کا احاطہ ایک مضمون میں ممکن نہیں، صرف چند ایک کی طرف اشارات ہی کیے جاسکتے ہیں۔

نعت گوئی کے کئی محرکات ہوسکتے ہیں، تاہم ان میں عقیدت و عشق خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں میں فرق کیا جانا چاہیے۔ عقیدت، کسی بات کو درست سمجھ کر اس پر دل کو مرتکز کرنا ہے۔ کسی بات کو درست سمجھنے کے کئی طریقے اور ذرائع ہوسکتے ہیں: ذرائع میں خود آدمی کی اپنی صلاحیتِ امتیاز اور دوسرے لوگ اور متون شامل ہیں۔ واضح رہے کہ کسی آدمی کی صلاحیتِ امتیاز کبھی خود مختار نہیں ہوتی، اسے کسی 'اور' پر انحصار کرنا پڑتا ہے، یعنی دوسروں کی آرا، تحقیقات، کتب وغیرہ پر۔ اسی طرح جو صاحبِ علم اور راوی مستند سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی علم کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ نیز زبانی یا تحریری روایت اور الہامی متون خود علم اور ذریعۂ علم ہیں۔ سوال یہ ہے کہ عقیدت کا تعلق، بات اور اس کی سچائی تک پہنچنے کے ذریعے سے ہے یا نہیں؟ کیا ہر وہ بات جسے ہم کسی بھی ذریعے سے درست سمجھیں، اس کے سلسلے میں ایک طرح کا یا کئی طرح کے جذبات محسوس کرتے ہیں؟ ان سوالات کے سلسلے میں کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں، کیوں کہ ہر آدمی کے یہاں ایک ہی شے یا ایک ہی تصور مختلف جذبات یا احساسات کو تحریک دیتا ہے۔ مگر ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان باتوں کی سچائی ہمارے دل میں تحسین کے جذبات پیدا کرتی ہے، جن کا تعلق باہر سے ہے؛ ان باتوں کی سچائی ہمیں آسودگی دیتی ہے، جن کا تعلق ہماری نفسی الجھنوں کے دور ہونے سے ہے، اور ان باتوں کی سچائی ہمارے دل میں احترام و عقیدت کے جذبات ابھارتی ہے، جن کا تعلق ہماری روح سے ہے۔ احترام و عقیدت کا تعلق، ایک طرف خود کسی مخصوص بات سے ہے تو دوسری طرف اس کے ذریعے سے ہے۔ یوں عقیدت، جن احساسات کی حامل ہوتی ہے، وہ ذریعہ اور بات دونوں کو محیط ہوتے ہیں۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ عقیدت اور عقیدے میں ایک طرح کا 'انٹرپلے' ہوتا ہے؛ دونوں ایک دوسرے کے ہم قرین ہوتے رہتے ہیں، اور دونوں میں لامتناہی طور پر مکالمہ جاری رہتا ہے۔ بایں ہمہ کچھ استثنائی صورتیں بھی ہوسکتی ہیں، جہاں عقیدت کا عقیدے سے تعلق نہیں ہوتا۔ غیر مسلموں کی نعتوں میں عقیدت بہ درجۂ اتم ہوتی ہے، مگر وہ مسلمانوں کے عقیدے میں شریک نہیں ہوتے۔

ان معروضات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب عقیدت، نعت کی بنیاد بنتی ہے تو یہ ایک سادہ سا، سامنے کا، عام سا معاملہ نہیں ہوتا۔ نعت کا تخلیقی عمل، محض چند بندھے ٹکے موضوعات تک محدود نہیں ہوتا۔ یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ عقیدت کے تحت لکھی گئی نعتوں میں

رسمیت کے پیدا ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے، مگر یہ ان شعرا کے یہاں ہوتا ہے، جن کی نعتیہ شاعری کا محرک محض ثواب یا دنیوی اجر و شہرت ہوتے ہیں، لیکن جن شعرا کے یہاں حقیقی عقیدت موجود ہوتی ہے، یعنی جنھوں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں نبی پاک ﷺ کی حقیقت کو محسوس کیا ہوتا ہے، اور غیرشعوری انداز میں احترام و سپاس کے جذبات محسوس کیے ہوتے ہیں، ان کی شاعری رسمی نہیں ہوتی۔ تاہم شرط یہ ہے کہ وہ شعر کہنے کی اعلیٰ درجے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض جذبہ، شعر کے لیے کافی نہیں ہوتا؛ وہ تو محرک ہوتا ہے، اور محرک کیا کرسکتا ہے، اگر معروضِ تحریک کم زور یا سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ عقیدت بہت سوں کے یہاں موجود ہوسکتی ہے، مگر وہ خود اپنے آپ میں نعتیہ شاعری کا واحد محرک نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی درست ہے کہ عقیدت کا گہرا جذبہ، کسی بھی دوسرے حقیقی، گہرے جذبے کی طرح اپنا اظہار چاہتا ہے، مگر عقیدت، نعت میں اسی وقت منقلب ہوتی، جب شعرگوئی کی عمومی صلاحیت موجود ہو۔ عقیدت کے تحت لکھی گئی نعتوں میں نبی پاک ﷺ کی ذات وصفات کی سچائی کی تقدیس، ان کی کہی گئی باتوں، اور کیے گئے اعمال کی تکریم، مدحت ہوتی ہے۔ عقیدت کے تحت لکھی نعتوں میں اور ثواب ومغفرت کی آرزو سے عبارت نعتوں میں فرق کیا جانا چاہیے۔ عقیدت تو ایک طرح سے، سچائی اور اس کی عظمت کو خراجِ تحسین ہے؛ عقیدت، بے غرض ہوتی ہے، یعنی خراجِ عقیدت خود اپنا آپ انعام ہے۔ جب کہ ثواب و مغفرت کی نیت سے لکھی گئی نعتیں، بہرحال غرض رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نبی ﷺ کی ذاتِ گرامی مغفرت کا موجب ہے، اور ان کی طرف رجوع بالکل جائز ہے۔

مندرجہ بالا گزارشات سے واضح ہوگیا ہوگا کہ عقیدت کا موضوع بھی کئی پہلو رکھتا ہے؛ اس کی وحدت میں کثرت کا انداز ہوتا ہے۔ سچائی، اور اس کی عظمت کو پورے اخلاص کے ساتھ خراج پیش کرنے کا رویہ ابتدا تا آخر موجود رہتا ہے۔ مظفر وارثی کی معروف نعتیہ نظم، عقیدت کے بیشتر اجزا کی حامل ہے:

مرا پیمبر عظیم تر ہے
کمالِ خلاق ذات اس کی
جمالِ ہستی حیات اس کی
بشر نہیں، عظمتِ بشر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے
بس ایک مشکیزہ اک چٹائی

ذرا سے جَو ، ایک چارپائی
بدن پہ کپڑے بھی واجبی سے
نہ خوش لباسی نہ خوش قبائی
یہی ہے کل کائنات جس کی
گنی نہ جائیں صفات جس کی
وہی تو سلطانِ بحر و بر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

مظفر وارثی کی نعت میں، جو عمدہ شاعری کا نمونہ بھی ہے، عقیدت و عقیدے میں باہمی مکالمہ محسوس ہوتا ہے۔اب پنڈت دتاتریہ کیفی کی نعت کے چند اشعار دیکھیے، جن میں عقیدت موجود ہے۔

ہو شوق نہ کیوں نعتِ رسولِ دوسرا کا
مضموں ہو عیاں دل میں جو لولاک لما کا
پہنچائے ہیں کس اوجِ سعادت پہ جہاں کو
پھر رتبہ ہو کم عرش سے کیوں غارِ حرا کا

میر تقی میر اور کلاسیکی عہد کے دیگر شعرا کے یہاں، نعت کا موضوع عقیدت کے ساتھ ساتھ ثواب و مغفرت کا بھی ہوتا تھا، مثلاً یہ شعر دیکھیے:

جلوہ نہیں ہے نظم میں حسنِ قبول کا
دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسول کا

واضح رہے کہ اس وضع کے نعتیہ اشعار محض نعت گو کے دلی اخلاص کو ظاہر نہیں کرتے، بلکہ ثقافتی سطح پر ایک نئی نشانیات کو— یعنی کچھ نئی ثقافتی علامتوں اور رسمیات کو جو مخصوص معانی کی حامل ہوتی ہیں— متعارف کرواتے ہیں۔ اس نشانیات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس سے مختلف سماجی و ذہنی سرگرمیوں کی دنیویت میں مذہبی و الوہی تقدیس شامل ہوتی ہے۔ اور اس کے طفیل اس فاصلے کو کم کرنے میں مدد ملتی ہے جو دنیویت اور مذہبیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور جس کے بڑھنے سے نہ صرف سماجی گروہوں میں نظریاتی تفریق گہری ہوتی ہے، بلکہ گروہوں میں انتہا پسندانہ میلانات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کچھ غلط نہیں کہ عقیدت کے تحت لکھی گئی نعتیں سماجی ہم آہنگی اور ثقافتی رواداری میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مثلاً خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا ایک شعر ہے:

اب بعدِ نعت ہرزہ سرائی کا منہ نہیں
مجذوب شعر کہنے سے معذور ہوگیا

ہرزہ سرائی سے مراد محض دیگر اصنافِ شعر نہیں، جن کی اہمیت شاعر کی نظر میں کم ہوجاتی ہے، بلکہ نعت کہنے والی زبان، مختلف نقطۂ نظر، مختلف مذہب و مسلک کے حامل لوگوں کے خلاف نازیبا الفاظ ادا کرنے سے ابا کرتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام طرح کے سماجی فساد ہرزہ سرائی سے شروع ہوتے ہیں۔اس بات پر بارِ دگر زور دینے کی ضرورت ہے کہ عقیدت چوں کہ اس زبان کے ذریعے ثقافت کا حصہ بنتی ہے، جسے سب مذاہب کے لوگ ابلاغ کا ذریعہ بناتے ہیں، اس لیے عقیدت سے تشکیل پذیر ہونے والی نشانیات ہندوؤں، سکھوں اور دوسرے مذاہب کے شعرا کو بھی نعت لکھنے کی تحریک دیتی ہے۔ان کی نعتیں، پیمبرِ اعظم ﷺ کی ذات کی بے غرضانہ مدحت کے ساتھ ساتھ، یہ امر بھی باور کراتی ہیں کہ سچائی، اپنے لیے عقیدت مند خود پیدا کرلیتی ہیں، اور یہ عقیدت مند سماجی ہم آہنگی کی قابلِ قدر علامت ہوتے ہیں۔

عشق کا جذبہ، عقیدت کا مقابل نہیں، مگر عقیدت سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔عقیدت میں رسمیت ہوسکتی ہے، مگر عشق میں نہیں؛ عقیدت میں ایک طرح کی اجتماعیت ہے، مگر عشق انفرادی، داخلی، موضوعی ہے۔ اگر عقیدت کے تحت لکھی گئی نعت ایک ثقافتی کردار ادا کرتی ہے تو عشقِ نبی ﷺ میں لکھی گئی نعتیں، روحانی رفعت اور نفسیاتی قلبِ ماہیت ممکن بنانے کا غیر معمولی امکان رکھتی ہیں۔ تاہم ایک فرد کی روحانی رفعت کبھی اس شخص کی ذات تک محدود نہیں رہتی؛ چراغ کی مانند اس کی لو، اردگرد کے افراد کی روحوں میں چھائی تاریکی کو مٹاتی ہے، کبھی روحانی رفعت پانے والے کے عمل کے ذریعے، کبھی اس کے قول و گفتگو کے وسیلے سے اور کبھی سماج میں اس کی خاموش شرکت سے۔ واضح رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جہاں عقیدت ہو، وہاں عشق بھی موجود ہو، مگر جہاں عشق ہوگا، وہاں عقیدت لازماً ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ عشق، عقیدت کی انتہا بن سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عشق بے بصر نہیں ہوتا؛ اس میں بھی سچائی پر یقین موجود ہوتا ہے۔عشقِ نبی ﷺ ان عظیم صداقتوں پر اعتقاد کا حامل ہوتا ہے، جن کا علم مستند مذہبی متون (تحریری و زبانی) کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔

عشقِ نبی ﷺ کئی ایسی خصوصیات رکھتا ہے، جو محض اسی سے مخصوص ہیں۔ چوں کہ اس کی بنیاد میں عقیدت شامل ہوتی ہے، یعنی 'باخدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار' کی کیفیت ہوتی ہے، اس لیے اس کی وارفتگی اس بے تکلفی، غیر رسمیت سے پاک ہوتی ہے، جسے عام بشری عشق

میں اختیار کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عشقِ نبی ﷺ کی وارفتگی و دیوانگی دراصل ایک ایسی مقدس تجرید، ایک مابعد الطبیعیاتی مگر عظیم الشان تصوریت کو مرکز بناتی ہے، جسے پورے طور پر انسانی ذہن گرفت میں لینے سے قاصر ہوتا ہے۔ یوں عاشق کے لیے ایک پیراڈاکسیائی صورتِ حال ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال کا ایک رخ یہ ہے کہ اس تجرید کو اس الوہیت سے جدا رکھنا ہوتا ہے جو صرف خدا سے مخصوص ہے۔ بہت سوں کے لیے یہ محال رہا ہے، اور اس کی وجہ لاعلمی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی بشری بے بضاعتی بھی ہے، جو عشق کے وفور میں اس نازک ترین فرق کو بھول جاتی ہے جو الوہیت و رسالت میں ہے۔ یوں بھی عشق میں خود کو ہوشیار رکھنا آسان نہیں، لیکن عشقِ نبی ﷺ میں ہوشیاری اور احتیاط لازمی شرائط ٹھہرتی ہیں، اور عشقِ نبی ﷺ کے سفر کو کڑا اور آزمائشوں بھرا بناتی ہیں۔ اس کڑے سفر میں دعا سب سے اہم وسیلہ ہوتی ہے۔ احمد جاوید کا یہ شعر اسی طرف دھیان منتقل کراتا ہے:

کاش اس بات سے محفوظ رہیں یہ لب و گوش
جو مرے سیّد و سردار نے فرمائی نہیں

گویا بندے بشر کی استطاعت میں نہیں کہ وہ عشق میں ہوشیاری و احتیاط کا دامن تھامے رکھے، اس لیے وہ دعا کا سہارا لینے پر مجبور ہوتا ہے، لیکن دعا ایک بار پھر اسے اس مقدس تجرید کی طرف لے جاتی ہے۔ عشقِ نبی ﷺ کی پیراڈاکسیائی صورتِ حال کا ایک اور رخ یہ ہے کہ ایک طرف وہ عشق کا سچا، گہرا جذبہ محسوس کرتا ہے، مگر اپنے محبوب کا تصور ایک مقدس تجرید کے طور پر کرتا ہے؛ پیراڈاکس یہ ہے کہ جذبہ سامنے، حقیقی طور پر حسی وجود پر مرتکز ہونے کے بجائے، تصوریت سے وابستہ ہوتا ہے۔ اسی پیراڈاکس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عاشقِ رسول ﷺ کو ایک طرف اپنی خاکی نہاد کا منکسرانہ احساس ہوتا ہے، اور دوسری طرف وہ ایک عظیم الشان مابعد الطبیعی تصوریت پر اپنی تمام حسی وذہنی صلاحیتوں کو مرکوز کرتا ہے، مگر یہی پیراڈاکسیائی صورتِ حال اس کے عشق کو ایک عجب ذائقہ ،ایک انوکھی بلندی اور اس کے دل میں نئی آرزوئیں پیدا کرتی ہے۔ عاشق اپنی خاکی نہاد کا منکسرانہ احساس تو رکھتا ہے، مگر اسے حقیر، بے معنی، بے مصرف و بے مقصد نہیں سمجھتا: جو خاکی وجود ،ایک عظیم الشان تجرید کا تصور کرسکتا ہے، وہ کیوں کر حقیر ہوسکتا ہے؟ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں نعت سمیت دوسری مذہبی شاعری، جدید شاعری سے ایک الگ راستہ اختیار کرتی ہے۔ جدید شاعری میں اپنے حقیر ہونے، وجود کے لغو ہونے، نفس میں موجود تاریکیوں کو انسانی تقدیر سمجھ کر قبول کرنے کا رویہ موجود ہوتا ہے (جدید شاعری، اس حقیقت کو قبول کرکے دراصل اس کی ملکیت

کا احساس پیدا کرتی ہے)۔ جدید شاعری میں منفی قلبِ ماہیت (آدمی کا کیڑا، مکھی، بھیڑیا بن جانا) کا موضوع بھی تقریباً اسی راہ سے آیا ہے، مگر نعتیہ شاعری میں انکسار ہوسکتا ہے، حقیر ہونے کا احساس ہرگز نہیں۔ نعت میں نفس کی تاریکی کا ادراک ظاہر ہوسکتا ہے، مگر اسے انسانی تقدیر نہیں تصور کیا جاتا، اسے ایک عارضی صورتِ حال تصور کر کے، اس سے نکلنے کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔ اگر نفس کی تاریکی کو انسانی تقدیر تصور کیا جائے تو یہ سیدھا سادہ مذہبی اعتقاد پر سخت تشکیک کا اظہار ہے۔ نعت، مذہبی حسیت کی حامل صنف ہونے کے ناطے، انسانی وجود کی تاریکیوں کو دور کرنے کا لازمی امکان بنتی ہے۔ حقیقی مذہبی حسیت، لازماً رجائیت پسند ہوتی ہے؛ وہ انسان کی حتمی صورتِ حال کا پُرشکوہ رجائی تصور رکھتی ہے۔ بہر کیف، خالد احمد کی نعت کا یہ شعر دیکھیے جس میں انکسار تو موجود ہے، حقیر ہونے کا احساس نہیں:

زرِ گل ہوئی مری گرد بھی کہ ریاضِ عشقِ رسول ہوں
بڑی پاک خاک ہے یہ گلی ، میں اسی کی دھول کا پھول ہوں

یوں عاشق کی بشریت، اپنے اندر ایک غیر معمولی پن کا حقیقی روحانی تجربہ کرتی ہے۔ غیر معمولی پن کا احساس، محض تصوری اور نظری طور پر بھی ممکن ہے، مگر جب یہ عشق کی صورت اختیار کرتا ہے تو یہ تجربہ بن جاتا ہے، یعنی احساس، جذبے، فکر، تخیل، عمل یعنی انسانی وجود کے سب پہلوؤں اور سب سطحوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس سے ایک طرف عاشق کی قلبِ ماہیت ہوتی ہے، اس کے وجود کی تاریکی دور ہوتی ہے یا دور ہونے کا گہرا یقین پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کے دل میں نئی آرزوئیں جنم لیتی ہیں۔ نئی آرزوئیں بھی دراصل مذکورہ بالا پیراڈاکسیائی صورتِ حال سے پیدا ہوتی ہیں۔ عشق لازماً حسی ہدف چاہتا ہے، لیکن یہاں ایک مقدس تجرید ہوتی ہے، جسے تاریخ و سیرت ایک حسی سطح ضرور دیتے ہیں، مگر نبی ﷺ کی ذات اس درجہ وسیع اور تخیل کی حدوں سے ورا ہوتی ہے کہ اس کا قطعی متعین تصور ممکن نہیں ہوتا۔ عشق، حسی ہدف کی آرزو ترک نہیں کرسکتا، اور عشقِ نبی ﷺ میں یہ ممکن نہیں ہوتا تو اس کا نتیجہ ان نئے، عظیم الشان مقاصد کی آرزوؤں کی صورت میں نکلتا ہے جو حقیقی، حسی، مادّی دنیا کو اپنا ہدف بنا سکیں۔ چوں کہ یہ عظیم آرزوئیں، عشق کا حاصل ہوتی ہیں، اس لیے وہ مادّی دنیا کو جب ہدف بناتی ہیں تو اسے مسخ کرنے کے بجائے، اس کی وسعتوں کو کھوجتی ہیں، اور اس عمل کو خود اپنی ذات کی توسیع کی علامت تصور کرتی ہیں۔ یوں ایک نئی، بلند تر سطح کا رشتہ دنیا سے قائم ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ مشہور شعر اسی طرف اشارہ کرتا ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰی سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

عالمِ بشریت کی زد میں آسمان— یعنی وہ بلند ترین مقام، جسے انسانی آنکھ دیکھ سکتی ہے، اور جس کے سبب، انسانی تخیل عظمت و بلندی کا تصور کر سکتا ہے— کے ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی بساط کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ نبی ﷺ کی معراج، بشری دنیا کو یہ تحریک دیتی ہے کہ وہ خاک سے افلاک تک پہنچے۔ یہی کچھ مقدس تجرید کے عشق میں ہوتا ہے۔

عدم سے لائی ہے ہستی میں آرزوئے رسول ﷺ
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے جستجوئے رسول ﷺ
(بیدم وارثی)

میں کہ ذرّہ ہوں مجھے وسعتِ صحرا دے دے
کہ ترے بس میں ہے قطرے کو بھی دریا کرنا
(پیر نصیر الدین نصیر)

مقدس تجرید کے عشق کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اسے جس طرح اقبال نے پیش کیا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ اقبال کے یہاں عشق اس علامت کی طرح ہے، جس میں اپنے معنی متعین کرنے کے خلاف باقاعدہ مزاحمت ہوتی ہے۔ وہ علامت ہونے کی بنا پر کئی معانی کی حامل ہوتی ہے، مگر اس رمز کو بھی جانتی ہے کہ معنی کے تعین کی کوشش، دراصل اسے محدود کرنے کے عمل کا آغاز ثابت ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کی علامت، لامتناہی جستجو اور اَن تھک سفر کی محرک بنتی محسوس ہوتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اقبال اس لامتناہی سفر کو ایک خیالی دنیا اور فنتاسی میں سفر میں نہیں بدلنے دینا چاہتے۔ وہ عشق کی اس حسی، جذبی کیفیت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، جو انسانی دل میں حقیقی طور پر پیدا ہوتی ہے، اور جس کے ذریعے انسان خود اپنے بشری مرکز سے متصل رہتا ہے، اور اسی کو لامتناہی جستجو کا رختِ سفر بنانا چاہتے ہیں، خود اپنی ذات میں، تاریخ میں، دنیا میں اور کائنات میں۔ بہ قول اقبال:

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تاب ناک

اقبال نے عشق کا تصور واضح طور پر عشقِ رسول ﷺ سے لیا اور اس پیراڈاکسیائی صورتِ حال کا حل بنا کر پیش کیا، جس کا سامنا نبی ﷺ کی ذات کی مقدس تجرید کے عشق میں گرفتار ہونے سے ہوتا ہے۔ یہ نظری حل نہیں۔ ہوسکتا ہے نظری طور پر اسے واضح کرنا ہی محال ہو، لیکن اقبال بشری عالم کی

اس انتہائی بنیادی خصوصیت سے واقف تھے کہ تمام عظیم کارنامے، تمام بڑی تبدیلیاں، تمام غیر معمولی فن پارے ان عظیم آرزوؤں سے جنم لیتے ہیں جو عشق کا نتیجہ ہیں۔ عشق اور آرزو میں تعلق تو صدیوں سے معلوم بات ہے، مگر اقبال نے دریافت کیا کہ عشق اور آرزو کی عظمت کا ایک ہی سرچشمہ ہے۔ اقبال کی شاہکار نظم ''مسجدِ قرطبہ'' کے یہ اشعار ان معروضات کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے جن میں عشق کی علامت ایک مخروطی صورت اختیار کرتی محسوس ہوتی، اور جو تکمیلِ فن کا مظہر ہوتی ہے:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبریل ، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات ، عشق سے نارِ حیات

آخری بات! اردو نعت کے موضوعات، دیگر شعری اصناف کی طرح کبھی محدود نہیں رہے؛ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ نعت اسی طرح اپنے زمانے کی حسیت کو اپنی شعریات کا حصہ بناتی رہی ہے، جس طرح دیگر شعری اصناف۔ کلاسیکی اردو شاعری کے عہد کی نعت کا اہم موضوع، مدحت کے ساتھ ساتھ ثواب و مغفرت تھا، لیکن انیس ویں صدی کے اواخر میں نعت کے موضوعات میں تنوع پیدا ہونا شروع ہوا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ نوآبادیاتی عہد میں جب مسلم قوم پرستی کا آغاز ہوا، اور جداگانہ مذہبی شناختوں پر اصرار بڑھا تو نعتیہ شاعری کے موضوعات بھی تبدیل ہونا شروع ہوئے۔ شناختوں کو مسخ کرنے کی نوآبادیاتی سیاست اور یورپ کے کبیری بیانیے کے ردِ عمل میں برِصغیر کے مسلمانوں کے یہاں اپنی مذہبی شناخت پر اصرار بڑھا، اور وہ تاریخِ اسلام اور سیرتِ رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنے لگے۔ پہلی مرتبہ اردو شاعری میں مذہبی، قومی شناخت ایک اہم موضوع کے طور پر شامل ہوئی۔ نعتیہ شاعری مذہبی قومی شناخت کی تشکیل کا ذریعہ بنی، لیکن اس موضوع پر گفتگو کسی اور موقع پر۔

۞

پروفیسر سمیع اللہ قریشی

نعتیہ رویہ

نعت کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ جس زبان کو بھی نعت تک رسائی حاصل ہوئی اس کے ادب کو مابعد الطبیعیاتی اور فکری رفعت نصیب ہوئی۔ یہی نہیں، بلکہ جس معاشرے میں نعت کو رواج ملا وہاں سماجی اقدار بھی اس کی معطر روح سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ شاید کسی بھی دوسری صنفِ سخن کی کوئی حد ہوتی ہے، مگر نعت کے تانے بانے اور اس کی فنی حدود اور اس کی دُنیاوی اور روحانی انتفاع کا کوئی اندازہ نہیں۔ نعت کو میں مسلمانوں کے تہذیبی اور ثقافتی باطن کی شاعری سمجھتا ہوں۔ اس کی جڑیں مسلمانوں کے باطنی وطن میں بہت گہرائی سے پھوٹتی ہیں۔ جب جغرافیائی وطن اور وجود کے وطن میں سکھ اور سکون اور امن اور شانتی کم کم ہو جاتے ہیں اور بے حفاظتی اور محرومی کا احساس بڑھ جاتا ہے تو مسلمان من حیث القوم بھی اور من حیث الفرد بھی باطن کے وطن کی طرف رجوع کرتا ہے جہاں حمد اور نعت کے سرسبز درختوں کے سایوں میں اسے سُکھ کا سانس بھی نصیب ہوتا ہے اور حفاظت کا احساس بھی فراواں ہوتا ہے۔ شاعری کی دُنیا میں ساری محبتیں کم و بیش ہوتی رہتی ہیں، مگر نعت کے روپ میں ڈھلی محمد ﷺ کی محبت میں کبھی کمی نہیں آتی، کوئی مد و جزر نہیں ہوتا۔ یہ جذبہ مسلمان کی فطرت کے سمندر کی سطح پر ایک سا بہتا ہے۔

کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جیسے نعت کہنے والا نعت کے حوالے سے اپنے رب، اس دُنیا اور اپنی ہستی کی تلاش کی سعی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ ذہنی رویہ جب نعت کے روپ میں ڈھلتا ہے تو نعت کی باطنی موضوعیت میں نبیِ اکرم ﷺ کی ذات کا دفاع، معاشرے کی باطنی تفصیلات کی شرح، ملّی تقاضوں کا اعلان، آزادی کی تڑپ اور بہت ساری دیگر اہم باتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

نعت کی شہادت مسلمانوں کی ملّی شعور کی چودہ صدیاں دے رہی ہے، لیکن ملّی تاریخ کا معاشرتی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وطنی اور ملّی آشوب کے ایام میں نعت گوئی کے اسالیب میں فشار کی

کیفیت در آتی ہے اور لہجے میں وارفتگی آ جاتی ہے۔ آڑے وقتوں میں عشق رسول ﷺ کی کشش افزوں ہونے لگتی ہے اور مسلمان اپنے معروضی خلاؤں کو عشقِ رسول ﷺ کی انتہاؤں سے پُر کرنے کی شعری کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں خاص طور پر مسلمان شاعر اپنے اجتماعی اور انفرادی دکھوں اور دردوں کی دوا نعتِ رسول کہہ کر آزماتے ہیں اور کامیاب رہتے ہیں۔ پُرآشوب ایام میں نعت گوئی ایک طرح کی therapy کا اثر رکھتی ہے۔ گویا نعت ہر مسلمان معاشرے میں ہر عہد میں کہی جاتی رہی ہے، لیکن آڑے وقتوں میں فطری طور پر ایک تحریک کی صورت نمو کرتی ہے اور عرض داشت یا گزارشِ احوالِ واقعی کے لیے ایک وسیلے کی تلاش کی صورت قرار پاتی ہے۔ آڑے اور پُرآشوب وقتوں میں نعت کے اسلوب کا ٹھہراؤ اضطراب میں بدلنے لگتا ہے اور نعتیہ معروف انداز کے لہجے اور اسالیب نئے نئے قالب بدلتے ہیں اور ترقی پاتے ہیں۔

ٹھہرے ہوئے پُرسکون زمانوں میں نعت کہنے والوں نے عام طور پر محمدِ عربی ﷺ کے وجود کے فلسفۂ نور اور ذات کے جمال کے تذکرے کیے۔ مضطرب اور پُرآشوب ادوار میں آپ ﷺ کے اخلاقی عروج پر پیغمبرانہ کمال کے گوناگوں زاویے پیش کیے گئے۔ یثرب اور بطحا کو علامت بنا کے دھرتی سے محبت اور وابستگی کا اظہار کیا گیا۔ نبیِ کریم ﷺ کی ذات کے حوالے سے ذہن کی فکری سطح پر روشنی کے شعری سامان کیے گئے۔ یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ ابتدائی نعتوں میں عقیدے اور عقیدتوں کے رنگ زیادہ تھے۔ قومی اور ملّی زوال آمادگی کے زمانوں میں حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ اپنی نسبت اور تعلق کے اظہارات عام ہوئے، لیکن آج حضور کے ساتھ اپنی وابستگی کا بے ساختہ اور بے پناہ اظہار بھی ہے مگر ایسا بھی ہے کہ ذکرِ رسول گویا نعت میں ایک پناہ گاہ بھی ہے اور فکری قوت حاصل کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ آج کی نعت کو مسلمان شاعر کے باطن کی نعت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آج کا نعت گو اپنے جذبات اور اپنے دکھ نبیِ اکرم ﷺ کی حضوری میں پیش کر کے جیسے سپھل ہونا محسوس کرتا ہے۔ آج نعت کہنے والوں نے اپنے خوابوں اور اپنے ظاہر اور باطن کے انقلابوں کو ہم آمیز کر دیا ہے۔ حضور کی نعت آج شاعر کے خواب اور خواہش کا مرکز قرار پاتی ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ آج کی نعت اپنے موجودہ اور معروضی سماجی حوالے کو بھی کسی طور نظر انداز نہیں کرتی۔ آج نعت سے ذہنی اور فکری انقلاب کے چشمے رواں ہوتے ہیں۔ جیسی بھرپور نعت آج کہی جا رہی ہے پہلے شاید مجموعاً ایسا نہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ آج شاید نعت کہنا ایک ایسا وسیلہ بن گیا ہے جس کے حوالے سے دُنیا بھر کے مسلمان فکری اور عملی اعتبار سے بھرپور اتحاد اور یک جہتی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مسلمان

ثقافتوں میں ایک طاقت ور اشتراک پیدا کرنے کی قوت بے شبہ آج کی نعت ہی ہے۔ اس لیے کہ نعت کہنا آج کا بھرپور مسلم ثقافتی رویہ ہے۔ حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات نے سماج اور رواج میں جو مثبت انقلاب پیدا کیا اور آپ کے فکری اور اخلاقی انقلاب سے جو روشنی پھوٹتی ہے آج کی نعت اسے ایک وارفتگی کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہے۔ آج کی نعت کی زبان اور لہجے میں وہ قوتِ قدسیہ پیدا ہو جاتی ہے جو مسلمانوں دور دور سے گھیر کر اپنے پاس لے آنے میں کامیاب رہتی ہے۔

اُمتِ مسلمہ جب بھی اور جہاں جہاں بھی جبر اور استحصال کا شکار ہوئی ہے، اس کے شعرا نے بالخصوص حضورِ اکرم ﷺ کی رحمت کے تصور کو معاشرے اور معاشرتی رویوں میں عملی اور فکری سطح پر عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور یوں پھر اس کے صلے میں سکھ کا سانس لیا ہے۔ آڑے وقتوں میں حضور کی ذات کا تصور جیسے ایک امید اور ایک آسرا بن جاتا ہے شاید اسی لیے کل اور آج کی نعتوں میں قومی ملّی اور ذاتی دکھوں کی جھلک اور پرچھائیں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ آج کی نعت میں موجود کسی بہتر صورتِ حال کی طرف سفر کی خواہش کا احوال بھی عام ہے اور یوں نعت دُعا اور التجا یا عرض داشت بھی قرار پاتی ہے اور یوں نعت روحِ عصر بھی ٹھہرتی ہے۔

پوری انسانیت کے لیے جس انقلابی اور فعال رویے کی شدید ضرورت ہے اس کی گواہی آج کی نعت دے رہی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو نعت آج مسلمانوں کے اجتماعی بین الاقوامی اشتراک کی علامت بن جاتی ہے۔ ایک قابلِ ذکر بات آج کی نعت کے حوالے سے ضرور کہی جانی چاہیے کہ اس میں ہجر کی کیفیت کا اظہار تقریباً ختم ہو چکا ہے یا کم از کم اسے نعت میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں رہی ہے جب کہ ہجر کی کیفیت کا اظہار تاثیر کا ایک جداگانہ پہلو اپنے اندر ضرور رکھتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ انسان مدینہ پہنچے اور کچھ باتیں عین حضوری میں کرے مگر یہ تو محض فضلِ الٰہی ہے، میرے تیرے کسی کے بس کی بات نہیں۔

ذکرِ رسول اور نعتِ رسول ﷺ نے مجھے ایک سبق دیا ہے کہ ظاہر کی ٹوٹ پھوٹ کو دیکھتے ہوئے انسان کو اپنے باطن کو ٹوٹ پھوٹ سے بچانا چاہیے۔ انسان کا باطن مستحکم رہے تو باہر کی شکست و ریخت کے جڑنے اور اس کے استحکام کے امکانات باقی رہتے ہیں۔ نعتِ رسول ﷺ سے قوت حاصل کرتے ہوئے اس امکان کو اپنی معاشرتی زندگی میں ہر حالت میں باقی رکھنا ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی

جدید اردو غزل میں نعتیہ تخلیقی رویّے کا وفور

لفظ غزل نہ صرف عربی زبان کا لفظ ہے بلکہ یہ ایک شعری صنف کے طور پر بھی عربی ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ نعتیہ کلام کو غزل کے رنگ میں کہنے کی سب سے پہلی روایت تو خود شاعرِ رسول، محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت حسان ابنِ ثابت نے ڈالی اور جمہورِ علما کا اتفاق ہے کہ تمام عالم کے دیوانِ نعت ایک طرف ہوں اور حضرت حسان ابنِ ثابت رضی اللہ عنہ کے یہ دو اشعار ایک طرف تو یہ دو اشعار گویا سبقت لے جائیں گے:

احسن منک لم تری قط عینی
و اجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرأ من کل عیب
کانک قد خلقت کما تشاء

یہ دو اشعار بھی نعت کے ہیں، لیکن غزلیہ رنگ سے لبریز ہیں جس کا اردو میں مفہوم کچھ یوں ہے کہ آپ ﷺ ان تمام لوگوں سے زیادہ خوب صورت ہیں جنھیں شاعر نے دیکھا اور ان تمام لوگوں سے زیادہ وجیہہ ہیں جو آج تک تمام ماؤں سے پیدا ہوئے۔ آپ کو تمام عیوب سے پاک کر کے پیدا کیا گیا، یعنی ایسا بنایا گیا جیسے آپ نے خود خواہش کی ہو۔

اسی طرح جب نعتیہ رویے مسلمانوں کے ساتھ فارسی غزل کا تخلیقی حصّہ بنے تو وہاں بھی غزلیہ رنگ ہی غالب رہا، مثلاً مولانا جامی کی نعت کا مطلع ملاحظہ ہو:

تنم فرسودہ جاں پارہ زِ ہجراں یارسول اللہ
دِلم پژ مردہ آوارہ زِ عصیاں یارسول اللہ

جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ میرا جسم اداس اور جاں پُرسوز ہے کہ مجھے آپ ﷺ سے فراق

حاصل ہے۔ میرے دل میں اپنے گناہوں کی ندامت کے باعث پژمردگی سی چھائی ہوئی ہے۔ اس کلام میں فراق، محبوب کی ناراضی کا ڈر اور اس سے ملنے کی خواہش خالصتاً غزل کے موضوعات ہیں۔

برِصغیر پاک و ہند میں چوں کہ ہندوستانی اور اردو نے عربی، فارسی اور مقامی زبانوں سب کا اثر لیا، اس لیے غزلیہ رنگ نعت میں آنا یہاں بھی لازم تھا۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی کی اس مشہور نعت کو دیکھا جائے جو چار زبانوں کی لسانی خوش بو میں رچی بسی ہے، اس میں بھی نعت ہونے کے باوجود تغزل نمایاں ہے:

لم یاتِ نظیرک فی نظر ، مثلِ تو نہ شد پیدا جاناں
جگ راج کو تاج تورے سرسوں ، ہے تجھ کو شہ دوسرا جاناں

جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جسے میں مثال کے طور پر پیش کر کے آپ ﷺ کی شخصیت کو ثابت کر سکوں۔ اس لیے آپ ﷺ جیسا کوئی اور پیدا ہی نہیں ہوا۔ کائنات کی تمام بادشاہتیں اور اختیارات آپ ﷺ کی بادشاہی کا صدقہ ہیں اور میرے نزدیک آپ ﷺ ہی دونوں جہانوں کے بادشاہ ہیں۔

یہ کلام نعتیہ ہے، لیکن ان اشعار میں بھی محبوب کو مسابقت کی سطح پر ماورا قرار دینا اور کائنات میں فقط آپ ﷺ کی ذات کو ہی مرکزِ توجہ رکھنا خالصتاً غزلیہ رنگ ہے۔

وطنِ عزیز کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد سے لمحۂ موجود تک کا شعری منظرنامہ یہ بتاتا ہے کہ غزل نے اپنی عہد بہ عہد رونما ہونے والی فکری و فنی توانائیوں کا ہمیشہ خیر مقدم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ لسانی تشکیلات کے عہد سے گزشتہ ایک دہائی تک غزل کی جو جدید شعری روایت تشکیل پاتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ اپنے متنوع اسالیب اور مختلف فکری و فنی زاویوں سے خود کو باثروت کرتی دکھائی دیتی ہے، بلکہ اس نے ہر مروّجہ شعری صنف پر اپنے اسلوبیاتی اور موضوعاتی اثرات بھی مرتب و قبول کیے ہیں۔ یہاں تک کہ نعت جیسی خالص دینی صنفِ سخن بھی اس سے ہم آہنگ ہو کر فکری و فنی رویّوں کے نو بہ نو جہانِ معانی سامنے لا رہی ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ متعدد اہم نعت گو شاعر بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں اور دوسرا سبب خود غزل کی ہیئت میں شامل تاثر و تاثیر کا وہ تشکیلی ڈھانچا ہے جو براہِ راست ہمارے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ برِصغیر کا مزاج قافیے کا مزاج ہے اور قافیے کے زور پر آگے بڑھنے والی اظہار کی منظوم صورتیں شاعری کے قارئین کے لیے ہمیشہ خصوصی دل چسپی اور یاد آوری کا باعث بنتی چلی آ رہی ہیں۔ اس حوالے سے جب ہم جدید نعت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر کھلتا ہے کہ

جدید نعت گوشعرا نے اپنے نعتیہ شعری تجربات کو خصوصیت کے ساتھ ردیف کی بنیاد پر آزمانے کی کوشش کی ہے اور ایسی ردائف اور قوافی کو نبھانے کی شعورانہ صلاحیت کا مظاہرہ بھی کیا ہے جو مجموعی طور پر انھیں منفرد تخلیق کار ثابت کرنے کا وسیلہ بنتی ہیں۔ ان شعرا نے غزل کی نفسیات کو برت کر نعت کہنے کا فن اُجاگر کیا ہے:

مُنیر شہرِ محمد ﷺ میں جا کے دیکھیں ذرا
بلادِ کفر میں خود کو بہت گنوا دیکھا
(منیر نیازی)

ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو! اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے
(افتخار عارف)

کون سے نور کی زد پر ہے کہ شب کٹتی ہے
تیری آمد کے قرینے ہیں کہ پَو پھٹتی ہے
(خورشید رضوی)

میں نے تو کاغذ پر ان کا نام لکھا تھا سمر
حرف سارے اوڑھ کر خوش بو کہاں سے آ گئے
(حسین سحر)

دم بہ دم پھیلتا جاتا ہے اجالا دل میں
کوئی مہتاب ہے ان کی تمنا دل میں
(منور ہاشمی)

یہ دیکھنے سننے کو نہ کہنے کے لیے ہیں
آنکھیں تو انھیں سوچتے رہنے کے لیے ہیں
(صفدر صدیقی رضی)

اسی جائے نماز و راز پر اک روز ثروت
اچانک در کھلے گا اور وہ جھونکا ملے گا
(ثروت حسین)

جدید غزل کی طرح نئی نعت کا ایک فنی وصف یہ ہے کہ اس میں مروّجہ لفظیات سے ہٹ کر ایسی تراکیب، بندشوں، زمینوں اور بحور کو برتا گیا ہے جو اس کو قدیم طرز کے فنِ نعت گوئی سے

الگ شناخت دلاتا ہے۔ مختلف ہیئتوں، اسالیب اور موضوعاتی پھیلاؤ کے باوصف جدید نعت ندرتِ خیال اور طرزِ اظہار کا نادر نمونہ بن کر سامنے آئی ہے جس کی جھلک اُن نعتیہ اشعار میں باآسانی دیکھی جاسکتی ہے جو اوپر درج کیے جاچکے ہیں۔

غزل ایک عشقیہ صنفِ سخن ہے اور نعت سر بہ سر عشقیہ صنفِ سخن ہوکر بھی موضوع کے مرکزی چناؤ، طرزِ احساس اور نعت کی صنف کے آداب کی حدود و قیود اور خصوصی احترام کی رُو سے غزل کی صنف سے یکسر مختلف ہوجاتی ہے، کیوں کہ نعت کی صنف موضوعاتی برتاؤ کے اعتبار سے غزل کی طرح آزادانہ پھیلاؤ نہیں رکھتی۔ اس کے موضوع کو اپنی خیالی دنیا کے تحت پھیلایا نہیں جاسکتا، بلکہ ایک ہی موضوعی وحدت کا دائرہ نعتیہ صنف کو ایک خاص سمٹاؤ میں رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس خاص موضوعاتی سمٹاؤ میں بھی ایک طرف سے بکھراؤ کے امکانات یوں پوشیدہ رہتے ہیں کہ یہ موضوع جس عظیم ہستی کی سیرت و کردار کا احاطہ کرتا ہے، اُس کا بیان اظہار کے ہزار ہا رنگوں سے عبارت ہوکر بھی تشنہ ہی رہتا ہے۔

یہاں خیال کی قوت کو موضوع کے متعین کردہ آداب و احترام کے تابع رکھنا پڑتا ہے مگر جذبۂ عشق اس عشقیہ صنف کے دوش بہ دوش رہتا ہے اور یوں اس کی تخلیق کا ظاہری انداز غزل کی تخلیق کے ظاہری انداز سے ہم رشتہ محسوس ہوتا ہے اور اسی سبب سے غزل کہنے والوں کے لیے عموماً نعت کہنا اور نعت کہنے والوں کے لیے عموماً غزل کہنا چنداں مشکل تخلیقی عمل نہیں سمجھا جاتا، مگر اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار کی بھی گنجائش نہیں کہ نعت کہنا مشقِ سخن کا کمال نہیں، خصوصی توفیق سے مشروط ہے۔

غزل کی طرف آئیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ غزل میں محبوباؤں کا ایک بازار سجا ملتا ہے مگر نعت میں قاری کا محبوب و مطلوب ایک ہے۔ یہاں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کے جلوے ہیں۔ یہاں محبوبِ غزل کی طرح عاشق کا کوئی روایتی رقیب نہیں اس لیے کہ نعت کے محبوب کا کوئی رقیب ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ یہ بات دوسری ہے کہ شیفتگی اور عقیدت کی بنا پر رشک کی صورتیں ضرور دکھائی دیتی ہیں، اس لیے کہ یہ عشق و عقیدت کی والہانہ سرمستی میں قلب و روح کی بے تابیوں کا بیان ہے۔ مانسہرہ (پاکستان) میں مقیم ممتاز نعت گو شاعر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کے ہاں محبوبیت کے اس ہر دل عزیز اور بے رقیبانہ انداز کو اس شعر میں نہایت عمدگی سے ڈھالا گیا ہے:

رقابتوں کا تصور بھی دل کے ساتھ گیا
تری گلی میں ہر اک آشنا کہے ہے مجھے

اس میں مجازی سرور نہیں روحانی کیف ہے۔ دوسری طرف جدید غزل کی طرح جدید نعت بھی زمینوں کے انتخاب سے لے کر بات کہنے کے انداز تک، انفرادی تخلیقیت کو ظاہر کرتی ہے۔ لب و لہجے کی تازگی، لحن کی نادرہ کاری، بیان کی شائستگی، اظہار کی سلیقہ مندی اور وجدانی کیفیات کو جمالیاتی احساس میں بسا کر پیش کرنے کا انداز، سوز و گداز، وارفتگیِ شوق، کہیں ایمائی تو کہیں واضح اسلوب، عہد کے آشوب کے ساتھ ساتھ ذاتی دکھوں کو فریاد کی لے میں ڈھال کر التجا کرنے کا رویہ، وفورِ جذبات سے شوق کی آنچ پر جذبوں کے پگھلنے کا عمل سب کچھ جب نعت کے تخلیقی رویے میں ڈھلتا ہے تو اُس کا رنگ و آہنگ، قلبی کیفیت، اُس کی کسک، تڑپ اور سوز کی بنا پر غزل جیسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

جدید اردو غزل میں نعتیہ تخلیقی وفور کے فکری نقش کے ضمن میں بلا مبالغہ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اشعار بہ طورِ حوالہ درج کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس تقدس مآب موضوعِ سخن کو غزل کے ہر شاعر نے برتنے کی سعادت حاصل کی ہے، مگر زیرِ نظر مضمون کو سمیٹتے ہوئے متعدد شعرا کے غزلیہ شعری مجموعوں سے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں اور یہ اشعار وہ ہیں جو نعتیہ کلام سے انتخاب نہیں کیے گئے بلکہ سراسر غزلوں سے انتخاب کیے گئے ہیں:

محسوس ہو رہا ہے کہ دل کا معاملہ
دربارِ مصطفیٰ ﷺ سے خدا تک پہنچ گیا
(جمیل یوسف)

اک سخی ﷺ ایسا بھی ہے انسانیت پرور کہ جو
مانگنے والے کو ہرگز شرم سار آنے نہ دے
(سلطان رشک)

اُس ﷺ کو گزرے ہوئے زمانہ ہوا
جگمگاتی ہے اب بھی راہ تمام
(باقی احمد پوری)

درِ زنداں سے مقتل تک سفر ہوتا گیا آساں
لگایا ہم نے جب اسمِ محمد ﷺ اپنے سینے سے
(غلام مصطفیٰ بسمل)

باغ سارا اسی نے مہکایا
جتنی خوش بُو ہے اک کلی میں ہے
(غلام رسول زاہد)

عطا اُسی کی ہے یہ شہد و شہود کی توفیق
وہی گلیم میں یہ نانِ بے جویں لایا
(افضال احمد سیّد)

مروں تو شہرِ مدینہ ہو سامنے فیصلؔ
خدا کے بعد کسی کو جواب دینا ہے
(فیصل عجمی)

سب کچھ ہے ترے کرم کے صدقے
دامن میں ہمارے کیا نہیں ہے
(پیر نصیر الدین نصیر)

لبوں کو چھو رہی ہے خوش کلامی
غزل میں نعت کا رنگ آ گیا ہے
(اختر شیخ)

اے مری عمر کی پلکوں پہ لرزتے ہوئے خواب
تجھ کو سرکار کا فیضان سنبھالے ہوئے ہے
(جنید آذر)

اِک جھلک دیکھ کے جاگ اُٹھیں گے مردہ چہرے
تم جو آؤ گے تو ہو جائے گا محشر آباد
(فرخ راجا)

کبھی دیکھو طلسمِ روز و شب کے در کھلے اُن پر
نجوم اُن کی نظر میں ہیں خبر میں سب ستارے ہیں
(عائشہ مسعود ملک)

چہرۂ صبح پر چمکتی ہیں
وہی کرنیں تری جبین کے بعد
(عابد سیال)

ڈاکٹر عزیز احسن

نعتیہ شاعری میں متنی رشتوں کی تلاش

ساختیاتی مفکرین نے کسی بھی متن کو آزاد اور بالکل نیا (Original یا انوکھا) متن ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں معنی کا بہاؤ متن کی تجدید کا باعث بنتا رہتا ہے اور کسی بھی متن کو کسی زبان کے پہلے سے لکھے ہوئے موجود متن کی روشنی میں پڑھ کر متنی رشتوں (Textual Relationship) کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

دوسری بڑی اہم بات یہ ہے کہ کسی متن کی معنویت کے تعین میں مصنف کے منشا کو قطعی دخل نہیں۔ کسی بھی متن کی قرأت کے عمل سے اس کی معنویت پرت پرت کھلتی اور قاری کے ذہنی آفاق کو روشن کرتی جاتی ہے۔ معروف فرانسیسی ساختیاتی مفکر رولاں بارتھ (Roland Barthes) کی فکر میں بنیادی نکتہ ہی ''متن کی کثیر المعنویت'' ہے۔ وہ ادب کی تعریف بھی اس طرح کرتا ہے ''ادب اشیا و عوامل کی معنی خیزی کا پیغام ہے، محض معنی کا نہیں۔'' معنی خیزی یعنی طرح طرح کے معنی پیدا کرنے کا عمل جسے بارتھ نے Signification کا نام دیا ہے۔

رولاں بارتھ کے اس نظریے کی روشنی میں اگر ہم اپنے ادبی سرمائے کا بالعموم اور نعتیہ شعری سرمائے کا بالخصوص مطالعہ کریں تو ہم پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ بارتھ نے بیس ویں صدی میں (پیدائش ۱۹۱۵ء وفات ۱۹۸۰ء) جس نکتے کی طرف توجہ مبذول کروائی تھی اس کے مظاہر اُردو ادب میں پہلے سے موجود تھے۔

خیال کے چراغ سے چراغ جلنے کا عمل دنیائے ادب میں کوئی نیا نہیں ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس عمل کو کسی ادبی نظریے کی شکل دینے میں رولاں بارتھ نے پہل کی۔

بین المتنیت یا Intertextuality کا عمل ہمارے شعری منظر نامے پر دھنک کی طرح بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات کہ ہماری روایت نے اس عمل کو، توارد، نقالی، سخن دزدی کا نام

دے کر اسے بدنام تو کیا لیکن اس عمل سے گریز کی راہ ممکن نہ ہو سکی۔ ایک بات البتہ محسوس کی گئی کہ جب کسی شاعر نے کسی موجود متن کو اس طرح اپنایا کہ اس کے معنی کے آفاق وسیع تر ہو گئے تو اس کوشش کو ہر سطح پر سراہا گیا۔

نئی لسانیات اور ساختیاتی تنقید میں تجدیدِ متن نے ایک الگ مفہوم پیدا کیا ہے۔ یہاں موجود متن کو نئے انداز سے شعری بنت میں لانا حسن و خوبی کے ذیل میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کسی موجود متن کے منشا (جو کسی مصنف نے اپنے بنے ہوئے متن سے جوڑ رکھا تھا) سے انحراف اب قاری کا حق ہو گیا ہے۔ اب قاری کسی بھی متن کی قرأت سے اپنی مرضی کے معانی تراش سکتا ہے۔ پرانے اور موجود متن سے نئے اور من مانے معانی کا اخذ کرنا بھی اُردو ادب میں کوئی نئی چیز تو نہیں تھی تاہم اس کو بغیر نام دیے عمل میں لایا جا رہا تھا۔

اُردو شعرا نے بیشتر فارسی اشعار کا یا تو ترجمہ کرنے کی کوششیں کیں یا کسی فارسی شعری متن کو نئے اسلوب میں لکھا۔ ترجمے کی کوششوں کو تو بعض نے سراہا بعض نے معیوب جانا تاہم تجدیدِ متن کی ان کوششوں کو جن میں معانی کے آفاق پھیلتے ہوئے محسوس کیے گئے، حریفوں نے بھی استحسان کی نظر سے دیکھا۔ مثلاً یاس یگانہ چنگیزی نے غالب پر سرقے کا الزام لگایا، لیکن تجدیدِ متن کی اس خوبی کی اس نے بھی داد دی جس میں موجود متن کے معانی میں وسعت پیدا ہو گئی تھی یا شعری متن کے مفہوم میں بلندی کے آثار داخل ہو گئے تھے۔ غالب نے کہا تھا:

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

یگانہ نے لکھا ''بڑا بانکا شعر ہے۔ مگر یہ خیال شیخ علی حزیں کے ایک شعر سے پیدا ہوا جسے ترقی دے کر غالب نے نقل کو اصل سے بڑھا دیا ہے۔'' علی حزیں کا شعر تھا:

چہ لذت بو داز قاتل حزین نیم بسمل را
کہ درخوں می تپیدو آفریں می گفت بردستش

حزین نیم بسمل کو قاتل کے حملے سے کیا لذت حاصل ہوئی کہ اپنے ہی خون میں تڑپنے کے باوجود وہ قاتل کے زور بازو کو داد دے رہا ہے۔

ہماری شعری دنیا میں غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں ایک ہی مضمون کے مختلف شعری متون، مختلف انداز میں بُنے گئے ہیں۔ نعت کی طرف آیئے تو اس میں چوں کہ محبوب (محمد رسول اللہ ﷺ) ایک ہے اور نعت آپ ﷺ کے جمالِ صوری اور حسنِ معنوی یعنی صورت اور

سیرت دونوں کی عکس بندی کی کوشش ہے، لہٰذا ہر شاعر ایک ہی مضمون کو اپنے زاویۂ نظر، اپنے جوہرِ تخلیق اور اپنے اسلوب کی حدود میں رہ کر لکھتا ہے اس لیے ایک ہی متن کے بہت سے اشعار جمع کیے جاسکتے ہیں، لیکن متن کی اس یکسانیت کو نہ تو توارد کا نام دیا جاسکتا ہے نہ سرقے کا اور نہ ہی مکھی پہ مکھی مارنے کا۔ تاہم جس شاعر نے اپنے متن کو شعری لوازمات برتتے ہوئے اچھے اسلوب اور فصیح زبان میں لکھا ہوگا وہ اچھا شعر قرار دیا جائے گا۔ ایسی کوشش کو تجدیدِ متن کی کوشش سے تعبیر کیا جائے گا۔

ایسے اشعار کی مثالیں دینے سے قبل ایک بات کی وضاحت اور ہوجائے!... رولاں بارتھ کا مشہور قول ہے: "The Text is read without the father`s signature" ''متن اپنے باپ (خالق یا مصنف) کے دستخط کے بغیر پڑھا جاتا ہے۔'' مطلب یہ ہوا کہ متن کی قرأت کے لیے مصنف کا منشا جاننا ضروری نہیں اور نہ ہی کسی متن کو مصنف کے یک رخے معنی پہنائے جاسکتے ہیں۔

والٹر جے سلاٹوف Walter j. Slatoff کے بہ قول:

> متن کے ہیئتی خصائص ہمیشہ کے لیے مقررہ ردعمل یا متعینہ افہام و تفہیم کی ضمانت نہیں دے سکتے۔☆[۱]

والٹر جے سلاٹوف کے اس قول کے معنی اس مثال سے سمجھے جاسکتے ہیں کہ غالب نے نواب تجمل حسین خاں کے قصیدے میں یہ شعر لکھا:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اس شعر کو نواب تجمل حسین خاں نے اور ان کے عہد کے لوگوں نے تو نوابی قصیدے کا جزو جانا اور اسی طرح اس کی معنوی حیثیت متعین کی، لیکن بعد کے ادوار میں کسی نے اس شعر میں نعت کا رنگ دیکھ لیا اور اب اکثر اس شعر کو نعت کا شعر تصور کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شعر کو نعتیہ شعر قرار دینے سے شاعر کا منشا مجروح ہوتا ہے، لیکن قاری نے اس شعر کے معنیاتی طیف کو اپنے تأثر کے مطابق محسوس کیا اور اسی تأثر نے اسے اس نتیجے پر پہنچایا۔

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی مرحوم کے لاشعور میں بھی غالباً ادب کی یہی تھیوری تھی جس کی روشنی میں انھوں نے ''غزل میں نعت کی جلوہ گری'' کے موضوع پر قلم اُٹھایا، لیکن چوں کہ انھوں نے اس مضمون کو معنیاتی بوقلمونی کے روایتی تصورات کے تحت لکھا تھا اس لیے اس نظریے کی مخالفت کا

☆۱۔ With Respect to Readers (۱۹۷۰) بحوالہ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات ص۲۷۲۔

سامنا کرنا پڑا۔ اگر وہ رولاں بارتھ کے جدید نظریے کے حوالے سے اپنی بات واضح کرتے تو شاید کسی کو اس کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوتی۔ ویسے پورے نظریے کی مخالفت کے لیے اہلِ دانش کو اس تھیوری کی طرف رجوع کرنا پڑتا اور بات بہت دُور نکل جاتی۔

کشفی صاحب نے جتنے اشعار مثال کے طور پر پیش کیے وہ سب کے سب مصنّفین کے منشا کے برعکس نعتیہ شعری ادب کے کھاتے میں ڈال دیے تھے۔ ان کے مضمون کا پہلا شعر خود کشفی صاحب کے بیان کے مطابق شاعر (احسان دانش) نے غزل کا شعر قرار دیا تھا اور کشفی صاحب کی نشان دہی پر غور کرنے کے بعد نعتیہ شعر کے طور پر قبول کیا تھا۔ اب وہ شعر اور کشفی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
ترا نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے کو

کشفی صاحب لکھتے ہیں:

> شعر سن کر میں نے بے ساختہ کہا کہ نعت کا کیسا اچھا شعر ہے۔ مرحوم (احسان دانش) نے فرمایا، ''میں نے تو یہ شعر نعت میں نہیں کہا ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''تخلیق ایک بے حد پیچیدہ اور طلسماتی عمل ہے۔ ضروری نہیں کہ فن کار کو تخلیق کے ہنگام اپنے عمل کے تمام محرکات وعوامل کا علم اور شعور ہو۔ تخلیق میں تو ہمارا پورا وجود شامل ہوتا ہے۔ شعور بھی اور لاشعور بھی۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا معاشرتی اور اجتماعی شعور بھی اس عمل میں شامل ہوتا ہے۔'' پھر بات کا رخ کسی اور طرف مڑ گیا۔ خاصی دیر کے بعد احسان دانش مرحوم چونکے، میری طرف مڑے اور کہنے لگے، ''تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔''
>
> (''نعت رنگ'' شمارہ ۹، ص۱۳)

آج میں کشفی صاحب کے محولہ اشعار کو ان کے منشا کے مطابق (مصنّفین کے منشا کے خلاف) نعتیہ اشعار ماننے کو تیار ہوں۔ کیوں کہ آج میرے پیشِ نظر Reader-Oriented Criticism or Reader Response Criticism ''قاری اساسِ تنقید'' کی کسوٹی ہے۔ جو مجھے یہ باور کرنے پر مجبور کر رہی ہے:

> کسی متن کے بارے میں یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں یا آنے والے زمانوں میں قارئین اس کو کس طرح پڑھیں گے۔

(ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ گوپی چند نارنگ۔ ص۲۷۲)

ہم اکثر روایتی شاعر کے کسی شعر کو اس شعر کی لفظیات کی معنوی چکاچوند کے پیشِ نظر کسی بھی پیش آمدہ صورتِ حالات پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ اچھے نثر نگار اپنی بات میں خوب صورتی پیدا کرنے کے لیے یہ عمل اکثر و بیشتر کرتے رہتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی مثال ہی میری بات سمجھنے کے لیے شاید کافی ہو۔

ایک مرتبہ سٹی گورنمنٹ کالج ناظم آباد، کراچی میں چھوٹی سی شعری نشست ہوئی تھی۔ میں اس کالج کے پہلے بیچ میں شامل ہونے کے باعث اس کالج کا ''اولڈ بوائے'' ہوں۔ پروفیسر وسیم فاضلی صاحب کے حکم پر میں بھی اس شعری نشست میں شریک ہوا۔ اتفاق سے نظامت کے فرائض بھی مجھے ہی انجام دینے پڑے۔ بھارت سے عرفان صدیقی مرحوم آئے ہوئے تھے۔ کراچی کے حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ اس دن پاکستانی شاعروں نے بھی کچھ ایسی شعری تخلیقات پیش کیں جن میں بین السطور ہجرت کے تجربے کو تلخ تجربہ قرار دیا گیا تھا۔ عرفان صدیقی نے بھی جو شاعری سنائی اس میں غزل کے روپ میں شکایتِ زمانہ تھی۔ اختتام پر میں نے عرض کیا ''دونوں جانب کے شعرا کو سن کر جو تأثر میں نے قبول کیا ہے اس کے اظہار کے لیے مجھے مومن خاں مومن کا شعر مستعار لینا پڑ رہا ہے۔ مومن نے کہا تھا:

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

عرفان صدیقی مرحوم نے اس تأثر کے اظہار پر کچھ احتجاج کیا، لیکن پاکستانی شعرا نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

اس واقعے کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ مومن یا اس کے عہد کے کسی قاری کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ یہ شعر سیاسی عدم اطمینان کی کیفیات اور ماحول کی ناسازگاری کے حوالے کے طور پر بھی کبھی پڑھا جاسکتا ہے۔

اب ذرا وہ مصاریع ملاحظہ ہوں جو کسی شاعر نے کسی قدیم شاعر کے مصرعے پر گرہ لگانے کی غرض سے موزوں کیے ہیں اور اصل شاعر کے منشا کے برعکس نعتیہ شعر کے قالب میں ڈھال کر ہم سے داد وصول کی ہے۔

ایاز صدیقی نے غالب کی منتخب غزلوں پر نعتیں کہی ہیں اور اکثر مواقع پر غالب کے مصرعوں پر ایسی ایسی گرہیں لگائی ہیں کہ غالب کے مصرعوں کی معنیاتی تقلیب دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

آقاؐ نے مجھ کو دامنِ رحمت میں لے لیا
''میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا''

(ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی)۔ غالب نے موت میں اخلاقی محاسن کے فقدان کے باعث ہونے والی شرمندگی سے نجات ڈھونڈی تھی، لیکن ایاز صدیقی نے پہلا مصرع اس انداز سے کہہ دیا کہ غالب کے مصرعے کا تناظر ہی بدل گیا۔ یہاں حضور اکرم ﷺ کی رحمت کا وہ پہلو بھی سامنے آ گیا جو ''اَلطَّالِحُ لِي'' کی حدیث میں پوشیدہ ہے:

ارضِ طیبہ پر قدم تو کیا، نظر جمتی نہ تھی
''ذرّہ ذرّہ روکشِ خورشید عالم تاب تھا''

(کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں)۔ غالب نے اپنے جنونِ نارسا کی کوتاہیوں کا ذکر کر کے صحرائے عشق کے ذرّے ذرّے کو سورج کا حریف قرار دیا تھا اور یوں خود کو ملامت کی تھی۔ ایاز صدیقی نے ارضِ طیبہ کے ذرّے ذرّے سے پھوٹنے والی تجلیات کا احوال رقم کر کے غالب کا مصرع اپنا لیا ہے:

شدتِ تشنگیِ دید بیاں ہو نہ سکی
''گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا''

(نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب)۔ اس شعر میں ایاز صدیقی کوئی نعتیہ قرینہ پیدا نہ کر سکے کیوں کہ ان کا مصرع غالب کے مصرعے ہی کا دوسرا ملفوظی پیکر لگتا ہے۔ غالب کے مصرعے سے بھی تشنگیِ ذوق کا خاطر خواہ انداز میں بیان نہ کر سکنے پر افسوس مترشح ہے اور ایاز صاحب نے بھی بیان دید کی تشنگی کا جی کھول کر تذکرہ نہ کر سکنے پر اپنا احساس عدم آسودگی لکھا ہے۔ ایاز صدیقی کا یہ شعر نعت کے تسلسل سے الگ ہو جائے تو غزل کا شعر ہی معلوم ہوگا۔ اس کے باوجود متن کی تقلیب کا تأثر پیدا ہو رہا ہے۔

آیا ہوں آج آپ کا دربار دیکھ کر
''حیراں ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر''

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
(غالبؔ)

اس شعر میں ایاز صدیقی نے پہلا مصرع اس خوبی سے لگایا ہے کہ دوسرے مصرعے میں کیا جانے والا لفظی تغیر (جلتا ہوں کی جگہ حیراں ہوں) بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایاز نے نعتیہ تأثر اس قرینے سے پیدا کیا ہے کہ غالب بھی انھیں داد دیتے۔ یہ شعر تجدیدِ متن کی بہت اچھی مثال ہے۔

سوئے طیبہ لیے جاتی ہے حضوری کی لگن
''جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو''

(لیے جاتی ہے کہیں ایک تمنا غالب)۔ غالب کے ''کہیں'' کو ''سوئے طیبہ'' سے بدل کر ایاز صدیقی نے غالب کا مصرع نئی معنویت کے ساتھ اپنا لیا ہے۔

سبز گنبد کی زیارت کو ترستا ہوں ایاز
''واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے''

(کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم)۔ غالب نے خالص غزل کا شعر کہا تھا۔ ایاز صدیقی نے ''سبز گنبد'' کا حوالہ دے کر شعر کو نعتیہ تناظر دے دیا اور متن کی تجدید و تقلیب کی اچھی مثال پیش کی۔

ایاز صدیقی کے تضمینی عمل سے قبل غالب کے کسی قاری نے بھی غالب کے ان مصرعوں کو نعتیہ شعری تناظر میں نہیں دیکھا ہوگا، لیکن اب ان اشعار کی تجدیدِ متن اس طرح ہوئی ہے کہ معنیاتی تناظر بھی بدل گیا ہے اور مصرعوں کی قرأت کا اسلوب بھی یکسر تبدیل ہوگیا ہے۔ میں نے متن کے تغیر کو ظاہر کرنے کی غرض سے غالب کے وہ مصرعے بھی لکھ دیے ہیں جن کی جگہ ایاز صدیقی نے نعتیہ شعری تناظر میں مصرعے لگائے ہیں۔ ظاہر ہے ایاز صدیقی نے غالب کے شعروں کو غالب کے منشا کے مطابق قطعی نہیں پڑھا ہے۔ پھر انھوں نے غزل کا مزاج قائم رکھتے ہوئے ایسے محبوب کے ذکر کا بیڑا اُٹھایا ہے جس کے لیے پوری نعتیہ شاعری میں ایک مصرع ہی ضرب المثل کے طور پر دُہرایا جاسکتا ہے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

راغب مرادآبادی نے غالب کے ایک مصرعے پر گرہ لگا کر اس مصرعے کو اس طور اپنایا کہ ادب کے باذوق قاری اور بلند پایا نقاد ابوالخیر کشفی بھی کہہ اٹھے:

> غالب کا یہ شعر بہت خوب صورت ہے، لیکن راغب صاحب کی تضمین پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے غالب کا دوسرا مصرع سو سال سے زیادہ عرصے سے اس مصرعے کا منتظر تھا۔ غالب نے وحدۃ الوجود کی بات کی تھی۔ ذاتِ رب میں فنا ہو کر ہی مقامِ بقا پر پہنچنا مقصودِ حیات ہوسکتا ہے،

لیکن جہاں تک ہماری پہچان اور تشخص کا سوال ہے۔ اس کا رشتہ
حضور ﷺ سے ہے۔

اب راغب کا وہ شعر ملاحظہ ہو جس کی تعریف اتنے خوب صورت پیرائے میں کی گئی ہے:

جو سب سے محترم بعدِ خدا ہے
''ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا''

تجدیدِ متن کی یہ مثالیں قدیم متون کو نئے تناظر میں پڑھنے، سمجھنے اور تخلیقی عمل سے (جداگانہ اسلوب میں) گزارنے کے نتیجے میں سامنے آئی ہیں۔

اب ذرا وہ کاوشیں ملاحظہ ہوں جو کسی ایک ہی مصرعے کی تضمین میں اور تقریباً ایک جیسے متن کی بنت میں مختلف شعرا نے کی ہیں۔ سیّد علی حیدر نظم طباطبائی کی غزل کا ایک مصرع تھا:

ہنسے غنچے، کھلے گل، ابر تر اٹھا، نسیم آئی

اس مصرعے کو طرحی مصرع ٹھہرا کر نعتیہ مشاعرہ کیا گیا۔ شعرا کرام نے اس ایک مصرعے کی قرأت اس طور کی کہ کچھ نعتیں تو غیر مردف ہوئیں۔

یعنی ان نعتوں کا قافیہ ہی ''آئی''، ''پائی'' ٹھہرا۔ کچھ شعرا نے ''نسیم، سلیم'' کو قافیہ بنا کر ''آئی'' کو ردیف کے ذیل میں رکھا۔ کچھ شعرا نے ''اٹھا، پیدا'' وغیرہ قافیے کے طور پر استعمال کیے اور ردیف کو دو حرفی بنا دیا یعنی ''نسیم آئی'' دیگر شعرا نے ''ابرتر، معتبر'' کو قافیہ فرض کیا اور ''اُٹھا، نسیم آئی'' کو ردیف میں شامل کیا۔

اب مصرع طرح کی قسمت کس کس طرح چمکی اس کا انداز بھی دیکھتے چلیے:

۱۔ چمن میں رحمۃ للعالمیں کی آمد آمد ہے
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(محمد بشیر رزمی، لاہور)

۲۔ جہاں میں رحمتِ عالم نے جب کی بزم آرائی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابر تر اٹھا، نسیم آئی''

(جمیل عظیم آبادی، کراچی)

۳۔ ولادت میرے آقا کی بہارِ جاوداں لائی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابر تر اٹھا، نسیم آئی''

(رفیع الدین ذکی قریشی، لاہور)

۴۔ جب آئے آپ عالم میں تو لی موسم نے انگڑائی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(صدیق فتح پوری، کراچی)

۵۔ ابد تک ان چراغوں نے ترے در سے ضیا پائی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(قاری غلام زبیر نازش، گوجرانوالہ)

۶۔ بہ فیضِ عیدِ میلاد النبیؐ ہر شے دمک اٹھی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(خلش بجنوری، لاہور)

۷۔ محمد مصطفیؐ کی دیکھیے گا یوں پذیرائی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(ڈاکٹر عطاء الحق، انجم فاروقی، لاہور)

۸۔ شعاعِ نور ختم المرسلینؐ ہی کے توسل سے
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(عابد اجمیری، لاہور)

۹۔ سلگتے منظروں کو آپ نے بخشی وہ زیبائی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(صادق جمیل، لاہور)

۱۰۔ رسول پاک جب تشریف لائے بزمِ امکاں میں
''ہنسے غنچے ، کھلے گل ، ابرتر اٹھا ، نسیم آئی''

(حافظ محمد صادق، لاہور)

۱۱۔ ولادت باسعادت جب ہوئی میرے پیمبر کی
''ہنسے غنچے ، کھلے گل ، ابرتر اٹھا ، نسیم آئی''

(حافظ محمد صادق، لاہور)

۱۲۔ یہ کون آیا کہ خود فطرت نے بڑھ کر کی پزیرائی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(ضیا نیر، لاہور)

۱۳۔ ملی سرکارؐ کی آمد سے ہر اک شے کو رعنائی
''ہنسے غنچے، کھلے گُل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(رفاقت علی رفاقت سعیدی، کاموکے)

۱۴۔ حلیمہ اپنے گھر میں جب وہ رحمت کی گھٹا لائی
''ہنسے غنچے، کھلے گُل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(ڈاکٹر محمد ارشاد بھٹی، کاموکے)

۱۵۔ بہار بے خزاں آئی عرب کے خشک صحرا میں
''ہنسے غنچے، کھلے گُل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(منصور فائز، لاہور)

۱۶۔ انھی لفظوں کی برکت نے ہی مجھ سے نعت لکھوائی
''ہنسے غنچے، کھلے گُل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(اعجاز فیروز اعجاز، لاہور)

۱۷۔ جناب رحمت للعالمین تشریف جب لائے
''ہنسے غنچے، کھلے گُل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(محمد سلطان کلیم، لاہور)

۱۸۔ پڑھا ہوگا درود پاک بلبل نے کہ گلشن میں
''ہنسے غنچے، کھلے گُل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(ثاقب علوی، کاموکے)

۱۹۔ مرے سرکارؐ کے اس گلشنِ عالم میں آتے ہی
''ہنسے غنچے، کھلے گُل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(راجا رشید محمود، لاہور)

۲۰۔ لیا دستِ عقیدت میں جو میں نے خامۂ مدحت
''ہنسے غنچے، کھلے گُل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(راجا رشید محمود، لاہور)

۲۱۔ حرا سے جب سوئے مکہ نبوت کی شمیم آئی
''ہنسے غنچے، کھلے گُل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(محمد حنیف نازش قادری، کاموکے)

۲۲۔ نبیؐ پاک کی مکہ میں جب ذات رحیم آئی
"ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی"

(رفیع الدین ذکی قریشی، لاہور)

۲۳۔ بہاروں کے پیمبر کی جو گلشن میں ہوئی آمد
"ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی"

(سحر فارانی، کاموںکے)

۲۴۔ جو گھر میں آمنہ کے رحمتِ رب کریم آئی
"ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی"

(یونس حسرت امرتسری، لاہور)

۲۵۔ "ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی"
نبی تشریف لائے دہر میں بادشمیم آئی

(حافظ غلام رسول ساقی، گوجرانوالہ)

۲۶۔ درودِ مصطفیٰؐ محمود ہونٹوں پر جونہی آیا
"ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرِ تر اٹھا، نسیم آئی"

(راجا رشید محمود، لاہور)

۲۷۔ نویدِ جانفزا مولود پیغمبرؐ کی سنتے ہی
"ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی"

(راجا رشید محمود، لاہور)

۲۸۔ جو بعثت مصطفیٰ صلِ علیٰ کی حق نے فرمائی
"ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی"

۲۹۔ جو ہاتف نے خبر سرکارؐ کی آمد کی پھیلائی
"ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی"

۳۰۔ بہار گلشنِ امکاں سر فاراں جو مسکائی
"ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی"

۳۱۔ جہانِ آب و گل میں تھی نبیؐ کی جلوہ آرائی
"ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی"

۳۲۔ یہ تھی مولودِ محبوبِ خدا کی کار فرمائی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

۳۳۔ ربیع الاوّل آیا تو خزاں محمود شرمائی
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، نسیم آئی''

(گرہ بند نعت، راجا رشید محمود، لاہور)

۳۴۔ تجھے دیکھا تو سب کو اپنے ہونے کا یقیں آیا
''ہنسے غنچے، کھلے گل، ابرتر اٹھا، بہار آئی''

(غضنفر جاود چشتی، گجرات)

ایک مصرعے پر گرہ لگانے کی ۳۳ مثالیں ہیں۔ صرف ایک شاعر نے نسیم آئی کے بجائے بہار آئی لکھ کر مشقِ سخن کی ہے۔ ان تمام مثالوں میں صرف نو مصرعے (نمبر شار ۵، ۸، ۹، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۰، ۲۶ اور ۳۰) ایسے ہیں جن کا متن ولادت، آمد، مولود، یا حلیمہ سعدیہ کے گھر حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے مختلف ہے۔ باقی تمام تضمینی مصرعے ایک ہی متن یعنی آمد، بعثت یا حضرت حلیمہ کے گھر میں حضور ﷺ کی تشریف آوری کے حوالے سے شعری بنت میں آئے ہیں۔ اس طرح کی مشقِ سخن سے نعت گوشعرا کا اجتماعی رویہ جھلکتا ہے کہ غنچوں کے ہنسنے، پھولوں کے کھلنے، ابر تر کے اٹھنے اورنسیم کے چلنے کی سرشاری کے مضمون کو صرف اور صرف حضور ﷺ کی آمد، آپ کی ولادت با سعادت اور آپ کی بعثت کے تناظر ہی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ایسے تمام مصرعوں کی بنت میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہے، لیکن سارے مصرعے ایک ہی متن کے مختلف اسالیب کے آئینہ دار ہیں یعنی آج کی تنقیدی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب مصرعے ایک ہی متن کے رشتے میں منسلک ہیں ان میں Inter-Textual Relationship قائم ہے۔ ظاہر ہے شعرا نے نظم طباطبائی کے دوسرے مصرعے کو نہ تو جاننے کی سعی کی ہوگی اور نہ ہی اس شعر کے مکمل متن کی پیروی کا خیال رکھا ہوگا۔ اس طرح تمام شعرا نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ متن کی قرأت کے ضمن میں وہ اصل شاعر کے منشا کے نہ تو پابند ہیں اور نہ ہی اس کے بُنے ہوئے متن کا صدفی صد تتبع کرنے کے لیے تیار ہیں۔ راجا رشید محمود صاحب نے تو پورا ''گرہ بند نعت'' ہی سرکار علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی آمد کے متن کی روشنی میں قلم بند فرما دیا۔

ایسی شاعری میں مسابقت کے ہزار ہا پہلو ہوتے ہیں اس لیے ان تمام شعری کاوشوں میں بہتر Poetic discourse یا شعری مکالمہ اسی شاعر کا ہوسکتا ہے جس نے زبان و بیاں اور

اسلوب کی طرفگی کے ساتھ ساتھ طرحی مصرعے کے معنوی تیوروں کا خیال رکھا ہے۔ جن شعرا نے سرکارﷺ کی آمد کے مضمون سے ذرا مختلف بات کی ہے ان کا متن کہیں بہتر ہوگیا ہے اور کہیں سیاق سے ہٹ بھی گیا ہے۔ بہر کیف مجھے فی الحال شعرا کی تضمینی کوششوں کو درجہ بندی کے خیال سے نہیں پرکھنا ہے، صرف متنی رشتوں کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ ایک ہی متن کے مختلف شعری لونی عکس Shades کو درج بالا مثالوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

بین المتنی تناظر میں تجدید متن کی ایک مثال تابش دہلوی کا یہ شعر ہے:

میں عاصی آپ سر تا پا شفاعت
یہ رشتہ آپ سے محکم بہت ہے

اس شعر کا متنی رشتہ ساجد اسدی کے اس شعر سے قائم ہوتا ہے:

ہے درخشاں ایک پہلو یہ مری تقدیر کا
واسطہ ہے ان کی رحمت سے مری تقصیر کا

اور ساجد اسدی کا یہ شعر غالب کی زمین میں ہے:

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غزل ہے جس کا مطلع نعتیہ ہے:

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

اور مقطع ہے:

دل و دیں بردی و ہوش و خرد و صبر و قرار
دگراز خسرو بے دل چہ تمنا داری؟

خسرو کی اس غزل کا مطلع پچھلی سات صدیوں سے زیادہ مدت سے ہمارے نعتیہ شعری منظر نامے پر اپنے معنوی رنگ بکھیر رہا تھا، لیکن اس کے متن کی تجدید نہیں ہوسکی تھی یا اس خوبی سے اس متن کی تجدید نہیں ہوسکی تھی جس خوبی سے جمیل نقوی مرحوم و مغفور کے شعری عمل میں ممکن ہوئی ہے۔ جمیل نقوی نے اس مطلع کے متن کو اس طور اپنایا ہے اور اس کو اس قدر وسعت دے دی ہے کہ یہ متن ہی ان کا ہوگیا ہے، فرماتے ہیں:

آپ کے اور محاسن بھی ہیں بے حد و شمار
حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا کے سوا

اس ضمن میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

"آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کہنے والے نے بھی حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ اور یدِ بیضا کو مثال کے طور پر پیش کیا تھا اور ان اجزا سے دوسرے ان کے محاسن کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "خوباں" کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے، مگر جمیل نقوی نے "کے سوا" کے ٹکڑے سے مضمون چمکا دیا ہے۔

تجدیدِ متن کی اس بہترین مثال کے بعد میں مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔ نعتیہ شاعری کے گلشن میں ایک متن کے ہزار ہا پھول کھلے ہوئے ہیں جو اس بات کی دلیل فراہم کرتے ہیں کہ "ماترک الاوّل للاخر شیاء" (پہلوں نے دوسروں [بعد میں آنے والوں] کے لیے کچھ نہیں چھوڑا)۔ ہاں جودتِ طبع سے رائج متون میں اسلوبیاتی اور فکری سطح پر اضافے ممکن ہیں اور یہی رشتے تلاش کرنے کے لیے میں نے نعتیہ ادب کا کچھ مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہوسکتا ہے مستقبل میں نئی تھیوری کی روشنی میں مجھ سے بہتر نقاد کچھ زیادہ گہرے نتائج فکر پیش کرنے کے قابل ہو جائیں اور یوں نعتیہ ادب میں بھی سنجیدہ مسائل پر غور و فکر کی طرح ڈالی جا سکے!

کتابیات

۱۔ ایاز صدیقی، ثنائے محمد ﷺ، (ایاز صدیقی، ۳۰۲۔بی گلگشت، ملتان) ۱۹۹۳ء۔

۲۔ تابش دہلوی، تقدیس (ادب گاہ ناظم آباد، کراچی ۱۹۸۵ء)

۳۔ جمیل نقوی، ارمغانِ جمیل (ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ، ڈی ۱۱۸، سائٹ، کراچی) ربیع الاوّل ۱۴۰۵ء

۴۔ راجا رشید محمود، ماہ نامہ "نعت"، جلد ۱۶، شمارہ ۹ (اظہر منزل، چوک گلی نمبر ۵/۱۰، نیو شالا مار کالونی، ملتان روڈ، لاہور) اکتوبر ۲۰۰۳ء

۵۔ ساجد اسدی، پیامبر مغفرت (ا۔جی ۴۔۱۰، ناظم آباد، کراچی) ۱۹۷۵ء

۶۔ صبیح رحمانی، نعت رنگ، شمارہ ۹ (۲۵۔ای ٹی اینڈ ٹی فلیٹس، فیز ۵، شاد مان ٹاؤن، نمبر ۲ شمالی کراچی، مارچ ۲۰۰۰ء

۷۔ ضمیر علی بدایونی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت (ایک ادبی و فلسفیانہ مخاطبہ)، (اختر مطبوعات، اے۔۷۰ بلاک ۱۷، فیڈرل بی ایریا، کراچی) ۱۹۹۹ء

۸۔ غلام رسول مہر، نوائے سروش [مکمل دیوان غالب مع شرح] (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور) س۔ن

۹۔ گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، بھارت) دسمبر ۱۹۹۳ء

کاشف عرفان

اُردو نعت نگاری پر مابعد جدیدیت کے اثرات

اُردو نعت نگاری پر مابعد جدیدیت کے اثرات کے جائزے سے قبل اس حقیقت سے آگاہ ہونا ضروری ہے کہ خود مابعد جدیدیت کا جدیدیت اور روایت سے کیا رشتہ ہے؟ پھر اس سوال پر غور کیا جانا بھی ضروری ہے کہ مابعد الطبیعیات ادب میں سائنس اور طبیعیات کے کن اصول و ضوابط کو تخلیق کے رشتے سے منسلک کرتی ہے۔ روایت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت ایک تاریخی تناظر میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ روایت ایک خاص تناظر میں جدیدیت کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ روایت کو ادب کی کسی بھی صنف میں مکمل علاحدگی میں جاکر نہیں دیکھا جاسکتا کیوں کہ روایت خود صنفِ ادب میں موجود اُس لفظی و معنوی نظام کے ادغام سے وجود میں آتی ہے جس کا رشتہ تاریخ سے جڑتا ہے۔ روایت صنفِ ادب سے علاحدہ اپنا کوئی نفسیاتی نظام نہیں رکھتی، بلکہ یہ صنف کے اندر حیاتیاتی تغیرات سے وجود میں آتی ہے۔ حیاتیات کا لفظ صنفِ ادب کے اندر ہونے والے اُن عوامل کی وضاحت کرتا ہے جو ارتقائی عمل کو باضابطہ بناتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ روایت کے حوالے سے ٹی ایس ایلیٹ کیا کہتے ہیں:

> شاعر کے اپنے ماضی کے ساتھ رشتے کی بہتر وضاحت کے لیے یہ کہوں گا کہ وہ ماضی کو ایک بے جان اور غیر مربوط انبار شمار نہیں کرسکتا نہ ہی وہ اپنی ذاتی پسند سے اُس کی تعبیر کرسکتا ہے..... شاعر کو ماضی کے دریا کے اصل دھارے کا شعور ہونا لازمی ہے۔[☆۱]

گویا روایت ماضی کے دریا کے اصل دھارے کا شعور ہے۔ ماضی کا یہ دھارا صرف ادبی تخلیقات یا ادبی شخصیات کی مختلف تحریروں کا حصہ ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس کی جڑیں سماجیات

☆۱۔ مضمون ''روایت اور نئی تخلیق''، ٹی ایس ایلیٹ مشمولہ ''نئی تنقید''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

میں بھی موجود ہوسکتی ہیں۔ روایت یہ نہیں کہ تاریخ کے دو دھاروں کے درمیان موجود ادبی شخصیات کے فن پاروں کو سامنے رکھ کر تقابل کیا جائے، بلکہ روایت ہمیں اس اجتماعی تغیر پذیر ذہن کا پتا دیتی ہے جو خود آگاہ حال کو ماضی کے دریچوں تک لے جاتا ہے۔

روایت کا عمل ارتقائی ہے، یعنی یہ کسی تاریخی منظر نامے میں بنائے گئے ادبی منصوبے یا فکری نظریے کا پابند نہیں ہوتا۔ روایت کا تعلق ثقافت کے ساتھ گہرا ہے۔ ادب اور ثقافت کی بنیاد ایک ہی ہے اور روایت اس بنیاد کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا روایت اور جدیدیت کے تناظر میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> اردو ادب میں مابعد جدیدیت کے اثرات کے تحت کچھ چیزیں تخلیق ہوئی ہیں مگر ان میں سے بیشتر شعوری کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اردو ادب کو جدیدیت اور ہائی موڈرن ازم نے نسبتاً زیادہ متاثر کیا ہے۔[☆۲]

روایت سے جدیدیت کا سفر انسانی اذہان کی پیچیدگی کا مظہر ہے۔ ماہرینِ علوم بشریات اس بات پر متفق ہیں کہ معاشرتی سطح پر تبدیل ہوتی ہوئی صورتِ حال اور سائنس کی روز افزوں ترقی نے انسانی ذہن پر علم کے دریچے ہی وا نہیں کیے، بلکہ ذہنی ساخت میں کچھ پیچیدہ تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ اس تبدل و تغیر کے زیرِ اثر روایت سے جدیدیت کی جانب سفر کا آغاز ہوا۔ جدیدیت کا تعلق زمین سے ہے۔ ارضی سطح پر ان عوامل کی تلاش جدیدیت کا موضوع ہوتا ہے جو کسی انسان کو اصل تک لے جاتی ہیں۔ گویا انسان کی اپنی جڑوں کی تلاش خود جدیدیت کا موضوع ہے۔

اگر ہم جدیدیت کو مختصراً بیان کرنا چاہیں تو تین چار نکات فوری ذہن میں آتے ہیں:

- ☆ زمین سے رشتہ اور جڑوں کی تلاش اور اجتماعی شعور سے آگاہی
- ☆ نفسیات کی مدد سے لاشعور میں جھانکنے کا عمل جو لاشعور سے اجتماعی لاشعور تک پہنچتا ہے
- ☆ اساطیری حوالوں سے ادب کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش
- ☆ جدیدیت لفظ و معنی کے رشتے تلاش کرتی ہے، جدیدیت کا تعلق ساختیات سے ہے

اردو شاعری کے حوالے سے جب ہم جدیدیت کے ان نکات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں اقبال کے ہاں اجتماعی شعور اور لاشعور کو سمجھنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے؟
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

☆۲۔ مضمون ''جدیدیت اور مابعد جدیدیت'' ڈاکٹر وزیر آغا مشمولہ ''معنی اور تناظر'' مکتبہ نردبان سرگودھا، دسمبر ۱۹۹۸ء

طلوع ہے صفتِ آفتاب اُس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں

یا دوسری جگہ مسلم اجتماعی شعور کو کچھ اس طرح چھوتے نظر آتے ہیں کہ انفرادی لاشعور تک پہنچ جاتے ہیں:

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے اِمروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

جدیدیت سے مابعد جدیدیت کا سفر ایک تیز رفتار ریل گاڑی سے مشاہدے کی مانند ہے جہاں رفتار تیز ہونے کے باعث منظر اپنی اصل آشکار ہونے نہیں دیتا۔ اگر مابعد جدیدیت کو پھر نکات کی صورت میں بیان کیا جائے تو منظر کچھ یوں بنے گا:

☆ مابعد جدیدیت زمانے کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی، نظریاتی اور ادبی کروٹوں کے پھیلتے ہوئے آفاق سے ہم رشتہ ہونا ہے۔

☆ مابعد جدیدیت، جدیدیت کا ردِعمل ہے۔ جدیدیت ادب کی ارضی سطح سے مشاہدہ ہے، جب کہ مابعد جدیدیت آفاقی سطح سے معائنہ ہے۔

☆ مابعد جدیدیت تخلیق کے اندر اور باہر کی دنیا کے درمیان ہم آہنگی کی تلاش کا نام ہے۔

☆ آفاقیت اور وسعت مابعد جدیدیت کی ایک اہم کڑی ہے۔

☆ لامحدودیت، مابعد جدیدیت کو جدیدیت سے ممتاز کرتی ہے۔

☆ مابعد جدیدیت کائنات کی حدود میں پھیلاؤ اور کائنات کی لامحدودیت کو سمجھنے کا عمل ہے۔

☆ مابعد جدیدیت تاریخ، عمرانیات اور لسانی رشتوں کا مطالعہ کرتی ہے۔

(نعت نگاری میں تاریخی تناظرات اور عمرانیات کے علوم کے زیرِاثر عرب معاشرے سے برِصغیر کے تہذیبی تعلق کو سمجھنے کی کوشش مابعد جدیدیت کا موضوع رہی ہے۔)

☆ مابعد جدیدیت زندگی کی پیچیدگی کو ادب کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش ہے۔

☆ معنی کی کثرت مابعد جدیدیت کا اہم موضوع ہے۔

نعتیہ میدان میں مابعد جدیدیت کے حوالے سے اقبال کی شاعری اُس آفاقی سطح کو چھوتی نظر آتی ہے جس کی جانب مابعد جدیدیت کا نظریہ اشارہ کرتا ہے۔ اردو میں نعتیہ تنقید کو سب سے بڑا مسئلہ یہی درپیش رہا کہ اُس نے اقبال کو معیار اور مرکز مان کر بات کو آگے بڑھانے کے

بجائے ایسے کلام پر گفتگو کی جو خود اُس درجے کو نہیں چھوتا جہاں شعر آفاقیت حاصل کر لیتا ہے۔ مابعد جدیدیت کا ایک اہم نکتہ کائنات کی حدود میں پھیلاؤ اور کائنات کی لامحدودیت کو سمجھنے کے عمل سے متعلق ہے۔ اردو نعت میں کائنات کی لامحدودیت کو اللہ کے حکم سے تسخیر کرنے کا عمل واقعۂ معراج میں نظر آتا ہے۔ اردو نعت میں واقعۂ معراج کو مختلف سطحوں پر مختلف شعرا نے بیان کیا ہے۔ اِس موضوع کے بیان میں عام طور پر شعرا ندرتِ بیان اور نزاکتِ خیال کے ساتھ فکری گہرائی کا احساس نہیں رکھ پاتے۔ یوں بہت سے عمدہ نعت گو بھی افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

سیّد عارف کا اسی موضوع پر ایک خوب صورت شعر دیکھیے:

میں اُس کی وسعتوں کو لفظ پہناؤں تو کیا جس کا
زمیں پر اک قدم ہے دوسرا افلاک سے آگے
(سیّد عارف)

واقعۂ معراج کو وسعتِ کائنات اور لامحدودیت کے حوالے سے سائنسی اور منطقی طور پر سمجھنے کی کوشش ہمیں دوسرے کئی شعرا کے ہاں نظر آتی ہے، تاہم اقبال اس حوالے سے بھی سرخیل ٹھہرتے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
(اقبال)

مابعد الطبیعیات اور طبیعیات کے درمیان موجود آفاقی رشتے کی کڑیاں معراجِ مصطفیٰ ﷺ سے ہی دریافت ہوتی ہیں اور اقبال اِس کے منطقی استدلال کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ معراجِ مصطفیٰ ﷺ کو مختلف شعرا کرام نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا۔ تاہم اس کا عظمتِ انسان اور معراجِ انسانیت کا پہلو اُس طرح سے سامنے نہیں آیا جیسے اقبال نے اسے پیش کیا۔ توقیر احمد ملک اپنے ایک مضمون ''معراجِ مصطفیٰ ﷺ کے فکرِ اقبال پر اثرات'' میں لکھتے ہیں:

کلامِ اقبال میں استعمال ہونے والے رموز و علائم کی نظریاتی اساس بھی منبعِ انوار ہے۔ اس باب میں اقبال نے دو طرح کے وسائل بطورِ خاص استعمال کیے ہیں۔ اوّل مظاہرِ فطرت میں سے نورانی پیکر مستعار لیے ہیں اور دوم تصوف کی اصطلاحات کو اپنے تمام تر روایتی جمال کے ساتھ بھی برتا ہے اور نئے معنی بھی عطا کیے ہیں۔''☆۳

☆۳۔ سہ ماہی جریدہ ''جدیدیت اور مابعد جدیدیت''، ڈاکٹر وزیر آغا مشمولہ ''معنی اور تناظر'' مکتبہ نردبان سرگودھا، دسمبر ۱۹۹۸ء

اقبال کے تتبع میں اور ان سے قبل بھی اردو نعت میں مختلف شعرا نے واقعۂ شبِ معراج کولفظوں کی شکل دی۔ روایتی کلام کی تعداد زیادہ ہے تاہم مابعد جدیدیتی نظریات اور عظمتِ انسان کا پہلو کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیں:

علیم اختر مظفر نگری کے لہجے کی انفرادیت دیکھیں:

تغیرات کے پردے اٹھا رہا ہے کوئی
متاعِ تابِ نظر آزما رہا ہے کوئی

رئیس بدایونی فرماتے ہیں:

کیا سمجھے راز کوئی معراجِ مصطفیٰ کے
ہیں خلوتِ دنا میں مہمان وہ خدا کے

ضیاء القادری بدایونی کا انداز اگر چہ روایتی ہے، تاہم موضوع اور فن پر گرفت قابلِ تحسین ہے:

جلوے صفات و ذات کے ہر سمت چھا گئے
سلطانِ عرش ، عرشِ معلیٰ پہ آگئے

شاہ انصار الہ آبادی کی نعت کا یہ شعر دیکھیے:

شبِ معراج ہیں توحید کی محفل کا چراغ
کیوں نہ آئینہ ہو آئینہ نگر آج کی رات

آئینہ نگر کی ترکیب نے شعر کے صوتی اور معنوی حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔

مابعد الطبیعیات کو دریدا (Dareda) نے آزاد کھیل سے تشبیہہ دی تھی، لیکن یہ آزاد کھیل بھی اُن معنوں میں آزاد نہیں تھا جن میں اصول وضوابط کارفرما نہیں ہوتے۔ مابعدالطبیعیات کا منطق سے بہت گہرا تعلق ہے اور منطق اصول وضوابط کے بغیر وجود نہیں پاسکتی۔ خود سائنس بھی عوامل کی منطقی وجوہات تلاش کرنے کا ہی نام ہے۔ مابعد الطبیعیات بنیادی طور پر خدا، انسان اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی کو تلاش کرنے کا نام ہے۔

خدا

کائنات انسان

مابعد جدیدیت کی اہم ترین کڑی مابعد الطبیعیات ہے۔ انسان دوستی، قدروں کی بقا کی خواہش، محبت اور موجود کو ماورا سے جوڑنے کے نظریے کو مابعد الطبیعیات کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ خدا اور انسان کے رشتے کو کائنات کی وسعت میں سمجھنے کا عمل ہے۔ خود نعت بھی نبیِ

اکرم ﷺ کی شخصیت اور خدا سے ان کی محبت کو سمجھنے کا عمل ہے۔قرآن کریم میں ورفعنا لک ذکرک کہہ کر اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اس بات کا یقین دلا دیا کہ آپ کی سیرت وصورت اور کردار کی شان قیامت تک بیان کی جاتی رہے گی، دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے اور رسول ﷺ کے لیے اپنی محبت کا اظہار بھی فرما دیا۔ نبیِ اکرم ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو اور آپ کے کردار و افعال کی شان کا بیان رہتی دنیا تک کیا جاتا رہے گا۔

مابعد الطبیعیات کائنات کے بڑے اسرار سے پردہ اٹھانے اور کائناتی عوامل کو سمجھنے کے لیے ایک آلۂ فکر و اظہار ہے۔نعت کے شعرا کے ہاں عمومی سطح پر ذاتی فکری حوالوں کے ذریعے بات کہنے کا رجحان موجود ہوتا ہے، لیکن یہ ذاتی حوالے مابعد جدیدیت کے نظریے کی نعت کے شعبے میں تشریح کرتے نظر آتے ہیں۔سیّد ابوالخیر کشفی کی ایک نعتیہ نظم دیکھیں جو ذات سے کائنات تک کا سفر کرتی ہوئی معنوی سطح پر آفاقی حصار بنانے میں کامیاب نظر آتی ہے:

سب لفظوں کا مفہوم
''عرش''
''کرسی''
''زمان اور مکاں''
''کائنات''
کتنے بڑے لفظ ہیں یہ
اور ان کے مفاہیم..... ہمارا اور کائنات کا مقدر ہیں
''ہم''، ''میں'' یہ لفظ بھی ایسے ہی ہیں
مگر ان کا کوئی مفہوم نہ ہوتا
یہ لفظ موتی سے خالی صدف کی طرح ہوتے
اگر محمد ﷺ نہ ہوتے
محمد ﷺ..... ان سب لفظوں کا مفہوم ہیں
سلام اُن پر، درود اُن پر ☆۴

مابعد جدیدیت کے مفاہیم کو سامنے رکھیں تو آفاقی اشاروں سے سجی اِس کائناتِ رنگارنگ میں انسان مرکز کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے اور انسانوں کی نمائندگی انسانوں میں سب سے بہتر

☆۴۔ نسبت (نعتیہ مجموعہ)، سید ابوالخیر کشفی، اقلیم نعت کراچی، ۱۹۹۹ء، صفحہ ۹۴

انسان اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ (جن کے لیے یہ کائنات بنائی گئی) کرتے ہیں۔ عظمتِ انسان کا یہ پہلو کشفی صاحب سے قبل اقبال کے ہاں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ ساختیاتی تجزیے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ عرش، کرسی، وقت اور خود کائنات اپنے بڑے مفہوم کے باوجود اپنی ادھوری شناخت رکھتے تھے اور پھر اِس شناخت کی تکمیل کے لیے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی آمد ہوتی ہے اور یوں کائنات کو ایک پہچان مل جاتی ہے۔ نظم کا مصرع:

اور ان کے مفاہیم..... ہمارا اور کائنات کا مقدر ہیں

وقت، کائنات اور انسان کے درمیان نئے رشتوں کی وضاحت کرتا ہے۔

کائنات

وقت انسان

کائنات، وقت اور انسان تینوں ہی اللہ کی مخلوقات ہیں، لیکن حضرت محمد ﷺ سے قبل کی دنیا اِس رشتے کی معنویت سے آگاہ نہیں تھی۔ وقت کے ازل سے ابد تک کے سفر میں انسان کی حیثیت کا تعین آسان نہ تھا اور پھر آقا کریم ﷺ کی تشریف آوری نے وقت اور کائنات کے اسرار کو انسانوں کے سامنے کھولنا شروع کر دیا۔ سائنس آج بھی وقت اور کائنات کے رازوں کی دریافت کے لیے کوشش جاری رکھے ہوئے ہے، لیکن اُس کو حتمی فیصلے کے لیے قرآنِ حکیم اور سیرتِ رسول ﷺ سے مدد لینی ہوگی کہ سچا نظریہ اپنی اصل میں منبعِ علوم سے جاملتا ہے۔ اسٹیون ہاکنگ نے اپنی معروف کتاب "وقت کا سفر" میں اپنی ان کوششوں کے بارے میں لکھا ہے:

> اگر ہم ایک مکمل وحدتی نظریہ دریافت کر لیں تو یہ صرف چند سائنس دانوں کے لیے نہیں، بلکہ وسیع معنوں میں ہر ایک کے لیے قابلِ فہم ہوگا۔ پھر ہم سب فلسفی، سائنس دان بلکہ عام لوگ بھی اِس سوال پر گفتگو میں حصہ لے سکیں گے کہ ہم اور یہ کائنات کیوں موجود ہیں؟ اگر ہم اس کا جواب پا لیں تو یہ انسانی دانش مندی کی حتمی فتح ہوگی کیوں کہ تب ہم خدا کے ذہن کو سمجھ لیں گے۔[☆۵]

سائنس اور فلسفہ خدا کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش میں عرصۂ دراز سے مصروف ہیں۔ یونانی فلسفیوں ارسطو، سقراط اور افلاطون کے ہاں یہ کوشش موجود رہی، لیکن تین ہزار سال سے اب تک انسانی فکر اِن بڑے سوالات کے حل کے لیے صرف اپنے فہم پر بھروسا کرتی رہی ہے۔ مذہب

☆۵۔ وقت کا سفر، اسٹیون ہاکنگ، مشعل لاہور، ۱۹۹۸ء، صفحہ ۲۱۹

سے علاحدہ ہوکر کسی بھی کائناتی سوال کا حتمی جواب تلاش کرنا ممکن نہیں کہ کائنات کی معنوی تفہیم کے لیے انسان اللہ کریم کے پیغامات کا ہمیشہ محتاج رہا۔ اردو شاعری میں بڑی اور مابعد الطبیعیاتی فکر کو سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کے تناظر میں دیکھنے کا رجحان نمایاں نہیں ہوسکا۔ وجوہات بہت سی ہیں، لیکن بڑی وجہ علومِ دین اور علومِ دنیا کی غیر فطری تقسیم ہے۔ مذہبی حلقوں کے لیے یہ بات قابلِ قبول نہ تھی کہ منطق اور فطرت کے اصولوں پر مبنی نئی کائناتی تفہیم سامنے آئے۔ یوں شعر کی روایتی شکل آسان اور مغلوب ذہنوں کے لیے قابلِ فہم تصور ہوئی اور تن آسانی نے فکر کی مشکل تہوں میں جھانکنے کو قابلِ اعتنا نہ جانا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نعت میں نعتیہ نظم کو اُس طرح فروغ نہ ملا جو نعتیہ غزل (غزل کے فارمیٹ میں کہی گئی نعت) کو حاصل ہوا۔ حمد اور نعت میں نئے تجربات بھی مابعد جدیدیت کا حصہ رہے ہیں۔ مابعد جدیدیت بنیادی طور پر زمان و مکاں کے مسائل کو پیش کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کا نام ہے، لہٰذا یہ مکمل منطقی اور سائنسی اندازِ فکر کا دوسرا نام ہے۔ زمان و مکاں کے حوالے سے آفتاب کریمی نے اپنی کتاب ''قوسین'' میں ایک حمدیہ نظم (واکا— جاپانی صنفِ شعر) پیش کی ہے جس میں مشرق اور مغرب کو زمانی حالت کے طور پر بھی لیا ہے اور علامتی سطح پر مشرق کو قرآنی احکامات کی روشنی میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے:

(حمدیہ نظم) واکا

اے ربِ مشرق و مغرب، خدائے واحد و یکتا
تری عظمت کے چرچوں میں
تری مدحت کے نغموں میں
یہ ''واکا'' اک اضافہ ہے
مجھے مشرق کی بابت ہے خدا کا حکم قرآں میں
یہیں سورج ابھرتا ہے
یہیں سے دن نکلتا ہے
زمیں کا یہ وہ خطہ ہے
نہیں ہے جس کے پیچھے اوٹ☆[۶]

مشرقِ بعید کے ملک جاپان کی صنفِ نظم کو نعت میں استعمال کرنے کا یہ اوّلین تجربہ ہے، تاہم مشرق اور مغرب کی معنوی حیثیت کا بیان نعت کے موضوعات میں ایک نیا اضافہ ہوسکتا

☆۶۔ قوسین، آفتاب کریمی، اقلیمِ نعت، کراچی ۲۰۰۵ء، صفحہ ۱۳۸

تھا اگر اس کا بیان ذرا بہتر ہوتا۔ مصرع: ’’مجھے مشرق کی بابت ہے خدا کا حکم قرآں میں‘‘ کی وضاحت سورج کے ابھرنے اور دن کے نکلنے سے نہیں ہو پاتی۔ بہر حال ’’واکا‘‘ کو انھوں نے نعت بنایا جو ہیئتی سطح پر ایک مستحسن عمل ہے۔ غزل میں یہ کارفرمائیاں بہت سی اصناف اور ہستیوں کے حوالے سے ہوتی رہی ہیں، لیکن نعت کا روایتی شعر گوایسے کسی تجربے سے بہت گھبراتا ہے۔ اِس کی ایک بڑی وجہ اُس کی اپنی نفسیاتی کیفیات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نعت میں سیرت رسول ﷺ کے تناظر میں بڑے فلسفیانہ سوالوں کے جواب یا ان سوالات کی معنوی تفہیم پر مبنی شاعری سامنے نہیں آسکی۔

مابعد جدیدیت مذہب، منطق اور سائنس کے درمیان اُس نکتۂ مشترکہ کی تلاش ہے جہاں علوم کے درمیان مذہبی اور غیر مذہبی کی غیر فطری اور غیر منطقی تقسیم کا اختتام ہو جاتا ہے۔ مغرب میں سولھویں صدی کے بعد اٹھنے والی نشاۃِ ثانیہ کی تحریک بنیادی طور پر علوم کو منطقی سطح پر سمجھنے کی کوشش تھی، لیکن روایتی مذہبی حلقے نے اسے اپنے خلاف محاذ قرار دیا۔

ڈاکٹر صلاح الدین درویش لکھتے ہیں:

> اس نشاۃِ ثانیہ کی تحریک کے باعث انسان دوستی کا جو نظریہ منظرِ عام پر آیا وہ مذہبِ عیسائیت کے خلاف ہرگز نہ تھا اور نہ ہی اس کا مقصود مذہبی تعلیمات کی نفی کرنا تھا، بلکہ انسان دوستی کی یہ تحریک جن روشن خیال کلاسیکی فلاسفروں کی تحریروں کو زندہ کرنا چاہتی تھی، ان کی اشاعت کے باعث جو صورتِ حال پیدا ہوئی مذہبی حلقوں نے اسے اپنے خلاف ابھرنے والا محاذ قرار دے دیا۔☆۷

اُردو نعت کی روایتی صورتِ حال اِس سے مختلف نہیں کہ بہت کوشش اور محنت کے بعد عمومی ادبا نے اب نعت کو ایک صنفِ سخن کی حیثیت دے دی اور تنقیدی سطح پر کچھ بڑے ناموں نے نعتیہ تخلیقات پر اظہارِ خیال شروع کر دیا ہے۔ یہی مابعد جدیدیت کے نظریے کی کامیابی ہے کہ روایت سے علاحدہ نئے معاشرتی علوم اور منطقی استدلال کے ذریعے حمد اور نعتیہ تخلیقات پر بات کا آغاز ہو رہا ہے۔

نعت کے موضوعات سیرتِ رسول ﷺ کا آئینہ ہوتے ہیں۔ حُسنِ ازلی کا ادراک اور اُسے دیکھنے اور محسوس کرنے کی خواہش کا بیان صوفیائے کرام کی متصوفانہ شاعری کی بنیاد بنتا ہے اور یہی ادراک اور خواہش مابعد جدیدیت کے نظریے کے زیرِ اثر عمومی سطح پر مذہبی شاعری کا مرکزی نکتہ بھی ہوتی

☆۷۔ انسان دوستی (نظریہ اردو تحریک) پورب اکادمی اسلام آباد ۲۰۰۷ء صفحہ ۱۳

ہے۔سلیم کوثر کے حمدیہ اشعار ذاتی تأثر کے ساتھ اِسی حُسنِ ازلی کا بیان کرر ہے ہیں:

وہ رات سے دن کشید کرتا ہے، دھوپ سے چھاؤں کاڑھتا ہے
چراغ تخلیق کرنے والے نے تیرگی کو بہم کیا ہے
نہ کام میرا نہ نام میرا نہ علم میرا ہے اور پھر بھی
وہ مجھ میں پوشیدہ قوتوں کو عجب طرح سے ابھارتا ہے
سلیم آغاز بھی اُسی سے، سلیم انجام بھی اُسی پر
وہ وقت میری اذان کا تھا، یہ وقت میری نماز کا ہے☆[۸]

مابعد جدیدیت شعریت کو فکری و فنی ہر دو سطحوں پر یکساں اہمیت دیتی ہے۔ ڈاکٹر توصیف تبسم کا نام ادبی حلقوں میں معروف ہے۔غزل، نظم، نعت، تنقید اور تحقیق تمام شعبوں میں نام کمایا ہے۔نعت کے اِس معروف شعر کے خالق ہیں:

اے روشنیِ مقامِ محمود!
سورج ترے سائے میں کھڑا ہے

عزیز احسن ڈاکٹر توصیف تبسم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر توصیف تبسم کا شمار بھی ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے جو کوچۂ غزل سے حلقۂ مداحانِ مصطفیٰ ﷺ کی طرف آئے ہیں چناں چہ ان کی شعری اقدار کے بارے میں تو بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ وہ مکمل طور پر ادبی اسلوب کی حامل ہیں☆[۹]

ڈاکٹر توصیف تبسم مذہبی شاعری میں ایک بالکل مختلف اپروچ کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔اُن کے ہاں مابعد جدیدیت کے نظریے کا پھیلاؤ ذات سے کائنات تک نظر آتا ہے۔ایک نظم کا ٹکڑا ملاحظہ کریں:

عجب نغمۂ سرمدی ہے
کہ جیسے یہاں
وقت بھی سانس روکے ہوئے چل رہا ہو

نظم ''انوارِ مدینہ'' جادۂ زندگی کو روشن کرنے کی بات استعاراتی سطح پر کرتی ہے جہاں

☆۸۔ میں نے اسمِ محمد ﷺ کو لکھا بہت، سلیم کوثر، امیرہ پبلی کیشنز کراچی ۲۰۱۵، صفحہ ۲۴

☆۹۔ نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے، نعت ریسرچ سنٹر کراچی، ۲۰۱۵، صفحہ ۳۲۲

راستے میں ہزار ہا دشتِ ظلمت آتے ہیں۔ وقت کے سانس روک کر چلنے کا استعارہ اُس احترام کی کیفیت کا بیان ہے جہاں محبت اور عقیدت ذات سے ہوتی ہوئی کائنات تک پھیل جاتی ہے۔ مابعدالطبیعیات ہمیں وقت کی ماہیت کی مختلف سطحوں سے بھی روشناس کرواتی ہے۔ کائنات میں وقت کا تصور (جدید سائنسی تحقیق کے مطابق) خود اضافی (Relative) ہے۔ اضافی سے مراد ایسی اشیا جن کی پیمائش کے پیمانے مختلف اوقات یا مقامات پر مختلف ہو جائیں۔ وقت کی جہات مختلف اوقات یا مقامات پر اللہ کے حکم سے مختلف ہونے کا عمل ہمیں قرآنِ کریم میں تین مختلف واقعات سے ملتا ہے:

☆ پہلا واقعہ حضرت عزیرؑ کا ہے۔ یہ واقعہ قرآن پاک کی سورۃ البقرہ کی آیت ۲۵۹ میں بیان ہوا ہے۔

☆ دوسرا واقعہ نبیِ اکرم ﷺ کا واقعۂ معراج ہے۔ واقعۂ معراج سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں بیان ہوا ہے۔ اللہ کے حکم سے وقت کا موجودہ پیمانوں کے مطابق ٹھہر جانا اور نبیِ اکرم ﷺ کا معراج سے واپس آنے تک کنڈی کا ہلتے رہنا اور آپ ﷺ کے بستر کا گرم رہنا وقت کی اسی جہت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

☆ تیسرا واقعہ اصحابِ کہف کا ہے۔ یہ واقعہ سورۃ الکہف کی آیت ۹ سے آیت ۲۵ تک بیان ہوا ہے۔ اس واقعے میں بھی وقت کا موجودہ پیمائش کے مطابق ٹھہرنا ثابت ہے۔[☆۱۰]

تینوں واقعات میں وقت کی تفہیم اُس پیمانے کے مطابق نہیں ہوئی جو ہماری دنیا میں رائج ہے گویا موجود اور ماورا کے درمیان وقت کی گم شدہ کڑیوں کی دریافت اِن تینوں واقعات کی بنیاد بنتی ہے۔ ربِ کریم نے اپنے محبوب بندوں کے لیے موجود پیمانوں میں تبدیلی کی اور وقت کو اُن محترم شخصیات کی خاطر ٹھہرایا جس کا بیّن ثبوت ہمیں قرآن میں ملتا ہے۔

اقبال کے مذکورہ بالا شعر میں پہلی بار انسانوں میں سب سے کامل انسان اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کے معراج پر تشریف لے جانے سے سائنسی، منطقی اور ارضی سطح پر ایک نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال کے فلسفۂ عشق اور فلسفۂ تحرک کی روشنی میں اگر اس شعر پر غور کیا جائے تو یہ شعر معراجِ مصطفیٰ ﷺ کے تناظر میں عظمتِ انسان اور معراجِ انسانیت کی بات کرتا نظر آتا ہے۔

وقت کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے روحانی اور مابعدالطبیعیاتی نظام کے متوازی سائنس نے

☆۱۰۔ اردو فکشن میں وقت کا تصور، ڈاکٹر ناہید قمر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

بھی ایک مختلف نظام وضع کیا ہے جو طبیعیات میں تجرباتی بنیادوں کو مَس کرتا نظر آتا ہے۔ آئن اسٹائن نے طبیعیات میں ایک نظریہ پیش کیا جسے آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافت (Theory of Relativity) کہا جاتا ہے جسے طبیعیاتی شکل میں کچھ یوں لکھا جاسکتا ہے:

Energy = Mass x (speed of light)

$$E = M \times C^2$$

توانائی = مادّہ x (روشنی کی رفتار)

مادّہ اور توانائی کے درمیان رشتے کو سائنسی، منطقی اور تجرباتی سطح پر ثابت کرنے سے وقت کی ماہیت کو سمجھنے کے ایک نئے عمل کا آغاز ہوا۔ یہ نظریہ ہمیں وقت کے ایک نئے پہلو سے آگاہ کرتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان اگر روشنی کی رفتار کے مربع (C) سے سفر کرنے کے قابل ہوجائے تو وہ اپنی مادّی حیثیت کو تبدیل کر کے توانائی کی لہروں میں تبدیل ہوجائے گا گویا وہ اپنی مادّی شکل وصورت کے بجائے توانائی کی لہروں یا بنڈلز کی صورت اختیار کرلے گا۔ ایسی حالت میں وہ مادّے کی نسبت لاکھوں گنا تیز رفتاری سے سفر کر سکے گا۔ اِس بات کو ایسے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر انسان کسی بھی طرح توانائی کی لہروں میں تبدیل ہوجائے تو وہ روشنی کی رفتار سے سفر کرنے کے قابل ہوسکتا ہے۔

نبیِ اکرم ﷺ کے واقعۂ معراج کو عارف عبدالمتین نے کچھ یوں دیکھا:

مرحلے تیرے سفر کے تھے ازل اور ابد
جادۂ وقت سے آگے ترا جادہ دیکھا

جادۂ وقت سے آگے جادۂ محمد ﷺ کو دیکھنے کا یہ عمل وقت کی ماہیت کے اِس تغیر وتبدل کو سمجھنے کی کوشش بھی ہے۔ آئن اسٹائن کی تھیوری آف ریلیٹیویٹی سائنس کے بعد وقت کے حوالے سے آج نئے نئے انکشافات کررہی ہے۔ زمان ومکاں کے حوالے سے یہ انکشافات کائنات میں وقت کے عمل کو سمجھنے کے نئے دَروا کررہے ہیں۔ سائنس اور منطق آج ہمیں بتا رہی ہے کہ سورج کی روشنی (یاد رہے کہ سورج بھی ایک ستارہ ہے) ہماری زمین تک آٹھ منٹ بیس سیکنڈ میں پہنچتی ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ کسی بھی جسم سے نکلنے والی روشنی کے باعث ہماری آنکھیں اُسے دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ روشنی کا سفر ہمیں ہر بار آٹھ منٹ بیس سیکنڈ پرانا سورج دکھاتا ہے بالکل اسی طرح لاکھوں نوری سال کے فاصلے پر موجود ستاروں کو بھی ہم دیکھ سکتے ہیں۔ جن ستاروں کی روشنی ہماری آنکھوں تک یا ہماری زمین تک ایک لاکھ سال میں پہنچتی ہے انھیں ہم ایک لاکھ سال ماضی میں

دیکھتے ہیں۔ اس کو زیادہ آسانی سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک لاکھ نوری سال کے فاصلے پر موجود ستارے کو ہم ایک لاکھ سال ماضی میں دیکھتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے زمین تک اُس کی روشنی کے پہنچنے کے دوران وہ ستارہ مختلف فلکیاتی اور کائناتی تغیرات کے باعث ختم ہو چکا ہو، لیکن ہماری آنکھیں اُسے اس لمحے میں دیکھتی ہیں جب روشنی اُس ستارے سے سفر کا آغاز کررہی تھی۔ وقت کے اِس ماضی اور حال کے درمیان سفر کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقت کی حیثیت ریلیٹو ہے۔ اب آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافت اور وقت کے متعلق اِس نظریے نے ہمیں معراجِ مصطفیٰ ﷺ کو سائنسی اور منطقی طور پر بہتر طریقے سے سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے۔ سائنس کے اِن نئے نظریات نے مابعد الطبیعیات اور طبیعیات کے مابین ایک ہم آہنگی پیدا کردی ہے۔‘‘☆۱۱

حنیف اسعدی کا ایک شعر اِسی موضوع سے متعلق ہے:

سوچیں تو روحِ عصر کے ادراک کے بغیر
معراج کیسے آئے کسی کے گمان میں

یہ شعر پہلے بھی کئی بار پڑھا تھا۔ عقیدت و محبت کے جذبات دِل پر اثر انداز ہوئے، لیکن سچ پوچھیں تو شعر کی گرہیں کھل نہ پائیں۔ مابعد جدیدیت کے نظریے اور طبیعیاتی سائنس کی دریافتوں کے باعث ’’روحِ عصر کا ادراک‘‘ ہوا تو معلوم ہوا کہ وقت کی حیثیت اِس کائنات میں مستقل نہیں۔ زمان و مکاں ایک خاص طرح کے جبر میں رہتے ہوئے بھی آزاد ہیں۔ حال موجود میں رہتے ہوئے بھی پیچھے ماضی کی جانب اور آگے مستقبل کی طرف اللہ کے حکم سے ہاتھ بڑھا سکتا ہے۔

انسان کی عظمت کے حوالے سے اقبال یوں رقم طراز ہیں:

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

شکیب جلالی نے شاید ایسے ہی کسی لمحے کی آزادی کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا:

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

لیکن شکیب جلالی کا تجربہ ایک عام آدمی کا تجربہ تھا، اِس لیے شعر میں ’’تازہ لہو کے چھینٹے‘‘ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ حدودِ وقت سے آگے نکلنے کا عمل اللہ کی مدد سے انبیائے کرام یا اللہ کے برگزیدہ بندوں کے لیے تو روا ہوسکتا ہے، لیکن اِس تجربے سے کسی دوسرے انسان کا گزرنا ناممکن

☆۱۱۔ وقت کی ماہیت کے حوالے سے سائنسی معلومات طبیعیات کے حوالے سے مختلف ویب سائٹس سے لی گئیں۔

ہے۔

واقعۂ معراج کو مابعد الطبیعیاتی سطح پر سمجھنے کے لیے پھر اقبال کی جانب رجوع کرنا پڑے گا:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اِس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اقبال کا یہ شعر کائنات کی وسعت اور پھیلاؤ کو عظمتِ انسان کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کے ایک قدم کا فاصلہ بھی کائنات کے پھیلاؤ سے زیادہ ہے۔ اگر اللہ کی مدد سے سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کے ایک غلام اقبال کے عشق کا ایک قدم زمین و آسماں کی وسعتوں کو چھو سکتا ہے تو پھر امام الانبیا کی اللہ کے حکم سے آسمانوں کی سیر اور رب سے ملاقات عین برحق بھی ہے اور امت کے لیے رب کا انعام بھی۔ اللہ کی اپنے محبوب سے محبت کا یہ عالم کہ جہاں وقت کو موجود اور ماورا کے درمیان معلق کر دیا جائے اور زمان و مکاں کو کائناتی نظم و ضبط سے آزاد کر دیا جائے صرف واقعۂ معراج میں ہی نظر آتا ہے۔ وقت کی رفتار کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے روکنا بھی نبیِ کریم ﷺ اور امتِ نبیِ اکرم ﷺ کے لیے ایک تحفہ تھا جو ہمیں ربِ کریم کی بارگاہ میں شکر بجالانے کا پیغام بھی دیتا ہے اور اِس پر غور و فکر کی دعوت بھی۔

مابعد جدیدیت زمانے کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی، نظریاتی اور ادبی کروٹوں کو اپنے عہد کے تناظر میں دیکھنے کا عمل ہے۔ اردو نعت نگاری کا رشتہ جہاں برِصغیر کی مٹی سے ہے وہیں عرب کی سرزمین سے بھی ہے۔ برِصغیر کی ثقافت اور زبان کا رچاؤ جتنا امام احمد خان بریلویؒ کے ہاں نظر آتا ہے شاید ہی کسی شاعر کے ہاں فنی سطح پر یہ رچاؤ موجود ہو۔

آفاقی شاعری کی ایک خاص خوبی اُس کا علامتی پیرایہ ہوتی ہے۔ شاعری میں وسعت پیدا ہی اُس وقت ہوتی ہے جب شاعر شعوری سطح پر علامت کو تہذیبی عنصر کے طور پر برتے۔ مابعد جدیدیت جس آفاقیت اور وسعت کی بات کرتی ہے وہ شاعری میں علامت کے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہونے سے حاصل ہوتی ہے:

غالب کا ایک شعر ہے:

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اِس قدِ دل کش سے جو گل زار میں آوے

استادِ محترم جناب ڈاکٹر عبدالعزیز ساحؔر (ہیڈ آف اردو ڈیپارٹمنٹ، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد) نے دورانِ گفتگو اِس شعر کے علامتی اظہار کو ایک نئے زاویے سے دیکھا۔

انھوں نے فرمایا کہ غزل کے اِس شعر میں دنیاوی محبوب کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ یہ محبوب، محبوبِ خدا حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے طویل قامت کے باعث سرو کی علامت اُن سے منسوب ہے جب کہ صنوبر مناسب قامت کے باعث حضرت علیؑ کی شخصیت کی علامت ہے اور شعر کی تشریح ایک منظر پر مبنی ہے، جب نبیِ اکرم ﷺ اپنے ظاہری جمال کے ساتھ بازارِ مدینہ میں تشریف لاتے تو حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ ان کے ساتھ ساتھ چلا کرتے تھے۔ اب علامتی اظہار کے معنی کے لحاظ سے تہہ داری ہمیں اِس شعر کی بُنت میں نظر آ رہی ہے۔

علامتی اظہار کے ساتھ ساتھ شاعر کا تاریخی تناظرات سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔ شاعری ایسا فن ہے جسے علم سے جلا ملتی ہے۔ نعتیہ شاعری میں تاریخی حقائق کا درست صورت میں آنا ضروری ہے۔ تلمیحات کا درست اور برمحل استعمال شعر کی قدر متعین کرنے کا باعث بنتا ہے۔ تلمیحات کے حوالے سے اردو شاعری سے کچھ مثالیں ذہن میں آتی ہیں:

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
(حالؔی)

لازم نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
(غالبؔ)

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں
(میرؔ)

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
(اقبالؔ)

تلمیح اشعار میں کسی تاریخی واقعے، مقام یا شخصیت کی جانب اشارہ ہوتا ہے۔ تلمیح کا درست استعمال پورے منظر، مقام یا شخصیت کی تصویر آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے۔ حالؔی کے شعر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن کے بھائیوں کی جانب سے کنویں میں دھکا دینے کے

واقعے کا ذکر ہے، غالبؔ کے شعر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پہاڑ پر خدا کی تجلّی کو دیکھنے اور پھر اُس نور کی شدت سے پہاڑ کے جل جانے کا ذکر ہے، میرؔ کے شعر میں مغل عہد کے آخری حصے میں فرخ سیئر نامی بادشاہ کو تخت کے امیدواروں کی جانب سے اندھا کردینے کا ذکر ہے جب کہ اقبالؔ کے شعر میں آدم کا خلد سے نکلنے اور دنیا میں آنے کی قرآنی کہانی کا ذکر ہے۔ اِسی حوالے سے غالبؔ کا ایک شعر یاد آتا ہے:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

نعت نگاری میں تلمیحات کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ تاریخی واقعات کے حوالے سے اقبال کا تنقیدی شعور بہت بلند تھا۔ اقبال کے ہاں مکمل عنوان کے ساتھ نعت کم کم ہی ملتی ہے، لیکن:

لوح بھی تُو قلم بھی تُو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

جیسے اشعار جہاں اُس کی نبیِ اکرم ﷺ سے محبت کا ثبوت دیتے ہیں وہاں اُس کے تاریخ، ثقافت اور زبان پر عبور کا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ اسی نعت میں وہ کہتے ہیں:

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید بایزید تیرا جمالِ بے نقاب

نعت کے اِس شعر میں خلافتِ عثمانیہ کے بادشاہوں کے جلال کو مثال بناتے ہوئے جمال اور محبت کے پیکر صوفیائے کرام حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کی زندگی اور فلسفۂ حیات کے ساتھ ساتھ اُن بزرگانِ دین کی حضرت محمد ﷺ سے محبت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے، تلمیح کی یہ ایک خوب صورت مثال ہے۔ اقبال اِس نعت میں پرشکوہ الفاظ اور پرجلال ماحول کے ذریعے ایک ایسا افق بنانے میں کامیاب ہوئے جہاں جلال اور جمال کے ملنے کا خوب صورت منظر پیدا ہوتا ہے۔ اسی نعت میں وہ آگے کہتے ہیں:

شوق اگر ترا نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

محبت اتنی شدت کے ساتھ اقبال کے ہاں نبیِ اکرم ﷺ کے لیے خصوصی طور پر جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اِس پوری نعت میں جلال اور بزرگی کا عنصر کچھ اِس طرح چھایا ہوا نظر آتا ہے کہ اِسے سنتے یا پڑھتے ہوئے گنبدِ خضریٰ کی سرسبز چھاؤں اور سنہری جالیوں کی روشنی آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔

انھی نعتیہ اشعار میں آگے چل کر اقبال کہتے ہیں:

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب

تاریخی حقائق کا شاعرانہ زبان میں بیان فکری گہرائی کے ساتھ کچھ آسان کام نہیں۔ اقبال کے ہاں لسانی سطح پر اپنے دور کے دوسرے ہم عصر شعرا سے ایک مختلف تجربہ ملتا ہے۔ اُن کی شاعری کی فنی سطح پر بلندی لفظ کا علامت کی سطح پر استعمال ہونا ہے۔ لفظ اپنی ہیئت بدلتا ہے اور سات رنگوں کے نگینے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اِس نعتیہ شعر کا پہلا مصرع لفظوں کی اِسی ہمہ جہتی کی مثال ہے۔ ''عالمِ آب و خاک'' کو نبیِ اکرم ﷺ کی آمد سے حاصل ہونے والی سربلندی اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ منعکس ہوتی نظر آتی ہے اور سچ پوچھیں تو دل پر اثر کرتی ہے۔ جمالِ محمدی ﷺ اور جلالِ الٰہی کی مثال شاید ہی اردو نعت میں کہیں نظر آئے۔

آخری شعر میں اقبال عقل اور عشق کا موازنہ نعت کے تناظر میں کچھ یوں کرتے ہیں:

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

اقبال کے ہاں فکری سطح پر ایک خاص طرح کا توازن دکھائی دیتا ہے جسے مومن کی شان بھی کہتے ہیں۔ اقبال کے ہاں دو طرح کے فلسفے اُن کی پوری شاعری اور نثر میں دکھائی دیتے ہیں۔

فلسفۂ عشق

اس فلسفے کا تعلق مومن کی فکری زندگی سے ہے۔ خودی اور بے خودی اِسی فلسفے سے نکلنے والی وہ ندیاں ہیں جنھوں نے عالمِ اسلام کو سیراب کیا۔ اس فلسفۂ عشق کی بنیاد وہ عشقِ رسول ﷺ کو قرار دیتے ہیں۔ ساقی (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) سے کچھ یوں مخاطب ہوتے ہیں:

تُو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی
(اقبال)

فلسفۂ تحرک

اقبال کے ہاں دوسرا اہم فلسفہ تحرک کا ہے۔ اِس کا تعلق مومن کی جسمانی زندگی سے

ہے۔فکر یا نظریے پر عمل کا دار و مدار اسی فلسفۂ تحرک کا مرہونِ منّت ہوتا ہے۔ اِسی فلسفے کے تحت وہ ایک ایسے اسلامی معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں جہاں عدل و انصاف اور محبت ہر انسان تک پہنچتی تھی۔ پاکستان کو اِسی فلسفے کی عملی تصویر بنا تھا لیکن.....

نعت میں تلمیحات کی چند مثالیں دیکھیں:

اورنگِ سلیماں کے لیے رشک کا باعث
اے سیّدِ کونین ترے در کی چٹائی
(میاں اویس مظہر)

ستم ترکِ وطن کے جو سہے سب بھول جاتے ہیں
ہمیں یاد آتی ہے مکّے سے جب ہجرت محمدؐ کی
(بیدل جونپوری)

دستِ کرم سے تھم گئیں منبر کی سسکیاں
دیکھا شجر نے آگئی رفتار پاؤں میں
(اشفاق انجم)

مابعد جدیدیت ایک متن پر دوسرے متن کی تخلیق کے رجحان کو اہمیت دیتی ہے۔نعت نگاری میں ایک متن کے حوالے سے متن میں دوسرے تخلیقی رجحان کو علامت نگاری کے حوالے سے دیکھا جاسکتا ہے۔شاعری میں علامت تخلیقی بنیادوں پر آتی ہے، لہٰذا لفظ ہمہ جہت ہوجاتا ہے اور اُس کے کئی معنی لیے جاسکتے ہیں۔ اِس حوالے سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی رائے بڑی دل چسپ ہے:

میرے نزدیک اِس سے بڑی جہالت اور کوئی نہیں کہ کوئی شخص تخلیقی لفظ کی تلاش لغت کی کتاب میں کرے۔لغت کی کتاب میں اِس لفظ کا جو کسی تخلیقی فن پارے میں آتا ہے صرف ڈھانچا ہوتا ہے۔ اُس کی پوری ذات نہیں ہوتی۔☆[۱۲]

آفاقی شاعری میں لفظ منشور یا Prism سے نظر آنے والے رنگوں کی طرح نظر آتا ہے۔منشور میں روشنی کی شعاع ایک طرف سے داخل ہوتی ہے اور دوسری طرف سے سات رنگوں میں تقسیم ہوکر باہر دیکھنے والی آنکھ کو نظر آتی ہے۔ بڑی علامتی شاعری میں لفظ معنی کی کئی تہیں بناتا

☆۱۲۔ مضمون ''تخلیقی صلاحیت''، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مطبوعہ ''نئی شاعری'' (مُرتبہ افتخار جالب) نئی مطبوعات لاہور ۱۹۶۶ء،

ہے اور شعر لفظوں کی اِسی ہمہ جہتی کے باعث آفاقیت اور کلاسیکی درجہ حاصل کر لیتا ہے۔یاد رہے کہ علامت تشبیہہ اور استعارہ سے مختلف ہے۔ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے الفاظ میں علامت کی تعریف دیکھتے ہیں:

علامت مخفی تصورات کے وسیع ترین نظام کی مجمل ترین شکل ہے۔ یہ بھی دراصل تشبیہہ کے خاندان سے ہے اور کسی نہ کسی جہت سے مشابہت کا رابطہ اس میں کارفرما ہوتا ہے۔[☆۱۳]

علامت ایک واضح وجود ہے جو لفظوں میں اپنی معنویت پوشیدہ رکھتا ہے۔ علامت لفظوں میں پوشیدہ ہونے کے باوجود اِس کی شناخت صرف لغت سے ممکن نہیں، بلکہ لفظ یا اصطلاح کو معنوی پس منظر، ماحول (جہاں یہ لفظ استعمال ہوا) اور تاریخی تناظر میں شناخت کیا جاتا ہے۔ غزل میں علامت کے استعمال کی کچھ مثالیں دیکھیں:

خموش ہوں تو مجھے اتنا کم جواز نہ جان
مرے بیان سے باہر بھی ہیں سبب میرے
(جمالِ احسانی)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری کا
(میؔر)

آواز دے رہے ہیں درِ دل پہ وسوسے
ہر گام ایک کوہِ ندا ہے ہمارے ساتھ
(سجاد باقر رضوی)

ملی ہے اِس لیے خلعت کہ میں نے زیرِ عبا
چلا تھا گھر سے تو شمشیر بھی پہن لی تھی
(محمد اظہار الحق)

اردو نعت نگاری میں علامت کا گہرا اور تہذیب میں گندھا ہوا استعمال خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اِس کی بنیادی وجہ شعرا کی تن سہل اور سامع کی آسان پسندی ہے۔نعت خوانی میں ایسے کلام کا چناؤ جس کی شاعرانہ حیثیت مسلّم نہ ہو عوامی مزاج کے بگاڑ کا سبب بنا پھر اردو غزل کا بڑا شاعر نعت کی جانب آنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا رہا۔ ان سب وجوہات کے باوجود ایسا نہیں کہ

☆۱۳۔ اردو افسانے میں علامت نگاری، ڈاکٹر اعجاز راہی، ریز پبلی کیشنز، مری روڈ، راولپنڈی، دسمبر ۲۰۰۲ء

اردو نعت میں بڑی علامتی شاعری بالکل ہی نہیں ہوئی۔ اردو نعت نگاری میں علامت کے استعمال کی چند مثالیں دیکھیں:

سیرت ہے تری جوہرِ آئینۂ تہذیب
روشن ترے جلووں سے جہانِ دل و دیدہ
(حفیظ تائب)

فروغِ جاں بھی وہاں ہے، فراغِ خاطر بھی
جہاں جہاں بھی تری روشنی کا ہالہ ہے
(انور مسعود)

لیل و نہار آپ کے در کے طواف میں
لوح و قلم ہے آپ کی مدحت کا آئنہ
(محمد اقبال نجمی)

میں اُسی روز سے منسوب تری ذات سے ہوں
جب کہ جبریلِ امیں بھی ترا دربان نہ تھا
(حافظ مظہر الدینؒ)

اُردو نعت نگاری میں مابعد جدیدیت سے متعلق جو موضوعات وقتاً وقتاً شامل ہوتے رہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

☆ حسنِ ازلی کا ادراک اور بیان
☆ انسان دوستی
☆ آفاقیت اور وسعتِ کائنات کے تناظر میں محمد ﷺ کی سیرت کا بیان
☆ سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کے تناظر میں تہذیبی عناصر کی دریافت
☆ سیرتِ نبی ﷺ کے حوالے سے جدید عہد میں مسلمان ذہن پر پڑنے والے پیچیدگی کے اثرات۔

سیرتِ پاک سے تمام انسانوں کو انسان دوستی کا جو عالم گیر پیغام ملتا ہے اُس پر بات کی جانی ضروری ہے۔ اردو نعت نگاری میں مختلف شعرائے کرام اس موضوع پر کام کر رہے ہیں، تاہم ابھی بہت سا کام کیا جانا باقی ہے (آج ۲۰۱۴ء میں اسلام پر اٹھنے والے سوالات کے جوابات دینے کے لیے انسان دوستی کے پہلو پر لکھنا ہم تنقید نگاروں اور شعرا پر لازم ہو جاتا ہے)، انسان

دوستی کے حوالے سے فتحِ مکہ کا دن انسانی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جانے والا ہے، جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنے تمام دشمنوں کو معاف کر دیا۔ رحمۃ للعالمین سرکارِ دوعالم ﷺ نے ابوسفیان جیسے واضح اور کھلے دشمن کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ ان کے گھر کو جائے امن بھی قرار دیا۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی ایسا کہیں ہوا ہو کہ اپنی بیٹی اور چچا کے قاتلوں کو بھی اللہ کی رضا کی خاطر انسانی بنیادوں پر عام معافی دی گئی ہو۔ فتحِ مکہ کے حوالے سے مجھے اپنے چار مصرعے یاد آتے ہیں:

اک عہد تھا چٹائی سے آدھی کھجور تک
پہنچے حضور کیسے مقاماتِ نور تک
مکہ کی فتح دین کا رخشندہ باب ہے
بخشے گئے تھے قتلِ عمد کے قصور تک

اکیس ویں صدی کے آغا میں نائن الیون (۹/۱۱) نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے مسائل کے انبار لگا دیے۔ دنیا تہذیبی ٹکراؤ کے دہانے تک پہنچ چکی ہے۔ آج خصوصاً عراق، شام افغانستان، ایران اور پاکستان کے مسلمان عیسائی دنیا کی نفرت کا شکار ہیں۔ اُس پر زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ مسلمان متحد نہیں ہیں۔ فرقہ بندی اور مسالک کی جنگ نے ہمیں تنہا کر دیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں نے استعماریت کے خلاف اپنی اپنی جنگ شروع کر دی ہے۔ دین کی جس شکل کو جس نے پسند کیا، اُس پر نہ صرف خود عمل شروع کر دیا بلکہ ساتھ ہی بہ زورِ بازو دوسرے کو بھی اِسی شکل پر عمل کرنے پر مجبور کیا۔ یوں ہم مسلمان نفرتوں کے ایک ایسے جنگل میں گم ہو گئے ہیں جہاں سے ہمیں صرف سیرتِ محمد ﷺ ہی نکال سکتی ہے۔ اِسی حوالے سے صبیح رحمانی کی ایک نعتیہ نظم دیکھیے:

اے نویدِ مسیحا دعائے خلیل
نفرتوں کے گھنے جنگل میں شہا
عہدِ حاضر کا انسان محصور ہے
مشعلِ علم و اخلاق سے دور ہے
کتنا مجبور ہے
اے نویدِ مسیحا
دعائے خلیل
روک دے نفرتوں کی جو یلغار کو

پختگی ایسی دیں میرے کردار کو
آپ کا لطف و رحمت تو مشہور ہے

انسان دوستی کے عناصر کا نعت میں شامل ہونا شعرا سے بہت سے مطالعے اور ریاضت کا متقاضی ہے۔ سیرتِ پاک کا مطالعہ اور آپ کی زندگی کے اُن گوشوں کو اردو نعت کا حصہ بنانا اور لوگوں تک پہنچانا نہایت ضروری ہے جہاں ابھی شعرا کی نظر نہیں پہنچی۔ نعت کے شاعر کا تخیّل بلند ہونے کے باوجود اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ عمومی شاعری اور نعتیہ شاعری میں فرق کے حوالے سے عزیز احسن کہتے ہیں:

> نعت کی زبان، فصاحت، بیان، متانتِ اظہار، ادراکِ رسالت اور تفہیمِ کارِ نبوت کا نمائندہ ہو اور مقصدِ اظہار، ترویجِ منشائے رب العزت، تبلیغِ دینِ متین اور دفاعِ ناموسِ رسالت ٹھہرے اور مجموعی تأثر اتباعِ محبوبِ رب العالمین کے جذبوں کو بیدار کرنے والا ہو۔☆[۱۴]

زبان و بیان میں پاکیزگی کا تعلق جہاں عقیدت و احترام سے ہے وہاں فکری گہرائی، علمی سربلندی سے نصیب ہوتی ہے۔ مطالعہ اور مسلسل مطالعہ ہی سے انسانی ذہن کو وہ بالیدگی حاصل ہوتی ہے جو بڑی شاعری کی بنیاد بنتی ہے۔ یہ عمومی اصول نعت نگاری میں بھی کارفرما ہے۔ نعت کے شاعر کے لیے قرآنِ حکیم اور سیرت پاک ﷺ کا مطالعہ ازحد ضروری ہے۔

اب آخر میں صرف ایک نکتے پر بات کرنا چاہوں گا جس کی ضرورت آج کے تناظر میں پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ہے ترجمہ نگاری کی روایت۔ اردو کے نعتیہ ادب کو اگر دنیا کے دوسرے لوگوں تک پہنچانا ہے تو ہمیں اپنی نعتیہ شاعری اور نعتیہ تنقید کو اردو سے انگریزی کے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔ علوم کے پھیلانے میں ترجمہ ہر دور میں اہم رہا ہے۔ عرب میں قدیم مصر، روم اور ایران کی کتب ترجمہ ہوئیں تو اہلِ عرب زبان اور فکر کی بلندی تک پہنچے۔ نعت ریسرچ سینٹر نے اِس روایت کا آغاز کیا ہے جس کے لیے صبیح رحمانی اور ان کے احباب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اُن سے ایسے کسی عمل میں جس سے قرآن اور سیرتِ نبی ﷺ کا علم دنیا کے کونے کونے میں پہنچے، خود کو شامل کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

☆۱۴۔ نعت کی تخلیقی سچائیاں، ڈاکٹر عزیز احسن، نعت ریسرچ سنٹر کراچی، مارچ ۲۰۰۳ء

پروفیسر محمد فیروز شاہ

نعت میں جدید طرزِ احساس

زمانہ بدلتی رُتوں کا آشیانہ ہے۔

وقت سدا رواں دواں رہتا ہے، جواں رہتا ہے۔ اس کی جوانی لمحوں کی روانی اور تغیر و تبدل کی جولانی سے عبارت ہے اور اس کا آغاز و انجام نبی ﷺ، خیرالانام کے قدومِ میمنت لزوم کے صدقے میں اپنے وجود کے معلوم و معدوم کا ادراک کرتا ہے۔ حضورِ مکرم ﷺ کی نبوت ہر زمانے کی جبیں اور ہر زمیں کے آسمان پر تاباں و درخشاں رہے گی۔ اس لیے سرکار ﷺ کی نعت بھی ہر دور کی زندگی میں تابندگی کا طور منور کرتی رہے گی۔ یہ وہ آفاقی صداقت ہے جو ہر عہد کی پیشانی کو تابانی عطا کرتی ہے۔ ممتاز اسکالر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر رقم طراز ہیں:

> نعت کے دائرے کو محدود سمجھنا درست نہیں، کیوں کہ جتنا دائرہ حضور ﷺ کی نبوت و رسالت کا ہے، اُتنا ہی دائرہ اُن اوصافِ حمیدہ کا ہے جو نعت پر کام کرنے والوں کی کوششوں سے انسانیت تک پہنچ رہے ہیں۔ تمام اسلامی زبانوں میں نعت اور سیرت پر سب سے زیادہ ذخیرہ اردو زبان میں ہے۔ (ماہنامہ ''نعت'' لاہور، اگست/ستمبر ۱۹۹۸ء، ص ۵۸)

اور جب ہم اس بے بہا ذخیرۂ نعت پر عقیدت مندانہ نگاہ ڈالتے ہیں تو گہرہائے اَن مول کی چکاچوند کے سامنے زمانے بھر کی روشنیاں ماند پڑنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ صرف ایک ہی ابد تاب روشنی باقی رہ جاتی ہے بلکہ ہر شے پر چھا جاتی ہے۔ پھر یہ صدق نصیب روشنی لہو کی روشنائی میں گھل کر قلم کی توانائی بنتی ہے تو زندہ لفظ وجود میں آتے ہیں۔ عصری دانائی جن کی تابندہ گواہی سے نمود پاتی ہے اور محبتوں کے سدابہار گلاب کھل اُٹھتے ہیں... وہ گلِ نوبہار جن کی آغوش میں پرورش پانے والی نگاہوں میں خواب اور انقلاب کا فرق مٹ جاتا ہے اور آرزو کامران زبانوں کی خوش بو سے مملو

ہوکر عہد بھر کو سرخ رُو کر دیتی ہے۔ میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے...نعت، درِ حبیب ﷺ پر پلکوں سے دستک دینے کا عمل ہے۔ جسے یہ قرینہ نصیب ہوگیا اس کا نصیبہ کھل گیا... زمانوں، جہانوں اور آسمانوں تک اس کے جذبوں اور لفظوں کی مہکاریں پھیل گئیں۔ خالقِ کون و مکاں کی رحمتوں کی پھواریں اس کی ہستی کو عشق سے سرشار سرمستی میں شرابور کر گئیں اور وہ خوش بخت اپنے لکھے حرفوں کے عقیدت نامے محبوبِ خدا و کائنات کے دربارِ عالیہ میں پیش کر کے رازِ حیات پا گیا۔ راز محبوب ﷺ سے منسوب ہوکر حیات بھر کا اعزاز بن جاتا ہے... یہیں سے سرفراز زیست کا آغاز ہوتا ہے جو دوام لمحوں کی برکتوں سے جگمگا رہی ہوتی ہے کہ عزت و ذلت جس کے ہاتھ میں ہے اس نے ہمیشہ ذکرِ محبوب ﷺ کو ہمیشگی کی سند عطا کی ہے۔ و رفعنا لک ذکرک کے سربلند پرچم تلے ثناخوانِ مصطفےٰ ﷺ زندگی کرنے کا عہد کرتا ہے تو جاوداں ساعتوں کی بشارتوں میں اس کا نام ارفع مقام کی وہ ضمانت حاصل کرلیتا ہے جسے دستِ اجل بھی چھو نہیں سکا کبھی! یہ سلسلۂ خیر و برکت وہ چشمۂ محبت ہے جس کی دوامیت کو استناد خالقِ کائنات نے عطا کر دیا۔ ہر زمانے کی سرزمین پر محبتوں کی رفعتوں کا علم لہرا دیا...اب وقت کیسے ہی رنگ بدلے عشقِ رسول ﷺ ہر لمحے کی اُمنگ کو ترنگ عطا کرے گا! رنگ بدلتے منظروں اور رُوپ نکھرے موسموں کے آنگن میں ماہِ طیبہ کا اُجالا ہر عہد کا روشن تر حوالہ بن کر زندگی کو تابندگی کی سوغات بانٹتا رہے گا۔ الحمدللہ... یہ سوغات ہم فقیروں کے کاسۂ خیرات کو وہ تنویر عطا کر رہی ہے جو تازہ کار صبحوں اور تر و تازہ پھولوں کے اشتراک سے خیر و مسرت کا ادراک تخلیق کرتی ہے۔ یہ فروغِ نعت کا دور ہے۔ ہر لمحہ سرکار ﷺ کے نعلینِ پا کی دُھول سے کامرانی کے پھول حاصل کرتا ہے اور جدید دور کے نئے طور سے ہم آہنگ ہوکر عقیدتوں کے خوش رنگ گلوں کے سنگ زندگانی کو دائمی شادمانی سے ہم کنار کرتا ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں نعتِ محبوب ﷺ لکھنے/ پڑھنے والے خوش مقدر عمر بھر کے وہ سکندر ہوتے ہیں جو اگرچہ قلندر ہوتے ہیں مگر کامرانیوں کے سمندر اُن کے اندر ٹھاٹھیں مار رہے ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ نئے زمانے سے نہیں، زمانہ اُن سے ہم آہنگ ہوکر چلتا ہے اور اُن کے رنگ میں رنگ کر زندگی کی ترنگ حاصل کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم آج کی نعتیہ شاعری پڑھتے/ سنتے ہیں تو ایک پُرسرور سرشاری... بادِ بہاری کی طرح ہمیں اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں آ کر حصار موسمِ بہار بن جاتا ہے۔ نعت میں جدید طرزِ احساس کو جب ہم مختلف پہلوؤں سے دیکھتے ہیں تو اس کا خوب رُو منظرنامہ کچھ اس طرح ترتیب پاتا ہے:

اسلوب کا تنوع

شاعری طرزِ ادا سے دلوں کی ساحری بنتی ہے۔ اسلوب پڑھنے/ سننے والے کو محبوب ہو جائے تو دلوں کے طلسم شعر کے اسم سے کھلتے چلے جاتے ہیں، اسی لیے میں شاعری... بلکہ اب صرف نعتیہ شاعری کو تسخیرِ قلوب کا عمل کہا کرتا ہوں۔ دلوں پر پڑے قفل زنگ آلود ہو جائیں تو آشنا صدا کی کلید بھی انھیں کھولنے کی نوید نہیں دیتی... تب صرف ایک اسم کام آتا ہے۔ سچائی کا اسم... اور سچائی عشقِ صادق کی ہم راہی کا نام ہے۔ رفاقتیں سچی ہوں تو مسافتیں بجائے خود منزلوں کی بشارتیں بن جایا کرتی ہیں... اور لاریب... جس کا عشق جوازِ تخلیقِ کائنات ہوا اور جو خالقِ کائنات عزوجل کا محبوب ہوا... اس سے منسوب ہو کر تو اسلوب طرزِ مرغوب کے سوا اور کیا ہوگا... سو میں سمجھتا ہوں نئے دور کی نعتیہ شاعری کا اوّلین خاصہ اسلوبِ تازہ کا دروازہ کھولنا ہے جس کی اوٹ سے آنے والی بہار کے جھونکے مشامِ جاں میں تازگی اور اقصائے روح میں بالیدگی کی سرشاری بھر دیتے ہیں:

اس کی خلوت ہواؤں پہ کیا چھاپنی، اس کے سجدوں کی اونچائی کیا ناپنی
پھول غارِ حرا میں کھلاتا رہا اور پھل سدرۃ المنتہیٰ سے چنے
(مظفروارثی)

اس کی سانسیں سناٹے میں خوش بو کا اظہار بنیں
نیندیں تھک کر سو جاتی تھیں اور وہ جاگتا رہتا تھا
(سلیم کوثر)

اس کی مسافرت کا زمانہ بھی روشنی
اور ساتھ ہی نقوشِ کفِ پا بھی روشنی
(بیدل حیدری)

جس نے سوچا انھیں
وہ خدا کی قسم
ماورائے زمان و زمیں ہو گیا
جس نے لکھا انھیں
اس کا معجز قلم
شہپرِ جبریلِ امیں ہو گیا

جس نے چاہا انھیں
اس کی چاہت
بقا کی نگارش ہوئی
اس پہ دن رات پھولوں کی بارش ہوئی
جس نے چاہا انھیں
اس کو چاہا گیا
اس کی دہلیز تک ہر دوراہا گیا!

(شبنؔم رومانی)

سکوتِ حرف کو اذنِ بیان دیتا ہے
وہ دشتِ فکر میں اب بھی اذان دیتا ہے
(محسؔن نقوی)

آسمانوں پہ کوئی بادلہ کھل جاتا ہے
جب سحر جاگنے لگتی ہے کھجوروں میں ترے
(محمود علی محموؔد)

پھر آسمانوں کی آخری حد پہ جا کے بھی تیرے دل میں دھرتی دھڑک رہی تھی
ترے زمانے جو حشر سے بھی فنا نہ ہوں گے، ہماری مٹی میں سو رہے ہیں
(محمد اجمل نیازی)

صرف مدینے میں
اور کہاں پر اُگتے ہیں
سورج سینے میں

(سیّد صبیؔح رحمانی)

تنک مزاجوں کی سلطنت میں
بتایا جس نے
سخن حدودِ دعا میں کرنا
لباس ناآشنا رواجوں کی سلطنت میں سکھایا جس نے
نمو کی مشتاق بے ہنر خوئے شعلگی کو

طریقِ قطع و بریدِ جامہ
حریمِ شمعِ صفات ہونا
مکاشفے میں
مباحثے میں
مباہلے میں
دلیلِ قاطع، دعائے فاتح، ثبوتِ آخر کو
اپنے اوزان کی صداقت میں تولتا تھا
وہ نرم لہجے میں بولتا تھا!

(اخترؔ حسین جعفری)

کھلے ہیں جس میں محبت کے پھول ہر جانب
وہی ہے گلشنِ بے خارِ گفتگوئے رسول ﷺ
(راجا رشیدؔ محمود)

جہاں پیوندِ ظلمت بن گئے روزن مکانوں کے
وہیں کھولے گئے سارے دریچے آسمانوں کے
(غلام محمد قاصرؔ)

کوئی فکر لَو نہیں دے رہی کوئی شعر تر نہیں ہو رہا
رہِ نعت میں کوئی آشنا مرا ہم سفر نہیں ہو رہا
(سعودؔ عثمانی)

خزاں کا بطلان کر کے آخر بہار ہی سرخ رُو ہوئی ہے
تری صدا کے محیط میں آ کے زندگی خوب رُو ہوئی ہے
(محمد فیروزؔ شاہ)

جدتِ تشبیہات و استعارات

شاعری خوب صورت تشبیہات و استعارات سے آراستہ ہوکر نکھر آتی ہے، مگر جہاں ممدوح بے مثل اور بے مثال ہو وہاں مثالیں کہاں سے ڈھونڈی جائیں... کسی ایسے ہی تحیر میں کبھی میں نے کہا تھا:

یہ رنگ و بو کا جہاں تو خود اک گدا ہے دربارِ عالیہ کا
میں نعت لکھوں تو سوچتا ہوں کہاں سے لاؤں مثال آقا ﷺ!

لیکن یہ عشق وعقیدت کی گلاب رُتیں ہیں کہ جن کی جولانیاں جذبۂ صادق کی کمک سے کامرانیاں پا جاتی ہیں۔ لمحۂ موجود میں صدق بھری چاہتوں کی رفاقتوں میں خیال کے جمال نے ایسے کامیاب تشبیہاتی اور استعاراتی نظام کی تشکیل کی ہے کہ جسے پڑھ کر دل ونظر میں اعترافات کے پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ قلم کی وہ کامرانی ہے جو عشقِ رسول ﷺ کے علم تلے سانس لینے والوں کے نصیب ہی میں آیا کرتی ہے۔ کائنات کا سارا حسن محبوبِ کائنات ﷺ کا صدقہ ہے۔ رات واللیل والی زُلفوں کی بارات ہے۔ چاند ان کے رُخ انور کے آگے ماند ہے۔ خورشید اُن کی چشمِ ضیابار سے اذن لے کر روشنی کی نوید بنتا ہے۔ ستارے ان کی دہلیز سے روشنی کے استعارے بنتے ہیں، اُن کی گفتگو سے پھولوں کو خوش بو ملی۔ ان کے ہونٹوں سے گلابوں میں رنگ اُترے، اُن کے تبسم نے گلوں کو کھلنا سکھایا۔ اُن کے تکلم سے لفظ کو حیات ملی... حیات اُن پر نثار ہو کر ثبات پا جاتی ہے اور شاعری نعت میں ڈھل کر اثبات کی کائنات بن جاتی ہے... یہ بھی سرکار ﷺ کا ایک بے نظیر معجزہ ہے کہ آپ ﷺ بے مثل و بے مثال ہوتے ہوئے بھی جب اہلِ عشق کی عقیدتوں کا مرکز بنتے ہیں اور حرف وصوت اُن کے دربارِ گہربار میں حاضری دے کر شرفِ حضوری پاتے ہیں تو تشبیہات و استعارات کی کم یابی قدم بوسیِ حضور ﷺ کے صدقے میں انوکھے مگر پُرتاثیر تخیل و تشبیہ کی باریابی سے بدل دی جاتی ہے اور شاعر کے لفظوں کی جھولیاں نئے دور کی ہم طور تشبیہات و استعارات سے بھر جاتی ہیں:

ترے پنگھٹ سے بادل اپنی گاگر بھرنے آتے ہیں
زمانے بھر کے پیاسے پیاس عمروں کی بجھاتے ہیں
(مظفؔر وارثی)

پانی ہوتا اُداس چشموں کا
تیرے قدموں پہ بہہ گیا ہوتا
(حسن نثار)

کی دعا ختم تو پھر صلِ علیٰ پڑھتے ہوئے
ہاتھ یوں جسم پہ پھیرے کہ زرہ پہنی ہے
(محمد ثناء اللہ ظہیؔر)

سیاہ شب کی ہتھیلی پہ کاڑھ کر جگنو
وہ رہ رووں کو سحر کا نشان دیتا ہے
(محسن نقوی)

کھلا یہ قلزمِ نعتِ محمد ﷺ میں فنا ہوکر
کہ ملتا ہے کسی قطرے کو کیا کچھ اس سمندر سے
(قیصر نجفی)

کاسۂ جاں میں لیے نور کی لوٹے خیرات
جو گدا اُن کے درِ فیض رسا تک پہنچے
(سیّد صبیح رحمانی)

سبیل ہے اور صراط ہے اور روشنی ہے
اک عبدِ مولیٰ صفات ہے اور روشنی ہے
(افتخار عارف)

شامِ ابد کا ایک ستارہ
کتنے چراغ جلا سکتا ہے
(ثروت حسین)

تکے جاتی ہے اس کو اُمِ معبد
جو مہتاب اس کے گھر اُترا ہوا ہے
(حفیظ تائب)

زمینِ نعت نورِ مصطفیٰ ﷺ سے جگمگاتی ہے
ستارے لفظ بن جاتے ہیں جب صلِ علیٰ کہیے
(سیّد منیر)

اس رشکِ نو بہار کی سانسیں بھی خوش بوئیں
اس روشنی بدن کا پسینہ بھی روشنی
(بیدل حیدری)

سب آنکھیں ہیں اس کی گواہی چہرے اس کی امانت ہیں
عکس بچھڑ کر بھی اس کے ہیں وہ اک ایسا آئینہ تھا
(سلیم کوثرؔ)

ہمارے لمحے تری دعا کے شفیق ہالے میں جی رہے ہیں
ہمارے زخموں کو تیری یادوں کے شبنمی ہاتھ سی رہے ہیں
(محمد فیروز شاہؔ)

ندرتِ فکر و خیال

خیال کا جمال نئے پن کی انفرادیت سے اوجِ کمال تک پہنچتا ہے پھر تخلیقی عمل کی کٹھالی سے کندن بن کر نکلتا ہے۔ شاعر متخیّلہ کا وہ ماہر ہے جسے تغیر و تبدل کے عناصر کا ادراک بہ طریقِ احسن ہوتا ہے وہ وقت کا نباض ہوتا ہے۔ ساعتوں کی دھڑکنیں اس کے وجدان میں گونجتی ہیں ہم عصر صداقتوں کا عرفان اس کے شعری منظرنامے کا ارمغان بنتا ہے اور اس کی شاعری کا عنوان ہوا کرتا ہے۔ میں نے اسپنڈر کے اس مشہور عام نظریہ سے کبھی اتفاق نہیں کیا کہ ''شاعری سچ کا نہیں، صرف احساسات کا اظہار کرتی ہے۔'' میں سمجھتا ہوں تخلیقِ شعر تصدیقِ صدق کیے بغیر ممکن ہی نہیں۔ سو میں شاعری کو سچے احساسات کی ترجمانی سے الگ کوئی چیز نہیں سمجھتا... وقت کا فیصلہ بڑا کڑا اور اٹل ہوتا ہے جھوٹ تو اسے گوارا ہی نہیں۔ ورڈزورتھ کی بات مجھے زیادہ اپیل کرتی ہے جس نے شاعری کا مدعا ہی تلاشِ صداقت قرار دیا تھا۔ البتہ یہ اضافہ کرنے کی اجازت میں ضرور چاہوں گا کہ سچائی ہم عصر صورتِ حال سے توانائی لے کر ہی تخلیقی دانائی کی ثروت بنتی ہے اور اس کارِ شیشہ گری میں تخیل کی جدت اساسی اثاثہ کی سی اہمیت رکھتی ہے۔ علامہ ابنِ خلدونؔ نے اسی جانب اشارہ کیا تھا جب کہا تھا، ''انسان جو کچھ دیکھتا ہے... اس کا تخیل اس پر سبقت لے جاتا ہے کیوں کہ تخیل میں وسعت کی بہت گنجائش ہوتی ہے...'' بس اسی وسعتِ خیال سے ندرتِ فکر و خیال جنم لیتی ہے جو نئے دور کے تناظر میں جذبہ و احساس اور تجربہ و مشاہدہ کی آمیخت سے کشتِ قرطاس میں ایسے گلاب رنگ خواب کاشت کرتی ہے جن کی تعبیر نئی صبحوں کی تازہ کار تنویر سے تاثیر لے کر دلوں کو اپنی جاگیر بناتی چلی جاتی ہے۔ نعتیہ شاعری میں یہ ندرتیں کیسے کیسے خوب رُو گلابوں میں عکس پذیر ہوتی ہیں، چند مثالیں دیکھیے:

دراڑوں کو بھی تیری رحمتوں نے باندھ رکھا ہے
فضا کتنی شکستہ ہے مگر منظر سلامت ہیں
(مظفر وارثیؔ)

نگاہ پڑ رہی تھی دل چراغ ہو رہے تھے
یہ خواب تھا زرِ تعبیر بھی عنایت ہو
(علی زریون)

ایک اوڑھے تو سب کے جسم ڈھکیں
ایسی چادر تو مصطفیٰ ﷺ ہی دے
(قتیل شفائی)

اللہ کو مرغوب ہیں کیا تیری ادائیں
"قل" کہہ کے سنی بات بھی اپنی ترے لب سے
(حافظ مظہرالدین)

کون اس بھید کو پا سکتا ہے
کوئی کہاں تک جا سکتا ہے
(ثروت حسین)

بادِ صبا نے وردِ درود و ثنا کے بعد
اسمِ رسول ﷺ اَدھ کھلی کلیوں میں رکھ دیا
(ریاض حسین چودھری)

سمجھیں تو یہ اک لفظ بھی کیا نعت سے کم ہے
خود نامِ محمد ﷺ ہی محمد ﷺ کی ثنا ہے
(محشر بدایونی)

حرف کو میزانِ لب پر تولنا آیا ہمیں
نعت کے صدقے میں ہی سچ بولنا آیا ہمیں
(ساجد رضوی)

رستہ ہوتا ترے گزرنے کا
اور ترا رستہ دیکھتا ہوتا
(حسن نثار)

میں حرف و صوت کی خیرات اس سے مانگتا ہوں
جو پتھروں کو بھی رزقِ زبان دیتا ہے
(محسن نقوی)

پہنچنا چاند پر تو اک بہانہ تھا مرے آقا ﷺ!
یہ دنیا آپ ﷺ کا نقشِ کفِ پا ڈھونڈتی ہوگی
(وسیم بریلوی)

حرفِ مدحت میں نے لکھا معتبر تُو نے کیا
دل کو میں نے صاف رکھا اور گھر تُو نے کیا
(قیصر نجفی)

سرائے دہر میں مہمان تھے صدیوں کے سناٹے
تمھارا نام لے کر کارواں اُترے اذانوں کے
(غلام محمد قاصر)

اُتاری روح کی بستی میں جلوؤں کی دھنک اس نے
شکستِ شب پہ ہو جیسے سحر آہستہ آہستہ
(سیّد صبیح رحمانی)

ایک آہٹ کی تحویل میں ہیں زمیں آسماں کی حدیں
ایک آواز دیتی ہے پہرا بہت اور گہرا بہت
(سلیم کوثر)

جبریلؑ کا پر کلک ہو میری تو لکھوں میں
ہوتی ہے کہاں ایسے رقم نعتِ پیمبر ﷺ
(عبدالعزیز خالد)

دوڑ کر آئی صبا نکہت و خوش بو لینے
میرے آقا ﷺ کو جو فیروز پسینہ آیا
(محمد فیروز شاہ)

ہم عصر فضا کی صدا

شاعری اپنے عہد کی عکاسی نہ کرے تو اس کی تاثیر خوابِ بے تعبیر کی طرح فضا میں گم ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس لیے شعر... زندہ شعر... وہ ہوتا ہے جو اپنے دور کا ہم طور ہو اور پھر نعتیہ شاعری تو نام ہی زمانے بھر کی عقیدتوں کو طشتِ حرف وصوت میں سجا کر سرکار ﷺ کے دربارِ گہربار میں

پیش کرنے کا ہے سو حرفوں میں زمانہ کی گونج موجود نہ ہو تو اذن حضوری نہیں ملتا اور نعت تو ہے ہی سراپا عطا۔ اذن اور اجازت کے بغیر لفظ وجود نہیں پاتے اور حرفِ مدعا بے صدا رہتا ہے۔ میرا نظریۂ نعت یہ ہے کہ جب تک آرزو بھی باوضو نہ ہو، نعت گوئی ہو ہی نہیں سکتی...سرکارِ دو عالم ﷺ نے سب سے پہلی گواہی سچ بیانی اور حق گوئی کی طلب فرمائی اور جانی دشمنوں نے بھی صادق ہونے پر صاد کیا...اور اسی لیے حضورِ مکرم ﷺ کی شان میں کہی جانے والی نعت کے لیے میں نے صداقت شرطِ اوّل قرار دی ہے۔ جذبہ واحساس، وقت اور ماحول کی سچی عکس کاری ہی عقیدت کو بادِ بہاری بناتی ہے اس لیے نعتیہ شاعری میں جدید طرزِ احساس کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے بہ طورِ خاص عہدِ حاضر کی نعت میں ہم عصر فضا کو زبان دیتی آواز کے راز دریافت کیے تب علم ہوا کہ ہم عصر صداقت کی رفاقت میں تخلیقی لمحے کیسی دل نواز بشارت کے امین بنتے ہیں...فلپ سڈنی نے عالمِ آب وگل کو حس قرار دیتے ہوئے جب شعرا کو اسے کندن بنانے کی ذمہ داری سونپی تھی...تو اس تخیلاتی نظریے کی تشکیل میں اس کے خواب وخیال میں بھی یہ پُر جمال منظر نہ ہوگا کہ واقعتاً ایک ایسی شعری صنف بھی ہے جس کے ہر لفظ اور ہر حرف میں مسِ خام کو کندن بنانے کا ہنر چمکتا ہے کہ یہ اس عظیم آقا ﷺ کے غلاموں کا تخلیقی سرمایہ ہے جس نے اوّل اوّل مسِ خام کو کندن بنانے کا سلیقہ عام کیا تھا۔ آج کی نعت اپنے ماحول، اپنے زمانے اور اپنی فضا کے دُکھ سکھ پوری سچائی کے ساتھ اپنے آقا ﷺ کے حضور میں پیش کرتی ہے کہ سچ ہی کلیدِ حضوری ہے:

یہ قریۂ عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہے کہ خواب اور انقلاب کا فرق مٹ گیا ہے
یہ ایک شہرِ دعا ہے جس میں ہمارے آنسو لہو کے ہم راز ہو رہے ہیں
(محمد اجمل نیازی)

مسائلِ زندگی کے کہہ رہے ہیں
یہاں تو کلیہ تیرا چلے گا
(روحی کنجاہی)

شہر کے شہر ہی پتھرانے لگے ہیں اب تو
گونج اُٹھے مری گلیوں میں بھی نغمہ تیرا
(اشرف جاوید)

چٹائی اور پیوند اور یہ زرپوش اُمت
حرا اور ثور کے غاروں میں جا کر رو پڑوں گا
(محمد اظہار الحق)

جس طرح ملتے ہیں لب نامِ محمد ﷺ کے سبب
کاش! ہم مل جائیں سب نامِ محمد ﷺ کے سبب
(یعقوبؔ تصور)

نفرتوں کے گھنے جنگلوں میں شہا
عہدِ حاضر کا انسان محصور ہے
مشعلِ علم و اخلاق سے دُور ہے
(صبیحؔ رحمانی)

آقا ﷺ! فقیہہِ شہر نے آئینۂ حیات
اُڑتی ہے جن پہ دھول انھی رستوں پہ رکھ دیا
(ریاض حسین چودھری)

نہ عشق ہے نہ اذاں ہے نہ ہے بلالؓ کہیں
''یہ دور اپنے عمل کا حساب کیا دے گا''
(سعیدؔ اکرم)

اس وقت اک دھیان ہے اور ان کا دھیان ہے
یہ وقت دل کو آئینہ کرنے کا وقت ہے
(جمالؔ احسانی)

خدا کے گھر کو بھی ہم نے مقتل بنا دیا ہے
حسینؓ کے خانۂ عزا میں بھی خوں کا دریا بہا دیا ہے
نمازیوں کی صفوں پہ بوچھاڑ گولیوں کی
ابھی ہم نے کی ہے
حسینؓ کے سوگواروں کی جاں
بھی ہم نے لی ہے
ہماری وحشت کی سب کی سب ہیں
یہ داستانیں
پولیس کے پہرے میں لوگ پڑھتے ہیں اب نمازیں
پولیس کے پہرے میں لوگ دیتے ہیں اب اذانیں

یہ کھیل اندھے شعور کے ہیں
یہ قصے جرم و قصور کے ہیں
خدا ہے شاہد خدا سے زیادہ
ہم آج مجرم حضور ﷺ کے ہیں
(قیصر نجفی)

ہم اپنی آنکھوں کو رہن رکھ کر شبوں سے خورشید مانگتے ہیں
ہماری بے ذہن سوچ کو پھر بصیرتوں سے اُجال آقا ﷺ
(محمد فیروز شاہ)

والہانہ وابستگی کا اظہار

نعت وہ مبارک اور مقدس صنفِ شعر ہے جو کامل وابستگی بلکہ والہانہ پن کا تقاضا کرتی ہے۔ سرکارِ عالی تبار ﷺ سے قلبی عقیدت لہو میں خوش بو اُتارتی ہے تب نعتیہ شاعری اپنے شاعر کا مقدر سنوارتی ہے۔ یہ وہ شعبۂ فن ہے جس میں من کی لگن سے وضو کیے بغیر نمازِ عشق ادا ہوتی ہی نہیں... اقبالؒ نے سچ کہا تھا یہاں تو نماز بھی نظارۂ جمال کا بہانہ بنتی ہے... یہ عشق کی کوکھ سے جنم لینے والی عقیدتوں کی روایتیں ہیں، بشارتیں جن سے اذن لے کر طلوع ہوتی ہیں، محبت اپنی اصل میں فطرتِ انسان کا لازمہ ہے۔ اب یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ جس نے اس لافانی جذبے کو محبوبِ خدا و کائنات سے منسوب کرلیا... زندہ ہوگیا ورنہ محبتوں کی رائگانیوں کے نوحے پڑھتا پھرا اور سننے والا بھی کوئی نہ ملا... جب کہ دوسری جانب وہ خوش بخت لوگ کہ جنھوں نے صدقِ عشق کے تقدس کو دل و نظر میں اُجاگر کیے رکھا اور دل کے دروازے اُن کے لیے وقف رکھے دردِ دل کشا کا اسم جن کے تصدق میں وجود پذیر ہوا۔ بس اسی شاعری کو نعت کا درجۂ اولیٰ ملا اور لمحۂ موجود کے تقاضوں پر پوری طرح پورا اُترتے ہوئے نئے طرزِ احساس کے پہناوے میں اپنی عقیدتوں کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ مجھے رومن شاعر ہوریس یاد آگیا جس نے شاعری کو لطف و راحت اور اصلاح کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا... اب نعت سے بڑھ کر کون سی صنفِ سخن ایسی ہے کہ جو راحتِ جاں اور لطفِ قلب و نظر اور کیفِ روح کا باعث ہے اور بہ ایں ہمہ اصلاح انسان کا فریضہ بھی بہ طریقِ احسن ادا کرتی ہے کہ مصلحِ اعظم ﷺ سے وابستہ ہر حرف و خیال فلاح و اصلاح انسانیت کے اس عالم گیر و عالم آرا نظامِ حیات کا سفیر ہوتا ہے جس نے زمین کے ذرّوں کو ہم دوشِ ثریا کر دیا تھا! چناں چہ میرے

نزدیک نعتیہ شاعری سرورِ دل و جاں اور بہبودِ انساں، دونوں حوالوں سے اُجالوں کی سفارت کار ہے اور موجودہ زمانے میں اس کا انداز ہم عصر آگہی کی آواز بن رہا ہے:

دلوں میں غوطہ زن ہوتی ہے گہرائی محبت کی
کنارہ ان کو ملتا ہے جو تجھ میں ڈوب جاتے ہیں
(مظفؔر وارثی)

میرے ہاتھوں سے اور میرے ہونٹوں سے خوش بوئیں جاتی نہیں
میں نے اسمِ محمد ﷺ کو لکھا بہت اور چوما بہت
(سلیم کوثر)

تیرے حجرے کے آس پاس کہیں
میں کوئی کچا سا راستا ہوتا
(حسؔن نثار)

حضوری و حاضری کے آداب جانتے ہیں
درِ مطہر پہ گفتگو کم سے کم کریں گے
(افتخار عارف)

پاؤں رکھ رکھ کے گھروندے وہ بنایا کرتے
میں خنک ریت کا بے نام سا ٹیلا ہوتا
(ریاض حسین چودھری)

میں اپنے جسم کو اس خواب پر قربان کر دوں
میں تیرے شہر کے رستوں کی مٹی ہوگیا ہوں
(محمد اظہار الحق)

کاش! ہوتا رکاب گھوڑے کی
اور ترے پاؤں چومتا ہوتا
(افتخار شفیع)

بے پوچھے فرشتے لوٹیں گے یہ کہہ کے لحد سے میری صبیحؔ
یہ جسم مدینے والا ہے یہ روح مدینے والی ہے
(سیّد صبیحؔ رحمانی)

میرے آقا ﷺ! مری گرتی ہوئی بینائی کو
بس تری دید کا ارمان سنبھالے ہوئے ہے
(جنید آذر)

کریں ہم کیوں نہ اپنی آبرو سرکار ﷺ پر قرباں
کہ قائم ہے ہماری آبرو سرکار ﷺ کے دم سے
(راجا رشید محمود)

ازل سے دل ہے اسی مہرباں سخی کا اسیر
جو حوصلوں کو ابد تک اڑان دیتا ہے
(سیّد محسنؔ نقوی)

تمنا ہے کسی شب خواب میں اُن کی زیارت ہو
تمنا ہے کسی شب خواب ہی تعبیر ہو جائے
(عاصی کرنالی)

آجائے کبھی دل کے سفینے میں مدینہ
دن رات دھڑکنے لگے سینے میں مدینہ
(عدیم ہاشمی)

سیاہ رنگ ہو میرا زباں میں لکنت ہو
مجھے بھی آپ ﷺ سے کوئی بلالیؓ نسبت ہو
(علی زریون)

ورقِ جاں ہے تیرے نورِ صفا سے روشن
صفحۂ دل پہ ہر اک تیری ادا لکھی ہے
(اسلم فرخی)

ہر پل ہے اُن ﷺ کی ذات سے وابستگی کا پل
ہر وقت اُن ﷺ کی گفتگو کرنے کا وقت ہے
(جمال احسانی)

صدیاں حیرانی میں گم ہیں
کون وہ نام بھلا سکتا ہے
(ثروت حسین)

میری آنکھیں مرا رستہ جو نہ روکیں اقبالؔ
میں مدینے میں ملوں راہنما سے پہلے
(اقبالؔ عظیم)

تمام عمر جو مشقِ سخن رہی سرشار
بس اس لیے کہ ثناخوانِ مصطفٰے ﷺ ہو جاؤں
(سرشار صدیقی)

پھر اپنی آنکھوں کے واسطے میں ترے زمانے کی خاک ڈھونڈوں
تری تمنا کی وادیوں میں حیات اک جستجو ہوئی ہے!
(محمد فیروزؔ شاہ)

جذبہ و احساس کا ترفع

ہمارے عہد کی سوکھی دھرتی پر محسنِ انسانیت ﷺ کی رحمتوں کا ابرِ باراں رم جھم کے ترنم کی پھوار برسائے تو سوندھی مٹی کی مہکار سرکار ﷺ کے نعلینِ پاک کو بوسہ دینے والے ذرّہ ہائے خاک سے آمدِ بہار کی نوید پا کر لحہ لحہ خوش بو بانٹتی پھرے۔ سچی عقیدتوں کی یہ مہک قلم سے مس ہو کر قرطاس پر اُترے تو اس دور کا نعتیہ منظر نامہ رقم ہو جائے... یہ خواب ہے جو میری نیندوں میں بیداری کی سرشاری تقسیم کرتا ہے۔ اہلِ دل نے ہمیشہ بند آنکھوں کے دریچوں میں کشادہ ظرف منظروں کے خواب اُجاگر کیے ہیں۔ کیسے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے جذبہ و احساس میں عشقِ رسول ﷺ ترفع بانٹتا ہے۔ وہ آنکھیں بند کرتے ہیں تو مناظر کے در کھل جاتے ہیں۔ جن کی عشق سے قوی بصارتوں میں بصیرتوں کی معطر روشنی تیرتی ہے۔ ہمارا زمانہ روز افزوں دکھوں کا تازیانہ بنتا جا رہا ہے۔ رنج و الم کی کڑی کڑکتی دو پہروں میں جلتی جھلستی احساس کی زمین تانبے کی ہوتی جا رہی ہے۔ دُور دُور تک کوئی سایہ کوئی چھاؤں دکھائی نہیں پڑتی۔ ہمارا سفر بے اجر محنتوں کی طرح بے ثمر ہوتا محسوس ہو رہا ہے... اس درد آمیز تاثر کے جہنم میں ایک خیال جنت کی اعلیٰ وادیوں سے آتے ہوئے جھونکے کی طرح ہمیں اپنی ملائم آغوش میں لیتا ہے تو جیسے سارے دُکھ کٹ جاتے ہیں۔ حدت کا جبر بے اثر ہوتا چلا جاتا ہے اور ذکرِ محبوب ﷺ کی شادمان برکھا چھم چھم برس پڑتی ہے۔ لاریب دُکھ کیسا ہی جاں گداز کیوں نہ ہو یادِ محبوب ﷺ کی ترنم ریز خنک ہوائیں چل پڑیں تو حرارتوں کی شرارتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ دلوں کو سکون مل جاتا ہے روح پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور وجدان کیف و سرور سے معمور ہو جاتا ہے... یہی وہ مرحلۂ احساس ہے جب زمین کے سینے سے

اُٹھتی دعاؤں کے خوش بو سے معمور خزینے محبت کے مظہر و منزلہ جذبہ کی حلاوت بھری رفاقت میں شاعری میں ڈھل جاتے ہیں۔ اہلِ زمین کے دل اس مہکتی یاد سے آباد ہو کر دھرتی سے اُٹھنے والی سوندھی باس میں دھڑکنے لگتے ہیں۔ تب دھڑکنیں شعر بنتی ہیں۔ شعر خوش بو ہوتا ہے اور خوش بو محبوب ﷺ کی آرزو بن کر نعت کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے۔ عشق ایک پیاس ہے نعت وصلِ محبوب ﷺ کی آس ہے... پیاسی دھرتی پر ابر چند چھینٹے برسا دے تو ممنون مٹی کی باس حرفِ سپاس بن کر فضا کو معطر کر دیتی ہے... ہمارے عہد کی نعتیہ شاعری عشق کی اسی عطر بیزی سے عبارت ہے جو بہشت بریں کی سفارت بھی ہے اور صدقِ جذبہ و احساس کی بشارت بھی... جو قلب و روح کو ترفع بھی عطا کرتی ہے اور سرشاری بھی!

نطقِ بیمار کو صحت ہے درودوں سے ملی
لفظ نے نعت کے صدقے میں شفا پہنی ہے
(ثناء اللہ ظہیرؔ)

تمام پھول شگفتہ چمن میں رہتے ہیں
مرے حضور ﷺ گلوں کے بدن میں رہتے ہیں
(بیکلؔ اتساہی)

چلا ہوں سوئے دربارِ رسالت
ہے میرے ساتھ اک خوش بو سفر میں
(سیّد صبیحؔ رحمانی)

گلوں کی تمکنت کو کس نظر سے دیکھتی ہوگی
جو خوش بو آپ ﷺ کو چھو کر کسی قابل ہوئی ہوگی
(وسیمؔ بریلوی)

مثالِ نکہتِ گل ہو سفر مدینے کا
زمانہ دیکھتا رہ جائے میں ہوا ہو جاؤں
(سرشارؔ صدیقی)

دن رات درود کی اک محفل ہم دل میں سجائے رہتے ہیں
ویسے بھی نسیمؔ حقیقت میں یہ گھر تو اسی مہمان کا ہے
(وضاحت نسیمؔ)

وقت کا سیل بہا لے نہ گیا کس کس کو
پر ترے پاؤں کے تلووں کی لکیریں نہ مٹیں
(اعظم چشتی)

آنکھ سے اشک بہے کوئی قرینے والا
اس میں آئے گا نظر نور مدینے والا
(حکیم مظفر عزیز)

نبی ﷺ کو جس نے پہلی بار دیکھا
میں اُس لمحے کی بیعت کر رہا ہوں
(مظفر وارثی)

کلکِ ثنا کو نور کی موجوں میں رکھ دیا
یعنی گدازِ عشق کو ہونٹوں میں رکھ دیا
(ریاض حسین چودھری)

خیال پہنچا ریاضِ رسولِ اکرم ﷺ تک
تو لایا پھول تلطف کے واں سے چن چن کر
(راجا رشید محمود)

تو نے میری سمت جب بھی روشنی پیغام کی
نعت کا مصرع بنا دی ہر کرن الہام کی
(صہبا اختر)

شہد سا دوڑ گیا ہے مری شریانوں میں
جب کبھی پڑھ کے درود اپنا انگوٹھا چوما
(مظفر وارثی)

ہستیٔ خیرِ عالمیں کے لیے
سوچتا ہوں اور اپنے جذبے کو
جب بھی حرفِ ثنا میں لاتا ہوں
عشق کی لَو نوا میں لاتا ہوں
(حسن اکبر کمال)

مگر ہے پھر بھی مرے دل میں تیرا عکسِ جمال
میں اک نشیب کی ندی ہوں تو ہے ماہِ فراز
(محمد فیروز شاہ)

جمالِ محبوب ﷺ کے تذکار

ہر عہد کی نعت کا امتیاز عشق کی پاکیزہ اور ارفع کیفیات سے سرفراز ہوتا رہا ہے۔ یہ دور بھی اپنے باسیوں کی تمام تر گم راہیوں اور کج رویوں کے باوجود نعت گوئی کے مذکورہ بالا اعلیٰ ترین اعزاز کا ہم راز ہے۔ نئے طرزِ احساس کی انفرادیت میں عشقِ صادق کی گل رنگ کیفیت جب ورود کرتی ہے تو ساری کائنات درود پڑھتی محسوس ہوتی ہے... محبت تو نام ہی جمالِ محبوب کے ورد کا ہے۔ وہ دل ہی کیا جس میں عکسِ جمالِ یار نہ ہو۔ وہ زباں ہی کیا جس پر حسنِ یار کے تذکار نہ ہوں۔ وہ آنکھیں ہی کیا جن میں رعنائی محبوب کے جلوے خوابوں کو گلابوں کے رنگ نہ دے رہے ہوں۔ وہ لفظ ہی کیا جس میں مطلوبِ قلب ونظر کی دل کش یادوں کی چاشنی نہ ہو وہ صوت ہی کیا جس میں مقصودِ حیات کے چرچے نہ ہوں۔ وہ زباں ہی کیا جو دل دارِیٔ محبوب کا بیاں نہ کرے، وہ زندگی ہی کیا جس میں جلوہ ہائے رنگیں کی تابندگی نہ ہو... یہ کائناتِ عشق کے رموز ہیں جو سب پر نہیں کھلتے۔ مگر جس پر کھل جائیں اس کا نصیبہ کھل جاتا ہے۔ یہ سچ سہی کہ ہم گناہوں کی آلودگیوں میں لتھڑے تمدن میں جی رہے ہیں۔ یہ بھی درست... کہ یوں جینا زہر کا پیالہ پینا ہے... مگر اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار کی مجال نہ ہوگی کہ رات جتنی تاریک ہوتی ہے، چاند کی مانگ اتنی ہی بڑھ جاتی ہے... سو میرا عہد عشق کی پیاس کا عہد ہے۔ ہم جیتے ہیں کہ ذکرِ محبوب ﷺ سے سرشار تنویر سے آنکھوں اور دلوں کو منور کریں۔ جمالِ یار کے تذکار سے زندگی میں تابندگی کی مہکار بھر لیں کہ ذکرِ رسول ﷺ کرنے والوں کے حرف و بیاں سے وہ روشنی پھوٹتی ہے۔ جس میں جاوداں بہاروں کی مہک شامل ہوتی ہے اور جو سکون و سرور کے وہ بے مثال خزانے عطا کر دیتی ہے، زمانے جن کی آرزو میں زیست بھر کو سراپا جستجو بنائے پھرتے ہیں... سو اس عہد کا شاعرِ نعت اپنے طرزِ ادا میں سرمدی عشق کی صدا عام کرتا ہے اور ارض و سما اس کی آواز میں آواز ملا دیتے ہیں کہ دراصل یہی عمل جوازِ تخلیقِ کائنات ہے!

آیا ہے جہاں بھی ذکر تیرا
قرآن بھی مسکرا دیا ہے
(نجیب احمد)

انسانیت کے حسن کی یکتا مثال بھی
تیرے وجود میں ہے خدا کا جمال بھی
(یوسف حسن)

کوئی مثل مصطفیٰ کا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا
کسی اور کا یہ رُتبہ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا
(سیّد صبیح رحمانی)

جمالِ مصطفیٰ ﷺ سے منسلک ہوتی ہیں جب آنکھیں
فرشتے میرے اشکوں کی زیارت کرنے آتے ہیں
(مظفر وارثی)

تو وہ دل جو، تری دل جوئی کو اُتریں آیات
حکم قدسی کو دوزانو رہے قدموں میں ترے
(محمود علی محمود)

اس کے بعد اس کو کسی چیز کی حاجت نہ رہی
جس نے ایمان کی حالت میں وہ چہرہ دیکھا
(شہزاد احمد)

اس پیکرِ جمال کی پرچھائیں بھی جمال
اس روشنی کے پیڑ کا سایہ بھی روشنی
(بیدل حیدری)

جب اس مصور نے جلوہ گاہِ جمال احمد ﷺ کی ابتدا کی
تو ان نگاہوں نے مہر و ماہ و نجوم کو روشنی عطا کی
(اجمل سراج)

سورج، چاند، ستارے اس کے سائے میں ستاتے تھے
بچپن کی گلیوں میں اس کے ساتھ زمانہ کھیلتا تھا
(سلیم کوثر)

تیری یاد کو تیرے خواب کو میری آنکھ رکھے سنبھال کے
میری زندگی کا جواز ہیں یہی عکس تیرے جمال کے
(محمد فیروز شاہ)

حسنِ سیرت کی ضو

سرکارِ دو جہاں ﷺ کا فرمان ہے... ''فضیلت اس گواہی کی ہے جو دشمن بھی دے۔'' آج سارا زمانہ میرے حضور ﷺ کی عظمتوں کے ترانے گا رہا ہے۔ وہ تھامس کارلائل ہو یا جارج برنارڈ شا... برٹرینڈ رسل ہو یا پنڈت ہری چند اختر... بے شمار نام ہیں کہ جنھیں گنوانے ہی بیٹھیں تو ایک طویل دفتر درکار ہو... مائیکل ہارٹ نے تو ''سو عظیم شخصیات'' (The Hundred) کا آغاز ہی حضور محمد ﷺ کے احوالِ عظمیٰ سے کر کے ''خاصۂ خاصانِ کائنات'' کے بے مثل و بے مثال منصبِ جلیلہ کو سرکار ﷺ کے قدموں میں رکھ دیا... درحقیقت آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ معراجِ انسانیت ہے۔ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ نے آدمیّت کو عظمت و رفعت کا جادۂ مستقیم دکھلایا۔ یہ اس محسنِ انسانیت ﷺ کا عظیم کردار ہی تو تھا کہ جس نے دشمنِ جاں سے بھی صادق و امین کہلوایا۔ چناں چہ نعت نگار اسی عظمتِ کردار کا پرچار کرتے ہوئے ہر دور میں لفظوں کے عقیدت مند نذرانے پیش کرتا رہا۔ حضرت حسانؓ بن ثابت، حضرت کعبؓ بن زہیر اور حضرت کعبؓ بن رواحہ سے لے کر آج کے بلکہ قیامت تک کے شعرائے نعت کے لیے حسنِ سیرت کی ضو سے اپنے جذبہ و احساس کی لَو فروزاں رکھنے کا قرینہ باعثِ اعزاز ہوا۔ اس عہد میں بھی سیرتِ پاک کے حوالے سے اُجالے نکھرتے رہے اس نکھار میں قلبی عقیدتوں کی بہار شامل ہوئی تو حرف و صوت میں سحر دم نکھرتی کرنوں کی روشنی، چودھویں رات کی میٹھی چاندنی اور موسمِ گل کے اوّلین لمحے کی مہک بھری چاشنی دلوں میں سرشاریوں کی فصلیں کاشت ہوتی چلی گئیں اور نعت کہتے ہونٹوں کی آواز اہلِ عشق کا اعزاز بن کر چار دانگِ عالم میں گونج اُٹھی۔ پیغمبرِ انقلاب ﷺ کا پیغام عمروں کا نظام مرتب کرتا ہے تو اس حسنِ ترتیب کی تہذیب اہلِ زمیں کے تمدن کو ہم دوشِ فلک کر دیتی ہے۔ ایک ایسا انقلابِ محبت جس کی اساس بھی ہے اور اثاثہ بھی... جو دلوں کو جوڑ کر نفرتوں کے بت توڑ دیتا ہے، جس کی قیادت میں انسانیت، امن، پیار، اخوت، عدل، مساوات اور سر بلند حیات کے ایسے لامثال معاشرتی مناظر دیکھتی ہے جن کی نظیر کسی اور نظام کے پاس نہیں... نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیارؓ کی پُر تاثیر تقریر یاد کیجیے۔ ایک ایک حرف کو متشکل کر لیجیے اور پھر تاریخ سے اس کی مثال طلب کر دیکھیے... ہر زمانے اور ہر تہذیب کا دامن خالی ہوگا... جھولی تو صرف مدینہ کا خزینہ بھرتا ہے... یہ ہمارے ماضی کا بہت بڑا سچ ہے جو اس نے حال کی جبیں پر رقم کیا ہے اور اسی کی چمک دمک سے آج کی نعتیہ شاعری کا ایوان جگمگا رہا ہے۔ نئے طرزِ احساس کی روشنی!

جتنا سوچا محمد ﷺ کے کردار پر اتنے موتی چنے اتنے ہیرے چنے
کتنے جھونکے ہواؤں سے میں لے اُڑا، کتنے ساحل سمندر سے میں نے چنے
(مظفر وارثی)

میں نے ہر دور کی تاریخ میں جھانکا فخری
کوئی انسان محمد ﷺ سا مثالی نہ ہوا
(زاہد فخری)

سر تا پا معجزہ تھا آپ ﷺ کا اندازِ حیات
کم تھا کیا خلق کو توحید پہ یک جا کرنا
(حفیظ تائب)

وہی ابد کے دیے ہیں وہی ازل کے چراغ
جلائے ہیں مرے آقا ﷺ نے جو عمل کے چراغ
(اعجاز رحمانی)

میں نے قرآن کی تفسیر میں سیرت کو پڑھا
نور کو دائرۂ نور کے اندر رکھا
(افتخار عارف)

تری سیرت تری سنت چلے گی
ترا مسلک ترا شیوہ چلے گا
(روحی کنجاہی)

سرکار ﷺ کا انصاف ہے احسان کی تاریخ
دنیائے عدالت میں عدالت کا نمونہ
(شبنم رومانی)

نشاں قدموں کے سینوں میں اُترے جا رہے تھے
رسالت کن زمینوں میں ستارے بو رہی تھی
(محمد اظہار الحق)

مرکزِ انسانیت سے آشنا اس کو کیا
جب بھٹکتی پھر رہی تھی زندگی کی روشنی
(سیّد معراج جامی)

تو نے وہ دیا جلا دیا ہے
ذرّات کو جگمگا دیا ہے
(نجیب احمد)

گفتگو خوش بو کے لہجے میں سکھائی آپ ﷺ نے
خارِ نفرت چن لیے دے کر محبت کے گلاب
(سیّد صبیح رحمانی)

ایک دن وہ تھا کہ ہونا پڑا دہلیز بدر
ایک یہ دن ہے کہ دنیا تری دہلیز پہ ہے
(ماجد خلیل)

سدا بہار ہیں اک یادِ مصطفیٰ ﷺ کے گلاب
ابد نصیب زمانے میں ہے نبی ﷺ کا نصاب
(محمد فیروز شاہ)

فریاد کی لَے

ہمارے دور کی نعت میں فریاد کی لَے بہت اونچی ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ جب دُکھ بڑھ جاتے ہیں تو سکھ دینے والے بہت یاد آتے ہیں... انسان ہو یا قوم... بے سہارا ہونے لگے تو سہاروں کی جستجو بڑھ جاتی ہے۔ جن کے آسرے پہ جیتے ہیں اُن سے فریاد کی لَے میں اضافہ ہوتے چلے جانا دراصل اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ دُکھوں کی گمبھیرتا میں اپنائیت کا سہارا جہت نما ستارہ اور منزلوں کا استعارہ بن کر دھیرے دھیرے دل کو دھیرج دیا کرتا ہے۔ اماوس راتوں میں روشنی کی آرزو جس پر شوقِ جستجو کا سُرنامہ بنتی ہے اس کی بُنت میں نالہ و فریاد کی بازگشت دلوں کے غم زدہ رازوں کو طشت از بام کرتی ہے تو کھلتا ہے کہ دل درد سے بھر جائیں تو لبوں پر آوازوں کے ہجوم بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں... غمگین قلوب کو حرف و صوت کا ہم سفر ہونا مرغوب ہو جاتا ہے کہ اس طرح اُن کا ماجرائے غم درِ محبوب تک رسائی کی سعادت تو حاصل کر سکے گا اور بالخصوص جب محبوب بھی وہ ہو کہ جس نے ہر بے سہارا کا سہارا اور بے آسروں کا آسرا ہونے کو طرزِ زیست بنا رکھا ہو تو دل اس کی دہلیز بوسی کے سوا اور کس جانب کی سوچیں گے؟ اس سوال کے جواب میں فریاد کا سارا فلسفہ پوشیدہ ہے... داغستان کے دانش ور شاعر رسول حمزہ کی اس بات سے مجھے صد فی صد

اتفاق ہے کہ خزاں کے جابر لمحوں میں ٹوٹتے پتوں کا شور دراصل بہار کو پکارتے جذبہ و احساس کا منفرد طور ہے جس کے ذریعے وہ زرد یاس کے موسم کے دل میں سرخ گلابوں کی آس کے ہرے بھرے منظر بوتے ہیں... آج ہمارے تمدن پر ایک اجتماعی پت جھڑ کی جو کیفیت غالب نظر آتی ہے اس کی ہُوک شاعر کی تخلیقی ساعتوں میں اس کوئل کی کوک بن جاتی ہے جسے دُکھوں کے نیزوں نے چھید ڈالا مگر محبوب کی آرزو نے اس کی آواز میں جینے کی اُمنگ اور زندگی کی ترنگ بھر دی۔ دورِ جدید میں نعت گو اپنے دُکھوں کی چارہ جوئی کے لیے جب اپنے آقا کریم ﷺ کی رحمتِ عمیم سے فریاد رسی کی التجا کرتا ہے تو اس کی شعری صدا اس عہد بھر کی ترجمان نوا بن کر فضا کو محبوب آشنا خوش بوؤں سے بھر دیتی ہے... خوش بوئیں جو درماندہ ذہنوں اور یاسیت بھرے دلوں کو تابندہ زندگی کی اُمنگ ترنگ سے معمور کر دیتی ہیں! یاس میں آس کے یہ پھول اس تر و تازہ اور سدابہار احساس کے نمائندہ ہیں جو غلامانِ محبوب خدا ﷺ کو کسی دور میں، کسی حال میں بے حال نہیں ہونے دیتے۔ دُکھ کتنا ہی کڑا ہو عشقِ رسول ﷺ کا سائبان بہت بڑا ہے:

پھر گدڑیوں کو لعل دے
جاں پتھروں میں ڈال دے
حاوی ہوں مستقبل پہ ہم
ماضی سا ہم کو حال دے
دعویٰ ہے تیری چاہ کا
اس اُمتِ گم راہ کا
تیرے سوا کوئی نہیں
یا رحمت للعالمیں!
(مظفؔر وارثی)

حضور! ﷺ آپ نے تو گردنیں چھڑا دی تھیں
مجھے بھی حکم ہو پھر سے مری بحالی کا
(سعوؔد عثمانی)

اپنی اُمت کے برہنہ سر پہ رکھ شفقت کا ہاتھ
پونچھ دے انسانیت کی چشمِ تر، خیرالبشر ﷺ
(حفیظ تائب)

ہم پہ بھی ایک نظر آقائے مقامِ محمود
ہم کہ جیتے ہیں فقط آس میں خوابوں میں ترے
(محمود علی جعفری)

قیامتیں گزر رہی ہیں کوئی شہ سوار بھیج
وہ شہ سوار جو لہو میں روشنی اُتار دے
(افتخار عارف)

اے نویدِ مسیحا دعائے خلیل
روک دے نفرتوں کی یلغار کو
پختگی ایسی دے میرے کردار کو
تیری رحمت زمانے میں مشہور ہے
(سیّد صبیح رحمانی)

جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے اب گھر میں خدا کے
مسجد ہوئی ویران خبر لیجیے آقا ﷺ!
(قیصر نجفی)

ایک بار اور بھی بطحا سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیرا
(احمد ندیم قاسمی)

مرے لیے میری راہ آسان کر کہ پھر سے
میں تیری رحمتوں کے شفیق سائے میں لوٹ آؤں
طلب کا موسم خزاں رسیدہ ہے
اس کو رنگِ بہار دے
اور مجھے روشنی عطا کر
گزر گہِ وقت کے کنارے جو کھو چکا ہوں
مجھے وہی آگہی عطا کر

(ایوب خاور)

سرکار! ﷺ ناصحانِ قدامت پسند نے
حرفِ وفا پرانی کتابوں میں رکھ دیا
(ریاض حسین چودھری)

آسمانوں کے مسافر! تری اُمت کے جواں
پاشکستہ ہیں سرِ خاک بتاؤں کیسے
(شاہ نواز زیدی)

شبِ سفر کی مسافتوں میں دعا کا زادِ سفر عطا کر
کہ رہ گزاروں کی دُھول بننا ہماری نسلوں کی خو ہوئی ہے
(محمد فیروز شاہ)

لج پال نسبتوں کا تفاخر

شعر کا تعلق شعور کی اس رَو سے ہے جو نورِ قلب سے ضو پاتی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے شاعری کو یوں ہی تو ''جہانِ دیگر کی سیر'' قرار نہیں دے دیا تھا۔ یہ جہانِ دیگر ہمارے اس جہانِ ظاہر سے بالکل الگ بلکہ مختلف زمان و مکان رکھتا ہے۔ یہاں تخلیقِ شعر کی شرطِ اوّل محبت ہے اور محبت محبوب سے قلبی نسبت استوار کیے بغیر ممکن ہی کیسے ہے؟ سو دلی تعلق شاعری کی بنیاد ٹھہرا اور یہ رشتہ محبوب سے زندگی بھر کو... ہر عمل کو... منسوب کیے بغیر قائم ہی نہیں ہوتا اس کے لیے ارادوں، جذبوں اور عملوں میں صداقت ضروری ہے۔ سچائی کے بغیر نسبت میں توانائی نہیں آتی اور اس سے بھی ضروری بات یہ ہے کہ نسبت محبت کے خمیر میں گندھی روشن ضمیر تنویر کی تاثیر رکھتی ہو۔ ایسا تبھی ممکن ہے جب محبت کو فنا کی آلودگیوں سے دُور... سچے محبوب کے حضور میں عقیدتوں کے جلو میں پیش کر دیا جائے... سچ لافانی ہے۔ محبت امر ہے۔ اسی لیے سچے محبوب سے منسوب ہو کر نسبتیں بھی زندہ تر ہو جاتی ہیں... میں نے اکثر کہا ہے... نسبتیں بڑی لج پال ہوتی ہیں۔ خود سے وابستہ لوگوں اور لمحوں کو مرنے نہیں دیتیں... زندہ رکھتی ہیں... امر کر دیتی ہیں۔ مزاروں پر جلتے چراغوں کی روشنیاں گواہی دیتی ہیں، جن کی محبتیں سچی ہوتی ہیں جن کے محبوب سچے ہوتے ہیں اور جن کی نسبتیں راست باز ہوتی ہیں... ان کی خاک بھی ہم سرِ افلاک ہو جایا کرتی ہے... ذرّے ستارے بن جاتے ہیں اور فضا میں ابدی مسرتوں کا ذائقہ کیف بانٹ رہا ہوتا ہے۔ یہ نور و سرور سے معمور کیفیت نئے دور کی نعتیہ شاعری میں تمکنت بانٹتی ہے۔ یہی وہ مرحلۂ عظمیٰ ہے جہاں آ کر شاعری خواجہ حیدر

علی آتش کے لفظوں میں نسخۂ اکسیر کا درجہ اختیار کر جاتی ہے اور جسے یہ فن درست طرح سے آجاتا ہے وہ مستغنی ہو جاتا ہے اور غنی بھی... اور فن کی درستی من کی تندرستی سے ہی تو وابستہ ہوتی ہے جس کے من میں سچی نسبتوں نے چراغاں کر رکھا ہو اس کے فن میں کیسے کیسے روشن چراغ فروزاں ہوں گے۔

عہدِ موجود کی نعتیہ شاعری اس کی جگمگاتی مثالوں کا میلہ لگا دیتی ہے۔

فرشتوں نے مری لوحِ عمل پر روشنی رکھ دی
ثناخوانِ محمد ﷺ لکھ دیا اوّل سے آخر تک
(صبیح رحمانی)

یہ کمالِ معجزہ بھی آپ سے ہے یا نبی! ﷺ
آپ سے نسبت ہوئی اور ہم کو جینا آگیا
(غضنفر ہاشمی)

میری نسبت میرا رشتہ میرا ناتا ہے یہی
نعتِ سرکارِ ﷺ مدینہ جو حوالہ ہے مرا
(شوکت ہاشمی)

بہ فیضِ نسبتِ سرکار ﷺ ہر تلاطم میں
بھنور خود آئے ہمارے لیے کنارے لیے
(افتخار عارف)

کبھی جو مجھ سے اُلجھتا ہے دوپہر کا عذاب
وہ میرے سر پہ کرم اپنا تان دیتا ہے
(محسن نقوی)

سر اُٹھاتا ہوں تو افلاک کو مَس کرتا ہے
کہ جو محبوبِ ﷺ خدا ہے مرا اپنا بھی وہی
(احمد ندیم قاسمی)

تعلق ہے مرا اہلِ نظر کے اس قبیلے سے
خدا کو جس نے پہچانا محمد ﷺ کے وسیلے سے
(قتیل شفائی)

چادرِ زہراؓ کا سایہ ہے مرے سر پر نصیرؔ
فیضِ نسبت دیکھیے نسبت بھی زہرائی ملی
(سیّد نصیرالدین نصیر)

اُن سے گر ربط نہ ہوتا تو گلِ ہستی کو
کن عذابوں سے گزرنا تھا بشر ہونے تک
(عاصی کرنالی)

اویسی نسبتیں دُوری میں بھی سرشار رکھتی ہیں
کہیں پر بھی رہیں سرکار ﷺ کی خدمت میں رہتے ہیں
(ریاض مجید)

میں تیری نسبت کو اوڑھ کر جاوداں سعادت کا ہم سفر ہوں
تری مہک عام میری دنیائے قلب میں کو بہ کو ہوئی ہے
(محمد فیروز شاہ)

احیائے تہذیبِ اسلام کی خوش بو

ہمارے عہد کی نعتیہ شاعری میں ایک قلبی آرزو موسم گل کے اوّلین گلاب جیسی خوش بو بکھیر رہی ہے وہ زمانہ... آج جس کا ترانہ ہر خوب رُو تمدن کی جستجو کرتی تہذیب کی زبان پر ہے... لمحۂ موجود کے معروف ماہرِ عمرانیات ایلون ٹافلر نے سرخ رُو اور سربلند معاشرہ کے قیام کے لیے جسے آئیڈیل قرار دیا... مدینہ کی فراست مند ریاست کی معاشرت کا پروردہ وہ عہد ہے جس کی مہکار زمان و مکاں کی حدیں اور سرحدیں پار کرتی ہر عہد اور ہر دھرتی پر اپنا اعتبار قائم کرتی چلی گئی۔ زمین کو جس نے سرزمین اور انسان کو رشکِ آسمان بنا دیا۔ ملائک جس کی عظمتوں کے گیت گا رہے تھے۔ وہ پریت کا دور جس زندگی کا طور عام کرتا تھا۔ اس کی پیاس آج محسنِ انسانیت ﷺ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کے اثبات کی آس ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ رات کی گھات جتنی گہری ہوتی جاتی ہے روشنی کی طلب اتنی ہی بڑھتی چلی جا رہی ہے اور نور سے معمور صبحوں کا ہراول ہم سے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو... ہمارے دلوں میں اس کی چاہتوں کی صداقتیں دھڑکنوں کے تال پر نئی تمنائیں رقم کر رہی ہیں اور دل اُجڑ بھی جائیں اپنی آواز کی تاثیر کبھی نہیں گم کرتے بلکہ اُجڑے ہوئے دلوں کی ہوک تو برہا کی ماری کوئل کی کوک کی طرح تاثیر کی جاگیر قائم کرتی چلی جاتی ہے... چناں چہ ہم

دیکھتے ہیں کہ آج کی شاعری میں ان سنہرے دنوں کی بازیافت کی خواہش برکھارت کی موسلا دھار بارش کی طرح ترفع بانٹتی ہے جب انسانی تہذیب اپنی ترتیب میں اعلیٰ قدروں کی ترویج کرتی ایک ایسی جان دار ثقافت کی جاوداں روایت قائم کر رہی تھی... آنے والے کامران زمانوں میں جس کی رفاقت زندگی کی مسافت میں منزل نصیبی کی بشارت روشن تر کرنے والی تھی۔ اس موجودہ دورِ بے طور میں گئے دنوں کی اس خوش اطوار تہذیب کی بازگشت شاعری کی روشنی اور خوش بو سے بھر دیتی ہے۔ آج ہمیں سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ پستیوں سے بلندیوں تک جانے والے راستوں پر روشن چراغوں کی لَو سے اپنی حیاتِ مستعار میں ضو بھر لیں تا کہ دنیا ایک بار پھر دیکھے کہ سچ کے راج میں انسانیت کیسے سرخ رُو ہوتی ہے۔ محبت معاشرت کی روایت کیسے بنتی ہے۔ اور عشقِ رسول ﷺ سے سرشار انسان زمانے بھر کو کیسے کامران و شادمان زیست کی نوید عطا کرتے ہیں۔ یہ سارے خوابِ دل نشیں ہماری سرزمیں کی آنکھ میں زندہ ہو رہے ہیں اور ایک نیا طرزِ احساس تشکیل پا رہا ہے جو شاعری کو اسی پرانی تہذیب کا ورثہ عطا کر رہا ہے جو کسی دور میں پرانی نہ ہوئی بلکہ جس نے روایت کو جدت کی مسافرت میں قیادت کا استناد عطا کر دیا۔

تاریخ محمد ﷺ کا نشانِ کفِ پا ہے
انسان کو معراج ملی اُن کے قدم سے
(سیّد ابوالخیر کشفی)

فروغ اسمِ محمد ﷺ ہو بستیوں میں منیؔر
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو
(منیر نیازی)

شامِ میلاد ہے ہر کوئی شاد ہے وجد میں چاندنی رقص میں نکہتیں
اپنے گھر کی منڈیروں پہ پھر شوق سے موم کی بتیاں اب جلائیں گے ہم
(ریاض حسین چودھری)

زمانہ اور مواخاتِ مدینہ کا زمانہ
سو میں گھر گھر فتوحاتِ مدینہ دیکھتا ہوں
(شوکت ہاشمی)

شکست و ریخت کی اس تیرگی میں
اک یہی اُمید کا روشن حوالہ ہے

کہ اس عہدِ قتال و جنگ میں
وہ خیر خواہوں کا امامِ اوّل و آخریں
اک بار سب کو یاد آجائے

(سیّد صبیح رحمانی)

پھر اپنی ہم عصر یاد کوئی مرے زمانے کو بخش آقا! ﷺ
کہ خود فراموشیوں کے جنگل سروں سے اونچے نکل رہے ہیں

(محمد فیروز شاہ)

حرفِ آخر

اسلام کے جہانگیر و جہاں آرا نظام میں قدرت نے وہ شان دار لچک رکھی ہے کہ ادوار کے بدلتے تقاضوں کا عکس اس سے ہم آہنگ ہو کر رنگ پاتا ہے۔ اسی لیے یہ نظامِ زیست تا قیامت ہر زمانے کا سُرنامہ بن کر درخشاں رہنے کی صلاحیت و قوت رکھتا ہے۔ اسلام کی فطرت میں تغیر و تبدل کے ہم راہ رہنے کی یہ خصوصیت دراصل خالقِ کائنات کے اس اصول سے مطابقت رکھتی ہے کہ ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں'' اللہ کریم دن میں سے رات اور رات میں سے دن پیدا فرماتا رہتا ہے۔ موسموں کو تبدیل ہوتے رہنے کا دائمی حکم ہے۔ گھڑیاں اور ساعتیں فقط گزرتی ہی نہیں احوال و مناظر میں تبدیلیاں بھی پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس لیے لازم تھا کہ نظامِ حیات بھی ایسا عطا ہو جو ان تغیرات پر حاوی ہو۔ چناں چہ اسلام ہر دور اور ہر زمانے کے تقاضوں کی تکمیل کی خصوصیت لے کر آیا اور پیغمبرِ اسلام حضور محمد مصطفےٰ ﷺ اس نظام کو تمام زمانوں اور سبھی جہانوں میں نافذ کرنے کے لیے تشریف لائے سو ضروری ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے مدح سرا اس خوبی کو پیشِ نظر رکھیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی نعت کہتے ہوئے ایسا پیرایۂ اظہار اختیار کرنا ضروری ہے جو ہم عصر طرزِ احساس کی نمائندگی بھی کرتا ہو اور جذبہ و فکر کی تابندگی بھی مترشح ہو۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کے نعت گو شعرا جدید طرزِ احساس کو اپناتے ہوئے اپنی عقیدتوں اور والہانہ وابستگیوں کو زبان دے رہے ہیں۔ جذبہ و عقیدہ راسخ ہو تو شعر کی تاثیر دلوں کو اپنی جاگیر بنا لیا کرتی ہے۔ میں نے چند مثالیں اس مضمون میں پیش کی ہیں ایسے بے شمار اشعار اہلِ عشق کے دلوں میں اور اہلِ دل کے لبوں پر گونج رہے ہیں جو اس زمانے کی جدید روایات کے سفیر بھی ہیں الفاظ، تراکیب تشبیہات و استعارات طرزِ احساس اندازِ اظہار...کئی حوالوں سے جدید مگر اس کے باوصف عقیدتیں اور نسبتیں

وہی جو بلالؓ کی خاک پا کو چوم کر نکھرتی ہیں!!!

میرے عہد کو بھی نصیب ہوں تیری ذات سے وہی نسبتیں
وہ جو عظمتیں تھیں اویس کی، وہ جو رابطے تھے بلالؓ کے!

کتابیات

۱۔ ''میرے اچھے رسول ﷺ'' (مظفر وارثی)

۲۔ ''دل سے درِ نبی ﷺ تک'' (مظفر وارثی)

۳۔ ''قوس'' (مسعود عثمانی)

۴۔ ''پری زاد'' (محمد اظہار الحق)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۴ء

۵۔ ''خالی ہاتھوں میں ارض و سما'' (سلیم کوثر)

۶۔ ''دیوارِ آب'' (محمد اظہار الحق)

۷۔ ''خواب دریچہ'' (جلیل عالی)، ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، لاہور ۱۹۸۵ء

۸۔ ''پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء'' (مرتب: شہزاد احمد)، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء

۹۔ ''چمن'' (عاصی کرنالی)، مکتبۂ اہلِ قلم، ملتان، ۱۹۸۶ء

۱۰۔ ''پاکستانی ادب...شناخت کی نصف صدی'' (غفور شاہ قاسم)، ریز پبلی کیشنز، راول پنڈی ۲۰۰۰ء

۱۱۔ ''گل دستۂ نعت'' (مرتب: مقصود احمد)، ادارۂ مطبوعاتِ طلبہ، لاہور، ۱۹۹۷ء

۱۲۔ ''و رفعنا لک ذکرک'' (راجا رشید محمود)، اختر کتاب گھر، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۳۔ ''پشت پہ گھر'' (بیدل حیدری)، کاروانِ ادب، کبیر والہ، ۱۹۹۶ء

۱۴۔ ''سفر صدیوں کا'' (سعید اکرم)، کمال پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۰۱ء

۱۵۔ ''آئینہ دار'' (شاہنواز زیدی)، ''اساطیر''، میاں چیمبرز، ٹیمپل روڈ، لاہور ۱۹۹۰ء

۱۶۔ ''رؤف رحیم'' (خواجہ عابد نظامی)، مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۷۔ ''انتخابِ نعت'' (عبدالغفور قمر)، EE ۱۹، فیز ۴، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۸۔ ''نئی آوازیں'' (مرتبہ: یونس عزیز ملک)، ادارۂ تخلیقاتِ پاکستان، لاہور، ۱۹۹۷ء

۱۹۔ ''منظر'' (محمد فیروز شاہ)

۲۰۔ ''روح ایماں'' (منظر عارفی) جہان حمد پبلی کیشنز کراچی ۲۰۱۱ء

رسائل و جرائد

۱۔ ''معاصر'' ۔۴، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، ادارۂ معاصر، مزنگ روڈ، لاہور، ۱۹۹۶ء

۲۔ ماہنامہ ''نعت''، لاہور، راجا رشید محمود، اگست، ستمبر ۱۹۹۸ء

۳۔ ماہنامہ ''شام وسحر''، لاہور، خالد شفیق، نعت نمبر

۴۔ ''نعت رنگ''، کراچی، سیّد صبیح رحمانی، ۲۰۰۴ء

۵۔ مجلّہ ''ثناخوانِ محمد ﷺ'' (سیّد صبیح رحمانی نمبر)، کراچی، محمد عارفین خان، پاک لورز کلب، کراچی، ۲۰۰۴ء

۶۔ ماہنامہ ''بیاض'' (نعت نمبر)، لاہور، خالد احمد، عمران منظور، دسمبر ۲۰۰۰ء، جنوری ۲۰۰۱ء

۷۔ ''آثار''، اسلام آباد، فیصل عجمی، ثمینہ راجا

۸۔ سہ ماہی ''ادبیات''، خالد اقبال یاسر، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد

۹۔ سہ ماہی ''ادبیات''، نگہت سلیم، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد

۱۰۔ ''اوراق''، ڈاکٹر وزیر آغا، لاہور

۱۱۔ ''فنون''، احمد ندیم قاسمی، لاہور

۱۲۔ ''اوج'' (نعت نمبر)، ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی، گورنمنٹ کالج، شاہدرہ، لاہور ۱۹۹۲ء

۱۳۔ ''آفاق''، راول پنڈی، قیوم طاہر، ستمبر ۲۰۰۳ء

۱۴۔ سہ ماہی ''تسطیر''، لاہور، نصیر احمد نصیر

۱۵۔ ''نعت رنگ'' ۔۱۲، کراچی، سیّد صبیح رحمانی

تقاضے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اردو نعت میں ہیئت کے تجربوں کی ضرورت

اُردو شاعری کی تاریخ کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ نعت گوئی نے دوسری اصنافِ سخن کی مقبولیت و ترقی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اپنا قدم آگے بڑھایا ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ کا ابتدائی دور جسے دکنی ادب کا دور کہہ سکتے ہیں، عموماً مثنوی سے متعلق رہا ہے۔ یعنی دوسری اصناف کی بہ نسبت مثنوی کی ہیئت زیادہ مقبول رہی ہے۔ یہ مقبولیت نعت گوئی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ چناں چہ نعت کے بیش تر نمونے مثنوی کی صورت ہی میں ملتے ہیں۔

شمالی ہند میں دکن کے اثرات برقرار رہے، لیکن مثنوی کے ساتھ چوں کہ غزل و قصیدہ نے خصوصاً فروغ پایا اس لیے نعت بھی عموماً غزل و قصیدہ کی ہیئت میں لکھی جانے لگی۔ صرف دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں تک یہ بات محدود نہ رہی بلکہ جب مرشد آباد، بھوپال، رام پور وغیرہ میں اُردو کے چھوٹے چھوٹے مرکز قائم ہوئے تو وہاں کے شعرا نے بھی عموماً غزل اور قصیدے کی ہیئتوں میں نعتیں لکھیں اور یہ نعتیں بہت مقبول ہوئیں۔ مغربی تہذیب و تعلیم کے زیرِ اثر جب برصغیر پاک و ہند کی سماجی، سیاسی زندگی میں قابلِ ذکر تبدیلی رونما ہوئی اور انجمنِ پنجاب کے تحت طرحی مشاعروں کے لیے غزل کا مصرع دینے کے بجائے، نظم کا موضوع یا عنوان دیا جانے لگا تو اُردو شاعری کی کلاسیکی ہیئتوں میں تبدیلی آئی اور غزل و قصیدہ کے ساتھ مخمس، مسدس، ترجیع بند اور ترکیب بند کی ہیئتوں کو بھی قابلِ توجہ سمجھا گیا۔ مثنوی کی ہیئت بظاہر قائم رہی، لیکن اس کا مزاج ایسا بدلا کہ مثنوی پہلی جیسی مثنوی نہ رہی بلکہ جدید نظم ہوگئی اور مسدس و مخمس سے الگ تعداد کے بند کی صورت میں لکھی جانے لگی۔ جدید نظم کی اس صورت کو بھی نعت گوئی میں جگہ دی گئی، لیکن رواں صدی کی چوتھی دہائی میں اور اس کے بعد جب نظمِ جدید نے بالعموم جدید تر پابند نظم اور بلینک ورس یا نظمِ آزاد کی شکل اختیار کی تو نعت نے نہ جانے کیوں اس کا کوئی قابلِ ذکر اثر قبول نہ کیا اور یہ کیفیت و صورت ابھی تک باقی ہے۔ حالاں کہ

نعت کا موضوع اس امر کا متقاضی تھا کہ اسے جدید ہیئتوں میں زیادہ سے زیادہ برتا جاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور ہمارے شعرا عموماً قدیم ہیئتوں خصوصاً غزل کی ہیئت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اس مسئلے پر بطورِ خاص غور کرنے کی ضرورت ہے ورنہ خطرہ یہ ہے کہ اُردو نعت گوئی صرف غزل کی ہیئت میں بند ہو کر محض جلسے جلوس میں ترنم سے پڑھنے اور قوالی کی محفلوں میں گانے کا سرمایہ بن کر نہ رہ جائے۔ نعت کا موضوع بہت بڑا ہے اور بڑا موضوع شاعر سے فکر وفن کے بڑے کینوس کا تقاضا کرتا ہے۔ یوں تو اُردو نعت کے سرمایے میں اگر غزل کی ہیئت کی نعتیں بھی نہایت بیش بہا مقام رکھتی ہیں، لیکن علامہ اقبال کی نظموں اور مولانا حالی کے مسدس کے نعتیہ اجزا کی بات ہی کچھ اور ہے، اس لیے اُردو نعت کو شعر کی نئی ہیئتوں اور فکر وفن کے نئے نئے سانچوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر سحر انصاری

نقدِ نعت — تناظر اور تقاضے

اردو تنقید کو اگر تذکرہ نگاری اور پھر سرسیّد احمد خاں، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کے دامن میں بھی بہت کچھ نظر آجائے گا، لیکن گا ہے گا ہے اردو تنقید تردید و تحسین کے عمل سے اس طرح گزرتی رہتی ہے کہ کلیم الدین احمد جیسے نقاد کو یہ معشوق کی موہوم کمر اور فرضی نقطہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اچھی بات یہ کہی گئی تھی کہ اگر اردو میں تنقید کا وجود ہی نہیں ہے تو آپ نے دو ڈھائی سو صفحات کی کتاب کس کے بارے میں لکھی ہے؟ یہ شوشے جب کبھی چھوڑے جاتے ہیں، جیسا کہ آج کل بھی ہورہا ہے، تو مجھے انگریزی کا وہ فقرہ یاد آجاتا ہے:

Re-inventing the wheel.

گویا آپ پہیے کو ازسرِ ایجاد کرنے کا ڈول ڈالنا چاہتے ہیں۔

حالؔی کو ان کے معترضین نے انگریزی سے نابلد اور ماخوذ خیالات سے مستفیض قرار دیا، لیکن دیکھا جائے تو آج یورپ کی بیشتر زبانوں اور وہاں کی یونی ورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نقاد آج تک حالی کے بنائے ہوئے تنقیدی سانچے سے باہر نہیں نکل سکے۔ بہ قول ابنِ انشا:

تم ایک جہان کا علم پڑھے کوئی میرؔ سا شعر کہا تم نے

یہ ایک حقیقت ہے کہ حالی اور آزاد سے لے کر آج تک کوئی نقاد مغرب سے استفادے کے بغیر اس میدان میں قدم نہیں رکھ سکا، لیکن اس کے بعد ایسے ناقدین مغرب کے اثرات کا انکار اور اردو تنقید کو یکسر رد کرنا اپنا فرض بھی سمجھتے ہیں۔ اردو کے نقاد اب یونان اور روما سے ہوتے ہوئے رومانیت، مارکسیت، جدیدیت سے ہوتے ہوئے مابعد جدیدیت تک آپہنچے ہیں۔ بیچ میں اور بھی پڑاؤ ہیں اور ابھی یہ سفر جاری ہے۔

کسی بھی نئے رجحان یا میلان کی ابتدا کسی نہ کسی محرک ہی سے ہوتی ہے۔ اکثر ادبی محافل میں اور زیادہ تر نعتیہ اجتماعات میں اس امر پر بھی گفتگو ہوتی رہی ہے کہ نعت گوئی کے کچھ آداب ہیں جنھیں بعض شعرا اپنے کلام میں نہیں برتتے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ خود وہ شعرا آدابِ نعت گوئی سے بہرہ ور نہ ہوں۔ دوسرے کسی مناسب شخص نے انھیں اس طرف متوجہ نہ کیا ہو۔ اس کے علاوہ اوسط سے بھی کم درجے کی علمی استعداد یا تخلیقی صلاحیت رکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ نعت حصولِ ثواب کی خاطر کہی جارہی ہے، لہٰذا اس میں جذبِ دروں، بے ساختگی اور والہانہ پن پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، لیکن شاید اُنھیں اس تنبیہ کا احساس نہیں رہتا:

با خدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار

نعتیہ شاعری پر تنقید کا جب سلسلہ شروع ہوا تو بہت سے ذہن لفظ تنقید پر چونکے۔ شاید اُن کے ذہن میں تنقید کا ایک ہی مفہوم تھا— نکتہ چینی یا عیب جوئی۔ تاہم رفتہ رفتہ نعتیہ ادب پر تنقید کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں اوّلین نقش امیر مینائی کی وہ تنقید ہے جو انھوں نے محسنؔ کاکوروی کے لامیہ قصیدے:

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

کی تشبیب کے دفاع میں تحریر کی ہے۔ نعتیہ مجموعوں پر آرا اور تقاریظ بھی آتی رہی ہیں، لیکن آج کل کی نعتیہ تنقید میں وسعت بھی پیدا ہوئی ہے اور دانشِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق محاکمہ اور تحسین وستائش کا عمل بھی جاری ہے۔ نعتیہ شاعری کے ناقدین اصلاحی اور افادی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس سے نعت نگاری کے اسالیب میں بھی تبدیلی آرہی ہے اور افراط وتفریط کا رجحان بھی کم ہورہا ہے۔ ان تبدیلیوں کو نعتیہ ادب کے ذمے دار نقاد نہ صرف توجہ سے دیکھ رہے ہیں بلکہ اُن کے تحت نعت میں رُونما ہونے والی فکری وسعت اور معنوی گہرائی کا بھی جائزہ لے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نعتیہ تنقید کا معاصر منظرنامہ رسمی اندازِ محبت اور روایتی عقیدت کے اظہار کو موضوعِ گفتگو نہیں بنا رہا، بلکہ اُس کی نگاہ نعت کی جمالیات اور اُس کے معنوی ابعاد پر ہے۔

نعت گوئی اور سیرت کی نثری کاوشوں پر خاصا کام ہوا ہے۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ اُن میں ضمنی طور پر شعرا کی جانب سے وارد ہونے والے تسامحات کا ذکر بھی ملتا ہے، لیکن تنقید کے ایسے رویّے سامنے نہیں آئے جن سے نقد ونظر کے نئے باب وا ہوں اور شعرا اور دیگر ناقدین اُن سے رہنمائی حاصل کرسکیں۔

اس ضمن میں کاوشیں ضرور کی گئیں، لیکن جس التزام، معیار اور تسلسل کے ساتھ صبیح رحمانی

نے اپنے مجلّے ’’نعت رنگ‘‘ میں نعت گوئی پر صحت مندانہ تنقید کی روایت قائم کردی ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ صبیح رحمانی کی نعت گوئی کا آغاز اس انداز سے ہوا کہ وہ دیگر اصنافِ شاعری سے گریزاں ہوگئے اور نعت نگاری کے ساتھ ساتھ نعتیہ ادب کی تخلیق، ترویج اور فروغ میں اس قدر منہمک ہوئے کہ اب ’’نعت رنگ‘‘ کے توسط سے نعت گوئی کے ناقدین کا ایک ثقہ اور معتبر حلقہ نہ صرف پاک و ہند میں بلکہ اردو کی نئی بستیوں میں بھی پیدا ہو چکا ہے۔ ہر تحریک کے پیچھے ایک فرد ہی ہوتا ہے جو اکیلا ہی منزل کی جانب قدم بڑھاتا ہے اور پھر لوگ آتے رہتے ہیں، کارواں بنتا رہتا ہے۔ اس کا سہرا بلاشبہ صبیح رحمانی کے سر ہے۔

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط، ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر شہزاد احمد، نور احمد میرٹھی، منصور ملتانی (عارف منصور)، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق، شفیق الدین شارق، ظہیر غازی پوری، ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، احمد صغیر صدیقی، پروفیسر انوار احمد زئی، راجا رشید محمود، مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی، مبین مرزا، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر سیّد طلحہ رضوی برق، ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری، ڈاکٹر سیّد تقی عابدی، پروفیسر قیصر نجفی، پروفیسر محمد اقبال جاوید، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر سراج احمد قادری، ڈاکٹر خورشید رضوی، گوہر ملسیانی—— یہ نام جو میں نے نعتیہ ادب کی تنقید کے ضمن میں تحریر کیے ہیں محض وہ ہیں جنھوں نے مسلسل ’’نعت رنگ‘‘ کے لیے مقالات تحریر کیے ہیں۔ جو حضرات وقفے وقفے سے شریک ہوتے رہے ہیں، اُن کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ یہ سب ناقدینِ کرام ’’نعت رنگ‘‘ کے رفیقانِ قلم ہیں۔ یہ سیّد صبیح الدین رحمانی المعروف بہ صبیح رحمانی کی شخصی، تہذیب و شائستگی کا نتیجہ ہے کہ یہ اور دیگر اہلِ قلم اُن کے ساتھ مسلسل تعاون کررہے ہیں۔ میں نے جن ناقدین و مبصرین کے حوالے دیے ہیں وہ اپنے اپنے شعبے میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ان میں زیادہ وہ لوگ ہیں جو تنقید اور تخلیق کے ساتھ ساتھ تحقیق سے بھی ربط رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں جدید تنقیدی اور فکری رجحانات کی آگہی ملتی ہے جس کا مناسب اظہار اُن کی نعتیہ تنقید میں ہوتا ہے۔ شاعری خواہ سیکولر (ہمہ دینی) ہو خواہ کسی ایک عقیدے پر مبنی ہو، ہر صورت میں اُس کا تعلق مروّجہ اور ہم عصر کلچر اور زمینی حقائق سے ہوتا ہے۔ چناں چہ جن نعت گو شعرا کے یہاں فکریات اور ادبیات کے جدید رجحانات سے دل چسپی نظر آتی ہے، اُن کا اسلوبِ نعت گوئی اور زبان و بیان کے تجربات بھی دنیا کے بدلتے ہوئے تناظر کی روشنی میں کیے گئے ہیں۔ ان تغیرات کا شعور نعتیہ ادب کا مطالعہ کرنے

والے ناقدین کے ہاں بھی ہے۔ اس طرح نہ صرف نعت کے موضوعات اور اسالیب میں تنوع پیدا ہوا ہے، بلکہ نقد ونظر کے پیرایے بھی جدید رجحانات کے آئینہ دار بن گئے ہیں۔

عقیدت اور مودّت کی بنیاد پر جو شاعری تخلیق ہوتی ہے اس میں عموماً رسمی اندازِ بیاں کی تکرار نظر آتی ہے۔ تاہم جیسے جیسے علم، شعور اور حالات میں تبدیلی آتی جارہی ہے نعت گوئی کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اس رُخ سے جو تنقیدی مضامین نعتیہ شاعری کے بارے میں لکھے گئے ہیں اُن سے نعت گو شعرا کو بھی تخلیق کے نئے تناظر فراہم ہوئے ہیں۔

اس وقت جو نقاد نعتیہ تنقید میں خصوصیت کے ساتھ اپنا کردار ادا کررہے ہیں، اُن میں دورِ حاضر کے معروف لوگ جیسے پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر معین الدین عقیل، امین راحت چغتائی، ڈاکٹر یحیٰی نشیط، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی اور پروفیسر انوار احمد زئی کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ حالیہ برسوں میں جن نقادوں کے نام نعتیہ ادب کے حوالے سے ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہیں اُن میں مبین مرزا، ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، ڈاکٹر شہزاد احمد اور ڈاکٹر داؤد عثمانی خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

مبین مرزا کا مضمون ''نعت اور اردو کی شعری تہذیب'' نعت شناسی کے ضمن میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے غیر روایتی انداز میں اردو کی شعری تہذیب کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے اور پھر نعت گوئی کے مختلف ادوار سے مسلم اور غیر مسلم نعت گویوں کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ اندازِ تحریر شگفتہ اور مدلل ہے جو عموماً ایسے موضوعات میں کم کم ہی نظر آتا ہے۔ اگر مبین مرزا مزید مثالیں اور ادوار کو شامل کرسکیں تو یہ مقالہ بجائے خود ایک کتاب بن سکتا ہے جسے اپنے موضوع اور اسلوب کی بنا پر یقیناً مزید قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

مبین مرزا کے اس مقالے کی متعدد خوبیوں کے علاوہ بنیادی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ابتدا سے آخر تک وہ ممکنہ سوالات خود قائم کیے ہیں جو ہند اسلامی تہذیب اور اردو کی شعری تہذیب کے سلسلے میں مبتدی و منتہی کے ذہن میں پیدا ہوسکتے ہیں اور پھر مثالوں اور دلیلوں کے ساتھ ان سب کا جواب دیتے ہوئے اپنے بنیادی مقدمے (Basic Thesis) کو ثابت کرتے چلے گئے ہیں۔ اس طرح ان کا یہ مقالہ صرف اسلامی عقائد کے حامل افراد کے لیے نہیں، بلکہ اُن کے لیے بھی چشم کشا ہوگا جو سیکولر انداز میں شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل دیگر موضوعات کے علاوہ تحقیق کے مزاج و منہاج کے بارے میں تسلسل کے ساتھ لکھتے رہے ہیں۔ ''تحقیقِ نعت'' کے ضمن میں ان کے خیالات سے یقیناً

استفادہ کرنا چاہیے۔ ان کا یہ کہنا ہر طرح مناسب ہے کہ ایک تو نعت گوئی پر تحقیق و مطالعہ کو شخصیات پر منحصر و مخصوص نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے مطالعہ افادی مقصد سے ہونا چاہیے کہ یہ محض حصولِ سند یا مقام و منصب یا شہرت کی خاطر نہ ہو۔

فتح محمد ملک کا مقالہ ''اقبال حضورِ رسالت مآب ﷺ میں'' خاصے کی چیز ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے خاص زاویۂ نظر سے اقبال کی فکر اور شاعری کو مذہبی تناظر میں دیکھا ہے اور بہت کام کی باتیں کی ہیں۔ یہ اصل میں اُن کے مستقل موضوعات میں شامل ہے اور اس ضمن میں انھوں نے اپنے بعض دوسرے مقالات میں بھی اپنے نقطۂ نظر کو ابھارا ہے اور اقبال کی شاعری کے اس رُخ کو پاکستان کی آئیڈیالوجی سے بھی ہم آہنگ دکھایا ہے۔

مرزا دبیر اور انشاء اللہ خاں انشا کی نعتیہ شاعری پر شفقت نقوی اور ڈاکٹر تقی عابدی کے مضامین تحقیقی رُخ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق انجم کا مقالہ ''نعت میں منفی عناصر'' بھی اہم مضمون ہے۔ ایسے مقالات کی یقیناً بہت ضرورت ہے تاکہ افراط و تفریط کی فضا کو ختم کیا جاسکے۔ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے ''المدیح النبوی'' کا تفصیلی تعارف عربی اشعار کے ترجموں کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اس کا مطالعہ یقیناً اردو کے نعت گو شعرا کے لیے مفید ہوگا۔

نقدِ نعت کے عصری تناظر پر گفتگو کے بعد میں چند باتیں اس کے فردا کے امکانات اور تقاضوں کے حوالے سے بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی ضرورت یوں بھی محسوس ہو رہی ہے کہ آج تنقید کا شعبہ مختلف شاخوں میں اپنی وسعت نمایاں کررہا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ دیکھا جائے تو ہر شعبہ فکر و نظر کی اپنی بنیادیں رکھتا ہے اور ہر شاخ کے ماہرین اس کا ربط epistemology سے قائم کرتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ عصرِ حاضر کے علوم و افکار میں ابھرنے والے اسی عقلی اور انسانی تناظر کی وجہ سے مغرب میں بعض جدید نظریات رکھنے والے ناقدین کے ہاں آرکی ٹائپ تھیوری کے حوالے تازہ ہونے لگے ہیں۔ علوم و نظریات کی دُنیا میں تغیر و تبدل کا ایسا کوئی بھی عمل انسانی سوچ کے ان سانچوں سے اثر پذیر ہوتا ہے جن کے ایک رُخ پر مخصوص ثقافتی مظاہر کو دیکھا جاسکتا ہے اور دوسری طرف وقت اور حالات کے تحت نئی آفاقی قدریں ہمیں نظر آتی ہیں۔ تاہم نعت کی تنقید و تفہیم کے لیے کسی بھی نظریے یا فارمولے کے سہارے یا کمک کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لیے کہ نعتِ رسول ﷺ میں رسول سے محبت ہی کا نہیں، بلکہ مذہبی فکر کا زاویہ بھی بہت صاف اور روشن ہے۔ علاوہ ازیں جملہ انبیا پر ایمان ایک مسلمان کے لیے لازمی دینی تقاضا ہے۔ یہ سب عوامل نعت کی تخلیق اور تنقید دونوں کو وہ معیار اور اصولی بنیاد فراہم کرتے ہیں، جس کے بعد نعت گو شاعر، اس

کے پارکھ اور قاری کسی کو بھی نعت کی تفہیم اور ابلاغ کے لیے خارجی اور نظریاتی سہاروں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نعت کی بہتر اور وسیع پیمانے پر تفہیم کے لیے اپنا کردار موٴثر طور پر ادا کرنے کے لیے ناقدین کو آج کچھ تقاضوں کو شعوری سطح پر دیکھنا ہوگا۔ نعت کی تنقید کو اس وقت جن تقاضوں کو ملحوظِ نظر رکھنا چاہیے، ان میں ایک تو یہ ہے کہ اب اسے محض عقیدت کا معاملہ نہ سمجھا جائے، بلکہ عقیدت و محبت کے اظہار کو بھی ادب کے فن اور اس کی جمالیات کے معیار پر قبول کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس ضمن میں جس افراط و تفریط سے کام لیا جاتا رہا ہے اور جس کی گنجائش مسالک کے عنوان سے پیدا کرلی جاتی ہے، اب اس کو بھی قطعیت کے ساتھ دیکھا جانا چاہیے اور اس کے لیے ناقدانہ شعور کے ساتھ فیصلے کسی رُورعایت کے بغیر صادر کیے جانے چاہییں۔

اس کے بعد یہ کہ نعت کی تنقید کا بیڑا اٹھانے والے ناقدین کو اپنے وقت کے علوم، نظریات اور حقائق سے آگاہ ہوکر تفہیمِ نعت کے لیے قلم کو جنبش دینی چاہیے۔ اس کے بغیر آج نہ تو نعتیہ ادب کا فروغ ممکن ہے اور نہ ہی نقدِ نعت کے کوئی معنی ہیں۔ تخلیق کار کے لیے بھی یوں تو ضروری ہے کہ وہ اپنے عہد اور اس کے مطالبات کا شعور رکھتا ہو، لیکن نقاد کے لیے تو یہ تقاضا لازمی شرط کا درجہ رکھتا ہے۔ تنقید تو عصری شعور کے بغیر دو قدم نہیں چل سکتی۔ اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو چبائے ہوئے نوالے ہی اُس کے حصّے میں آتے ہیں۔

ڈگلس ایڈمز نے کہا تھا، انسان کرۂ ارض پر ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں لگا رہتا ہے جن کے جوابات کو خود اس نے اپنے نظریات اور زبانی جمع خرچ میں کھودیا ہے۔ اس خیال کا اطلاق دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ مذہبی علم پر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نظریات اور زبانی جمع خرچ کے مسائل تو اس شعبے پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ نعت کی تنقید کو اس مسئلے کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ اس کے بغیر تعلیماتِ نبوی ﷺ اور نعت کے اسلوبیاتی معیارات کا تعین ممکن نہیں ہوسکتا۔ معیارات کا تعین ہی آج غیر رسمی نعت کی ترویج اور اُس کے فکری و جمالیاتی ذوق کے فروغ کا اوّلین تقاضا ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

تحقیقِ نعت : صورتِ حال اور تقاضے

اصنافِ ادب، بالخصوص اردو زبان کی اصنافِ ادب میں، نعت گوئی یا نعت نگاری اگرچہ قدیم صنفِ سخن ہے اور اس کا قدرے ارتقا بھی تاریخِ ادب کے تقریباً ہر دور میں کسی نہ کسی اعتبار سے، قابلِ لحاظ رہا ہے، لیکن اس کا فروغ گزشتہ چند دہائیوں میں زیادہ دیکھنے میں آیا ہے۔ مختلف اسباب کے ساتھ ساتھ، جو دینی سے کے علاوہ معاشرتی بھی ہیں، میرے حیطۂ مطالعہ کی حد تک، یہ حالیہ فروغ کچھ صبیح رحمانی کے مجلّے ''نعت رنگ'' کے باعث بھی ہے جس میں اس کے مشمولات کے تنوع اور معیار کی کشش کے علاوہ اس کی طباعتی جاذبیت اور دل کشی بھی شامل ہے۔ میں شاید نعت کے موضوع پر کبھی کچھ نہ لکھتا لیکن اس مجلّے کی جاذبیت اور صبیح رحمانی کی تحریک وترغیب نے مجھے گاہے بہ گاہے لکھنے پر آمادہ کیا ہے۔ شاید ایسے ہی اسباب ہیں کہ جن کے طفیل نعت کی تخلیق ہی نہیں اس کے ہمہ جہت مطالعے اور تحقیق وتنقید کا رجحان بھی عام ہوا ہے اور مبسوط و مختصر ہر طرح کے مطالعات وتحقیقات کو گزشتہ دو چار دہائیوں میں خاصا حوصلہ افزا فروغ ملا ہے اور یہ سلسلہ مزید وسعت اختیار کر رہا ہے۔

مطالعے کی ایک صورت تو وہ ہے جو مضامین اور مفصل مقالات کی صورت میں ذاتی شوق و دل چسپی کے نتیجے میں سامنے آتی رہی ہے اور دوسری صورت اس کے مبسوط اور تحقیقی مطالعات کا عمل ہے جو جامع اور مفصل تحقیقی مقالات کے طور پر صرف کتابوں اور رسائل ہی میں نہیں جامعات کے سندی مقالات برائے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقصد سے لکھے جا رہے ہیں۔ ان سندی مقالات کے لکھے جانے کی وجہ سے گزشتہ سات آٹھ دہائیوں میں تحقیقات نے خاصا فروغ پایا ہے اور مطالعات وتحقیقات کا ایک عمومی رجحان عام ہوا ہے، جو ہر اعتبار سے مستحسن ہے۔ اگرچہ اس بنا پر اسناد کے حصول کی دوڑ بھی شروع ہوئی ہے جو سرسری، سطحی اور غیر معیاری مقالات پر اسناد حاصل کرنے کی ناروا اور غیر اخلاقی و غیر قانونی کوششوں کا باعث بھی بنی ہے، لیکن

اسی تسلسل میں معیاری اور اہم موضوعات پر تحقیقات و مطالعات بھی سامنے آئے ہیں۔ اس نوعیت اور اس سطح کے مقالات کی روایت میں نعت اور اس کے متعلقہ موضوعات وعنوانات نے بھی توجہ حاصل کی ہے اور یہ سلسلہ روز افزوں ہے۔

یہاں یہ امر ضرور پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ مطالعہ و تحقیق اپنے کسی مقصد کے تابع ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے سارے موضوعات، بہ شمول نعت پر تحقیق اگر حصولِ سند کے مقصد سے انجام دی جائے تو یہ مقصد بڑی حد تک مادّی فوائد کا حصول ہوسکتا ہے۔ جب کہ نعت کے ساتھ عقیدہ و مسلک اور جذبہ و تقدس بھی منسلک ہیں۔ اس حوالے سے نعت کی تخلیق اور اس کا مطالعہ جذبہ وعقیدت کا ایک مظہر تو ہے لیکن اگر مطالعہ سندی نوعیت کا ہے تو وہ مادّی مقصد کے حصول سے مبرا نہیں۔ ہاں یہ اضافی فیضِ پیش نظر ہوسکتا ہے کہ جب سندی مقالہ لکھنا ہی ہے تو وہ نعت پر کیوں نہ ہو؟ یہ امر بہر حال بے حد مستحسن اور بے لوث ہوتا ہے کہ کسی مادّی مقصد کے بغیر نعت کا مطالعہ اور اس کی تحقیق پیشِ نظر ہو، لیکن جہاں نعت کا مطالعہ و تحقیق موضوع بنیں وہاں جامعاتی تحقیقات ہی زیادہ نمایاں رہتی ہیں کیوں کہ ایک بڑی تعداد ایسی تحقیقات و مطالعات ہی کی ہے جو جامعات میں حصولِ سند کے مقصد سے انجام دیے جارہے ہیں۔ اگرچہ ایک زمانے میں جب جامعاتی تحقیقات کا رواج عام نہ تھا، ذاتی خواہش اور ذوق وشوق اس کا محرک بنتے تھے اور عمدہ تحقیقات منظرِ عام پر آتی تھیں، لیکن جامعاتی تحقیقات کے رواج میں آنے کے بعد زیادہ اور منظّم تحقیقات جامعات ہی میں انجام پانے لگی ہیں۔ لیکن جامعات میں ہونے والی تحقیقات کے بارے میں یہ کہنا کہ سب ہی معیاری اور مفید ہوتی ہیں، درست نہیں۔ یہ مقالہ نگار پر اور کسی حد تک نگرانِ تحقیق پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک عمدہ موضوع کا انتخاب کرسکتے ہیں، اور کس قدر لیاقت، جستجو اور محنت و سلیقے سے اپنا کام کرتے ہیں۔

یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جامعات میں صنفِ نعت اور اس کے متعلقات پر ہونے والی تحقیقات اپنی نوعیت اور اپنے موضوعات کے اعتبار سے کس معیار کی حامل ہیں اور اسی مناسبت سے ان کی افادیت اور اہمیت کیا ہے؟ یہاں نوعیت کی حد تک تو یہ تسلیم ہے کہ یہ مطالعات سب ہی اسناد کے حصول کے لیے کیے گئے ہیں، چاہے ان کا مقصد مادّی افادیت کے تابع ہو یا عقیدے و مسلک کے تحت ہو، لیکن ہم انھیں عقیدے و جذبے ہی کے تحت یہاں شمار کریں گے۔ کم ہی ایسا نظر آتا ہے کہ بہ اعتبارِ ضرورت و اہمیت اور بہ لحاظِ دریافت و انکشاف کسی نے نعت کو اپنے مطالعے یا تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ جامعات میں ہونے والے مطالعات کی ایک فہرست ہمارے پیشِ نظر ہے، جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ نعت کے کس کس پہلو، یا موضوع اور عنوان کو مطالعات کے لیے منتخب کیا

گیا ہے یا ترجیح دی گئی ہے؟ان کی افادیت اور اہمیت کس قدر ہے؟

نعت کے زمرے میں، خصوصاً پی ایچ ڈی کی سطح پر، جو مطالعات انجام دیے گئے ہیں ان میں موضوعات کی اہمیت و افادیت بلکہ علمیت کے لحاظ سے، جو اس سطح کا عین تقاضا تھا، کم ہی ایسے کام ہیں جنھیں فکر انگیز، معلوماتی، سیر حاصل اور جامع کہا جاسکے۔ کم ہی ایسے کام ہیں جنھیں اس سطح اور معیار کے مطابق سمجھا جائے۔ زیادہ ترجیح شخصی مطالعات یا موضوعات کو دی گئی ہے، جس سے اس عام تأثر کی تصدیق ہوتی ہے کہ شخصیات کے موضوع پر ہونے والے کام شاذ ہی معیاری اور جامع ہوسکتے ہیں۔ چوں کہ تحقیق دریافت و انکشاف کا کام ہے اور اس کے لیے خاص جستجو، تلاش و محنت اور عرق ریزی کی ضرورت ہے، اس لحاظ سے ایسے افراد جو ان تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، مناسب یا ضروری وقت نہیں دے سکتے، ضروری مآخذ اور مصادر کی تلاش و جستجو کا یارا نہیں رکھتے اور نہ ان میں ایسی صلاحیت ہوتی ہے اس لیے وہ بالعموم شخصیات کو موضوع بناتے ہیں۔ چاہے موضوعِ شخصیت کتنی ہی وقیع اور قد آور ہو، موضوع کے لحاظ سے محدود ہوتی ہے کہ سارا موضوع اس کے گرد گھومتا ہے۔ پھر اگر اس شخصیت کا بھی صرف کوئی ایک پہلو یا ایک گوشہ پیشِ نظر رہے، جیسے نعت نگاری، تو موضوع اور بھی محدود ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے، تحقیق کے میدان میں اور بہ حیثیت نگران، اپنے چالیس سالہ تجربے و مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جو افراد تلاش و جستجو کی دشوار گزار وادیوں میں سرگرداں نہیں رہنا چاہتے، محنت و مشقت سے گریز چاہتے ہیں، یا پھر فکری موضوعات پر اپنے ذہن کو آزمانے کا یارا نہیں رکھتے یا تحقیق و تجزیے کی صلاحیت نہیں رکھتے، بالعموم شخصیات کو موضوع بناتے ہیں۔ اس امر کی دوسری مصلحت یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی شخصیت کو موضوع اس لیے بھی بنایا جاسکتا ہے کہ اس طرح اس کی جانب اپنے عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار ہوسکے۔ یا اگر وہ شخص زندہ اور معاصر ہو تو اس عمل کا ایک رُخ اس شخص کی خوش نودی اور اس سے مطلب براری بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح شخصیت پر ہونے والے کام شاذ ہی معیاری ہوتے ہیں۔ اس کام میں جذبات حاوی رہتے ہیں اور ایک غیر جانب داری اور بے نیازی کا جو التزام رہنا چاہیے، وہ بالعموم نہیں رہتا۔ پھر اگر شخصیت زندہ ہو تو وہ شخصیت نامکمل ہوتی ہے کیوں کہ جس وقت وہ مطالعے یا تحقیق کا موضوع بنی ہے، اس کے بعد بھی تو اسے کچھ کرنا ہے، لکھنا ہے۔ کام کی تکمیل کے بعد کی اس کی تخلیقات یا سرگرمیوں کا تو اپنے مطالعے یا تحقیق کا موضوع نہیں بنایا گیا، اس لحاظ سے موضوع نامکمل یا ادھورا ہی کہا جائے گا۔

اب تک دوسو سے زیادہ مقالات، پی ایچ ڈی اور ایم فل دونوں سطحوں پر، ادبی شخصیات

کے احوال و آثار پر لکھے جا چکے ہیں، لیکن کتنے ہیں جنھیں ''مولوی نذیر احمد'' (از افتخار احمد صدیقی)، ''رجب علی بیگ سرور'' (از نیر مسعود) اور ''امین الدین علی اعلیٰ'' (از حسینی شاہد) کے معیار کا کہا جا سکے۔ یہ شخصیات بھی اپنے اپنے زمرے میں تاریخِ ادب میں ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں اور حسنِ اتفاق سے انھیں محققین اور مصنّفین بھی ایسے ملے جنھوں نے اس قدر محنت، تلاش و جستجو، اور سلیقے کا ثبوت دیا کہ ایک نظیر پیش کر دی کہ شخصیات پر اگر کام کیے جائیں تو وہ ایسے ہوں۔ (ورنہ کراچی یونی ورسٹی میں ۲۰۰۳ء میں تو ایک کام ایک زندہ شاعر، کالم نویس اور ایک ادبی ادارے کے ایک عالی مقام منصب دار پر، جن کا ذکر معاصرِ ادب پر لکھی جانے والی کسی معیاری تاریخِ ادب میں شاید کبھی آ نہ سکے گا، لیکن ان پر ان کی زندگی ہی میں، ان کی خواہش اور ان کے سماجی اثرات کے نتیجے میں، پی ایچ ڈی کا مقالہ ایک ''فاضل'' نگران نے صرف دو ماہ کے عرصے میں لکھوا دیا اور ایسے ناجائز طریقے بھی اختیار کیے کہ تمام ضوابط کو پس انداز کر کے سند بھی دلوا دی جس کے صلے میں اسی بااثر شخصیت کے زیر اثر ''فاضل'' نگران صاحب موضوعِ مذکور کی زیر اثر ایک یونی ورسٹی میں ایک اعلیٰ عہدے پر ''سرفراز'' بھی ہو گئے! شخصیات پر ''تحقیقی'' کاموں کی ایسی داستانیں مزید بھی ہیں۔)

شخصیات پر کام کے ضمن میں یہ شاید جذباتیت کی ایک نمائندہ مثال بھی ہے کہ مثلاً مولانا احمد رضا خان کو بہ حیثیت نعت گو کم از کم آٹھ (۸) افراد نے پی ایچ ڈی کا موضوع بنایا! اور موضوع قریب قریب سب کا ایک جیسا ہی ہے! مولانا احمد رضا خان اپنی علمی و تصنیفی اور دینی خدمات میں چاہے جتنے بھی پہلو رکھتے ہوں، اور یقیناً رکھتے ہیں، لیکن ان میں نعت گوئی تو ایک جزوی پہلو ہے۔ وہ ایک پہلو کیا اس قدر وسیع و عمیق ہے کہ آٹھ افراد صرف اسی ایک پہلو کو موضوع بنائیں؟ اس تحقیق کا حاصل کیا نکلا؟ کیا کیا نئے نئے نکتے نکلے، جو دیگر نعت گو شعراً سے یکسر مختلف اور ممتاز ہیں؟ یہ سب مقالات چھپتے تو ان امور کا جائزہ لیا جا سکتا تھا، لیکن کم زور مقالات کو کوئی کیوں چھپوانا چاہے گا؟ اس سے کئی طرح کی قلعی بھی تو کُھلنے کا امکان رہتا ہے۔

مولانا احمد رضا خان کے معاصر نعت گو شعرا میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی، نعت گوئی سے قطعِ نظر بھی، نام ور اور ممتاز شاعر کی حیثیت میں تاریخِ ادب میں اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ان دونوں کی اپنی اپنی دیگر مؤقر ادبی و علمی حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نعت نگاری بھی ایسا شعبہ ہے جو بہت نمایاں اور مثالی ہے۔ محض نعت نگاری میں بھی ان دونوں کی حیثیت مولانا احمد رضا خان سے کم نہیں بلکہ فنی و معنوی لحاظ سے شاید زیادہ ہی وقیع ہے اور اسی لیے نصابوں کا لازمی حصہ بھی بنی ہے، لیکن ان دونوں بزرگوں پر اس حوالے سے کتنے کام ہوئے ہیں؟ صرف دو، اور وہ بھی انفرادی نہیں

مشترکہ۔اس جائزے سے یہ ثابت ہے کہ مولانا احمد رضا خان پر ہونے والے مطالعات میں کسی فنی امتیاز سے زیادہ عقیدت و مصلحت کا زیادہ دخل ہے، جو تحقیق کے معیار کے لحاظ سے مستحسن نہیں۔کیوں کہ تحقیق اور مطالعے کے موضوع کو منفرد، اچھوتا اور نکتہ رس ہونا چاہیے کہ اس مطالعے یا تحقیق سے کچھ دریافت و انکشاف ہونا چاہیے، محض سرسری جائزہ یا تنقیدی مطالعہ نہ ہو۔ایک ہی موضوع کے اگر آٹھ مطالعے ہوں گے تو ان میں محض تکرار ہوگی یا وہ ایک دوسرے سے استفادے کی تعریف میں شمار ہوں گے۔

شخصیات ہی کے ضمن میں یہ اعداد و شمار ہمیں اس مذکورہ فہرست سے اخذ ہوتے ہیں کہ پی ایچ ڈی کی سطح پر کُل ۶۲ موضوعات میں ۱۸ موضوعات شخصی مطالعات پر مبنی ہیں، جن میں آٹھ فقط مولانا احمد رضا خان پر ہوئے ہیں۔دیگر شخصیات میں امیر بینائی، محسن کاکوروی اور ظفر علی خان کے علاوہ، جو بہ حیثیت شاعر اور مصنف معروف و مؤقر نام ہیں، فرید عمادی، علیم صبا نویدی (دو مقالات)، ناوک حمزہ پوری، جمیل الدین شرقی، حافظ لدھیانوی ہیں جو موضوع بنے ہیں۔ان میں ایک دو کے علاوہ سب ہی غیر معروف اور کسی ادبی معیار و وقعت کے حامل نام نہیں۔اگر نعت نگاری کو شخصیت کے ایک جزو کے طور پر مطالعہ کرنا ہو تو ایسے متعدد اہم نام موجود ہیں ، جیسے نیاز بریلوی، جنھیں کسی نے کسی سطح پر مطالعے کے لیے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔متعدد اکابر شعرا، جیسے غالب، جنھوں نے نعتیہ قصائد و منقبت لکھے، اور بعض نے بہ کثرت بھی لکھے، انھیں کسی نے موضوع نہ بنایا، شاید اس لیے کہ ان پر کام آسان نہ تھا۔قدیم اور دکنی شعرا کے ہاں انفرادی سطح پر بھی نعت تخلیقی زمرے میں شامل رہی، لیکن کسی نے شاذ ہی کسی ایسے شاعر کو موضوع بنایا، کیوں کہ کاتا اور لے دوڑی کے مصداق ان پر کام نہیں ہوسکتے تھے۔

مذکورہ عمومی مطالعات کے ضمن میں ایک عمومی مطالعہ غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی پر دو مقالات میں ہوا۔حمد اور سلام بھی موضوع بنے اور میلاد ناموں (تین مطالعات) پر بھی کام ہوا۔ علاقائی ارتقا کے حوالے سے مطالعے بھی ہوئے اور دکن، راجستھان، کراچی، بہار (دو مطالعے)، پاکستان، کرناٹک جیسے مقامات کے جائزے بھی لکھے گئے۔ ارتقائی اور تاریخی حوالے سے عہدِ نبوی میں نعت گوئی کا مطالعہ ہوا، جس کا موضوع عربی نعت گوئی ہی رہا ہوگا۔شعرائے الرسول بھی ایک مطالعے کا موضوع بنا۔ہندوستان میں عربی نعت گوئی بھی موضوع بنی اور بھارت و پاکستان کی نعت گوئی کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا اور عربی و اردو نعتیہ شاعری کا تقابلی مطالعہ بھی ہوا۔محض نعت گوئی کا ارتقا یا تاریخ بھی موضوع بنی اور علاقائی نسبت سے مطالعہ بھی ہوا اور بہ طور صنفِ ادب بھی تاریخ

لکھی گئی اور 'اردو میں نعت گوئی'، 'اردو شاعری میں نعت گوئی'، اردوشاعری میں نعت گوئی کا ارتقا'، 'اردو شاعری میں نعت'، 'اردو شاعری میں نعت گوئی کی روایت اور ارتقا'، ۔'اردو میں نعت گوئی کا ارتقا، ۱۹۴۷ء کے بعد'،اس قسم کے سارے مطالعے اردونعت گوئی کی تاریخ کا مختلف صورتوں میں جائزہ لینے تک محدود ہیں۔ان میں بہ ظاہر کسی تجزیے ونکتہ آفرینی کی کوشش ظاہر نہیں ہوتی۔ایک دو مطالعے نعت کے صنفی اور ہیئتی مطالعے پر مشتمل ہیں اور ایک عمومی و سرسری جائزے تک مخصوص ہیں۔ان میں، میرے مطالعے کی حدتک اور میرے معیار کے مطابق، ایک آدھ ہی مطالہ تحقیقی اور تجزیاتی نوعیت اور مزاج لیے ہوئے ہے۔

اگرچہ کہ اس طرح کے تاریخی یا ارتقائی نوعیت کے مطالعات میں ڈاکٹر سید محمد رفیع الدین اشفاق اور ریاض مجید کے مقالات و مطالعات بہت جامع اور معلوماتی ہیں،لیکن دیگر ارتقائی اور تاریخی نوعیت کے جائزے زیادہ تر سرسری اور رواں مطالعے ہیں، جن میں گہرائی اور نکتہ آفرینی کم کم ہی نظر آتی ہے۔اس طرح کے مطالعے ایک سندی تقاضا تو پورا کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن تحقیق و مطالعے کے ایک معیار و افادیت کی نمائندگی نہیں کرتے۔ان سے قطع نظر جن موضوعات اور جن مطالعات پر نظر جمتی ہے وہ زیادہ نہیں، جیسے: 'اردو نعت میں غیر اسلامی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'،'اردو حمد ونعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'،'اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمایے کا تنقیدی مطالعہ'،'اردو نعت گوئی کا موضوعاتی تنقیدی مطالعہ'، ''اردو نعت گوئی میں قرآن و حدیث کی تعلیمات'' (یا تلمیحات؟ یہ موضوع دونوں صورتوں میں بہت بڑا ہے۔معلوم نہیں کہ مقالہ نگار نے اس کا حق کس حد تک ادا کیا ہے، جب کہ اس طرح کی ایک مثال کے تحت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے قرآن و حدیث کے محاورات پر علیحدہ علیحدہ جو دادِ تحقیق دی ہے وہ بے مثال اور سیر حاصل ہے۔ یا پھر ڈاکٹر سیّد عبدالمقیت کا حدیثوں کے حوالے سے کام بھی جو اپنے بلند معیار کے سبب اپنی مثال آپ ہے۔)۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جن میں افادیت کا تلاش کیا جانا مشکل نہیں۔

ایک معیاری اور افادیت کی حامل تحقیق کے لیے موضوع کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ موضوع ایسا ہونا چاہیے جو زندہ رہے اور محقق کو بھی اپنے ساتھ زندہ رکھے۔پھر موضوع کی کوئی افادیت بھی ہونی چاہیے کہ اس سے ادب، علم اور معاشرے کو کیا مل رہاہے، یا اس کے توسط سے علم و ادب یا معاشرے کی کیا خدمت کی جارہی ہے۔سرسری، سطحی، اور غیر معیاری موضوعات تاریخ سے محو ہوجاتے ہیں اور جلد فراموش ہوجاتے ہیں۔اگر شخصیت موضوع بنے تو خود وہ شخصیت کتنا عرصہ تاریخ میں زندہ رہنے کے قابل ہے؟ اقبال ،اور ایک حد تک غالب بھی، ہمیشہ زندہ رہیں

گے، اس لیے ان پر ہونے والے معیاری کام بھی ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں اور محقق و مصنف کو بھی اپنے ساتھ زندہ رکھیں گے۔اوپر جن نعت گوشعرا کا ذکر ہوا، ان میں سے صرف اپنی نعت گوئی کی وجہ سے کون ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے یا تاریخ میں جگہ بنانے اور اس جگہ کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوگا؟ مولانا احمد رضا خان شاید اپنی نعت گوئی کے بجائے اپنی اصل دینی و علمی حیثیت میں تو زندہ رہیں گے، لیکن اگر وہ اپنی اس علمی اور دینی حیثیت کے حامل نہ ہوتے تو کیا وہ صرف ایک شاعر اور وہ بھی ایک نعت گوشاعر کے طور پر اردو شاعری کی تاریخ اور تاریخِ نعت گوئی میں فنی امتیازات کے تناظر میں شامل ہوتے، جتنا اب ان کے عقیدت مند انھیں باور کرانے میں مصروف ہیں؟ یہ رویہ جذباتی ہوتا ہے۔

اسی طرح امیر مینائی اپنی ایک متنوع حیثیت کے سبب اپنا ایک ہمہ جہت مقام علم و ادب کی تاریخ میں رکھتے ہیں۔وہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی شاعر بھی ہیں، لغت نویس اور زبان داں بھی ہیں، عالم بھی ہیں، موسیقی کے ماہر بھی ہیں،اور دیگر کئی علوم کے شناور بھی ہیں۔پھر نعت نگاری میں اپنے معاصرین میں شاید کسی سے کم رتبہ بھی نہیں، بلکہ ممتاز تھے، لیکن کیا صرف نعت گوئی کی وجہ سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے؟ یہی نوعیت مولانا ظفرعلی خان کی بھی ہے کہ وہ یقیناً ایک نعت گوشاعر کی حیثیت میں معروف ہیں اور شاعر کی حیثیت میں بھی اپنی پُرگوئی اور قادر کلامی کے باعث اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، لیکن ان کی شہرت و مقبولیت ایک شاعر کے ساتھ ساتھ ایک صحافی اور ایک سیاسی رہنما کی بھی ہے۔وہ اور امیر مینائی اپنی متنوع حیثیتوں میں یقیناً ایک صدی دوصدی تو تاریخ میں یاد رہیں گے، لیکن اگر وہ اپنی مذکور حیثیتوں کے بجائے صرف اور صرف نعت گو ہوتے تو کب تک تاریخ میں یاد رکھے جاتے؟ اس اعتبار سے ان کا مطالعہ محض ایک نعت گو کے طور پر خود ایک محقق کو کتنا وقیع و ممتاز بنا سکتا ہے؟ یہ امر بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ جب شخصیت موضوع ہو تو مطالعہ کرنے والے کا تأثر یا احساس اس کے ساتھ جانب داری یا عصبیت کا بھی ہوسکتا ہے اور یہ عین فطری عمل بھی ہے۔اس لیے شخصیت کا مطالعہ مشکل ہی سے غیر جانب داری سے کیا جاسکتا ہے، جو تحقیقی دیانت داری کے اعتبار سے اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی مستحسن نہیں۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ نعت گوئی پر اگر تحقیق و مطالعہ مقصود ہو تو اسے شخصیات پر منحصر و مخصوص نہیں ہونا چاہیے، کہ کوئی تنہا شخص اب تک اردو نعت گوئی کی تاریخ اور اس کی مستحسن روایت میں ایسا شاید موجود نہیں جو صرف اور صرف اپنی نعت گوئی کی وجہ سے تاریخ کا حصہ بنا رہے۔ ہاں، اگر نعت گوئی کی روایت اور تاریخ یا اس کے رجحانات اور فن کا مطالعہ مقصود ہو،اور یہ ایک مخصوص دور، علاقے یا کسی عصری یا معاشرتی حوالے سے موضوع بنیں تو پھر مشترکہ رجحانات و مزاج

کے حامل شعرا کی نعت گوئی کا اجتماعی مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور یوں شخصیات موضوع بن سکتی ہیں۔اس طرح تقابلی مطالعہ بھی قدرے گوارا کیا جاسکتا ہے جیسا کہ امیر مینائی اور محسن کاکوروی کا مطالعہ ہوا ہے، لیکن اس قسم کے تقابلی مطالعے میں بھی فنی ہم سری کا لحاظ رہنا چاہیے اور مخصوص رجحان یا مزاج یا عصری حوالہ شامل ہو تو ایسا مطالعہ اس ایک حد تک جان دار ہوسکتا ہے۔میرے خیال میں نعت گوئی میں اس طرح کے تقابلی یا مشترکہ رجحانات کے حوالے سے شخصیات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ تنہا کسی شخصیت کے مطالعے سے زیادہ بہتر، مفید اور جامع ہوگا۔

مطالعے کے موضوع اور مقصد کے تناظر میں، میرے نقطۂ نظر سے یہ بھی اہم ہے کہ مطالعہ افادی مقصد سے ہونا چاہیے کہ یہ محض حصولِ سند یا مقام و منصب یا شہرت کی خاطر نہ ہو، اور اگر ایسا ہو تو بھی اسے یہ سوچ کر کرنا چاہیے کہ ہم اس مطالعے کے ذریعے اپنے معاشرے کو یا علم و ادب کو بھی کچھ دیں۔یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے اس مطالعے سے علم و ادب اور تاریخ و تہذیب میں کوئی اضافہ ہونا چاہیے۔کوئی دریافت، کوئی انکشاف، کوئی نکتہ آفرینی، کوئی راہِ عمل، کوئی رہنمائی، علم و ادب کو یا معاشرے اور ماحول کو اس مطالعے کے توسط سے میسر آئے۔پھر موضوع بہت پھیلا ہوا، ہمہ جہت، متنوع، اور دوری اعتبار سے بسیط نہ ہو، ایسے مطالعے سرسری اور سطحی ہوتے ہیں۔ان میں گہرائی اور گیرائی اور نکتہ آفرینی نہیں ہوسکتی۔مطالعے اور موضوع کا عرصہ یا دور جتنا مختصر اور محدود ہوگا، اتنا ہی اس کا مطالعہ نکتہ رس اور نتیجہ خیز ہوگا۔شخصیات کا مطالعہ ہمیشہ ہمہ جہت ہوتا ہے، اس میں اگر صرف کسی جزو کا مطالعہ کرنا ہو، جیسے نعت نگاری، تب بھی ساری شخصیت پہلے پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا اور پھر اس کے بعد اس ایک مطلوبہ جزو کو موضوع بنانا ہوگا۔اس طرح مطالعہ مبسوط ہو جائے گا اور اس صورت میں مطالعے کے تقاضے اور محقق کی ذمے داریاں بڑھ جائیں گی۔

تحقیق کے معیار کا بڑی حد تک تعلق موضوعات سے ہی ہے۔اس لیے اگر اپنی تحقیق کو معیاری، پرکشش اور افادیت کی حامل بنانا ہے تو سب سے زیادہ توجہ موضوع کے انتخاب پر ہونی چاہیے۔یہ تقاضا پی ایچ ڈی کی سطح کے لیے زیادہ ہے جب کہ ایم فل اور یہاں تک کہ ایم اے کے لیے لکھے جانے والے مقالات بھی اس تقاضے سے مبرا نہیں۔یہاں سطحات و معیار کی مناسبت سے یہ لحاظ رکھا جاسکتا ہے کہ شخصیات کے مطالعے زیادہ سے زیادہ ایم فل کی سطح پر کیے یا کرائے جائیں۔اس زمرے میں بڑے سے بڑے نعت گو کا مطالعہ بھی مناسب ہی ہوگا، کیوں کہ اوپر جو کم زوریاں اور نقائص شخصی مطالعات کے ضمن میں پیش کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں یہ محض جذباتی فیصلہ ہی ہوگا اگر معیار پیشِ نظر ہو اور مطالعہ کسی شخص کا پی ایچ ڈی کی سطح پر کیا جائے۔اس لحاظ سے

جو کام اب تک شخصیات پر پی ایچ ڈی کی تکمیل کے لیے کیے گئے ہیں، وہ اگرچہ پی ایچ ڈی کی سند سے فیض یاب ہو چکے ہیں لیکن ان کا معیار، کم ہی کسی مقالے کا، ایک جائز تنقیح کے مطابق پی ایچ ڈی کی سطح پر شمار کے قابل ہوگا۔

اس معیار کے مطابق اکابر شخصیات ، جو چاہے ماضیِ قریب ہی سے تعلق رکھتی ہوں، صرف ایم فل کی سطح کے مطالعے کے لیے ملحوظ رکھی جانی چاہییں جب کہ معاصر یا قریبی عہد کی شخصیات کا مطالعہ ایک جامع معیار کے مطابق پی ایچ ڈی کی سطح پر ہرگز معیاری نہیں ہوسکتا۔ معیار کے حوالے سے ایک ثقہ رائے کے مطابق کسی زندہ، یا ماضیِ قریب کی کسی شخصیت پر ہونے والے سارے کام غیر معیاری ہوتے ہیں کیوں کہ معیاری کام کے لیے متعلقہ بنیادی، ثانوی اور ضمنی مآخذ و مصادر کسی شخص کے انتقال کے وقت فوری دستیاب نہیں ہوسکتے، منتشر اور دور افتادہ ہوسکتے ہیں اور شاید کہیں پوشیدہ اور چھپے رہ سکتے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دریافت ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے خطوط اور دستاویزات۔ پچاس ساٹھ سال کے بعد ہی کہیں یہ تمام چیزیں دستیاب ہوسکتی ہیں ۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس شخص سے متعلق جذبات اور تأثرات میں ایک ٹھہراؤ بھی آجاتا ہے۔ اس وقت اس شخص کے بارے میں جو رائے دی جائے گی وہ غیر جانب دارانہ اور متوازن ہوگی۔ ورنہ بااثر شخصیات اور ان کے اعزا و لواحقین مطالعے کے نتائج پر اثر انداز ہوسکتے ہیں اور اس کی مثالیں موجود بھی ہیں کہ زندہ افراد نے خود اثر ڈال کر خود پر مقالے لکھوائے اور کم ظرف افراد نے اپنی نگرانی میں اپنے مادی یا منصبی فوائد کے لیے ایسے مقالات لکھوائے اور ان پر اسناد بھی جاری ہوچکیں!

زندہ یا معاصر و قریبی عہد کی شخصیات پر، نعت کے حوالے سے، تحقیقی کام ایم اے کی سطح پر کیے جانے میں کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ شخصیات پر تو کام ایم اے کی سطح پر ہی ہونا چاہیے یا اگر شخصیت بڑی اور مؤقر ہو تو اس پر ایم فل کے مقالے لکھے جاسکتے ہیں۔ پی ایچ ڈی کی سطح پر کوئی کام شخصیت پر ، اوپر بیان کردہ معائب یا کم زوریوں کے سبب، خاص طور پر کسی جزوی موضوع کے حوالے سے، معیاری نہیں ہوسکتا اور زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ زمانہ علمی فتوحات کے اعتبار سے تیزی سے ترقی کی جانب گامزن ہے۔ اب مطالعہ وہ مفید اور مؤثر ہوتا ہے جس میں عصری و معاشرتی تقاضوں کا لحاظ رکھا جائے اور اس کا تعلق معاشرتی مسائل، عصری تقاضوں اور مستقبل کے امکانات سے جڑا ہوا ہو۔ نعت کی حد تک بھی ایسے نظری، فکری اور معاشرتی موضوعات کا تعین ہوسکتا ہے جن سے نعت کے رشتے، فنی اور روایتی اور ساتھ ہی فکری و نظری، اپنے معاشرے سے جوڑ کر دیکھے جائیں اور ان سے اصلاح اور تعمیر کا کام بھی لیا جائے۔ مذکورہ بالا فہرست میں جو کام ہوئے ہیں،

میرے نقطۂ نظر اور میرے معیار کے مطابق شاید محمد کا کا خیل کا مقالہ ''اردو نعت میں غیر اسلامی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' بے حد اہم موضوع پر لکھا گیا ہے۔ معیار کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا کہ وہ مقالہ میرے مطالعے میں نہیں آسکا، لیکن یہ قابلِ اطمینان ہے کہ یہ مقالہ ڈاکٹر صابر کلوروی کی نگرانی میں لکھا گیا، جو میرے ذاتی تعلقات اور ذاتی تجربے اور مشاہدے کے مطابق، ایک راسخ فکر استاد اور مصنف و محقق تھے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ عنوان اور موضوع کا انتخاب شاید ان ہی کا طے کردہ ہو۔ یہ موضوع ہر اعتبار سے تعمیری اور صحت مند جذبات کا آئینہ دار ہی نہیں بلکہ مقاصد کا آئینہ دار بھی ہے۔

اس طرح کے تعمیری و فکری موضوعات کی کمی نہیں۔ اگر مطالعے کا مقصد خود صحت مند اور تعمیری ہو تو نعت کی روشنی میں اور اس کے حوالے سے اس مذکورہ مقالے کے مثل، جس میں ہندو عقائد کے اثرات مسلمانوں پر دکھائے گئے ہیں، دیگر عقائد و مسالک اور مذاہب کے منفی یا مثبت ہر طرح کے اثرات کا مطالعہ بھی ممکن ہے۔ ہم اصلاحِ احوال کے لیے ان بدعتوں اور غلط عقائد کو بھی موضوع بنا سکتے ہیں جن سے آج مسلم معاشرے داخلی طور پر اختلافات و نزاعات سے دوچار ہیں اور منفی عقائد کو اپنی زندگی اور اپنی تخلیقات کا موضوع بنا رہے ہیں اور انھیں جائز اور درست بھی سمجھتے ہیں۔ اسوۂ حسنہ اور عہدِ رسالتؐ کے تعلق سے بھی ایسی متعدد باتیں ہماری روایات و حکایات کا حصہ بن گئی ہیں جنھیں تاریخ و حقائق تسلیم نہیں کرتے، اور آج یہ سب نعتوں کا لازمہ بن کر قبولیتِ عام کے درجے پر پہنچی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح کے مطالعے، جو حقائق کو اجاگر کریں اور سچ کو سامنے لاسکیں، نعت نگاری کی روایات کے حوالے سے ہماری توجہ اور ہمارے تحقیقی مطالعات کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ امور صرف مقالہ نگاروں کی توجہ کے طلب گار نہیں بلکہ ان حضرات کی زیادہ توجہ چاہتے ہیں جو تحقیقی مطالعات کی نگرانی اور رہنمائی کے منصب پر فائز رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری تحقیق کو آج کے رسمی تقاضوں کے تحت مقالہ نگاروں سے زیادہ ان حضرات نے زوال اور بگاڑ سے دوچار کر رکھا ہے جو طلبِ منفعت و منصب کی خاطر ''نگرانی'' کا ''فریضہ'' انجام دیتے ہیں اور خود معیاری تحقیق کے علائم و رموز سے بے نیاز بلکہ نا آشنا ہوتے ہیں۔ موضوع کا مسئلہ جو سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے، مطالعے کے معیار کے حوالے سے دراصل نگران کی لیاقت پر بھی منحصر ہوتا ہے۔

نعت نگاری کو اور خاص طور پر اس کے مطالعہ و تحقیق کو معیاری بنانے کے لیے یہ ضروری ہونا چاہیے کہ عربی زبان سے واقفیت کی اہمیت کو سمجھا جائے تا کہ اصل مآخذ اور مصادر کے مطالعے سے حقائق کی جستجو اور جانچ پرکھ ہو سکے اور خلافِ واقعہ روایات اور حکایتوں کو نظر انداز بلکہ رد کیا جا سکے۔ تقابلی مطالعات کے ضمن میں جہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عربی و فارسی کے نمائندہ و ممتاز

نعت گو شعرا سے استفادہ کیا جائے اور ان کا ان کے مضامین و اسلوب کے حوالے سے اردو کے ہم سر شعرا سے تقابل کیا جائے، وہاں مقابل شاعر کی زبان سے بھی محقق کو واقف ہونا چاہیے تاکہ اصل زبان میں اس کی تخلیقات کو پڑھ کر رائے قائم کی جا سکے۔ پشاور یونی ورسٹی میں اختر اورکزئی نے عربی و اردو کے صوفی شعرا کا مدح النبیؐ کے حوالے سے تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ یقین ہے کہ مقالہ نگار عربی زبان سے کامل واقفیت رکھتے ہوں گے تب ہی انھوں نے یہ عنوان منتخب کیا اور مقالہ لکھا، لیکن کچھ لوگ تراجم پر انحصار کر کے مطالعہ کرتے ہیں جو قطعی نامناسب ہے۔ اصل اور بنیادی ماخذ کے بغیر، ترجمہ چاہے کتنا ہی معیاری کیوں نہ ہو، کوئی کام معیاری نہیں ہو سکتا۔ تقابلی مطالعے میں، جو اگر اردو کا کسی اور زبان کے شعرا سے تقابل کیا جا رہا ہو، تو زبان دانی کا یہ تقاضا ضرور ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

مطالعے کے معیار کی بہتری کے لیے جہاں اس کا موضوع سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہیں اس کے رسمی اسالیب اور اس کی پیش کش کا حسن و سلیقہ بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ظاہری پیش کش ہی کسی مطالعے یا مقالے کو پُرکشش اور جاذبِ توجہ بناتی اور مطالعے پر صرف آمادہ ہی نہیں شاید مجبور بھی کر دیتی ہے۔ اس عمل کے لیے ضروری ہے کہ مقالہ نگار ان جدید اصولوں اور ضوابط سے واقف ہو جو مقالہ لکھنے کے لیے آج کی علمی دنیا میں ضروری سمجھے جا رہے ہیں اور انھیں عالمی سطح پر اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں ان کتابوں اور مقالات سے مدد لی جا سکتی ہے جو 'رسمیاتِ مقالہ نگاری' کے ذیل میں خاص اس مقصد سے لکھی گئی ہیں اور دستیاب ہیں۔

کسی مطالعے اور تحقیق کے لیے یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر مطالعہ کیا جائے اور اس کا مقصد اور اس کی سطح چاہے کچھ ہو، اسے معیار کی انتہائی بلند سطح تک پہنچانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے جب موضوع انتہائی پُرکشش، یکسر نیا، اور فکر انگیز ہو۔ پہلے اسے کسی اور نے موضوع نہ بنایا ہو۔ ساتھ ہی وہ کسی شخصی مطالعے تک یا اس کے لیے محدود و مخصوص نہ ہو۔ شخصیات کا باہمی تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے اگر وہ شخصیات ہم سر ہوں اور متعلقہ میدان میں ہمیشہ زندہ رہنے والی ہوں۔ فکری نوعیت کے موضوعات، جن کا تعلق معاشرے اور اس کے مسائل سے ہو، وہ تعمیری اور اصلاحی بھی ہو سکتے۔ اس طرح ہم کیوں نہ ایسے موضوعات پر محنت کریں جن کے توسط سے ہم علمی خدمت بھی انجام دے سکیں اور اپنے معاشرے کی تعمیر و خدمت کا فریضہ بھی ہم سے انجام پا سکے۔ اس طرح وہ موضوع بھی زندہ رہے اور اس کے طفیل ہم بھی تاریخِ ادب میں تادیر زندہ رہ سکیں۔

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

نعت اور نقدِ نعت — چند گزارشات

کہا جاتا ہے کہ موجودہ صدی، نعت کی صدی ہے۔ اردو، فارسی، عربی بلکہ بعض علاقائی زبانوں کا مطالعہ، ہم عصر ادبی پیش رفت کا جائزہ اس خیال کا مؤید ہے۔ انیس ویں صدی (خصوصیت سے اس کا نصف آخر) اور بیس ویں صدی کا ادبی منظرنامہ واضح کر رہا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی ادبی کاوشوں کا بیش تر سرمایہ نعت کا ہی حوالہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعت ایک معتبر صنفِ سخن کی حیثیت سے تنقید نگاروں اور جائزہ کاروں کی توجہ حاصل کر رہی ہے۔ اگرچہ ناقدانہ آرا کی ہماہمی میں بعض مغالطے بھی جنم لے رہے ہیں مگر یہ بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ نعت کے حوالے کے بغیر کوئی ادبی تحریک مکمل نہیں ہوسکتی۔ ضرورت اس کی ہے کہ تنقیدی آرا کو بھی معرضِ نقد میں پیش کیا جائے تا کہ نعت اور نقدِ نعت میں متوازن فکر نشوونما پا سکے، اس متوازن فکر کی دریافت سے قبل مناسب ہوگا کہ نعت کے تاریخی سفر پر ایک نظر ڈال لی جائے، اس سے استخراج کی سہولت میسر آئے گی۔

نعت کا سفر تخلیقِ آدم علیہ السلام سے ہی شروع ہوگیا تھا اور اگر وجہِ تخلیق کا محرک پیشِ نظر ہو تو یہ سفر بہت پہلے سے جاری ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی زمین پر آمد سے نبی اکرم ﷺ کی بعثت تک نعت اظہار کے تفاوت کے باوجود، موجود رہی ہے، محققین نے اس سلسلے میں اَن تھک محنت کی ہے اور بہت تاب دار موتی دریافت کیے ہیں، ولادت کے جاودانی لمحے سے اس سفر کو تاریخ کی پوری روشنی حاصل ہے، ماضی میں دُور تک پھیلے ہوئے ان آثارِ نعت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اُس دورِ ہمایوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو نعت کا معتبر اور مثالی دور ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عہد، نعت کا معتبر حوالہ ہے کہ اس میں نعت کی کثرت بھی ہے، تنوع بھی اور آدابِ آشنائی کے ذوقِ سلیم کی معراج بھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، ذاتِ ممدوح کے عینی شاہد تھے اس لیے بلاواسطہ اُس وجودِ مکرم سے فیض یاب تھے، قرآن مجید کی ہدایات،

روایات و احادیث کی تعلیمات اور اُن کا اپنا جذبۂ صادق رویوں میں توازن اور اظہار میں حسن پیدا کر رہا تھا۔ وہ طلاقتِ لسانی کی وسعتوں سے آشنا ہونے کے باوصف حدود شناس تھے، عرب فطرتاً بھی خلافِ واقعہ اور دُور از کار گفتگو کے عادی نہ تھے، وہ اپنے مشاہدے میں کھرے بھی تھے اور بے باک بھی۔ وہی دیکھتے جو موجود ہوتا اور وہی کہتے جو محسوس ہوتا۔ تصور و خیال کی جولاں گاہ اُن کی دسترس میں تھی مگر وہ حقیقت اور خیال کی ہم مشربی کے قائل تھے، وہ نہ تو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے کے خوگر تھے اور نہ عدمِ مشاہدہ کو مشاہدہ کی مصنوعیت عطا کرنے کا ذوق رکھتے تھے، یہ بندگانِ صحرائی، فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس لیے اُن کے ہاں نہ کسی مصلحت کا پردہ تھا اور نہ ہی کسی قسم کی تہذیبی منافقت تھی۔ عرب شاعر اپنے مشاہدہ اور اپنے خیال کے ساتھ زندہ تھا۔ وہ نہ تو خیال مستعار لیتے تھے اور نہ الفاظ، یہ ضرور تھا کہ اُن کے داخل میں جب بے ترتیبیوں نے ہنگام بپا کیا تو اس کا اثر اُن کی زبان اور رویے پر بھی نظر آیا۔ اسلام نے جب شرک کی ظلمت سے پیدا ہونے والی بے خبری کا پردہ چاک کیا اور عرب فطرت کے جوہرِ آب دار پر پڑی گرد صاف کی تو اُن کا باطن لہلہانے لگا، داخل سنوارا تو ظاہر مستقیم ہوگیا۔ داخل و خارج کی یگانگت سے صداقتوں کا نور دمکنے لگا۔ عرب فطرت کی صداقت پسندی انھیں بارگاہِ صدق میں لے آئی تو صحرائے عرب کا گوشہ گوشہ پیغام بر صداقت ﷺ کی مدح سرائی سے مہکنے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آفتابِ نبوت ﷺ کی ضوفشانیوں نے نجومِ ہدایت بنا دیا۔ روشنیوں کا یہی ہالہ تھا جس میں نعت کا سفر جاری رہا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ اعزاز حاصل رہا کہ وہ نعت کے تقاضوں سے باخبر تھے۔ لفظ و معنی کے رشتوں سے بھی آگاہ تھے اور خوش قسمتی کہ انھیں ہادیِ اعظم ﷺ کی راہنمائی بھی حاصل تھی۔ یہ دعویٰ بڑے یقین و اعتماد کے ساتھ کیا جاسکتا ہے کہ نعت کی ابتدا ہی بلند بام تھی جب کہ دیگر اصنافِ سخن، صدیوں کے سفر اور بے شمار نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد تکوینی وقار حاصل کرتے ہیں۔ نعت کا یہ شرف کہ اس کی ابتدا ہی معیاری تھی، بعد والوں کو سہولت بھی عطا کرتا ہے اور محتاط قدمی کا پیغام بھی دیتا ہے۔ نعت کا معیار، مضامینِ نعت کا تنوع اور حدود، حالات و ظروف کے تحت اس میں کشادگی کے امکانات، نعتیہ ادب کے طالبِ علم کو عہدِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی تلاش کر لینے چاہییں تا کہ لغزشِ قدم کا خطرہ نہ رہے۔ بہتر ہوگا کہ ابتدا ہی میں عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی نعتیہ شاعری کے مشتملات کا شمار کرلیا جائے تا کہ راہ متعین کرنے میں دقت نہ ہو، استیعاب تو ممکن نہیں مگر پھر بھی یہ کاوش کر لینی چاہیے کہ نعت میں ذاتِ ممدوح ﷺ کے حوالے سے ان امور کا خیال رکھا گیا ہے اور یہی امور ہر دور کے لیے لائقِ تقلید ہیں، اس لیے ہر نعت نگار

کو ان سے اپنی راہیں روشن کرنا چاہییں۔

☆ ممدوح، مخلوق ہے مگر تخلیق کا شہکار ہے، لازم ہے کہ ذاتِ ممدوح میں الوہی صفات تلاش نہ کی جائیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ مثلیتِ مخلوق کی غیر موافق توجیہ پر اصرار نہ کیا جائے۔

☆ ممدوح، انسانی حسن و جمال اور اوصاف و محامد کا بے مثل پیکر ہے اس لیے بہر رنگ مدح سرائی کا مستحق ہے۔

☆ ممدوح فرستادۂ الٰہی ہے اور فرستادگان کا امام ہے۔

☆ ممدوح کی سیرت لائقِ اتباع ہے کہ وہی اسوۂ حسنہ ہے۔

☆ ممدوح کا جسمانی وجود، حسی حوالہ، خاندانی نجابت اور تعلقات کا ہر ہالہ معتبر ہے۔ یہ یقین رہنا چاہیے کہ ذاتِ ممدوح ہر حوالے سے بے مثل اور عظیم تر ہے۔

☆ ممدوح کی محبت باعثِ نجات اور غلامی سرافرازیوں کی ضمانت ہے۔

☆ ممدوح کی مدح معاشرتی تقاضا ہی نہیں ایمان کا مطالبہ بھی ہے۔

☆ ممدوح کی ذات، صفات اور خصائص کا بیان اور دفاع، علامتِ ایمان ہے اس لیے قول وعمل سے مدافعت کا حق ادا ہونا چاہیے۔

صحابہ کرام علیہم الرضوان کی نعتیہ شاعری میں قرب کی تمنا اور وصال کی طمانیت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے مگر کہیں کہیں فراق کی کسک کا اندازہ بھی ہوتا ہے جس کا والہانہ پن بعد میں ظاہر ہوا، قرب و بعد میں انسانی رویوں کا اظہار مختلف ہوتا ہے اگرچہ وجہِ اظہار ایک ہی رہتا ہے۔ استعانت و استغاثہ کی کیفیات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شاعری میں بڑی نمایاں ہیں۔ اگرچہ اس عہدِ زرّیں کے بعد اور خاص طور پر دورِ زوال میں ان کا لہجہ اور آہنگ زیادہ درد آفریں ہوگیا۔ دفاعی شاعری کے اوّلیں پیکر، اشاعتِ اسلام کی راہ میں حائل معاندانہ سرگرمیوں کے حوالے سے ترتیب پائے تھے، بعد کے ادوار میں مکر و فریب کی چالوں، منافقت کے ہتھکنڈوں اور بدعقیدگی کی زہریلی چالوں کے حوالے سے ترتیب پانے لگے۔ اس لیے کہ سازشیں بالمقابل نہ تھیں، ملفوف تھیں اور ملتِ اسلامیہ کو اپنا تشخص قائم رکھنے کے لیے آستین کے سانپوں سے محتاط رہنا تھا۔ الغرض مدحیہ شاعری، توصیف و دفاع کے جذبوں کے ساتھ عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے عصرِ حاضر تک موجود ہے۔

نعت، دینی تقاضوں کے حرفی پیراہن کی صورت میں ہر دور کی زینت رہی ہے۔ بعض ادوار اس ثروت سے مالا مال رہے تو بعض ادوار مداہنت کا شکار بھی ہوئے۔ اس مداہنت میں حکمرانوں کی نرگسیت کا عمل دخل زیادہ رہا۔ حال مست معاشرے بے اعتدالیوں کا شکار ہوئے تو

صاحبانِ اقتدار کی نفس پرستی نے بھی اس واجب کی ادائیگی میں منفی کردار انجام دیا مگر جب غلامی، زوال، انحطاط اور جبر نے زبوں حال کر دیا تو نعت ہی نے سہارا دیا۔ بے بسی، بدحالی، در، در کی خواری اور خصوصیت سے اقتدار کی بے ثباتی نے مضطرب کیا تو اُس وجودِ مکرم ﷺ کی یاد آئی جو ہر درماندہ کا سہارا ہے۔ سلطنتِ عباسیہ کے زوال، ہلاکو خان کے مظالم اور معاشرتی بے چینیوں نے جھنجھوڑا تو بے چین نظریں گنبدِ اخضر کا سہارا ڈھونڈنے لگیں، مادّی سہاروں کی خودفریبی کا طلسم ٹوٹا تو پناہ گاہ عالم ﷺ کی دُہائی دی جانے لگی اور نعتیہ شاعری کا دورِ عروج شروع ہوا۔ امام الصوصریؒ، امام البوصیریؒ سے احمد شوقی تک ایک مربوط سلسلہ ہے۔ برِصغیر میں بھی ایسا ہی ہوا۔ شیخ عبدالمقتدر اور شیخ احمد سے نعت کی دنیا آباد ہوئی مگر پھر وہی طاقت و رحکمرانی جس سے اس تعلق کو ضعف پہنچا، لیکن شاہی طمطراق کو زوال آتے ہی خودفریبی کا پردہ چاک ہوا اور نعت کی طرف توجہ ہوئی۔ برِصغیر میں استعماریت کا دور استغاثوں اور فریادوں کا دور ہے۔ بغداد کی تباہی اور دہلی کے زوال نے ایک سے اثرات مرتب کیے۔ تحریکِ پاکستان نے اس تعلق کو تقویت دی کہ اپنے وجود کی تلاش اس حوالے کے بغیر ممکن ہی نہ تھی۔ نعت نے مطالبوں کو ہی یک رنگی عطا نہیں کی، شعور و فکر کو بھی وحدت آشنا بنایا، اس طرح نعت ملّی تشخص کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی۔

نعت کا یہ چودہ سو سالہ سفر بہت سے نشیب و فراز سے گزرا۔ حالات، تقاضے اور جغرافیائی ماحول میں یکسانی نہ تھی، مقامی اثرات اہم رول ادا کر رہے تھے۔ منابع نعت سے بے خبری بھی اثر دکھاتی رہی تھی۔ برِصغیر کا دیومالائی پس منظر بھی شب خون مارتا رہا تھا۔ ماحول کی سنگینی نے بھی معتقدات پر اثر ڈالا تھا جس سے مقامی شاعری متاثر ہوئی تھی۔ نعت میں بھی مقامی اثرات در آئے تھے اس لیے گاہے گاہے ایسے اشعار بھی کہے گئے جو نعت کے تقدس کو برقرار نہ رکھ سکے۔ ضروری تھا کہ ایسے اشعار اور ایسے خیالات کا فوری محاسبہ کیا جاتا۔ سوچیے جب قرآن مجید کی آیات کی تلاوت میں ایسے لہجے اور رویے کی نشان دہی ہوئی جو معیاری نہ تھے تو خلیفہ راشد نے ہزار احترام کے باوجود غیر معیاری نسخے واپس لے لیے اور معاشرے میں باقی نہ رہنے دیے۔ یہ ایک انتباہ تھا کہ مسلم معاشروں میں معیار سے ہٹ کر غیر صالح رویے برداشت نہیں کیے جانے چاہییں۔ یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ غیر معیاری میلان پر کاری ضرب لگاتے ہوئے مناسب اختلافات کی گنجائش باقی رہنی چاہیے کہ انسان کی جغرافیائی اور علاقائی مجبوری کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ گنجائش اور حدود کے درمیان ایسی حدِ فاصل قائم رہنا لازم ہے جو پریشان نظری سے بچائے اور آزادیِ فکر کی بھی آبیاری کرے۔ اسی ضرورت نے نعت کے حوالے سے تنقیدی شعور کی حوصلہ افزائی

کی ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ عصرِ حاضر میں نقد و نظر کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے اور بڑی مخلصانہ کاوشیں ہوئی ہیں۔ یہ تنقیدی رویے، اصلاح کے ضامن بھی ہیں اور ترویجِ نعت کے محرک بھی۔ یہ مستحسن پیش رفت ''نعت رنگ'' کے اجرا سے ثبات لے رہی ہے۔ ''نعت رنگ'' کا ہر شمارہ پُرخلوص ناقدانہ بصیرت کا مرقع بنتا جا رہا ہے۔ مناسب ہوگا کہ تنقیدی حوالوں سے لکھنے والے قلم کار اپنے رویوں پر خود بھی نظر رکھیں کہ کہیں جوشِ نقد سلامت روی سے برگشتہ نہ کر دے، اس حوالے سے چند بنیادی امور کی طرف نشان دہی کی جا رہی ہے تا کہ نعت اور تنقیدِ نعت میں موانست کے جذبے بیدار رہیں۔

نعت تین عناصر سے تشکیل پاتی ہے:

۱۔ زبان جو اظہار کا پیراہن ہے اس کی حدود کا احساس رہے اور لفظ لفظ کی حرمت پیشِ نظر رہے۔ ادبی و شعری روایات سے لائق اعتماد آگہی ہو کہ ان کو صدیوں کی محنت نے روایت بننے کا حق عطا کیا ہے۔ ہر زبان کے اپنے تقاضے ہوں گے۔ اختیارِ کلمات کا ذوق، ضمِ کلمات کی صلاحیت اور حرف حرف کا مرتبہ و مقام، معیاری شاعری کے اساسی اجزا ہیں۔ نعت چوں کہ شعری لبادے میں ہے اس لیے اوزان و قوافی کی مروّج حد بندیاں، ایک ایک کلمہ کا درست تلفظ تا کہ صرفی قوانین بھی مجروح نہ ہو۔ نحوی ضابطے بھی نہ ٹوٹیں اور عروضی حدود بھی پامال نہ ہوں۔ بدقسمتی سے اوزان و بحور سے فطری یا کسبی لگاؤ نہیں ہوتا مگر معاشرتی تقاضوں سے مجبور ہو کر میدانِ شعر میں قدم رکھ دیا جاتا ہے۔ اس سے ایک غیر صالح رویہ جنم لیتا ہے۔ شاعر اُسے ہی کہنا چاہیے جو شعر کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ معاجم سے ہم قافیہ کلمات کی فہرست تیار کرنے سے شاعری نہیں ہوسکتی۔ قدما ان حدود کے پابند رہے مگر عصرِ حاضر کی آزاد روش نے بارہا ان حدود سے بغاوت کی۔ بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بے خبری کا شاخسانہ ہے۔

۲۔ نعت صرف عروضی جمع تفریق کا نام نہیں۔ یہ سیرتِ رسول ﷺ کے لائق اعتماد تذکار کا نام ہے۔ اس لیے نعت گو شاعر کو سیرت کے حوالوں سے آگہی کا اہتمام کرنا چاہیے تا کہ کوئی خیال، بے سند اور کوئی نشان دہی محض قیاس نہ قرار پائے۔ عصرِ حاضر کے شعرا کو اس جانب خصوصی توجہ دینا چاہیے۔

۳۔ نعت نہ تو صرف شعری صلاحیت کا اثر ہے اور نہ روایات کی ترتیب کا نام۔ یہ تو جذباتِ محبت

اور احساسِ عقیدت کے اظہار کا وہ سلیقہ ہے جو ہمہ تن محترم ہے۔ یہ صرف نظم نہیں بلکہ ذاتی واردات کا شعری پیراہن ہے۔ جذبوں کی سچائی نعت کا حسن ہے اور حرفوں کی متانت اس کا جمال ہے۔ اُس بارگاہِ عظمت میں اسے پیش کرنا ہے جہاں اگر جنبشِ لب، خارج از آہنگ ہو جائے تو ایمان کا خطرہ ہے اور اگر جذبے مستقیم اور پابندِ آداب نہ رہیں تو دھتکارے جانے کا احتمال ہے۔

غور کیا جائے تو نعت مشکل ترین صنفِ سخن ہے کہ اس میں لفظ و معنی کی طہارت درکار ہے۔ اسی لیے فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ نے اسے تلوار کی دھار پر چلنے کے مشابہ قرار دیا تھا۔ اس حوالے سے ناقدینِ فن حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے قصیدے ''بانت سعاد'' کے ایک شعر پر پیغمبرانہ ردِّعمل کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ اور اُن کے بھائی حضرت جبیر رضی اللہ عنہ جب آفتابِ نبوت کی ضیاپاشیاں محسوس کرنے لگے تو مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ پہلے حاضر ہوگئے کہ حالات کا جائزہ لیں۔ وہ مدینہ منورہ آئے تو وہیں کے ہو رہے۔ اس پر حضرت کعب رضی اللہ عنہ جو بھائی کے منتظر تھے جذباتی ہوگئے اور غصے میں تین شعر ایسے کہہ دیے جو منزلتِ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مناسب نہ تھے۔ قتل کا حکم ہوا، صحرا کو نکل گئے اور مدت بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پناہ میں دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور ماسبق لغزشوں پر معذرت چاہی اور تلافیِ مافات کے طور پر ایک قصیدہ پیش کیا جو روایتِ مدح کا معروف و مقبول قصیدہ ہے اور اس لیے بھی محترم ہے کہ دربارِ رسالت میں پیش کیا گیا اور رحمتِ عالمین ﷺ نے اسے سماعت فرمایا۔ تحسین بھی فرمائی اور انعام بھی دیا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر جو مدح نگاری کا نقطۂ کمال ہے۔ یوں تھا:

ان الرسول لنور یستضاء بہ
مھند من سیوف الھند مسلول

اس پر نبیِ رحمت ﷺ نے روکا اور اس کے مصرعۂ ثانیہ کو بدل دیا اور شعر یہ صورت لے گیا:

ان الرسول لنور یستضاء بہ
مھند من سیوف اللّٰہ مسلول

یعنی سیوف الھند کی بجائے سیوف اللّٰہ کر دیا گیا۔ اس سے نقدِ شعر کے حوالے سے یہ اصول استنباط کیا گیا کہ لفظ مناسب نہ ہوں تو نعت کی عظمت پر حرف آتا ہے۔ یہ اصلاح چوں کہ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمائی تھی اس لیے حجت قرار پائی اور ناقدین کو نقدِ شعر کا ایک

ضابطہ ہاتھ آیا اور اس بنیاد پر نعتیہ شاعری پر تنقید کا در کھلا، اس اصلاح کا یہ پہلو ضرور پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ سیوف الھند کی ترکیب کو بدل دیا گیا مگر مھند کا کلمہ برقرار رکھا گیا۔ سیوف الھند کی ترکیب عرب معاشرت میں ہندی تلواروں کی عمدہ کارکردگی کی بنا پر معروف ہوئی تھی مگر اس میں اضافت تھی جو سیوف کو فوقیت کا مقام عطا کر رہی تھی۔ رسولِ عالمین ﷺ کے حوالے سے گفتگو کو کسی محدود نسبت کا حوالہ دینا، آفاقی حسیت کو علاقائی نسبت سے محدود کرنا تھا۔ پھر یہ کہ ہند کی تلواریں کاٹ میں عمدہ تو ہوسکتی تھیں مگر اُن کی کاٹ میں خوب و ناخوب کی کوئی قوت نہ تھی۔ ان کے مقابلے میں اللہ کی تلواریں کہہ کر یہ واضح کرنا بھی تھا کہ یہ کاٹ دار ضرور ہے مگر اُٹھتی کسی ناخوب پر ہی ہے۔ قوت کو خیر ہی کا پیغام بر بننا ہے۔ شعر سے کسی ذہن میں تاویل کا سقم پیدا نہ ہو، اس لیے اصلاح کر دی گئی۔ اس حوالے سے غلط انتساب، ناموافق نسبت اور غیر محمود ترکیب سے اجتناب کی راہ دکھائی گئی۔ شعر میں مھند کا کلمہ بھی ہندی حوالہ رکھتا ہے مگر اسے تبدیل نہیں کیا گیا اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگرچہ لفظوں کی ساخت کسی نہ کسی حوالے سے ہی ترتیب پاتی ہے لیکن تشکیل کا یہ حوالہ عموم حاصل کرلے حتیٰ کہ تشخیص سے تجرید کا سفر کرلے تو ایسے لفظ استعمال ہوسکتے ہیں اور ان کا بدلنا ضروری نہیں ہوتا۔ اصطلاحات و تلمیحات کی یہی حقیقت ہے کہ اُن کی بنیادی ساخت میں کسی حسّی حوالے کی کارفرمائی ہوتی ہے مگر یہ حوالہ صرف تشکیلِ معنی کا ایک بنیادی عنصر ہوتا ہے۔ اور تفہیم کی سہولت عطا کرتا ہے۔ مروّج اصطلاح یا رائج تلمیح کو ہر اعتبار سے اُس کے بنیادی معنی کا پابند نہیں رکھا جاسکتا، مثلاً مسیحا یا مسیحائی کے کلمات یقیناً حضرت مسیح علیہ السلام سے نسبت رکھتے ہیں کہ شفا بخشی کا ایک بنیادی مفہوم آپ کی ذات سے ہی لیا گیا ہے مگر جب مسیحا کسی معالج کے لیے استعمال ہو تو اُس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تمام صفات تلاش کرنا کارِ لاحاصل ہوتا ہے۔ یہ تو قوتِ علاج کو ایک معتبر حوالہ دینا ہے۔ مثیل قرار نہیں دیتا۔ صبرِ ایوب، گریۂ یعقوب یا طوفانِ نوح، اب تلمیح کے طور پر مستعمل ہیں اس لیے اگر کوئی کہے کہ ''صبرِ ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا'' تو وہ اپنی کیفیات کو تاریخی تناظر میں بیان کر رہا ہے، ہم سری کا دعویٰ نہیں کر رہا۔ یقیناً زبان کی ثروت ایسے ہی کلمات اور ایسی ہی تراکیب سے ہوتی ہے۔ ''دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری'' جسارت نہیں کسبِ فیض کی ایک تمنا ہے۔ تشبیہات میں بھی بعض اوقات ایسی الجھن پیدا ہوجاتی ہے۔ عموماً مشبہ بہ کو برتر سمجھا جاتا ہے کہ اسی برتری کی بنیاد پر تشبیہ دی جاتی ہے مگر یہاں بھی اس قانون یا ضابطے کی شدت نقصان دہ ہے۔ حسن و جمال کے حوالے سے چاند سے تشبیہ فضیلت کے حوالے سے نہیں۔ حسن و جمال کی کیفیات کو ایک عیاں تر حوالہ دے کر قاری

پر اس کا نقش ثبت کرنا ہوتا ہے۔ کبھی پہلے سے معروف مفہوم کے سہارے نئے مفاہیم کی جلوہ گری مقصود ہوتی ہے۔ درودِ ابراہیمی میں ''کما صلیت علی ابراھیم'' رحمتوں کی طلب کا ایک پہلے سے موجود معروف حوالہ ہی ہے۔ ایسی الجھن عربی کے مایہ ناز شاعر ابو تمام کو پیش آ گئی تھی جب وہ وہ دربارِ عباسی میں مدحیہ قصیدہ پیش کر رہا تھا۔ دورانِ قصیدہ ممدوح کی صفات شماری میں وسعتوں کے حوالے سے یہ کہہ گیا:

اقدام عمرو فی سماحة حاتم

فی حلم احنف فی ذکاء ایاس

کہ ممدوح پیش قدمی میں عمرو کی طرح ہے تو سخاوت میں حاتم ہے۔ حلم میں احنف اور ذکا میں ایاس ہے۔ اُس نے سوچا ہوگا کہ ممدوح کو ایک شعر میں چار بلند قامت اور اپنے اپنے میدان کے شہسواروں سے تشبیہ دے رہا ہوں تو اس قادر کلامی پر سامعین حتیٰ کہ شاہِ بغداد بے حد خوش ہوں گے اور زر و جواہر نثار کر دیے جائیں گے مگر دربار میں موجود مشہور عرب فلسفی الکندی بھی موجود تھا اُس نے فوراً ردِ عمل دیا کہ ''اتشبہ امیر المومنین باخلاف العرب'' کیا تو امیر المومنین کو عرب کے بدوؤں سے تشبیہ دے رہا ہے۔ بہ ظاہر تو یہی بات تھی، کہاں قبائل کے سردار اور کہاں پوری مملکتِ اسلامیہ کا صدر نشین؟ اعتراض نے سب کو مبہوت کر دیا۔ ابو تمام نے سر اٹھایا اور عرض کیا، ''ابھی بات جاری ہے، جلد فیصلہ نہ کیجیے۔'' اور پھر دو ایسے شعر کہہ دیے جو اس کے ہاتھ میں تحریر کیے ہوئے قصیدے کا حصہ نہ تھے بلکہ اس کی بدیہہ گوئی کا مظہر اور اعتراض کا مسکت جواب تھے۔ کہا، ''میری ان تشبیہات کو جو برتر کو کم تر سے دی گئی ہیں لائقِ تردید نہ سمجھو کیوں کہ:

فاللّٰہ قد ضرب الافل لنورہ

مثلاً من المشکوٰۃ والنبراس''

اللہ تعالیٰ نے بھی تو اپنے نور کو چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ قرآن مجید میں دی گئی تشبیہ کو ابو تمام نے اپنی دلیل بنایا اس لیے کہ اگر یہ کلمہ تسلیم کر لیا جائے کہ مشبہ سے مشبہ بہ کو برتر ہی ہونا ہے تو خالق کی کسی صفت کو بھی تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح مخلوقات کے امام ﷺ کے لیے کسی تشبیہ کا مقام نہ ہوگا۔ حالاں کہ تشبیہ برتری ظاہر کرنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے مگر ہر موقع پر نہیں، بے مثل صفات کو نسبتاً کم تر سے تشبیہ دینا کم کرنا نہیں ہوتا۔ مفہوم کی توضیح اور سامع یا قاری کو تفہیم کا ایک سہارا عطا کرنا ہوتا ہے۔

ان گزارشات سے صرف یہ مطلوب ہے کہ لفظوں کے ورے جذبوں کو بھی پیشِ نظر

رکھیں تاکہ بعض قیمتی شعر بھی زد میں نہ آجائیں۔ حیرت تو اس پر ہے کہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کے بعض اشعار بھی اسی پیمانے پر کس دیے گئے ہیں۔ برِصغیر میں نعت کی دنیا کو ایک نہایت محتاط وارفتگی کا حامل ایک شاعر ملا تھا ہم اُس وجود کو بھی اپنی ذہنی تنگناؤں کے حوالے سے ہدفِ تنقید بنا رہے ہیں۔ نعت میں ایمان کے تقاضے جب محبتِ رسول ﷺ کی رفعت سے آشنا ہوتے ہیں اور قرب کی منزلوں سے آگہی بخشتے ہیں تو کئی فرش نشین ان رفعتوں کے ادراک سے قاصر رہ جاتے ہیں مگر ان کوتاہیوں کو حجت قرار دے کر صائب و ناصائب پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

برِصغیر کی فضا میں یہ بھی اکثر کہا جاتا ہے کہ محبتِ رسول ﷺ میں غلو کیا جاتا ہے اور بندہ و مولا کا فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اس دعوے کی تائید میں چند اشعار ہر نقاد کو یاد ہوتے ہیں۔ حیرت ہے مدت سے یہی اشعار جو کسی طور بھی معیاری نہیں بہ طورِ دلیل پیش کیے جاتے ہیں۔ کیا نعت کے معیاری ادب میں ان اشعار کی کوئی حیثیت ہے، کیا ان اشعار کو بنیاد بنا کر اصول مرتب کیے جا سکتے ہیں؟ اس میں ایک نفسیاتی مغالطہ بھی ہے۔ برِصغیر میں جب اسلام داخل ہوا تو یہاں کی مقامی آبادی کا تصورِ الٰہ بھی بے کیف تھا اور تصورِ انسان بھی۔ آبادی کی اکثریت تعددِ الٰہ کی قائل تھی اور انھوں نے اپنی فہمِ ناقص کے حوالے سے الٰہ کو بھی اپنی صفات عطا کر رکھی تھیں۔ دیوتا انسان کی طرح رہتے، آپس میں جنگ و جدال کرتے۔ حتیٰ کہ شادی بیاہ کرتے اور اولاد پیدا کرتے تھے۔ اوتار اور دیوتا کا فرق نہ رہا تھا۔ اس طرح تصورِ الٰہ بہت محدود ہو کر کم تر صفات کا حامل ٹھہرا تھا۔ اسلام نے اس تصور کی نفی کی۔ مقامِ الٰہ کی عظمت سجھائی اور خالق و مالک پر ایمان کو واضح کیا۔ اس طرح ایک انقلاب برپا ہوا۔ مگر اس کے باوجود قربِ ہنود کی پستیاں کہیں کہیں راہ پاتی رہیں۔ حتیٰ کہ بعض اعمال میں ہندو معاشرت، مسلمان گھرانوں میں بھی داخل ہوئی۔ کانگریس کا قرب بھی شاید کسی ایسے مخفی شب خون کا اثر تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جب بھی مدحِ رسالت ﷺ کی بات ہوئی تو ایک شور اُٹھا کہ ''رسول'' کو خدا بنایا جا رہا ہے۔ حد سے تجاوز کیا جا رہا ہے۔ بلا جواز مبالغہ ہو رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ شور اسی نفسیاتی الجھن کا نتیجہ ہے۔ مقامِ رسالت میں مبالغہ کیسا، حد سے تجاوز کیسا۔ یہاں تو لوگوں کو ہزار محنت کے باوجود حد ہی نہیں ملی۔ شاید یہ مسئلہ شانِ رسالت ﷺ میں حد سے بڑھنے کا نہیں، شانِ الوہیت میں کمی کا ہے۔ ''الٰہ'' کو اس قدر نیچے اُتار لیا گیا ہے کہ مقامِ رسالت ﷺ کے حوالے سے ہر گفتگو پر قرب و شرکت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ حالاں کہ عصرِ حاضر کی نعتیہ شاعری بھی اپنے لیے عہدِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نعتیہ شاعری سے ہی مضامین چن رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مطالعے کی کمی سرِ راہ ہے۔ اس سلسلے میں نعتیہ جرائد کو

تعلیمِ سیرت کے لیے خاص گوشے متعین کرنے چاہییں۔

ایک اور ذہنی تحفظ جو غیر جانب دارانہ جائزوں کی راہ میں حائل ہے، وہ مسلکی وابستگی ہے۔ یہ زندہ معاشروں کا حسن ہوتا ہے کہ مخلصانہ اختلاف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ مرکز تو ایک ہی وجود ہے۔ سب اُسی کے حضور اپنی اپنی عقیدتوں کے گل دستے لیے حاضر ہیں۔ اس رنگارنگی سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں انشراح آنا چاہیے کہ میرے محبوب کریم ﷺ کا میں ہی نہیں سب ہی چاہنے والے ہیں۔ محبت بے لوث ہو تو محبوب کی ہر نسبت معتبر ہوتی ہے۔ اللہ کرے محبتِ رسول ﷺ، اُمتِ مسلمہ کی وحدت کی پختہ اساس بنے۔ یہ خواہش ہر دردمند دل کی ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہر مدعیِ محبت ایسا رویہ نہیں رکھتا اور وہ اپنے خیالات کو ہی صائب گردانتا ہے اور دوسروں کی لائقِ تحسین کاوشوں کو بھی رد کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ نعت کے مضامین میں بھی ایسی ہی پسند و ناپسند اثر دکھاتی ہے۔ کاش ایسا نہ ہو کہ نعت کا تقدس ایک بے نفسی کا تقاضا کرتا ہے۔

تنقیدِ نعت کی موجودہ کاوشوں کا ایک مثبت اثر ضرور ہوا ہے کہ نعت جسے دینی حلقوں کے ذوق کی علامت ہی قرار دیا جا رہا تھا۔ زندہ ادب کا اہم عنصر بھی سمجھی جانے لگی ہے اور وہ شاعر جو اسے مسجدوں یا حجروں کی چیز سمجھ کر نظرانداز کر رہے تھے۔ نعت کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ غزل گو شاعر نعت میں تقدیس کے حوالوں سے پوری طرح باخبر بھی نہیں ہیں اس لیے غزلیہ آہنگ کو نعت کی رفعتوں کے لیے زینہ بنا رہے ہیں۔ یہ بجا طور پر کہا جا رہا ہے کہ نعت کا عنوان ہٹا دیا جائے تو وہ غزل ہی ہے مگر بعض اساتذۂ غزل، نعت کی حدود کا ادراک رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ جب اس میدان میں آئے تو اُن کی عقیدتوں نے بڑے کارنامے انجام دیے۔ موجودہ ادب کے مطالعے سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ نعت گو شعرا کے اندر ایک حیرت انگیز وارفتگی موجود ہے جسے نقد و نظر کے مشفقانہ رویوں سے مزید بہتر صورت لینے کی تحریک کی جاسکتی ہے۔ جناب عاصی کرنالی، جناب عزیز احسن، جناب رشید وارثی اور اسی قبیل کے چند اور اصحابِ فکر اس سلسلے میں قائدانہ کردار انجام دے سکتے ہیں۔ ان احباب کے ہاں فکر کی گہرائی، مطالعے کی وسعت اور دینی ادب سے فیض یابی کی صلاحیت بھی ہے۔ ان کی نگارشات ''نعت رنگ'' کا وقار ہیں۔ اختلاف کی گنجائش موجود ہے کہ یہی گنجائش خوب تر کی تلاش کے لیے مہمیز ہوتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ''نعت رنگ'' سے اصلاح کی خواہش کی بھی تکمیل ہو اور وحدتِ فکر و اظہار کی تمنا بھی بر آئے۔

یقین کیجیے اس اُمت کو اس راہِ مستقیم پر ثابت قدم رہ کر چلنا ہے۔ نعت ایک صنفِ سخن ہی نہیں، تطہیرِ جذبات، تکمیلِ انسانیت اور تقویمِ عقائد کا ذریعہ بھی ہے۔ حیرت ہوتی ہے جب یہ

آواز اُٹھتی ہے کہ نعت میں مبالغہ ہو رہا ہے، تجاوز کیا جا رہا ہے۔ میری دانست میں تو اب بھی کمی کا احساس ہی ابھرتا ہے۔ یہ افراط کا مسئلہ نہیں تفریط کا ہے۔ ذاتِ ممدوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفعتوں کا جتنا ادراک ہوگا اُسی قدر ملت کی سرافرازیوں کی سبیل نکلے گی۔ اس لیے کہ تمام عظمتیں اسی وجودِ گرامی کی خیرات ہیں اور جس کسی کو بلندیاں تلاش کرنا ہیں اُسے اُسی ذاتِ گرامی ﷺ کے راہ گزر کے ذرّات شمار کرنا ہیں۔ غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ) نے سچ کہا تھا:

و غبارها المحسوس خوف هواء ها
كحل اليقين لمقلة المتردد

یعنی ''مدینۂ رسول ﷺ کی ہواؤں پر اُڑا ہوا ہے، متردد اور بے یقین آنکھ کے لیے سرمۂ ثبات ہے۔'' اللہ تعالیٰ ان قدمین کی نسبتوں سے سفرِ زندگی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر محمد اقبال جاوید

نعت کہیے، مگر احتیاط کے ساتھ

دورِ حاضر کو نعت کا دور کہا جاتا ہے۔ نعت نے اِس دور میں جو وسعت حاصل کی ہے وہ یقیناً قابلِ قدر ہے۔ ویسے ہر دور نعت ہی کا دور رہا ہے۔ نعت تو ایسی بہار ہے جو بے خزاں ہے، ایک ایسا نغمہ ہے جو فصلِ بہار کا محتاج نہیں، بلکہ لالہ و گل، رعنائیوں کی بھیک اُس سے مانگتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ذکر تو بلند و بالا تھا، ہے اور رہے گا۔ اگر یوں کہا جائے تو شاید بہتر ہو کہ ہمارے دور نے اپنے تشخص کو پالیا ہے اور بھٹکتی ہوئی انسانیت کو یہ احساس ہوگیا ہے کہ وہی ایک در ہے جہاں تمناؤں کے اضطراب کو آسودگی نصیب ہوتی ہے۔ وہی ایک دیوار ہے جو آبلہ پائی کا واحد سہارا ہے اور وہی ایک راستہ ہے جہاں شوق ہی راہ رو، شوق ہی رہبر اور شوق ہی منزل ہوتا ہے۔ آج کے قلم اگر نعت سرا ہیں تو یہ اسی احساس کی شدت کا نتیجہ ہے۔ اِس دور نے اگر آفتاب کو پہچان لیا ہے تو احسان آفتاب پر نہیں ہے۔ یہ تو ثبوت ہے اس بات کا کہ دیکھنے والے کی نگاہ سالم اور سمت درست ہے اور یہ بھی محبوب کی عطا ہے، محبّ کا فخر نہیں۔

آنکھوں میں نور، دل میں بصیرت ہے آپ سے
میں خود تو کچھ نہیں، مری قیمت ہے آپ سے

مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعروں میں ایک دوڑ شروع ہوگئی ہے اور ہر ''صاحبِ تخلص'' نعت گو بننے کی سعی کر رہا ہے۔ گویا، ہر بوالہوس نے حسن پرستی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اُس ذاتِ والا صفات سے قلبی تعلق نہ ہو، بات بنتی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اکثر نعتیں یا تو بے کیف ہیں یا غزل کا چربہ۔ غزل مبالغہ آفرینیوں کا دوسرا نام ہے، جب کہ نعت ایک ایسی احتیاط ہے جو تلوار کی دھار پر چلنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے حضور ﷺ کے بارے میں مبالغے سے کام لیا، اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ نعت میں

ادبیت اور حسنِ ادا کو اپنے کمال پر ہونا چاہیے، مگر غزل کی مجاز آفرینیوں اور مبالغہ آمیزیوں سے دامن بچانا چاہیے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ اِس پاکیزہ صنفِ سخن اور غزل میں امتیاز مشکل ہو جائے اور پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ مستقبل میں اس دور کی نعت کی تطہیر کے لیے کسی مجتہد کو اٹھنا پڑے اور کہنا پڑے کہ:

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اِسے اور ذرا تھام ابھی

اور بہ قول ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''کوئی ایسا عشقِ رسول ﷺ کی شاعری نہیں کرسکتا جو محبت کے کرب و درد، انہماک اور مرکزیتِ توجہ سے باخبر نہ ہو۔'' سچی بات یہ ہے کہ نعت کی دنیا میں محو ہونے والا انسان، کوئے مجاز کا رُخ کر ہی نہیں سکتا، کیوں کہ جب حقیقت دل میں سما جائے تو افسانے خود بہ خود بکھر جایا کرتے ہیں:

عشق اک کفر ہے جب تک ہے وہ محدودِ مجاز
اور اِس حد سے گزر جائے تو ایماں ہو جائے

ایک نعت گو کے نزدیک حضور ﷺ کی محبت کے مقابلے میں باقی تمام محبتیں فروتر ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا مومن بیٹا حضور ﷺ سے عرض کرتا ہے کہ اجازت ہو تو اپنے منافق باپ کی گردن اتار کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں۔ پاسِ ناموسِ عشق اور تکمیلِ ایمان کا تقاضا یہی ہوا کرتا ہے:

وفا کا سوز تو کندن بنا دیتا ہے انساں کو
محبت جس کو خاکستر کرے گی کیمیا ہوگا

ضرورت اس امر کی ہے کہ غزل باوضو ہو کر نعت بن جائے، مگر غزل باوضو ہو نہیں سکتی جب تک کہ شاعر خود باوضو نہ ہو۔ چناں چہ ضروری ہے کہ شاعر نعت کہنے سے پہلے، حضور ﷺ سے تعلق کی کوئی صورت پیدا کرے اور اِس صورت کی اوّلین منزل اتباعِ رسول ﷺ ہے جس میں اہم ترین چیز اہتمامِ نماز ہے کہ وہ مومن و کافر میں حدِ امتیاز ہے۔ نماز، حمد و ثنا اور درود و سلام کا ایک شرعی انداز ہے اور نعت اسی درود و سلام کا غنائی اظہار اور مترنم شکل ہے۔ گویا جب تک دل کا آئینہ شفاف نہ ہو، اُس میں جمالِ رسالت جھلک نہیں سکتا اور مکدر آئینہ نہ کوئی عکس سمیٹ سکتا ہے اور نہ کوئی جھلک دکھا سکتا ہے۔

عارض و رخسار اور گیسو و کاکل کے تذکروں نے بھی نعت کو غزل بنانے میں اہم کردار ادا

کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے لیے معشوق، نازنین، طرح دار، خوب رو، ایسے الفاظ نعت میں در آئے ہیں۔ رسولِ پاک ﷺ یقیناً سراپا حسن تھے کہ سورج اُن کی ضیائے رُخ سے تاب و تب لیتا، راستے اُن کے قدموں کی چاپ سے جھوم اُٹھتے، کہسار اُن کے قدِ دل نواز سے سر بلندی پاتے اور فضائیں اُن کے نفس کی مہک سے عنبر فشاں رہتی تھیں۔ مگر اصل شے غازۂ جاں تھا جس سے رُخِ رسول ﷺ کا ہر خط نکھر گیا تھا اور اسی غازۂ جاں کا دوسرا نام سیرتِ رسول ﷺ ہے جس کی آگہی، شناسائی، تعلق اور محبت کے بغیر، ایمان ہی مبہم ہے اور ایمان ہی مشکوک ہو تو نعت کے لیے اگر قلم اُٹھے گا تو وہ تخلیقِ مجاز سے بلند نہ ہو سکے گی۔

میں بہ صد توبہ و استغفار لکھتا ہوں کہ قرآنِ مجید میں موسیقیت کی جو شان، ترنم کا جو انداز، آہنگ کی جو کیفیت اور دل نشینی کی جو خصوصیت ہے، اُسے ہم شعری جمال و کمال کے جملہ محاسن کے باوجود شعر کا نام بھی نہیں دے سکتے اور قرآن نے شعرا کی تکذیب بھی، غالباً اِسی لیے کی کہ اس دور کے لوگ نبیِ کریم ﷺ کو شاعر اور قرآن کو شعر کہتے تھے۔ گویا قرآن اپنی تمام تر ترنم ریزیوں کے باوجود شعر نہیں ہے۔ اسی طرح نعت میں اسلوب و ادا کی تمام تر رعنائیوں کے باوجود غزل کا رنگ اور ڈھنگ نہیں ہونا چاہیے اور نہ اُن اصطلاحات و تشبیہات کو نعت کے عظیم و جلیل ممدوح کے لیے استعمال کرنا چاہیے، جو غزل کی مجازی فضا کے لیے مخصوص ہیں۔

قدیم شاعر جب نعت کہتے تھے تو اُن کے پیشِ نظر عرفی کا دیا ہوا کڑا معیار ہوتا تھا:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

نتیجہ معلوم کہ وہ لوگ اپنے دل کی پاکیزگی، عقائد کے خلوص، روح کے گداز اور جملہ شعری صلاحیتوں کے باوجود نعت کہنے سے لرزتے تھے کہ کہیں توہین کے مرتکب نہ ہو جائیں، کیوں کہ ممدوح وہ ذاتِ گرامی تھی جس کے حضور میں جنید و بایزید بھی سانس روک کر آتے تھے اور اُن شعرا کے پیشِ نظر قرآن پاک کی یہ تنبیہ بھی تھی کہ رسول کی آواز سے اپنی آواز بھی اونچی نہ کرو، بہ صورتِ دیگر اعمال یوں سلب ہو جائیں گے کہ احساس تک نہ ہوگا۔ آج ہر کہ و مہ نعت کہنے کی دوڑ میں شریک ہے۔ اس دوڑ نے نعت کو بے کیف، بے سوز اور محض بیت بازی بنا کر رکھ دیا ہے۔ دل میں منافقت کے بت چھپا کر نعت نہیں کہی جا سکتی۔ جب تک نعت گو سراپا نالہ نہیں بنے گا، اس کی

نوا بے تاثیر رہے گی۔ جب تک سوزِ دل، سازِ رگِ جاں نہیں ہوگا، نعت، منافقت ہی کی ایک صدائے بازگشت ہوگی۔ ''چوں کہ یہ دورِ نعت کا ہے، اس لیے نعت کہنی چاہیے''، یہ منافقت کا ایک انداز ہے اور سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ منافق شب کا چراغ ہوتا ہے۔

نعت خود بولتی ہے۔ اس کا خلوص قاری کے دل میں خود بہ خود اترتا ہے۔ شعر کے پیراہن میں لہراتے ہوئے آنسوؤں کی تپش اور مچلتے ہوئے گداز کی لَو از خود دل کی طہارت اور قلم کی پاکیزگی کا پتا دیتی ہے، مگر آج کی اکثر نعتیں، علیل جذبوں، اپاہج عقیدتوں اور وقتی مصلحتوں کی ترجمان ہیں۔ انداز کی خوش نمائی کے لاکھ پردوں کے باوجود اعمال کی سیاہی نمایاں ہے اور ریشمی الفاظ کی بہتات اور شبنمی تراکیب کا شکوہ بھی ابتذالِ کردار کو چھپا نہیں پاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ نعت میں الفاظ کا بانکپن تو ہے مگر اخلاص کا جمال نہیں اور محض لفظوں کا حسن ہر دور میں گفتار کے غازیوں کی منافقت کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ آج کی بیشتر نعتوں کو اگر حضور ﷺ کے اسمِ گرامی کے بغیر پڑھا جائے تو اُن میں اور ایک عام غزل میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اور بعض تو توہین تک جا پہنچتی ہیں اور لوگ انھیں جدید دور کا جدید انداز سمجھ کر گوارا کر رہے ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک اخباری مبصر نے ٹھیک لکھا تھا کہ آج کے بعض شاعر پہلے ایک غزل کہتے ہیں، پھر وہی غزل قائداعظم کی شان میں نظم بن جاتی ہے اور بہ وقتِ ضرورت وہی نظم، نعت کا روپ دھار لیتی ہے۔ نعت کو نہ اس روپ کی ضرورت ہے نہ بہروپ کی، اور ڈر ہے کہ کہیں ایسی ثنا وجہِ ناراضی نہ ہو جائے اور رحمتِ عالم ﷺ کی خشمگیں نگاہوں کا کون سامنا کر سکے گا؟ شاعر کے لیے بہترین 'حکم' اس کا اپنا ضمیر ہے۔ اگر اُس کا ضمیر نعت گوئی پر مطمئن ہے تو ٹھیک، بہ صورتِ دیگر اُسے اپنے گستاخ قلم کو لگام دینی چاہیے اور توبہ کرنی چاہیے۔ غیر مطمئن ضمیر، دھندلے دل اور آلودہ قلم کے ساتھ نعت گوئی ایک خوف ناک جسارت ہے۔

خیال رہے کہ نعت ذرا سی بے احتیاطی (بہ زعمِ خویش عقیدت) سے حمد بن جاتی ہے اور اکثر نعتیں ایسی ہیں کہ حضور ﷺ کے تصور کے بغیر انھیں پڑھا جائے تو وہ حمد لگتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور کو اُن کے مرتبے سے گرا دینا، اپنے ایمان کو ختم کر لینا ہے اور مرتبے سے بڑھا دینا شرک ہے۔ احتیاط کے انھی تقاضوں کی وجہ سے بڑے بڑے قادر الکلام نعت کے میدان میں خود کو عاجز محسوس کرتے ہیں۔ یہ شعر حضور ﷺ کے اعجاز اور غالب کے عجز ہی کا آئینہ دار ہے:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد ﷺ است

نعت گوئی جہاں ایک شاعر کے لیے سعادت ہے، وہاں آزمائش بھی ہے۔ شاعرانہ صلاحیتیں تو ہر قلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہیں۔ شاعر ذاتی طور پر اُس وہبی ذوق کو محض جلا دیتا ہے۔ اِسی طرح حبِ رسول ﷺ ہر مسلمان کا سرمایۂ افتخار ہے۔ 'ظرف' اور 'عطا' کے مطابق دل کی اِس کیفیت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ دونوں صلاحیتیں فطرت کی دین ہیں۔ انسان کے بس کی بات نہیں ہیں۔ ایک نعت گو کے لیے بس کی بات اگر کوئی ہے تو وہ یہی کہ اس نے نعت کو نعت کے دائرے میں رکھنے کے لیے کیا کیا ہے؟ وہ اس کے لیے ذمے دار بھی ہے اور جواب دہ بھی اور کسوٹی ایک ہی ہے کہ نعت کہتے کہتے، توحید کے تقاضے تو مجروح نہیں ہوگئے، وہ پیمانِ وفا ٹوٹ تو نہیں گیا جو ''الست'' والی رات کو ہر ذی روح سے باندھا بھی گیا تھا اور مانا بھی کہ اللہ، اللہ ہے۔ اس کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے اختیارات میں اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک نہیں کیا جائے گا۔ گویا جوہرِ الوہیت میں اس جیسا کوئی نہیں، اُس ایسی صفات بھی کسی میں نہیں۔ اُس جیسا دینے والا اور چھیننے والا بھی کوئی اور نہیں۔ رکوع و سجود بھی اسی کے لیے وقف، دعا اور پکار بھی اُسی بارگاہ میں، اور اس پر ہر روح نے ہاں بھی کہی اور شہادت بھی دی۔ یہ پیمانِ وفا جب بھی ذہنوں میں دھندلایا، اللہ تعالیٰ نے اُسے تازہ کرنے کے لیے نبی بھیجے۔ ہر نبی کے پہلے اور آخری سبق میں توحید ہی کی خوش بو اور توحید ہی کی تازگی ہے۔ رنگ اور خوش بو کے یہ قافلے، ہزاروں کی تعداد میں، پے بہ پے اِسی لیے آتے رہے اور پھر آخر میں وہ آئے جنھیں اقبال نے آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب کہا اور ظفر علی خاں نے الست والی تاریک رات کو باندھے جانے والے عہد (توحید) کو نورِ اوّلین قرار دیتے ہوئے، حضور ﷺ کو اُس نور کا اُجالا سمجھا:

پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اُس نورِ اوّلیں کا اجالا تمھی تو ہو!

اب، چوں کہ اس آخری آنے والے کے بعد، کسی اور نے نہیں آنا، اس لیے امتِ محمدی کے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ اِس چراغ کی لَو کو اونچا رکھے۔

نعت گوئی آزمائش اسی لیے ہے کہ حمد میں انسان جتنی بھی تعریف کرے، اتنی ہی کم ہے۔ جب کہ نعت میں شاعر کو انتہائی چوکنا اور باشعور رہنا پڑتا ہے۔ بہ زعمِ خویش ارادت و محبت کی رو میں بہہ جائے تو ''الست'' والا عہدِ وفا ٹوٹ جائے گا اور اگر شایانِ شان بات نہ بن سکے تو قلم توہینِ رسالت کا مرتکب ہوگا۔ دونوں صورتوں میں ایمان کا جملہ حسن و کمال سلب ہوجائے گا اور شاعر کی بے شعوری کو شعور اس وقت آئے گا جب میدانِ حشر میں خود ممدوحِ عظیم و جلیل ﷺ اپنے

ہی نعت گو کے خلاف، حضورِ کبریائی میں استغاثہ دائر کر رہے ہوں گے۔ نعت سرائی میں خدا کو خدا کے اور رسول ﷺ کو رسول (ﷺ) کے مقام پر رکھنا ہی نعت گو کی آزمائش ہے۔ یہ منزل جتنی بڑی ہے، اتنی ہی کڑی بھی ہے۔

سچی نعت گوئی کے لیے مقامِ نبوت اور شانِ رسالت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ توحید کے تقاضوں سے مکمل آگاہی بھی چاہیے اور یہ بھی لازم ہے کہ مدحت نگار، نعت کو غزل کی آشفتہ مزاجی اور قصیدے کی مبالغہ آرائی سے بچالے جائے، کیوں کہ غزل اور قصیدے کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں، یہاں ہر مبالغہ آفرینی اور ہر مستانہ لغزش حسن ہے جب کہ نعت کی ایک دینی حیثیت ہے، اس لیے یہاں قلم قلم پہرے ہیں اور دیکھنے والی نظروں کو دیکھنا بھی چاہیے اور ٹوکنا بھی کہ کہاں کہاں عقیدت نے عقیدے کے آبگینے کو مجروح کیا ہے، کیوں کہ عقیدہ بہرنوع بالاتر ہے۔ حضور ﷺ ہم مسلمانوں سے صرف خراجِ عقیدت نہیں، بلکہ خراجِ اطاعت بھی لینے کے لیے تشریف لائے تھے۔ یاد رہے کہ سچا اتباع ہی محبت کی واحد دلیل ہے۔

دورِ حاضر کے ایک عظیم نعت گو جناب حفیظ تائب کے الفاظ میں:

> نعت اِس کیفیت کا نام ہے جب فکرِ شاعر، ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی طرف پورے انہاک و اخلاص کے ساتھ رجوع کرتا ہے۔

اس کیفیت کے اظہار کے لیے اس سے بہتر لفظ نہیں مل رہے:

شان اُن کی سوچیے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

یہ کیفیت خدائے کریم کی خصوصی عنایت میں سے ہے۔ اس کیفیت کے الفاظ میں ڈھلنے کا عمل بھی تائیدِ ایزدی کے بغیر ممکن نہیں، یہاں قدرتِ فن ساتھ دینے سے قاصر رہتی ہے:

کیا فکر کی جولانی کیا عرضِ ہنر مندی
توصیفِ پیمبر ﷺ ہے توفیقِ خداوندی

میں نعت گوئی کے موجود رجحان کو روکنا نہیں چاہتا، محض سنبھلنے کی تلقین کر رہا ہوں۔ نعت کے لیے جس پاکیزہ سوچ اور کمالِ محویت کی ضرورت ہے، اس کا احساس ہر نعت گو کو ہونا چاہیے۔ بارگاہِ لطف و کرم سے یہ طہارت و نظافت نصیب ہو جائے تو خاص کرم ہے، ورنہ طلب اور آرزو تو ہونی چاہیے، معلوم نہیں نصیب کب کھل جائیں:

فیضِ حق ناگاہ می رسد
ولیکن بر دلِ آگاہ می رسد

اور سچی طلب کی پذیرائی یقیناً ہوتی ہے۔ اگر وہاں سے توفیق مل گئی تو پھر فکر کے عقدے خود بہ خود کھل جائیں گے اور قلم میں بھی پرِ ہُما کی جنبش پیدا ہو جائے گی:

نعت میں کیسے کہوں اُن کی رضا سے پہلے
میرے ماتھے پہ پسینا ہے ثنا سے پہلے

اہلِ دانش کی آرا

اہلِ دانش کی آرا

رشید احمد صدیقی

اُردو نعت میں، میں چند بزرگوں کا قائل ہوں، مثلاً حالی مرحوم، اصغر گونڈوی مرحوم اور حضرت اقبال مغفور کا۔ جہاں تک شاعرانہ حسن آفرینی و حسن کاری کا تعلق ہے میں محسن کاکوروی مرحوم کے کمال کا بھی معترف ہوں، کیسی پُر خار و پُر خطر راہوں سے کس لطف و مشاقی سے یہ گزرے ہیں کہ بے اختیار دل سے تحسین نکلتی ہے، لیکن محسن کے ہاں صناعی ہے، سپردگی نہیں، تخیل کی رعنائی ہے، روح کی وارفتگی نہیں۔ سخن ہے، شغف نہیں۔

اصغر مرحوم کی شاعری میں نزہت و نور کی جو فضا ہے وہ اُن کے شخصی تاثرات سے مل جل کر نعت میں جلوہ گر ہوئی ہے، غالباً ایک ہی نعت کہی ہے اور خوب کہی ہے۔

حالی مجسم انسانیت تھے، پھر رحمتِ عالم ﷺ کے حضور میں! اُردو نعت میں آج تک نظم کہی گئی ہو یا نثر حالی کی نعت کا جواب نہ ہوا، ایک سے ایک سحر طراز آئے، لیکن حالی سے نہ آگے بڑھ سکے نہ روگرداں ہو سکے، مستفید سبھی ہوئے۔

اقبال کو رسالت مآب ﷺ سے جو شخصی عقیدت تھی وہ طرح طرح سے اُن کے کلام میں جلوہ گر ہے۔ مجھے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ اقبال کا کلام وزن و وقار اور حسن و جلالِ رسولِ عربی ﷺ ہی کی گراں مایہ شخصیت کے محور پر گردش کرتا ہے اور یہی وہ قوت ہے جو اُن کے کلام میں کبھی کہیں سے ڈھیلا پن نہیں آنے دیتی۔

اقبال کے بعض نکتہ چیں یہ کہتے ہیں کہ اقبال پر مذہب کی گرفت ہے، یہ اعتراض سطحی اور اصطلاحی ہے دراصل اقبال پر سب سے بڑے انسان کی گرفت ہے، سب سے بڑے مذہب کی

نہیں۔اور اقبال کا یہ اتنا بڑا امتیاز ہے جو صرف بہت ہی بڑے اشخاص یا شعرا کے حصے میں آتا ہے۔
نعتیہ کلام کی محرومی یہ رہی کہ ہمارے بیشتر شعرا نے اسے ایک مقدس رسم سمجھ کر اختیار کیا اور سننے والوں نے ثواب کی خاطر آہ یا واہ کر لی۔ اس طرح کے کلام، اس طرح کے شعرا اور اس طرح کے مقاصد نے مل جل کر نعت کو شریفوں یا شاعروں کا شیوہ نہیں، میراثیوں کا پیشہ بنا دیا۔
(ماخوذ ''گلبانگ حرم'' از حمید صدیقی، مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ، ۱۳۷۰ھ)

رسولِ اکرم ﷺ سے شیفتگی اور اسوۂ حسنہ کی پیروی ہم پر بمنزلہ فرائض عائد ہے۔ نعت کی یہی شانِ نزول ہے۔ اس کو اُردو شعر و ادب میں ایک مستقل اور نازک صنف کہا گیا ہے۔
نعت کے آداب ملحوظ رکھنا اور شاعری کے گلِ ریحان سے اس کو آراستہ کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ تاوقتے کہ شاعر خود گرامی نہ ہو۔ نعت کے جیسے کڑے آداب ہیں اس کا اندازہ عرفی جیسے شاعر کے اعتراف سے ہوتا ہے جو اپنی اور اپنی شاعری کی منزلت کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، نعت گوئی شہِ کونین ﷺ کے بارے میں بار بار اپنے آپ کو یاد دلاتا ہے اور خبردار کرتا رہتا ہے:

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
ہشیار کہ رہ بردم تیغ است قدم را

لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور مذہب کی تعبیر و تلقین معمولی درجہ کے اشخاص کے ہاتھوں میں آتی گئی، نعت گوئی بھی معمولی درجہ کے شعرا کے حصے میں آئی جنھوں نے اس کو کھانے کمانے کا وسیلہ بنایا اور صرف کارِ ثواب جانا۔ انھوں نے شاعری کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا۔ ان میں ان کو پورا کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس صنفِ کلام کے حسن اور عظمت کو حالی اور اقبال نے خاص طور پر پہچانا اور اسے اتنا مشکل اور بلند کر دیا کہ آبروئے شیوہ اہلِ ہنر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی۔
یہ عشقِ رسول ہی کا فیضان ہے کہ حالی اور اقبال نے اپنے کلام سے اُردو کے بیشتر اصنافِ سخن کی جن میں غزل کافی بدنام تھی اس طرح تہذیب و تطہیر کی اور اسے نئی جہت اور نئے جہان بخشے کہ اُردو زبان اور شاعری کی وقعت مدتِ دراز کے لیے متعین ہوگئی۔ عشقِ رسول آئینِ ملت ہی نہیں، تعبیرِ انسانیت بھی ہے۔
(ماخوذ از عزیزانِ علی گڑھ، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں''، مرتبہ پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، نعت ریسرچ سینٹر کراچی)

پروفیسر کرار حسین

اس دُنیا کی روح اور حقیقت مدینہ ہے۔ مدینہ ہی دُنیا اور دین ہے۔ یہیں سے دُنیا کی زندگی کے لیے نظر روشنی لیتی ہے۔ یہیں سے عقبیٰ کی معرفت کے لیے ہر نفس نور لیتا ہے:

نفس نفس نے مدینہ سے کسبِ نور کیا
نظر نظر کو ملی روشنی مدینہ سے

اس مقام پر دل اور عقل کا روایتی تضاد مٹ جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ مقام دل ہی کا ہے۔ دل ہی سے عقل کی تربیت ہوتی ہے۔ محبت سے ہی شعور و آگہی پیدا ہوتی ہے۔ مودّت ہی سے دین کی سمجھ اُبھرتی ہے۔

آگہی کیا ہے، صرف حبِ رسول ﷺ
یہ محبت نہ ہو تو سب ابہام

نعت۔ مدینہ اور مدینہ والے سے دلی تعلق کے اظہار کا نام ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''تابندگی'' از خمار انصاری، مطبوعہ ۱۹۹۵ء، ناشر بزمِ تخلیقِ پاکستان کراچی)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

نعت گوئی کے مدارج اور انداز متعدد اور مختلف ہیں، اس لیے کہ ہر نعت نگار اپنا ایک الگ مزاج اور اپنی ایک الگ روحانی شخصیت رکھتا ہے جس کے زیرِ اثر وہ جو کچھ کہتا ہے وہ قدرتی طور سے اپنی ہی معنوی سیرت کا عکس پیش کرتا ہے اس لیے ہر انداز اور ہر نوا کا مختلف ہونا ناگزیر ہے۔

اس کلیے کے باوجود، کچھ مرکزی معیار بھی ہیں جن کی بنا پر نعتیہ کلام کو اصولی طور سے اور ہر نعت گو کی نگارشات کو خارجی معیاروں کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے اور اس کی نعت کے انفرادی خصائص یا امتیازی نقوش متعین کیے جا سکتے ہیں۔ اور کرنے چاہییں کیوں کہ اگر اس قسم کی معیار بندی نہ کی جائے تو غزل کی طرح نعتیہ کلام میں بھی یکسانی و یک رنگی کی خصوصیت اتنی عام اور مشترک ہے کہ ہر نعتیہ مجموعے پر ایک ہی دیباچہ اگر چسپاں کر دیا جائے تو کچھ فرق محسوس نہ ہو اور وہ ہر مجموعے میں ٹھیک ہی معلوم ہو۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''نشیدِ حضوری) از حافظ لدھیانوی، مطبوعہ بیت ادب، فیصل آباد)

میں نے اکثر سوچا ہے کہ نعت کا کون سا عنصر حقیقی معنوں میں اثر و تأثر کا باعث ہوتا

ہے جسے نعت کا مرکزی عنصر کہا جا سکے۔ غور کرنے سے محسوس ہوگا کہ یہ مرکزی عنصر نیاز و عجز نہیں، یہ عنصر فقط اشتیاق بھی نہیں، یہ محض دُعا و طلبِ شفاعت بھی نہیں، یہ محض تعریف اور اوصافِ رسول ﷺ بھی نہیں۔ یہ بہت کچھ ہے، بہت کچھ جمع کرنے سے ہے۔ یہ سوز بھی ہے اشتیاق بھی ہے، یہ طلب بھی ہے توصیف بھی ہے، دُعا بھی ہے یہ سب کچھ ہے۔ غرض اس کا مرکزی عنصر ایک نہیں۔ یہ سب اوصاف جب تک آمیز نہ ہو جائیں، نعت کی تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔

(رائے سے اقتباس مشمولہ ''گلدستہ'' از نذیر صابری، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر کراچی)

نعتیہ شاعری کی مشکل یہ ہے کہ یہ اگر ایک طرف مذہبی شاعری ہے تو دوسری طرف اس کے رشتے عاشقانہ شاعری سے ملتے ہیں اور اس کے باوجود حق یہ ہے کہ یہ نہ مذہبی شاعری ہے اور نہ عاشقانہ شاعری، بلکہ ایک صنف ہے جو ایک عجیب قسم کے مگر گہرے روحانی تجربے سے اُبھرتی ہے۔ یہ خدا سے محبت کی شاعری نہیں کہ جس کا مخاطب کسی کو کبھی نظر نہیں آیا اگرچہ وجدان میں ہے اس لیے اس شاعری کی ساری رمزیں ماورائی ہیں مگر نعت کا موضوع ایک پیکرِ محسوس ہے اس کی محبت ایک پیکرِ محسوس کی محبت ہے۔ اس لیے نعت کی رمزیں اور اس کے استعارے مبالغہ و اغراق کی تاب نہیں لا سکتے۔ نعت گو اس کی مدح میں حقیقت گوئی پر مجبور ہے ورنہ ہر گام سوے ادب کا خطرہ ہے اور اس پر یہ کہ محبت کے پُراحترام جذبے کو ادب کی قیود میں سنبھال کر لے جانا بھی پڑتا ہے لیکن اس کے باوصف گداز اور گھلاوٹ شرطِ لازم ہے۔

(مضمون سے اقتباس از ''نعت رنگ'' بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر کراچی)

پروفیسر میرزا محمد منوّر

نعت گوئی کارِ دشوار ہے۔ جو سہولت اور بے تکلفی غزل اور بعض دیگر اصنافِ سخن میں میسر ہوتی ہے وہ نعت میں دسترس سے دور ہو جاتی ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ تو وہی ہوتا ہے مگر نعت گوئی کے لیے مناسب اور موزوں الفاظ ملنا مشکل ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ حدودِ نعت کے باہر جولانیِ گفتار فصاحتِ طرّار کے جلوے دکھانے والے گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں اسی الفبا (الف، با) میں ڈھلے ہوئے مگر خاص معانی ادا کرنے کے پابند کلمات ڈھونڈے نہیں ملتے۔ یہ نعت کہنے والے کی مجبوری

ہوتی ہے۔ دراصل شعور حضور قدسی مرعوب کر کے رکھ دیتا ہے۔ باادب نعت نگار جب قلم کار ہوتا ہے تو یہی محسوس کرتا ہے کہ اُسے خود خدائے خلاق العالمین نے خصوصی زبان اور کلمات سے نواز دیا ہے ورنہ زبان کو یارائے گفتگو کہاں تھا۔

میں تو چپ تھا کہ نہ آتے تھے بنانے الفاظ
نعت گوئی کے لیے بخشے خدا نے الفاظ

نعت میں ادب کا قرینہ نبھا جانا بہت بڑے امتحان سے گزرنا ہے، بقول عرفی ''ہشیار کہ رہ، بردم تیغ است قدم را'' ذرا بے احتیاطی ہو تو نعت اور روایتی غزل کے روایتی مضامین میں فرق ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نعت بے تکلفی بلکہ بعض اوقات بے ادبی کا ارتکاب دکھائی دینے لگتی ہے۔ خدا اہلِ ذوق کو عقیدت و ادب کے نفیس رموز سے آشنا کرے۔ دلوں کے حال خدا جانتا ہے کہ کس نے ازروئے اخلاق نعت کہی ہے اور کس نے فقط اکتسابِ زر کی خاطر قافیہ بندی کی مشقت اُٹھائی ہے مگر پھر بھی اشعارِ نعت بڑی حد تک اعلان فرمائے دیتے ہیں کہ یہ کلمات گلے سے نکلے، یا دل سے اور اس امر کا ثبوت نعت نگار کا مسلمان کی حیثیت سے سلوک و عمل ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''آفتاب مرا'' از اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، مطبوعہ ۱۹۸۸ء، ناشر مجلسِ اردو، لاہور)

مولانا منتخب الحق قادری

یاد اور ذکر کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ تصور سے لے کر فکر و عمل کے ہر زاویے سے اس کی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور دل و دماغ کو منور کرتی رہتی ہیں اسی میں زبان و بیاں کی منزل بھی آتی ہے، ایسی منزل جو بجائے خود منزل بھی ہوتی ہے اور منزل نما بھی۔ یہیں سے نثر و نظم کے ایسے سوتے جاری ہوتے ہیں، انسانیت کی روح جن سے سیراب ہوتی ہے۔

یادِ رسول اکرم ﷺ جب نظم کے سانچے میں ڈھلتی ہے تو اس کے قامتِ زیبا کو نعت کے حسین نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نعت گوئی اور نعت خوانی کا دامن، دامنِ بعثت سے ملا ہوا ہے، اسے ''تقریر رسول'' کی توثیق بھی حاصل ہے۔ مثال کے طور پر قصیدہ ''بانت سعاد'' کا سدا بہار چمن آج بھی لہلہا رہا ہے اور تا قیامِ قیامت لہلہاتا رہے گا۔ نعت گوئی کے حوالے سے میرا اپنا معیار تو یہ ہے کہ نعت گو بارگاہِ رسالت میں یا تو اپنا دل پیش کر دے یا دماغ یعنی یا عقیدت میں ڈوب کر اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنائے یا تفکر سے مدد لے کر دماغ کی صلاحیتوں کو پیکر عطا کر دے۔

اس کے علاوہ ایک منزل اور بھی ہے اور وہ یہ کہ دل و دماغ کا حسین امتزاج اشعار کے قالب میں نظر آئے۔ اس سلسلے میں میرا اپنا ایک معیار اور بھی ہے جس کی بنیاد امیر المومنین حضرت علی h کے اس قول پر ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ نعت کے ذیل میں نہ دیکھو کہ کیسا کہا، بلکہ یہ دیکھو کہ کس جذبے سے کہا۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''گلہائے عقیدت''، از سیّد حمید الدین حمید، مطبوعہ ۲۰۰۱ء، اقلیم نعت کراچی)

احسان دانش

صرف الفاظ سے نعت کا حق ادا نہیں ہوتا، بلکہ جو جذبہ الفاظ کا جامہ قبول کر کے کاغذ پر قابلِ اظہار بنتا ہے وہی جذبہ ہے جسے ثنائے بے نقطہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جذبات کا وہ لمحہ ایسا ہوتا ہے کہ کائنات میں دل کی دھڑکن کے سوا کوئی آواز نہیں آتی۔ اگر آنسو بھی گرتا ہے تو پہروں روح میں اس کی جھنکار گونجتی رہتی ہے۔ اس وقت انسان اور خدا لسانی طور پر ایک سطح پر آ جاتے ہیں۔ کیوں کہ جب کوئی درود پڑھتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ میں بھی درود پڑھتا ہوں، دوسرے لفظوں میں نعت کو پیرایۂ درود بھی کہا جا سکتا ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''جلوہ گاہ'' از حافظ مظہر الدین، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر کراچی)

یہ ضروری نہیں کہ نعت کے ہر شعر میں حضور ﷺ کا نام لفظِ مدینہ، گنبدِ خضرا، رسول، رسالت وغیرہ الفاظ استعمال ہوں بلکہ ہر وہ شعر نعت کا شعر ہے جسے سن کر رسولِ اکرم ﷺ کی طرف خیال جائے یا کوئی اسوہ سامنے آجائے یا ایسی تعریف و توصیف ہو جو حضور ﷺ ہی کی شان کے شایاں ہو، مثلاً جلیل مانک پوری کی غزل کا مطلع ہے:

نگاہِ برق نہیں ، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

شعر کی لفظی تعمیر اور معنوی روح سے بھی نعت گو شاعر کا مقام متعین ہوتا ہے۔ اگر شعر کا تأثر عام سطح سے بلندی کی طرف اشارہ نہیں کرتا تو نعت تو بڑی بات ہے وہ موزوں طبعی تو ہے، شاعری نہیں۔ چناں چہ جس نعت سے حضور ﷺ کے اوصافِ حمیدہ جو قاری یا سامع کے علم سے

باہر ہوتے ہیں، نمایاں نہ ہوں اور حضور کی ذات و صفات کو اُجاگر نہ کرے یا ان کے معنوی استناد کی وضاحت سے عاری ہو، وہ نہ حسنِ شعر ہے، نہ شاعر کا کمال۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''حدیثِ شوق'' از راجا رشید محمود، مطبوعہ ۱۹۸۶ء، ناشر سلیم بک سینٹر، لاہور)

احمد ندیم قاسمی

یہ جو نعت نگاری میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے تو یہ اچھی بات ہے مگر مشکل یہ ہے کہ بیشتر نعتیں یکسانیت کا شکار ہونے لگی ہیں۔ یقیناً نعت کا موضوع تو صرف اور صرف حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے مگر آپ کے اقوال و فرمودات بھی تو نعت کا موضوع ہیں۔ آپ کے ارشادات و تعلیمات بھی تو نعت کا موضوع ہیں۔ محض عقیدت کا اظہار بھی عظیم نعت تخلیق کرنے کا سبب بن سکتا ہے مگر نعت کو محدود کر دینا اس دل پذیر صنفِ سخن سے کما حقہٗ کام نہ لے سکنے کے مترادف ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''محرابِ عقیدت'' از امین راحت چغتائی، مطبوعہ ۲۰۰۷ء، ناشر بک سینٹر، راول پنڈی)

ڈاکٹر وزیر آغا

روحانی بحران کی یہ فضا جس میں انسان بے بال و پر ہو کر رہ گیا ہے محض اُس فراق کے باعث ہے جو عبد و معبود میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس کائنات کی ہر شے، شمس و قمر سے گل اور شجر تک آئینوں کا ایک سلسلہ ہے اور خالقِ کائنات ان میں سے ہر آئینے میں موجود ہے۔ وہ شہ رگ سے بھی قریں ہے ہر چند کہ نظروں سے نہاں ہے۔ نظروں سے کیوں نہاں ہے اس لیے کہ نظروں پر خواہشات کی دھند پھیل چکی ہے جس نے انسان کی روحانی پرواز کے امکانات کو ختم کر دیا ہے۔ حبیبِ خدا، سرورِ دوجہاں ﷺ کے ذکرِ خیر کی وساطت سے عبد اور معبود کے درمیان پھیلی ہوئی یہ دھند دور ہو سکتی ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ شانِ دو کریم از جسٹس محمد الیاس، مطبوعہ ۱۹۹۳ء، ناشر فیروز سنز، لاہور)

نعت گوئی کے اس دور میں عبد و معبود کے اس حقیقی رشتے پر زور دینے کے بجائے جو نعت

کا امتیازی وصف ہے، ایک ایسے تجریدی رشتے کو اُبھارنے کی سعی ہوتی ہے جو غزل کو ہمیشہ سے بہت عزیز رہا ہے۔ نعت پر غزل کا یہ اثر آج کے اکثر نعت گو شعرا کے کلام میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

نعت کہنا طوافِ کعبہ سے مشابہہ ہے جس میں سالک کعبہ کے حقیقی وجود کے گرد پروانہ وار گھومتا ہے۔ نعت بھی ''ذاتِ یکتا'' کا گویا طواف کرنے کے لیے مختص ہونی چاہیے نہ یہ کہ وہ داخلی واردات کے لامتناہی سلسلوں کو تجریدیت کی حد تک پھیلا کر رقیق کر دے۔ نعت میں ''من'' اور ''تو'' پروانے اور شمع کی طرح ایک دوسرے کے روبہ رو آ جائیں تو بات بنے گی ورنہ نہیں۔

(فلیپ سے اقتباس مشمولہ ''مرحبا سیّدی'' از تابش صمدانی، مطبوعہ ۲۰۰۲ء، خلیل صمدانی اکادمی، ملتان)

ڈاکٹر سلیم اختر

آنحضرت ﷺ کے حضور نعت کی صورت میں محض نذرانۂ عقیدت ہی پیش نہیں کیا جاتا بلکہ نعت میں ہر ممکن طریقے سے ان کی سیرت و کردار اور اسوۂ حسنہ کو بیان کرنے کی سعی بھی کی جاتی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ سب کچھ کہہ کر بھی یہ احساس باقی رہے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آج کا معاشرہ بحرانوں کی زد میں ہے اور تضادات کا شکار نظر آتا ہے۔ ایسے میں جب کہ افراد کے اعصاب کشیدگی کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور بحیثیتِ مجموعی ہذیان کا عالم ہے تو یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آج کی پیچیدہ ترین صورتِ حال اور حالات کی اُلجھی ڈور کا نعت جیسی صنفِ سخن سے کیا تعلق؟ کہاں رسولِ پاک ﷺ کی عظیم شخصیت اور کہاں آج کا دُنیا دار اور ہر طرح کی آلودگی سے داغ دار عام پاکستانی فرد؟ لیکن درحقیقت اسی لیے آج نعت اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتی ہے کہ ہمیں آنحضرت ﷺ کی ذاتِ مبارک کی صورت میں واضح کردار کی مکمل ترین مثال ملتی ہے، ایسی مثال جو فلاح و نجات کا باعث بن سکتی ہے، اسی دُنیا میں اور باعثِ شفاعت آخرت میں۔ ہمارے نعت گو شعرا کی اکثریت کے ہاں ''میرے مولا بلالو مدینے مجھے'' کی جذباتی خواہش ملتی ہے جو غلط نہیں کہ ہر مسلمان کی یہ دلی آرزو ہے۔ مدینہ جا کر روضۂ رسول ﷺ پر حاضری موجبِ خیر و برکت ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کی صورتِ حال کے تناظر میں نعت گو اپنے تخلیقی کردار کا جائزہ لے کر اپنی ترجیحات متعین کرے۔ نعت میں بڑی وسعت اور تنوع ہے، لہٰذا اسے باآسانی عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے کردار و عمل کی روشنی میں امر و نہی کا

درس دیا جا سکتا ہے کہ اسی پر اسلام کی اخلاقیات کی اساس استوار ہے۔ مذہبی تشدد کو نعت کے ذریعے سے یہ احساس کرایا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تو ایذا دینے والوں کے حق میں بھی دُعائے خیر کی تھی۔ آخری بات یہ کہ نعت گو یہ احساس کرا سکتا ہے کہ ہمارا راستہ رسولِ خدا ﷺ کے راستہ سے کتنا مختلف، بلکہ برعکس ہے۔ آج کے نعت گو کا یہی مقصد ہونا چاہیے۔ گر یہ نہیں تو بابا باقی کہانیاں ہیں۔

(ماخوذ مکالمہ روزنامہ جنگ لاہور، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

شان الحق حقی

جہاں تک نعت گوئی کا تعلق ہے، اس کی ایک عظیم الشان روایت شمعِ نبوت ﷺ کے پروانوں نے پیدا کی ہے جو اپنی فراوانی، تنوع، رنگا رنگی گونا گوں محاسنِ شعری، تسلسل، پائیداری اور ترقی کی بنا پر بلاشبہ ہر دوسرے دین کی روایات پر سبقت لے گئی ہے۔ اس کے سرسری جائزے کے لیے بھی ایک دفتر چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں اُردو شاعری نے خود جس پایے کی نعت پیش کی ہے وہ اُردو زبان کا ایک امتیاز بن گئی ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ نسیم حجاز از غنی دہلوی، مطبوعہ ۱۹۹۱ء، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی)

ڈاکٹر وحید قریشی

جدید نعت گوئی کا آغاز اگرچہ پاکستان بننے کے بعد ہی ہو گیا تھا، لیکن اس صنفِ سخن کا زیادہ چرچا ضیاء الحق کے زمانے میں ہوا جب نعت گوئی کو محض مذہبی رُجحانات کے بجائے ادب کی اصناف میں شمار کیا جانے لگا۔ جدید نعت میں بعض نئے رُجحانات نمایاں ہوئے، ایک تو یہ کہ شخصیت نگاری کے جدید اسالیب اور معیاروں کو سامنے رکھتے ہوئے رسولِ پاک ﷺ کی شخصیت کے مختلف روشن پہلوؤں کو پیش کیا جانے لگا۔ اس سے پہلے نعت میں شخصیت پرستی کا ایسا رنگ غالب تھا جس میں قصیدے کی مبالغہ آرائی اور قصیدے ہی کی پُرشوکت زبان کو استعمال کیا جاتا تھا۔ مغرب کی شخصیت نگاری کے اصولوں نے جدید نعت کو متاثر کیا۔ اب پیغمبرِ اسلام ﷺ کے معجزات کے بجائے ان کے انسانی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ واقعات سے مبالغہ آرائی کا عنصر غائب ہو گیا۔

محبت و عقیدت نے جذبات کے کچھ نئے آہنگ دریافت کیے۔ اب نعت گو کی شخصیت بھی نعتوں میں نمایاں ہونے لگی اور جذبوں کی نئی نئی شکلیں سامنے آئیں۔ سماجی علوم اور تاریخ کے

حوالے سے کچھ نئے رنگ بھی نعت میں شامل ہوئے۔ اب نعت لہجے کے اعتبار سے بھی غزل کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اب یہ قصیدے سے زیادہ غزل کے قریب آ گئی ہے، اس لیے فکر و احساس میں تنوع بھی زیادہ آ گیا ہے۔ آج نعت محض اظہارِ عقیدت و جذبات کا نام نہیں۔ اس میں توازن اور فکری وسعت پیدا ہوئی ہے، جس سے یہ صنفِ ادب بھی آج کا ایک نمایاں رُجحان بن گئی ہے۔

(انٹرویو سے اقتباس ''نوائے وقت'' بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

اُردو کی نعتیہ شاعری کی روایت میں صدر ضیا الحق کے زمانے میں بیش از بیش اضافہ ہوا اور یہ صنفِ ادب دین کی صنف سے بڑھ کر ادب کی قلم رو میں داخل ہوئی۔ نعت محض عقیدت کا اظہار نہیں، بلکہ فکر و احساس کی فراوانی کا اظہار بھی ہے۔ جذبِ دروں سے نعت کا شجر بار آور ہوتا ہے اسی اعتبار سے اسے ادب کی اصناف میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو نعتیں کہنے والوں میں ہر سطح پر ہر انداز کے نعت کہنے والے موجود ہیں، لیکن تخلیقی سطح پر قدر و قیمت کا تعین ادبی اقدار کے ذریعے ہی ممکن ہے ورنہ اوسط درجے کے اور اعلیٰ پایے کے نعت گو میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ اصل چیز وہ جذبہ اور احساس ہے جس سے نعت کا درجہ اور مقام متعین ہوتا ہے۔ اس کا ایک رشتہ داخلی کیفیت اور سوزِ دروں سے ہے اور دوسرا اس پیرایۂ اظہار سے جس میں کہنے والے کی فنی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے یعنی (Craftmanship) کا دخل بھی ہے اور نعت گوئی کی سابقہ روایت کے ساتھ ایک تسلسل کا رشتہ بھی موجود ہے اُردو نعت نے عجمی روایت ہی کا سہارا نہیں لیا، بلکہ مقامی ہندی روایت کو بھی اپنایا۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''وظیفہ'' از عاصم گیلانی، مطبوعہ ۲۰۰۱ء، ناشر خزینۂ علم و ادب لاہور)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

نعت گوئی میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ اور جامی رحمتہ اللہ علیہ کو اپنی اپنی جگہ جو امتیاز حاصل ہے، وہ عربی اور فارسی زبانوں سے شغف رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اُردو میں بھی اس صنفِ شعر گوئی کی روایت خاصی پرانی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس میں محسن کاکوروی کا کارنامہ قابلِ لحاظ ہے۔ انگریزی ادب میں حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی شخصیت سے متاثر ہو کر جو شعری سرمایہ وجود میں آیا ہے وہ توجہ کو اپنی جانب کھینچتا ہے، خصوصاً ان کے مصلوب کیے جانے کے واقعے نے تو ایک شعری محرک کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اینگلو سیکسن ادب سے لے کر موجودہ دور تک کے

ادب میں ان کی پرچھائیاں نظر پڑتی ہیں۔ یہ فرض کر لینا کہ مذہبی جذبے کی شاعری اعلیٰ اور کھری شاعری نہیں ہو سکتی، محلِ نظر ہے اور عصبیت کی چغلی کھاتا ہے۔ اصل معاملہ احساس کی شدت اور اس کے مکمل شعری اظہار کا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر جس موضوع پر شعری کارنامہ وجود میں لایا جا رہا ہے، اگر وہ پوری طرح شعور کی گہرائیوں میں جذب ہو چکا ہے اور اس نے شعری حس کی ایک خاص حد تک تحریک کی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسی شاعری ہمیں اپیل نہ کر سکے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''اک شخص مہکتی چھاؤں سا'' از عمران نقوی، سنِ اشاعت ندارد، ناشر حریمِ علم و ادب، لاہور)

تابش دہلوی

نعت کے موضوع میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی، تعلیمات اور سیرت کے حوالے سے انسانی زندگی کے ثقافتی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی مباحث در آتے ہیں اور یہ مباحث شاعرانہ فن کاری کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھل کر ادب کا قابلِ فخر حصہ بنتے ہیں۔

نعت گوئی کا میدان وسیع بھی ہے اور محدود بھی، وسیع اس لحاظ سے کہ رسول اللہ ﷺ کی صفات اور فضائل و کمالات کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس طرح شاعر کو موضوعات کی ایک طویل فہرست با آسانی ہاتھ آ جاتی ہے اور یوں فکر کی بلندی اور رفعتِ تخیل کا سامان بغیر کسی دقت کے فراہم ہو جاتا ہے اور شاعر کو مبالغہ آرائی سے خود بخود نجات مل جاتی ہے کیوں کہ خود صفاتِ نبوی ﷺ اس درجۂ کمال پر ہیں کہ شاعر کو مبالغہ آرائی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور اس طرح وہ غلو سے نجات پا جاتا ہے اور اس کا من و عن بیان کر دینا ہی کمالِ شاعری کی سند ہے۔

نعت کا میدان محدود اس لحاظ سے ہے کہ یہی کمالات و فضائلِ نبوی ﷺ جن کا دائرہ نہایت وسیع ہے شاعر کی فکری گرفت میں مشکل سے آتے ہیں اور تخیل اور فکر کی حوصلہ مندی کے باوجود شاعر کو ان کا احاطہ کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے شاعر میں غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت کا ہونا نہایت ضروری ہے کیوں کہ نبی ﷺ کی بارگاہ میں مبالغے کی گنجائش اور اجازت نہیں۔ اور جو کلام صداقتِ بیان سے عاری ہوگا وہ قبولیت کا شرف نہیں پا سکتا۔ غرض نعت گوئی نہایت مشکل صنفِ شاعری ہے۔

ان آسانیوں اور دشواریوں کے باوجود جن کا اوپر ذکر ہوا ہے شاعر کا توحید و رسالت اور عبد و معبود کے رشتوں کو سمجھنا اور اپنے خیالات، جذبات اور افکار و عقائد میں ہم آہنگی پیدا

کرنے کی پوری صلاحیت رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ قادر الکلامی اور شاعرانہ طباعی کے باوجود نعت گوئی کے منصب سے پوری طرح عہد برآ نہیں ہو سکے گا۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''آپ'' از حنیف اسعدی، مطبوعہ ۱۹۹۶ء، ناشر اقلیم نعت کراچی)

سلیم احمد

اُردو میں نعت گوئی اب ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس عہد کے شعرا نے اسے ایک وسلیۂ اظہار کی صورت میں اپنے تخلیقی عمل میں باقاعدہ شامل کر لیا ہے۔ شعرا کے تخلیقی اخلاص کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ نعت کے لیے ہر ہیئت اور ہر شعری سانچہ استعمال ہو رہا ہے۔ غالباً اتنا تنوع اُردو کے کسی عہد کی نعت میں کبھی موجود نہیں رہا ہے۔ جہاں تک نعت کے مواد کا تعلق ہے تو اس میں بھی یہی تناظر کارفرما ہے۔ اب تک کے سرمایے کو اگر ہم سمیٹنا چاہیں تو ہمیں تین رویوں کا واضح اظہار ملتا ہے۔ پہلے رویے میں عقیدت کی بنیاد پر نعت کو ثواب کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ دوسرے رویے میں شعرا نے حضور ﷺ کی ذات کو اپنے ذاتی تعلق اور محبت کے وسیلے سے اپنا موضوع بنایا ہے اور تیسرا رویہ ان شعرا کا رہا ہے جو حضور ﷺ کو انسانی تاریخ کے ایک کامل رہنما اور ہادی کے تصورات کے تحت محسنِ انسانیت کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے رویے میں شعرا عموماً ان صفات سے گہرا رشتہ قائم کرتے ہیں — خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضور ﷺ کی صفاتِ کاملہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن تیسرے رویے میں ایک طرف حضور ﷺ کی انسانی، اخلاقی اور سماجی خدمات کا ذکر کیا جاتا ہے تو دوسری طرف قوم کے اجتماعی زوال اور بحرانی ادوار کے حوالے سے حضور ﷺ کو ایک آئیڈیل کی صورت میں پیش کر کے ماضی کی عظمتوں اور کارناموں کو زندہ کیا جاتا ہے، لیکن ان تینوں رویوں میں سب سے زیادہ تخلیقی صداقت کا اظہار دوسرے رویے کے شعرا میں پایا جاتا ہے جہاں حضور ﷺ سے ذاتی تعلق کی بنا پر وارداتِ قلبیہ کی صورت میں اظہار اسے شعرا کا زندہ تجربہ بنا دیتا ہے۔ یہ شعرا حضور ﷺ کی صفات کو اپنی نفسی کیفیت میں شامل کر کے بیان کرتے ہیں۔ یہی عمل زندہ نعتیہ کلام کی صورت میں ہمارے اجتماعی تشخص کو قائم رکھتا ہے جو اپنی تاثیر اور حسنِ اخلاص کی بنا پر ہر دور میں نعت کا بنیادی حوالہ بن جاتا ہے۔

موجودہ دور کے نعتیہ کلام کا اگر جائزہ لیا جائے تو آپ کو اس میں مندرجہ بالا تینوں رویے نظر آئیں گے، لیکن ان میں وہی شعرا ممتاز اور نمایاں نظر آئیں گے جو دوسرے رویے والی

وارداتِ قلبیہ سے کام لیتے ہیں۔

(مضمون سے اقتباس، مشمولہ ذکرِ خیر الانام از حنیف اسعدی، مطبوعہ ۱۹۸۴ء، مکتبہ اربابِ قلم، کراچی)

سیّد ضمیر جعفری

معروف مفہوم میں نعت ایک صنفِ شعری ہی متصور ہوگی مگر یہ تو مسلمان کا سرمایۂ ایمانی بھی ہے۔ ہمارے لیے تو حضور کا تذکارِ مبارک ''روحانی تسکین و سیرابی کا موجب'' ہے۔ فارسی اور اُردو نعت کے نخلستان پہ نگاہ ڈالی جائے تو محسوس ہوگا کہ شعرا نے اس صنف کو ارادت کے وجدانی اظہار اور ایک باطنی مکالمے کا وسیلہ سمجھا اور اپنے جذبوں اور دھڑکنوں کو الفاظ سے آگے گزر کر اپنے احساس کے لمس سے قلم بند کرنے کی آرزو کی ہے۔ اس حوالے سے نعت گو شعرا کی تخلیقی دشواری اور کرب کا بھی کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نعت کی چاندنی ذہن و خیال سے خوابوں اور خواہشوں میں ڈھلتی ہے۔ یہ محض طاقتِ لسانی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن جذب، وارفتگی، سپردگی اور بے خودی کی کیفیت میں — ارادت و محبت، عبودیت و ادب کے حدود کی نگہ داری کے مراحل سے گزرنا بھی آسان نہیں۔ ادب کا یہ مقام کہ بارگاہِ رسالت مآب میں جبرئیلِ امین بھی دم بخود رہتے۔ اس احساس کا اظہار درجِ ذیل مقبول و مشہور شعر میں اس طرح کیا گیا ہے:

ہزار بار بشویم دہن بہ یزداں گذا شیتم
مکاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اُردو شاعری میں اگر نعت گوئی کے اسلوبی اور فکری سفر کا جائزہ لیا جائے تو میں سمجھتا ہوں۔ پس منظر میں — واضح ترین نشانِ راہ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے نعتیہ کلام میں اُبھرتا ہے، مثلاً:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آ بگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

اپنی نگاہ کی حد تک میں کہتا ہوں کہ یہ اُردو نعت گوئی میں پہلی آواز تھی کہ جس میں —

ارادت و محبت کے بے پایاں خوش بو، شیفتگی و سپردگی کی اتھاہ لہریں اور روح کی نغمگی کے والہانہ بہاؤ میں اس فلسفۂ حیات گونج بھی — اس طاقت و تاثیر کے ساتھ سنائی دی جس نے دُنیا کے اس عظیم ترین محسنِ انسانیت اور معلمِ اعظم کی سیرت سے جنم لیا اور کائنات نے روشنی پائی۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''قدیر و شبیر'' از جسٹس محمد الیاس، مطبوعہ ۱۹۹۴ء، ناشر القمر انٹر پرائزز، لاہور)

پروفیسر منظور حسین شور

حقیقت یہ ہے کہ نعت گوئی اردو شاعری کی اعلیٰ ترین قدر ہے۔ اس کا تعلق چوں کہ دنیا کی تاریخ میں ایک ایسے عظیم ترین انسان کی ذات سے ہے جس نے صدیوں کی تاریکی سے تہذیب کا سورج تراش کر نوعِ آدم کو انسانیت کا اُجالا تقسیم کیا ہے اس لیے بے جا نہ ہوگا اگر دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ اُردو شاعری میں اگر کوئی صنفِ سخن انسانی معاشرے کے لیے نفس کی تہذیب اور کردار کی شائستگی کا بہترین درس دے سکتی ہے تو وہ سرکارِ کائنات ﷺ کی نعت ہے اور چوں کہ نعت گوئی کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ پاک ہوتی ہے اس لیے کامیاب نعت گوئی انسانی معاشرے کے لیے ایک مثبت اور تعمیری خدمت کے مترادف ہوتی ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''جامِ طہور'' از صابر براری، مطبوعہ ۱۹۸۲ء، ناشر مجلس سخن، کراچی)

پروفیسر عارف عبدالمتین

نعت نگاری کو ملی تخصیص کا علمبردار تو ہونا چاہیے، مگر ملّی تحدید کو اسی طرح روا نہیں رکھنا چاہیے۔ جس طرح آنحضرت ﷺ کے پیغام اور اُن کی کرم گستری کو کسی نوع کی تحدید گوارا نہیں کیوں کہ آپ ﷺ رحمت للعالمین اور آپ ﷺ کا پیغام ہمہ گیر ہے۔ لہٰذا اس کی آفاقیت کو نعت نگاری کے دوران ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے بصورتِ دیگر حضور ﷺ ملتِ اسلامی کے محسن کے طور پر تو نظر آسکتے ہیں، محسنِ انسانیت کے روپ میں دکھائی نہیں دے سکتے۔

دیکھنا یہ ہے کہ دورِ حاضر کے نعت گو نعتیہ مجموعوں کے تعداد میں اضافے کی تمنا کے تحت کہیں میکانکی انداز سے نعتوں کا انبار تو نہیں لگا رہے اور سچی شاعری کا تابندہ مظہر بننے کے لیے شاعر کو جس تخلیقی لمحے کا منتظر رہنا پڑتا ہے وہ اس سے کہیں بے نیاز تو نہیں ہوگئے۔

(اقتباس مشمولہ صل علی محمد از عابد نظامی، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد

اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

یوں تو نعت نگاری ہر عہد میں جوئے شیر لانے کے مترادف رہی ہے، تاہم جدید دور میں مدحت سرائی کے تقاضوں کی تکمیل کچھ زیادہ ہی دشوار ہوگئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ عہد میں ثنائے خواجہ کے مطالبات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ثناگر کو جس طرح تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہی، شاید سابقہ ادوار میں اس کے ہم منصبوں کو اس طور کبھی نہ چلنا پڑا ہو اور اس کی بنیادی وجہ اغلباً یہ محسوس ہوتی ہے کہ آج کا نعت نگار نعت نگاری کے ہفت خواں کو کربِ شعور کے دہکتے ہوئے خورشید کی جس تمازت میں طے کرتا ہے، وہ سابقہ ادوار میں اتنی شدت کی حامل نہ تھی۔ کلاسیکی نعت حقِ توصیف ادا کرتے ہوئے عام طور پر آنحضور ﷺ سے اپنی عقیدت و ارادت کو صورت اور سراپا کے حوالے سے پیش کرتی تھی، مگر جدید نعت اپنے معتقداتی و ارادتی حاصلات کو سیرت و کردار کے نقطۂ نظر سے ہمارے سامنے لاتی ہے اور اس سلسلے میں قرآنِ حکیم کی حکمت کو ایک ایسے معیار کے روپ میں بروئے کار لاتی ہے جس کی تہ داری اور گوناگونی کا اندازہ طبعی، عمرانی اور نفسیاتی علوم سے کماحقہٗ آگہی کے بغیر ممکن نہیں اور موجودہ عہد میں ان علوم کی لحظہ بہ لحظہ فروغ پذیر وسعت کا کسے ادراک نہیں ہے۔ پھر جدید نعت نگار کے لیے جہاں حکمتِ کتاب سے بھرپور اور ہمہ جہت آشنائی ناگزیر ہے وہاں اُس کے لیے فہمِ سنت کی اس درخشاں منزل پر استوار ہونا بھی انتہائی لازمی ہے جو ابنِ آدم کی کتنی ہی شخصی، ملی اور انسانی احتیاجات کی تکمیل کے اوراق اور پیچیدہ مراحل کی نشان دہی کرتی ہے۔

پھر عہدِ نو کے مدحت نگار پر اس ذمہ داری کا اطلاق بھی ہوتا ہے کہ وہ کتاب و سنت کو انسانی معاشرے میں رائج کرنے اور حیاتِ انسانی پر ان کو نافذ کرنے کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ کی اُن کوششوں کو بالعموم اور خلفائے راشدینؓ کی اُن مساعی کو بالخصوص پیشِ نظر رکھے جو انھوں نے آنحضور ﷺ کی بے مثال قیادت میں کیں اور اس حوالے سے ابتدائی طور پر ملتِ اسلامیہ کے اور آخری تجزیے میں پوری انسانیت کے عظیم محسنین ٹھہرے اور یوں کسی محدود جماعتی یا فرقہ وارانہ عصبیت سے قطعِ نظر وہ اُن مفکرینِ اُمت تک بھی رسائی حاصل کرتا ہے جو اپنی متنوع جدوجہد سے ہماری حیاتِ اجتماعیہ کے مختلف ادوار کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مصروف ہیں اور یوں قومِ ہاشمی کو اس کی نشاۃِ ثانیہ کے توسط سے عالمی تہذیبی و تمدنی سیادت کا اہل بنانے کے تمنائی ہیں۔

علاوہ ازیں جدید نعت نگار اس امر کا بھی مکلّف ہے کہ وہ آنحضور ﷺ کی مدح سرائی کے دوران اُن جمالیاتی لوازم کو بھی پوری مہارت سے فراہم کرے جو الفاظ کو ان کی عام بے

اثر اور بے معنی سطح سے اوپر اُٹھا کر فن کی پُر تاثیر اور پُر اسرار سطح پر لا کھڑا کرتے ہیں اور یوں شعری اظہار ایک کرشمۂ حرف وصورت کا مظہر بن کر طلوع ہو جاتا ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''ریاضِ نعت'' از رفیع الدین ذکی قریشی، مطبوعہ ۱۹۹۳ء، مکتبہ القریش، لاہور)

عرش صدیقی

غزل او رنعت دونوں میں تشبیہیں، استعارے اور علامتیں مشترک ہیں اس لیے بھی بعض شعرا اور نقاد غزل اور نعت کی فضا میں تفریق قبول نہ کرنے پر مصر رہتے ہیں۔ یہ دلیل اس لیے کم زور ہے کہ ایک ہی لفظ مختلف مواقع پر مختلف لہجوں میں استعمال ہو کر فضا کو بدل دیتا ہے۔ چناں چہ میں لازم سمجھتا ہوں کہ نعت اور غزل کی زبان بحیثیتِ مجموعی ایک ہونے کے باوجود اور تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کے اشتراک کے باوجود نعت کی فضا کو غزل سے مختلف ہونا چاہیے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ہاں روایتی عاشق انتہائی غیر ذمہ دار، بے ادب اور بے پروا شخص ہوتا ہے جسے صرف محبوب کی قربت چاہیے۔ اُسے محبوب کی نیک نامی کا خیال کم ہی آتا ہی دراصل ہمارے ادب میں عشق و ہوس میں عام طور سے کوئی فاصلہ نہیں رہنے دیا گیا۔ مرشد اور رہنما سے محبت میں جو ادب کی اقدار شامل ہیں، وہ عام محبت میں نہیں ہوتیں۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''برگِ ثنا'' از تابش صمدانی، مطبوعہ ۱۹۸۸ء، ناشر خلیل احمد صمدانی اکادمی، ملتان)

شہزاد احمد

میرے خیال میں جو شے ہمیں دوسرے مذاہب کے مقابلے میں واضح امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے وہ ہمارا تصورِ نبوت ہے۔ ظاہری اور باطنی دونوں لحاظ سے رسولِ کریم ﷺ کی شخصیت ہمارے لیے مثالی ہے اور اس کا اتباعِ زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ موجودہ دور میں جب مسلم اُمہ بے شمار مسائل میں گھری ہوئی ہے ہمارے لیے اتحاد بین المسلمین کا سب سے بڑا ذریعہ اسوۂ حسنہ کی پیروی ہے اور قرآنِ حکیم کے بعد مسلمانوں کے لیے فلاح کا راستہ بھی یہی ہے۔ نعت گوئی اس امر کا اظہار ہے کہ ہم رسولِ اکرم ﷺ اور ان کے مشن کے ساتھ کس قدر لگاؤ رکھتے ہیں اور موجود عہد میں جو نعت لکھی جا رہی ہے وہ زیادہ تر اسی رُجحان کا اظہار ہے کہ ملتِ اسلامیہ

اب اس حیثیت میں آ گئی ہے کہ وہ اقوامِ عالم میں اپنا کردار ادا کر سکے اور یہ کردار ادا کرتے ہوئے ہمیں رسولِ اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے راستے ہی کو اپنانا ہے وگرنہ اتحاد اور ترقی دونوں ہی نا قابلِ حصول ہو جائیں گے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے انسانوں کے مابین عدل پر بہت زور دیا ہے۔ اس زمانے میں جب دُنیا کی تمام قومیں صرف اپنے اپنے مفادات تک ہی محدود ہیں، رسولِ اکرم ﷺ کی شخصیت ہی عدل کی علامت بن سکتی ہے اور تیسری دُنیا کی پس ماندگی کا حل صرف اسی عدل میں ہے۔ لہٰذا نعت کے ذریعے ہم نہ صرف اپنے تمام مسائل کو بیان کرتے ہیں، بلکہ ان کا ایک حل بھی دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ نعت صرف رسولِ پاک ﷺ کے ظاہری خواص تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں ان کے مشن کے بارے میں واضح اشارے بھی موجود ہیں۔ اقبالؒ نے تصور نبوت کو جدید رنگ دیا تھا اور اب ہماری تمام شاعری میں نعت کا یہی رنگ بہت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ غزل کے اندر بھی نعت کے مضامین جابجا نظر آتے ہیں۔ ہماری شاعری کی خصوصی خاصیت یہ مضامین ہی ہیں اور ان کا اثر پوری جدید شاعری پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہماری شاعری بنیادی طور پر ایک اسلامی معاشرے کی شاعری ہے۔ اس میں کوتاہیاں ہو سکتی ہیں مگر اس کی سمت کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ اقبالؒ نے درست کہا تھا۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(انٹرویو سے اقتباس مشمولہ روزنامہ جنگ لاہور، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

حفیظ تائب

شاعری کی دوسری اصناف کی طرح نعت بھی زندگی کی تیزی سے بدلتی ہوئی اقدار سے متاثر ہو رہی ہے۔ انسان کے اندر جو شکست و ریخت ہو رہی ہے، اس کے نشانات بھی نعت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس دور کا نعت نگار ذاتی، جماعتی اور کائناتی دکھوں کا مداوا سیرتِ اطہر سے تلاش کرتا ہے۔

نعت میں ملی آشوب کے حوالے سے التماس دُعا اور طلبِ رحمت کا رواج پہلے ہوا مگر رفتہ رفتہ آشوبِ عصر اور آشوبِ فرد جیسے پیچیدہ موضوعات بھی نعت کا حصہ بنتے گئے۔ مادیت، عقل پسندی اور فلسفہ پسندی کے دھندلکوں میں نعت کے ذریعے روحانیت، ایمان اور ایقان کی شمعیں روشن کی گئیں۔ نعت نگاری کے نئے امکانات سے عشقِ رسول ﷺ کو سینوں میں بیدار کر کے مثبت قوت بنانا

تذکارِ سیرت کے ذریعے اتباعِ خیر الانام ﷺ کی ترغیب دلانا، اسوۂ حسنہ اور تعلیماتِ نبوی ﷺ کے بیان سے خوب صورت معاشرے کے قیام کے لیے راہ ہموار کرنا، اقدارِ خیر کا فروغ اور باطل نظریات کا رد، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مثالی سیرت کے حوالے سے اپنے احوال و اعمال کا جائزہ لینا اور فکرِ اقبال کی روشنی میں خودشناسی، کائنات شناسی اور خدا شناسی کی جملہ منازل میں حضور ﷺ کی ابدی رہبری کو اُجاگر کرنا جیسے مضامین نعت میں شامل کر کے اسے زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔

(اقتباس انٹرویو رونامہ نوائے وقت، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

بیس ویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں نعت گوئی نے فروغ و ارتقا کی جو منزلیں طے کرنا شروع کی تھیں، ان کا سلسلہ اکیس ویں صدی میں برابر پھیلتا جا رہا ہے۔ نعت گوئی کا کینوس وسیع تر ہو رہا ہے اس کے فنی تجربات میں بھی توسیع ہو رہی ہے۔ تمام تر بڑے شعرا کے نعت کی طرف توجہ دینے اور نئے طرزِ احساس کی بدولت نعت گوئی کے بیکراں امکانات سامنے آ رہے ہیں۔ نظم اور غزل کی صورت میں کی جانے والی بڑی شاعری نے جہاں نعت کو متاثر کیا وہاں نعت نے بھی عام شاعری کی لفظیات و تراکیب ہی نہیں مضامین کو بھی وسعت آشنا کیا ہے۔

نعت میں زندگی کے تمام مسائل بیان ہو رہے ہیں جو باتیں عام شاعری میں کہنا مشکل ہیں وہ نعت میں باآسانی کہی جا سکتی ہے۔ اب نعت صرف ایمانیات کا حصہ نہیں رہی، اس نے ادبیاتِ عالیہ میں بلند مرتبہ حاصل کر لیا ہے اور اکیس ویں صدی میں نعت ادب کا دقیع و رفیع موضوع ٹھہرے گی۔

(انٹرویو سے اقتباس روزنامہ جنگ لاہور، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

عبدالعزیز خالد

بیس ویں صدی میں اُردو نعت گوئی کو بڑا فروغ حاصل ہوا، خاص کر صدی کے آخری دو عشروں میں تو نعت گوئی کو بڑا عروج ہوا اور ہر ایک شخص نے نعت گوئی کی طرف رجوع کیا اور ہر شخص نے اپنے اندر کی کیفیت کو جس انداز میں پیش کیا، اس سے حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ عقیدت صاف عیاں ہوتی ہے اور نعت میں بڑا سوز بھی ہے کیوں کہ نعت سے انسان کو سکونِ قلب

بھی ملتا ہے اور حضور پاک ﷺ کی خوشنودی بھی۔

(اقتباس مذاکرہ روزنامہ جنگ لاہور، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

بلند پایہ نعتیہ شاعری کے لیے دوسری خارجی ضرورتیں گنوائی جاسکتی ہیں، لیکن اس کی اصل روح اور اس کا جزوِ اساسی آنحضرت ﷺ کی ذات و صفات سے والہانہ محبت ہے۔ نعتیہ شاعری اپنی تمام لسانی وفنی آرائش کے باوصف اگر حبِ رسول ﷺ کے سچے اور شدید جذبے سے عاری ہوتو پھر بغیر خوش بو کے پھولوں کا گل دستہ ہوکر رہ جاتی ہے۔ لفظاً اور رسماً اس کو شاعری کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ حقیقت اور سچی شاعری کے زمرے میں نہیں آتی۔ اس میں دل رُبائی اور درد آفرینی کے دیرپا عناصر نہیں ہوتے، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ کسی شاعر کے نعتیہ کلام میں جس نسبت سے عشقِ رسول ﷺ کی شدت و گہرائی ہوگی، اسی نسبت سے اس کا کلام جاں گداز و دل آویز ہوگا تو بے جا نہ ہوگا۔

اشفاق احمد

نعت کسی صنفِ سخن کا نام نہیں۔ یہ تعلق، رابطے اور گزارشِ احوال کا ایک ذریعہ ہے، ایسا ذریعہ جس سے معمولی غلام اور بندے آقائے دوجہاں کی کائناتِ کرم سے دامن بھرنے کے لیے اپنا رُخ متعین کرتے ہیں۔ نعت گوئی کا فن خوش نصیب اور خوش بختی ہی کا مظہر نہیں بلکہ خوش حالی کی وجہ بھی ہے۔ نعت کہنے اور نعت کی دُنیا میں رہنے والا اپنے عہد کا خوش حال ترین انسان ہوتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اس کو یا اس کے لواحقین کو اس حقیقت کا شعور نہ ہو سکے۔

یہاں صدا کی اور فریاد کی اور مسلسل کوک کی ضرورت ہے، ایسی کوک جو دل کی گہرائیوں سے اُٹھے تو گلا رُندھ جائے، سانس رک جائے اور آواز بند ہو جائے لیکن آنکھیں اس فریاد کا آنسوؤں کی صورت میں ترجمہ کرتی چلی جائیں۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''ورفعنا لک ذکرک''، از راجا رشید محمود، مطبوعہ ۱۹۹۳ء، ناشر مکتبہ عالیہ، لاہور)

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

نعت بہ ظاہر ایک صنفِ سخن ہے جس میں انتخابِ کلمات، اختیارِ خیالات اور اسلوبِ نظم کی رعایت رکھی جاتی ہے۔ اس لیے اس کا ظاہری ہیولہ فنی تقاضوں کے ساتھ مربوط رہنا چاہیے مگر اس کی اندرونی فضا عام شعر و نظم سے مختلف ہے۔ اس کا پورا ڈھانچا ہی پاکیزگی میں لپٹا ہوتا ہے۔ صداقت شعاری اس کا جوہر ہے اور حقیقت پسندی اس کا اختیار ہے۔ شاعر جب نعت لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو ایک طاہر و معطر وجود اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے خیالات کا مرکز طہارت کے حصار میں ہوتا ہے اور وہ ہزار مبالغے کے باوجود سچ بولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ نعت کی کرداری دیانت شاعر کے خیالات کا احاطہ کرتی ہے اور وہ ایک عام شاعر سے مختلف روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح نعت تہذیبِ نفس کا ذریعہ بنتی ہے پھر یہ پاکیزگی ایک ذات تک محدود نہیں رہتی۔ پوتر خیالات جن کلمات کے جلو میں معاشرتی فضا میں پھیلتے ہیں، وہ فضا کو بھی خوش گوار بناتے ہیں۔ نعت کی مجلس ہمہ جہت وقار کا نمونہ ہوتی ہے جس سے منسلک افراد کے رویوں میں پاکیزگی اترنے لگتی ہے۔

نعت خیالات کی تطہیر، میلانات کے توازن اور جذبات کی راستی کی محرک بنتی ہے جس سے معاشرتی اصلاح کی نمود ہونے لگتی ہے۔ غزل ہو یا عمومی نظم، اثر آفریں ہو یا نہ ہو، معاشرتی رویوں کی راستی کی کفیل نہیں ہوتی۔ تاریخِ شعر گواہ ہے کہ جب شاعر نعت کو اپنانے لگتا ہے تو اس میں معاشرتی تبدیلی پیدا ہونے لگتی ہے۔ داد دینے کے انداز سے لے کر سماعتی رویوں تک انقلاب برپا ہوتا ہے اور مشاہدہ تو یہاں تک ہے کہ کردار سنورنے لگتے ہیں۔

(اقتباس مشمولہ "مدحت" مدیر سرور حسین نقشبندی مطبوعہ شمارہ ۲، ۲۰۱۰ء، ناشر نعت فورم، لاہور)

پروفیسر حسنین کاظمی

ایمان ایک قلبی کیفیت ہے اور بہ حیثیت مسلمان جذبۂ عشقِ رسول ﷺ ہمارے قلوب کو اس کیفیت سے منور کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اسی کیفیت سے ایمان کو معنویت میسر آتی ہے۔ فکرِ اقبال میں اسی جذبے، اسی کیفیت کی جھلک ہے، جب انھوں نے کہا کہ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

اسی اُجالے، اسی نور کا عکس شعر کے پیکر میں ڈھل کر نعت بن جاتا ہے اور ہمارے دلوں کو حُبِ رسول ﷺ کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ روشنی کی تصدیق بصارت اور محبت کی تصدیق صداقت سے ہوتی ہے اور محبت کی دولت میسر آ جائے تو اپنے اظہار کی راہیں وہ خود تلاش کر لیتی ہے اور حُبِ رسول ﷺ کی ایک بہت معتبر صورت نعت کے پیکر میں ڈھل کر نمایاں ہوئی ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں عشقِ رسول ﷺ کے نقوش بہت گہرے ہیں اور مختلف جہتوں میں بڑی آب و تاب اور بڑی توانائی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارے شعری اور نثری ادب میں بھی یہ توانائی پوری طرح نمایاں رہی ہے اور نمایاں تر ہوتی جا رہی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں ملّی شعور کی بیداری میں جذبۂ عشقِ رسول ﷺ ہی ہمارا محور و مرکز بنا اور حالی و اقبال کی فکر اور فن کو اس کا وسیلہ بننے کی توقیر ملی، اور سچی بات تو یہ ہے کہ خود مملکتِ پاکستان کا وجود بھی اسی جذبے کی توانائی کے معنوی اظہار کی دلیل ہے۔ اس کا سب سے نمایاں ثبوت پاکستان میں نعت گوئی کا ہمہ جہت فروغ ہے۔

(اقتباس مشمولہ ''آرزو'' از عبدالمالک مضطر، مطبوعہ ۲۰۰۳ء، یونی پرنٹ کورنگی، کراچی)

حمایت علی شاعر

اُردو زبان میں بے شمار نعتیں لکھی گئی ہیں، لیکن بہت کم نعتیں ایسی ہیں جن میں کوئی نکتہ نمایاں ہوا ہو، بیشتر نعتیں، ایک دوسرے کی بازگشت محسوس ہوتی ہیں۔

دراصل ہم جب نعت کہتے ہیں تو ہمارے پیشِ نظر، صرف ہمارا عقیدہ ہوتا ہے۔ ہم عقیدے کو شعور نہیں بنا پاتے۔ نتیجتاً ہماری نعت، روایت کا جذباتی اظہار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسی نعتوں کی بھی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے مگر ہمارا موضوع جس ارتفاع کا متقاضی ہوتا ہے، شاید ہم وہ تقاضا پورا نہیں کر پاتے۔

میں نے اُردو کی نعتیہ شاعری کے سات سو سال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے مقالے میں نعت گو شعرا کی اس کم مائیگی کی طرف اشارہ کیا تھا اور علامہ اقبال کی مثال دیتے ہوئے عرض کیا تھا کہ وہ اس صدی کے واحد شاعر ہیں جن کی نعت ہماری فکر کو نئے امکانات سے آشنا کرتی ہے۔

لوح بھی تو ، قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ ، تیرے محیط میں حباب

اس شعر میں انسانی عظمت کے نئے اُفق نمایاں ہوتے ہیں اور رسولِ اکرم ﷺ کی

ذات اس عظمت کا استعارہ بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شعر اس وقت تک نہیں کہا جا سکتا جب تک طرزِ فکر میں ایک انقلابی تبدیلی نہ آ جائے۔ اس انقلابی تبدیلی کا سراغ ہمیں علامہ کے اس شعر سے ملتا ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردُوں

ان دونوں اشعار میں فکر کی ایک جست نظر آتی ہے جو ایک تخلیقی محرک کے طور پر دونوں اشعار میں جاری و ساری ہے۔

(مضمون سے اقتباس، مشمولہ ''شاعر لوح شیشۂ دل'' از ابوالامتیاز ع س مسلم، مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی، مطبوعہ ۱۹۹۹ء، مقبول اکیڈمی، لاہور)

شبنم رومانی

نعت گوئی منجملۂ عبادات ہے۔ دوسری عباداتِ جلیلہ کے لیے جسم اور لباس کی پاکیزگی شرط ہے مگر نعت گوئی کے ساتھ روح کی پاکیزگی بھی مشروط ہے۔ نعت دیگر اصنافِ سخن کی طرح محض خیال آرائی یا مضمون آفرینی کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک گہرے روحانی کمٹ منٹ کا اظہار ہے اور اپنے سننے اور پڑھنے والوں میں ایک گہرے روحانی کمٹ منٹ کا احساس پیدا کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں محبت کے بغیر مدح بے معنی ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''ارم در ارم'' از نظیر شاہ جہان پوری، مطبوعہ ۱۹۹۲ء، مکتبۂ اربابِ قلم، کراچی)

مشفق خواجہ

ایک شاعری وہ ہے جس میں خاصۂ خاصانِ زندگی کی عظمتوں کے حوالے سے اس دُنیا اور اس میں موجود زندگی کی وسعتوں پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ اسی شاعری کا دوسرا نام نعت ہے جو عام شاعری کے مقابلے میں اس سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں شاعر اپنے عہد کے تقاضوں کو پیشِ نظر تو رکھتا ہے، لیکن زمانے کا اسیر نہیں ہوتا۔ شعر میں ابدی محاسن کا فروغ نعت کی ایک بیش قیمت عطا ہے۔ عام شاعری میں ہر طرح کے انسانی جذبات کی عکاسی ملتی ہے، لیکن نعت میں جذبے کی رفعت پہلی شرط ہے۔ عام شاعری میں صرف دل کے گداز سے کام چل جاتا ہے۔ لیکن نعت میں صفائے قلب کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

نعت ایک ایسی بے مثال ہستی کے اوصاف کا بیان ہے جسے خود خدا تعالیٰ نے رحمتہ اللعالمین کہا ہے۔ ظاہر ہے اس بے مثال ہستی کے اوصاف کو بیان کرنے کے لیے صرف شعر گوئی کے اصول اور فنی مہارت کام نہیں آسکتی، بلکہ اس بصارت اور بصیرت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو صرف اپنے موضوع کی ذات سے بے پایاں محبت ہی پیدا کر سکتی ہے۔ صنفِ نعت کی تعریف کے لیے اگر صرف ایک لفظ کا انتخاب کیا جائے تو وہ سوائے ''محبت'' کے کوئی دوسرا لفظ نہیں ہو سکتا، لیکن یہ محبت عام جذبۂ محبت سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں ایک انسان دوسرے انسان کا صرف طلب گار نہیں ہوتا، بلکہ اپنے مطلوب کے حوالے سے زندگی کے مسائل سے اس طرح آگاہی حاصل کرتا ہے کہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی محبت بھی اس کی دل میں بیدار ہو جاتی ہے۔ گویا محمد ﷺ کا اُمتی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل بنی نوع انساں کی محبت کا مرکز بن جائے۔

یہی شعور کہ انسان ہے کسی کے لیے
شعورِ دیں ہے محمد ﷺ کے اُمتی کے لیے

جب تک دین کا یہ شعور بیدار نہ ہو محمد ﷺ کے اُمتیوں میں شامل ہونا ممکن نہیں، اور اس شعور کے بغیر نعت بھی غزل کی طرح روایتی اور رسمی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔

(مقدمے سے اقتباس، مشمولہ ''سیّدنا''، از سلیم گیلانی مطبوعہ ۲۰۰۳ء، علم و عرفان پبلشرز، لاہور)

صہبا اختر

موجودہ نعت کا رشتہ عقیدت کی سطح سے بلند ہو کر ادب کی اعلیٰ تر سطح سے مل چکا ہے۔ اب نعت دل و دماغ کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اب یہ محض ذریعۂ ثواب اور نجات نہیں رہی بلکہ رسول اور حیاتِ رسول ﷺ، اسلام اور روحِ اسلام، کائنات اور مقصدِ کائنات کے افہام و تفہیم کا ذریعہ اور وسیلہ بن چکی ہے۔

(دیباچے سے اقتباس مشمولہ ''اقرا'' از صہبا اختر مطبوعہ ۱۹۸۱ء، مکتبۂ ندیم کراچی)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

اُردو کی جدید نعت کا آغاز حالی سے ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جدید اور قدیم کے درمیان حد کس طرح کھینچی جائے، اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ قدیم نعت قرونِ اولیٰ کے ماحول کا نقشہ کھینچنے

کے ساتھ ساتھ خلق و جمالِ رسولِ عظیم ﷺ کا تذکرہ کرتی ہے جب کہ جدید نعت خلقِ نبوی ﷺ کی طرف خصوصی میلان ظاہر کرتی ہے۔ مولانا حالی کی مسدس ''مدوجزرِ اسلام'' کے مشہور نعتیہ اشعار اس حقیقت کی تجسیم کرتے ہیں کہ اسلام کے پھیلنے کی وجہ قرآنی تعلیمات تھیں اور چوں کہ حضور ﷺ مجسم قرآن تھے، اس لیے آپ کی زندگی اور آپ ﷺ کے جملہ اعمال و افعال قرآنی تعلیمات کا بہترین نمونہ تھے، اس لیے آپ ہی کی ذات کے لیے انسانِ کامل کا لقب زیبا ہے۔

جدید نعت کا اہم ترین نام بلاشبہ علامہ اقبالؒ کا ہے۔ علامہ اقبال کی نعتیہ شاعری کی روح تو وہی ہے جو حالؔی کی نعت میں موجود ہے تاہم اس کی فضا کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اگر نعت کو مزید وسعت دینی مقصود ہو تو اقبالؔ کی نعتیہ شاعری سے بیش از بیش استفادہ کیا جانا ناگزیر ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد نعت گوئی کو رفتہ رفتہ فروغ حاصل ہوتا چلا گیا، لیکن اس کا سنہری دور گزشتہ صدی کے آخری بیس برسوں سے شروع ہوتا ہے اور اسے سال بہ سال فروغ حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔

مروّجہ و مستعملہ مضامین کو اپنے اپنے رنگ میں متعدد شعرا نے اپنی استعداد کے مطابق بہتر انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نعت لکھنے کے لیے خلوص اور محبت کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں کوئی بدبخت مسلمان ایسا نہیں ہوگا جسے آپ ﷺ کی ذات سے عقیدت اور لگاؤ نہ ہو۔ اس کے بغیر کوئی مسلمان ہو ہی نہیں سکتا، لیکن اچھی نعت لکھنے کے لیے خلوص، محبت اور عقیدت کے ساتھ ساتھ بعض اور شرائط کی اشد ضرورت ہے۔ نعت گو کے لیے قرآنِ مجید، احادیث، کتب سیر، کتبِ تاریخ اور عرب کی تمدنی تاریخ کے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ اگر نعت گو محض عقیدت کے سہارے لکھے گا تو بہت جلد مضامین کی تکرار تک محدود ہو جائے گا۔

اس قسم کی وسعتِ معلومات کے ساتھ ساتھ اچھے نعت گو کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ اور ذوقِ ادب بھی غیر معمولی ہو۔ بہتر ہوگا کہ وہ عربی اور فارسی ادب سے واقف ہو اور اُردو ادب کے سرچشموں سے بھی مستفید ہو چکا ہو۔ کسی بھی ادبی صنف میں کمال اس وقت حاصل ہوتا ہے جب شاعر اس کے فنی تقاضے پورے کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''مدحت'' شمارہ نمبر۱، مدیر سرور حسین نقشبندی، مطبوعہ ۲۰۱۰ء، نعت فورم، لاہور)

ڈاکٹر خورشید رضوی

دورِ جدید میں موضوعاتِ نعت کے نمایاں خدوخال تہذیبِ حاضر کے دکھوں سے اُکتائی ہوئی اُمت کے اس وفورِ شوق سے متعین ہوتے ہیں جس کے ساتھ وہ اپنی اصل کی طرف پلٹنا چاہتی ہے اور دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے اپنے ازلی رشتے کی پیہم تجدید و توثیق کی تمنا رکھتی ہے۔ انتشارِ اُمت کا غم، اتحادِ ملت کی آرزو اور نعت کو جذبے کی تڑپ کے پہلو بہ پہلو فکر کی گہرائی سے بھی مربوط رکھنا، علومِ قرآن وسنت کے مستند ذخیروں سے مضامینِ نعت کا استنباط کرنا، آج کے مسائل و مصائب کو خیر القرون کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی خواہش اور نعت کے آئینے میں حریت، مساوات اور مواخات کے ان احساسات کی عکاسی جو آج عالمگیر حیثیت اختیار کر گئے ہیں لیکن اپنی اساس میں خالص اسلامی ہیں اور جن کی وساطت سے فنِ نعت گوئی اسلامیت کے علاوہ انسانیت کے تناظر میں بھی حد درجہ دل نشین ثابت ہو سکتا ہے۔ شاید یہ اور ایسے ہی کچھ اور رُجحانات مل جل کر دورِ جدید میں موضوعاتِ نعت کے خدوخال کا تعین کرتے ہیں۔

(انٹرویو سے اقتباس مشمولہ روزنامہ نوائے وقت، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

علامہ شمس بریلوی

نعت گوئی موضوع کے اعتبار سے ہماری شاعری میں سب سے زیادہ اہم اور دشوار موضوع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نعت نگاری صرف اسی ذات کا حصہ ہے جس کو سرورِ کائنات ﷺ سے دلی تعلق اور روحانی رابطہ ہے کہ یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں بقول شاعرِ مشرق کہ:

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

آپ شاید یہاں بے ساختہ کہہ اُٹھیں کہ ذاتِ ختم المرسلین ﷺ سے تو روحانی تعلق اور دلی لگاؤ ہر مسلمان کو ہے، پھر یہ تخصیص کیسی؟ آپ کا خیال بجا و درست لیکن ذرا اس بات پر بھی تو غور کیجیے کہ عشقیہ شاعری اور نعتیہ شاعری میں کتنا فرق اور کیسا بُعد ہے۔ عشقیہ شاعری میں اگر آپ موزوں طبع ہیں تو عشق و محبت کی کیفیات میں سے جس کو چاہا الفاظ کے در و بست کا لباس پہنایا۔ لیجیے شعر ہو گیا۔ اس کے مقامِ شعریت سے بحث نہیں، لیکن نعتِ مبارک کے لیے اس وقوفِ خاص کی

ضرورت ہے جو مرتبہ نبوت کے ساتھ مختص ہے اور ان آداب و قیودِ شرعی سے باخبری درکار ہے جو اس راہ میں قدم رکھنے والے کو بے راہ روی سے روکتے ہیں، اس بحر ناپید کنار سے وہی فکرِ غواص درِ آب دار نکال کر لا سکتی ہے جو ورطہ نادانی میں غرق نہ ہو سکے، علمی بصیرت، مذہبی تبحر اور دینی شعور و ادراک کی ضرورت ہے جس کے پیشِ نظر وہ تمام آئین و آداب ہوں جن کی ادائیگی اور جن کا لحاظ دربارِ رسالت میں حاضری کے لیے ضروری ہے۔

نعیم صدیقی

نعت شاعری کی مشکل ترین صنف ہے۔ عام شاعر، شعر نگاری میں آزاد ہوتا ہے کہ جیسے چاہے، جولانیاں دکھائے۔ یہ درست کہ ایسے تعمیر پسند شعرا بھی ہمارے معاشرے میں ممتاز رہے جنھوں نے فنی تگ و تاز سے روحانیت کی قدروں اور ادب و شائستگی کے حدود کو کبھی پامال نہیں کیا، لیکن نعت میں معاملہ اور بھی نازک ہو جاتا ہے کیوں کہ یہاں جنید و بایزید بھی نفس گم کردہ آتے ہیں اور بقول ماہر مرحوم دُہرے رُجحانات میں کش مکش ہوتی ہے:

اک سمت محبت ہوتی ہے ، اک سمت شریعت ہوتی ہے

نعت اگر دو طرفہ تقاضوں میں سے کسی کو مجروح کر جائے تو پھر نعت، نعت نہیں رہتی۔ یا وہ بے جان ہو جائے گی یا سروش غلط آہنگ ہو جائے گا۔ خدا اور رسول دونوں کے مقام اور حقوق کو الگ الگ پہچاننا ضروری ہے۔ محبت کو شریعت کے پلِ صراط پر سے گزرنا پڑتا ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''نور کی ندیاں رواں'' از نعیم صدیقی، مطبوعہ ۱۹۸۷ء المنارہ بک سینٹر منصورہ، لاہور)

پروفیسر جعفر بلوچ

دیگر اصنافِ ادب کی طرح نعتیہ ادب بھی زمان و مکاں سے منقطع ہو کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ حمد و نعت میں عصری تقاضوں کے انعکاس کی کم سے کم صورت یہ ہے کہ شاعر اپنی کیفیات و واردات کی کہانی اور اپنے سوز و ساز کی حکایت اپنے حالات اور اپنے زمانے کے تناظر میں بیان کر رہا ہے۔ حضرت حسان بھی ثابتؓ، حضرت کعب بن زہیرؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور دیگر نعت نگار شعرا کی نعتوں میں جنابِ رسالت مآب ﷺ کے اوصاف و محامد کا تذکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر کے ذاتی محسوسات اور اجتماعی کوائف کا بیان بھی ملتا ہے اور دُعا کے پیرایے میں بھی شاعر اپنا

اور اپنی ملت کا منظرنامہ بھی پیش کرتا ہے، بلکہ رسولِ پاک ﷺ کے اوصاف و محامد کے ذکر میں بھی شاعر بالعموم انھیں صفات پر زیادہ زور دیتا ہے جو اس کی ذاتی اور عصری تقاضوں سے زیادہ معنوی قربت رکھتی ہیں۔

(ماخوذ مذاکرہ روزنامہ جنگ، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

انسانی معاشرے میں نعت کا کردار ہمیشہ تابندہ رہا ہے۔ نعت ہمیں جناب ختم الرسل ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے قریب تر کرتی ہے اور سیرتِ نبوی ﷺ کی تجلیوں کو نعت نگاری کے عصری تناظر میں نمایاں کرتی ہے۔ نعت کے ذریعے رسولِ پاک ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا ذکرِ خیر ہوتا ہے اور آپ کی عطا کردہ انسانیت نواز قدروں کی یاد دہانی ہوتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ادوار سابقہ کی طرح اکیس ویں صدی عیسوی میں بھی نعت اپنا رول حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرتی رہے گی۔ وہ انسانوں کو روز بروز قریب تر لانے والے ابلاغ و ترسیل اور نقل وحمل کے جدید ذرائع کی معرفت اسوۂ حسنہ کی روشنی کو زیادہ طمانیت، قوت، تیزی اور تاثیر کے ساتھ نئی گلوبل بستی کے سامنے پیش کر سکے گی۔ نئے حالات میں نعت بھی خاتم المنبیین ﷺ کے انوارِ نبوت کے نشر و ابلاغ کا ایمان افروز ذریعہ ثابت ہوگی اور آئندہ زمانے نعت کی وساطت سے بھی تجلیاتِ اسلام سے اور زیادہ مستفید ہوں گے۔

(ماخوذ مذاکرہ روزنامہ جنگ لاہور، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

ڈاکٹر عاصی کرنالی

نعت گوئی کا مختلف ادوار و احوال سے جائزہ لیا جائے تو نعت گوشعرا فنی اور موضوعاتی تقسیم کے پابند ہوکر نعتیں کہتے رہے ہیں اور کسی نہ کسی تلازمے کے دائرے میں نعت تخلیق کرتے رہے ہیں۔ ان التزامات کے ساتھ کہی جانے والی ساری نعتیں اچھی، بہت اچھی اور بہت ہی اچھی ہیں۔ ان کے حوالے سے ہم ایک وقت میں چمنستانِ نعت وثنا کے کسی ایک گوشۂ پُر بہار اور کسی مخصوص کیاری کی گل آفرینی سے کیف اندوز ہوسکتے ہیں، لیکن وہ نعت جو کسی فنی یا موضوعاتی حد میں محدود نہ ہو وہ ایک ایسے باغ کی مانند ہے جس میں بہ یک وقت بہت سے رنگ، بہت سی خوش بوئیں اور

بہت سے ذائقے یک جا ہوکر ہمیں قریب کیفیات سے سرشار کر دیتے ہیں۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ ہم ایک پرواز میں کئی آفاق کی سیر کر لیتے ہیں۔ آج کل نعت خوانی میں یہ رویہ ابھر رہا ہے کہ ایک ہی نعت میں ہمیں موضوعات و مضامین کا تنوع مل جاتا ہے اور بہت سی روشنیاں مل جل کر ہمارے دل و دماغ کو جگمگا دیتی ہیں۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''م'' از غالب عرفان ۱۹۹۹ء بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان کراچی)

پروفیسر شفقت رضوی

اگر نعتیہ ادب کی کمیت کا جائزہ لیا جائے تو صورتِ حال اطمینان بخش دکھائی دیتی ہے، لیکن کیفیت کا مسئلہ لائقِ غور قرار پاتا ہے۔ نعت کی جو بنیادی شرائط ہیں ان کی موجودگی کا احساس کم ہوتا ہے۔ نعت گو کا علم وسیع ہونا چاہیے۔ وہ حضور ﷺ کے اوصافِ حمیدہ، سیرتِ طیبہ، آپ کے بارے میں ارشاداتِ خداوندی، آپ کے اسلام کے حوالے سے فرمان، درجاتِ روحانی کی بلندی، بطورِ انسان کے زندگی، آپ کے شب و روز کا عالمِ انسان کے لیے نمونہ ہونا، ان تمام باتوں کا علم پوری وسعت اور گہرائی سے اس طرح ہو کہ آپ کی ذاتِ گرامی سے قربت نہ سہی، واقفیت یا شناسائی کا احساس پیدا ہوا ہو۔

فی زمانہ جس نوع کا نعتیہ ادب تخلیق ہو رہا ہے اس میں یا تو ہیئت کے تجربے ہوتے ہیں یا لفظیات کی بوالعجبی ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ خصوصیات اہم ہیں، لیکن جہاں تک نعتیہ شاعری کا تعلق ہے، ان کی اہمیت ثانوی ہے۔ زور ہیئت یا لفظ پر نہیں مضمون پر ہونا چاہیے۔ مضمون میں جس قدر اہم بات شامل ہوگی، نعت اتنی ہی مؤثر ہوگی۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''اُردو میں نعت گوئی'' از شفقت رضوی، مطبوعہ ۲۰۰۲ء، جہانِ حمد پبلی کیشنز کراچی)

پروفیسر سحر انصاری

اُردو میں نعتیہ شاعری ایک الگ اور منفرد مقام حاصل کر چکی ہے۔ نعتیہ شاعری کے اس سرمایے کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضورِ کائنات ﷺ کے فضائل و شمائل، آپ ﷺ کی تعلیمات و مراتب، آپ ﷺ کی سیرت کی جملہ جہات و صفات کا بیان نعتیہ شاعری کے مشترک موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس میں ہر دور کی اُردو شاعری کا معاشرتی،

سیاسی و علمی ماحول اور لکھنے والے کی ذاتی کاوش و کاہش بھی ایک نمایاں پہلو اختیار کرتی گئی جسے پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ زبان و بیاں، اسالیب اور پیرائیہ اظہار کی تبدیلیوں، مختلف اصنافِ سخن کو اختیار کرنے کے بعد نعت گوئی کے زاویوں کو اگر دیکھا جائے تو عہد بہ عہد ایک حیرت انگیز ارتقا نظر آتا ہے۔ یہ موضوع اپنی جگہ خود ایک مکمل مقالے کا متقاضی ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''روحِ الہام'' از شاعر لکھنوی، مطبوعہ ۲۰۱۱ء جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی)

ڈاکٹر تحسین فراقی

تخلیقِ پاکستان کے بعد اُردو کی نعتیہ شاعری نے ایک نئی کروٹ لی ہے اور نعت گو شعرا کا ایک پورا کارواں وجود میں آچکا ہے۔ اس نعتیہ سرمایے میں ہیئت اور اصناف کا تنوع بھی اور عقیدت و محبت اور سپردگی و شیفتگی کے شب تاب گوہر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جدید نعت گوؤں نے بالخصوص نعت کو انسانی باطن کی ایک جیتی جاگتی تہذیب بنا دیا ہے۔ اب نعت، حضور ﷺ سے بیعت معنوی کی ایک علامت اور ہجرت سوئے دوست کا ایک زندہ استعارہ بن گئی ہے اور خارج میں پھیلی ہوئی کائنات اور اس کے متنوع مظاہر کے لیے روشن منشور۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''عکسِ خیال'' از اثر لدھیانوی، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

ڈاکٹر سیّد حامد حسین

نعتیہ شاعری کو کلیتًا رسمی شاعری کے تحت نہیں رکھا جاسکتا۔ اچھی نعتیہ شاعری گہری ارادت اور عقیدت کے تأثرات سے تحریک پاتی ہے اور اس قسم کے تأثرات بسا اوقات اس محسوساتی ڈسپلن اور جذباتی محویت کا نتیجہ ہوتے ہیں جسے اکثر صوفیانہ تجربے کا نام دیا جاتا ہے۔

(مضمون سے اقتباس۔ مشمولہ ''نقشِ قلم'' مرتبہ ڈاکٹر سلیمان اطہر مطبوعہ ۱۹۹۲ء ناشر تمل ناڈو، اُردو پبلی کیشنز، بھارت)

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

نعت میں فن کار کا جذبہ مساوی اور ارضی تقاضوں سے پرے ہوتا ہے اور عبودیت اور

محبت اپنے شدید تر اثرات کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ اس نوع کی شاعری کا لطیف تر ہونا بالکل منطقی بات ہے۔

(مضمون سے اقتباس۔ مشمولہ ''نقشِ قلم'' مرتبہ ڈاکٹر سلیمان اطہر مطبوعہ ۱۹۹۲ء ناشر تمل ناڈو، اُردو پبلی کیشنز، بھارت)

پروفیسر انور جمال

اگر ہم نعت گوئی کا فروغ چاہتے ہیں اور سیرت طیبہ کی قندیل کی روشنیاں عام کرنا چاہتے ہیں تو نعت میں ایسے مضامین کی حوصلہ افزائی کی جائے جن کا تعلق اسوۂ حسنہ سے ہے، جن کا واسطہ رحمتِ عالم کی انقلاب آفریں حیات سے ہے، جن کا رشتہ اخلاقِ نبوی ﷺ سے ہے، جن کا علاقہ عقیدت و محبت کے متوازن جذبوں سے ہے، جن مضامین سے انسانی ذات میں تحقیق کے سوتے پھوٹتے ہیں، جن سے دلوں میں مؤدّت اور احترام کے الاؤ سلگتے ہیں اور جن سے ایمان کی کلیاں مہکتی ہیں۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''لولاک لما'' از انور جمال، بحوالہ ''نعت میں کیسے کہوں'' از پروفیسر محمد اقبال جاوید، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

شاعر لکھنوی

موجودہ دور کی نعت نے ہیئت، رنگ، مواد اور طرزِ اظہار کے نئے نئے سانچوں اور مرحلوں سے گزر کر مستقل ادبی روایت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہیئت، رنگ، مواد اور طرزِ اظہار کے ان مختلف النوع تجربوں میں سب سے کامیاب تجربہ غزل کے لہجے میں نعت کہنے کا ہنر ہے جو آج کی دُنیا کے حساس اور باشعور صاحبانِ ذوق کے لیے بڑی کشش اور مقبولیت کا باعث ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کے غزل گو شعرا کی اکثریت غزل کے طرزِ اظہار کے تانوں بانوں سے اپنی نعت کا پیرہن تیار کرتی ہے۔ اس بات کو ذرا اور خوب صورت لہجے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آج کے دور کی نعت وہ کیمیا ہے جو غزل کے لہجے کی آنچ پر تیار کی جاتی ہے۔ اس طرح ایک خیالی اور فرضی محبوب کی جگہ ایک حقیقی جیتے جاگتے محبوب سے مخاطب اور اس کی بارگاہِ جمال میں آنکھوں اور دلوں کے نذرانے پیش کرنے کی سعادت شاعر کے حصے میں آتی ہے۔ یہ سعادت تمام سعادتوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔

نعت کی کیمیا کی تیاری کا عمل اتنا آسان نہیں کہ جو چاہے اس سے سونا تیار کر لے۔

اصل عمل میں احترام و عقیدت، احتیاط، اعتدال، توازن، تأمل، تفصیل، اجمال، اظہار واخفا اور وجدان وعرفان کے ایسے ایسے نازک، دشوار اور تلوار کی دھار پر چلنے والے مرحلے آتے ہیں جہاں زبان و بیاں کی سانس رک جاتی ہے اور ان مرحلوں سے گزرنے کا ہنر انھی کے حصے میں اتا ہے جو معرفتِ رسول ﷺ اور حُبِ رسول ﷺ کا ادراک رکھتے ہیں۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ ''منارۂ نور'' از حیرت الہ آبادی، مطبوعہ ۱۹۸۹ء، ناشر بزمِ عبرت، کراچی)

ریاض حسین چودھری

جدید اردو نعت میں ارضی صداقتوں کا ظہور اور زمینی حقائق کا شعور فکر ونظر کی اَن گنت گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کی نعت پر ایک نظر ڈالیں تو یہ احساس اطمینانِ قلب کا موجب بنتا ہے کہ اپنی تمام تر سیاسی، معاشی، تہذیبی، علمی اور مجلسی لغزشوں کے باوجود روحِ محمد بدن میں سرد نہیں ہوئی۔ روحانی رتجگوں کا موسم باطن میں نہیں ہمارے ظاہر کے تشخص کا بھی سب سے بلیغ استعارہ ہے۔ اگر مسلم اُمہ کا سیاسی، جغرافیائی اور معاشی پس منظر مسائل و مصائب کے گہرے پانیوں میں ڈوبا ہوا ہے اور جدید اردو نعت میں جبرِ مسلسل کی صورت پذیری کے گمبھیر مراحل کا مشاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے پھر بھی اُفقِ تخیل ابھی بجھا نہیں، عکس آئینہ خانے میں دھندلائے ضرور ہیں لیکن مٹے نہیں، عشقِ مصطفےٰ ﷺ کی روشنی ہر عکس کو پھر سے روشن کر دے گی۔ جدید اردو نعت میں بھی تلاشِ ذات کا مسئلہ فرد کی جملہ ذہنی الجھنوں کے موجود ہے، لیکن آج کا نعت گو اپنی اور اپنے عہد کی پہچان حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کے حوالے سے چاہتا ہے اور اس کی یہ آرزو بڑی حد تک کامرانیوں اور کامیابیوں سے ہم کنار بھی ہوئی ہے۔ قلم کا اعزازِ ثنا جدید اردو نعت کے سر کا بھی تاج ہے۔ ہوائے شہرِ خنک سے ہم کلامی کا شرف نئی نعت کے شاعر کی بھی سعادت ہے اور وہ اس سعادت پر نازاں ہے۔ جدید اردو نعت کے حوالے سے گلوبل ولیج کی تکمیل کے امکانات روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔ امنِ دائمی کا ماحول آج کی نعت کا ہدفِ عزیز ہے اور یہ امر طے شدہ ہے کہ جدید اردو نعت مسلم اُمہ کی ثقافتی اکائی کے تحفظ کی ضمانت بھی دیتی ہے۔ یقیناً اس صدی کے اختتام تک انسان کے اندر کے درندے کو پابندِ سلاسل کیا جاچکا ہوگا اور یہ دنیا بھر کے امن اور انصاف پسند شہریوں کی مسلسل صدائے احتجاج کے ذریعے ہوگا۔ جنگ کے بادل چھٹ چکے ہوں گے، حضور ﷺ کا دین جو امن اور سلامتی کا دین ہے، دنیا کی اکثریت اس کے دامنِ رحمت میں پناہ

تلاش کر چکی ہوگی، غزل سے لے کر ہائیکو تک اور نظم آزاد سے لے کر نثری نظم تک ہر طرف محامد و محاسنِ سرکار ﷺ کا پرچم لہرا رہا ہوگا، جدید اردو نعت، نئے آفاق کی تسخیر ساتھ صدی کے اختتام تک اُفقِ عالم پر دائمی امن کی بشارتیں تحریر کرنے کا کارنامہ سرانجام دے چکی ہوگی۔

کاوش بدری

سرورِ کائنات ﷺ کو ہندوستانی فضا میں رکھ کر دیکھنے کا عمل بہت مستحسن ہے، حضور کے اقدس پاک کو منظوم کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ عربی اور فارسی شاعری میں اس کے وافر نمونے ہیں۔ اردو اور دکنی زبانوں میں نعتیہ شاعری کا سرمایہ بہت ہے، مگر قدیم دکنی شاعری میں صنفِ نعت کا معیار موجودہ ترقی یافتہ اردو زبان سے بھی اس لیے بلند ہے کہ اس میں آفاقی لب و لہجہ کی کھپت ہے۔ لفظیات میں سوچنے سے زیادہ ماورائی، مابعد الطبیعیاتی اور لاشعوری سرچشموں سے نعتیہ شاعری زیادہ سراب ہوتی ہے۔ نعت گوئی گویا مراقباتی شاعری ہے۔

(مضمون سے اقتباس۔ مشمولہ ''نقشِ قلم'' مرتبہ ڈاکٹر سلیمان اطہر مطبوعہ ۱۹۹۲ء ناشر تمل ناڈو، اُردو پبلی کیشنز، بھارت)

ڈاکٹر مظفر شہ سیّدی

نعتیہ شاعری، عشقیہ و ذوقیہ شاعری ہے۔ یہ دلِ عاشقِ رسول سے مانند آہ نکلتی ہے اور مثل تیر دلوں میں گھر کر جاتی ہے اس راہ میں صرف اسی شاعر کو کامیابی نصیب ہوتی ہے جو اپنے کوچۂ عشق کی گرد بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ رتبہ اور مقام کم ہی کسی کو ملتا ہے۔

(مضمون سے اقتباس۔ مشمولہ ''نقشِ قلم'' مرتبہ ڈاکٹر سلیمان اطہر مطبوعہ ۱۹۹۲ء ناشر تمل ناڈو، اُردو پبلی کیشنز، بھارت)

اردو میں نعت گوئی کی روایت خاصی قدیم ہے۔ کلاسیکی شاعری کے عہد میں نعت کو بالکل ایک الگ صنفِ سخن کی حیثیت سے برتنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔ دوسری اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے اساتذہ بالعموم حمد کے ساتھ ساتھ نعت اور منقبت کے اشعار اپنے کلام کے ابتدائی حصے میں شامل کردیا کرتے تھے۔ مگر امتدادِ وقت کے ساتھ نعتِ رسول پاک کو ایک الگ صنفِ کلام کی حیثیت سے برتنے کا رجحان عام ہوا۔ اس لیے عرصے سے نعت گوئی بالکل اسی طرح سے شعری اصطلاح بن گئی ہے۔ جس طرح غزل گوئی، نظم گوئی یا قصیدہ گوئی۔ اس طرح اردو کے ممتاز کلاسیکی شعرا نے مثنوی اور قصیدے میں نعتیہ اشعار کو شامل کرکے الگ سے اس صنف پر طبع آزمائی نہ کرنے کی تلافی کرنے کی کوشش کی تھی۔ تاہم جب سے نعت گوئی کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے اس بحث کی گنجائش نکالی گئی کہ اس صنفِ سخن میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کی طرح استعارہ سازی اور تہ دار اسلوبِ بیاں کا انداز کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے؟ اس کا ایک بڑا سبب یہ رہا کہ اردو شعر و ادب کے پارکھوں کے درمیان یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ اردو میں نعتیہ شاعری کو فنی اور فکری دونوں اعتبار سے کیوں کر ایسا استحکام بخشا جائے کہ اس نوع کی شاعری اردو کی دیرپا اور اعلیٰ اقدار کی شعری روایت کی صورت اختیار کرسکے۔

ناچیز کو اس بات سے ہمیشہ دلچسپی رہی کہ نعت گوئی کے ایسے نمونے ضرور سامنے آئیں جن کو محض خانہ پُری یا نری عقیدت پر محمول نہ کیا جاسکے۔ اس لیے فنی اعتبار سے بلند مرتبت نعتیہ شاعری نے دلی طمانیت بخشی اور اس بات کا امکان نظر آیا کہ شاعر اس نوع کی کاوشوں کی بنیاد پر نعت کو بھی اردو شعر و ادب کی قدر و منزلت میں اضافے کا ایک اہم وسیلہ بنا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں رسالہ "نعت رنگ" کے واسطے سے جناب صبیح رحمانی نے عرصے سے مضامین کی اشاعت اور نعت گوئی کی معیار بندی سے متعلق تحریریں شایع کرنے کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ مزید برآں یہ کہ صبیح رحمانی کی تدوین کردہ اس کتاب میں نعت کی تعریف، تاریخ اور نعتیہ کلام سے متعلق رجحانات پر نمائندہ اور معیاری مضامین اشاعت پذیر ہو کر قارئین کی ضیافتِ طبع کے ساتھ نعتِ رسول پاک کی قدر و قیمت میں اضافہ کا سبب بنتے جارہے ہیں۔ ناچیز کو یقین ہے کہ اس نوع کے سنجیدہ علمی اور فکری مضامین نعت گوئی کے موضوع پر ایک نئی جہت کا آغاز ہیں۔ اس لیے شعری، علمی اور مذہبی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی بیش از بیش ہوگی۔ میں ان کلمات کے ساتھ صبیح رحمانی کو ان کی مساعیِ جمیلہ کے لیے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی

نعتِ سرورِ کائنات ہمارے شعرا اور شعر شناسوں میں ہمیشہ سے یکساں مقبول رہی ہے۔ اس میں مسلم، غیر مسلم کی قید نہیں۔ متعدد غیر مسلم شعرا نے پوری محویت، لگن اور لگاؤ کے ساتھ نعت کہی ہے۔ حضور رسولِ مقبول ﷺ کی شخصیت کی خوش بو اُردو تہذیب میں پوری طرح رچی بسی ہوئی ہے۔

نعت بطور صنفِ سخن پر ہمارے بزرگوں نے کلام نہیں کیا ہے، نہ اردو میں اور نہ فارسی میں۔ نعت کو ہمیشہ قصیدے کے ذیل میں رکھا گیا اور قصیدے ہی کے کم و بیش تمام لوازم و شرائط کی روشنی میں نعت کو پرکھنے اور پڑھنے کی رسم رہی، لیکن انیس ویں صدی کے آخر ہوتے ہوتے نعت بطور نظم بھی قائم ہونے لگی اور قصیدے کے انداز کے بجائے اس میں نئے زمانے کی نظم کے انداز نظر آنے لگے۔ ایسے شعرا جنھیں قصیدے سے کوئی دل چسپی نہ تھی، انھوں نے نظم کے انداز میں نعتیں کہیں، لیکن یہ بات پوری طرح متعین نہ ہو سکی کہ نعت اگر قصیدہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

ایک زمانہ ہوا جب محمد حسن عسکری نے محسن کاکوروی پر اپنا بے مثال مضمون لکھ کر نعت کی نئی تنقید کی داغ بیل ڈالی تھی، لیکن افسوس کہ ان کی اٹھائی ہوئی بنیاد پر کوئی عمارت قائم نہ ہو سکی۔ شاید اس منہاج سے نعت کا مطالعہ کچھ ایسا سہل بھی نہ تھا۔ عسکری کے تصورات کے برابر یا ان کی توسیع میں بات کہنے کے لیے جس غور و فکر اور تخلیقی اُپج کی ضرورت ہے وہ، ہم نقادوں میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ نعت پر تنقیدی غور و فکر کا رجحان جواب سامنے آ رہا ہے، وہ بڑی حد تک صبیح رحمانی اور ان کے رسالے ''نعت رنگ'' کا مرہونِ منّت ہے۔ گزشتہ کئی برس سے اُردو نعت گوئی میں رسمیاتی، روایتی انداز نمایاں رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے آج کل تقریباً ہر اُردو پرچے نے نعت کو ''فریضۂ مذہبی'' جان کر فروغ دینا شروع کیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نعت کو بھی قصیدے کی طرح ''مجبوری'' کے طور پر اختیار کیا جانے لگا ہے۔ دل کی تڑپ زیادہ نہیں ہے، دماغ کی کارفرمائی زیادہ ہے۔

صبیح رحمانی کی اپنی نعتیں اس غیر ادبی ''تکلف اور اہتمام'' سے خالی ہیں جس کی بنا پر ہماری نعتیں بے رس ہو گئی ہیں۔ پھر ان کے رسالے ''نعت رنگ'' میں بھی مسلسل نعت کے فنی اور داخلی معاملات پر بحث ہوتی رہتی ہے جس کی بنا پر نعت گوئی کے اصل خط و خال بھی سامنے آنے لگے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کو نعت کے میدان میں صبیح رحمانی کی مساعی کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں اردو نعت کی روایت، تاریخ اور تنقید پر عمدہ تحریریں یکجا ہیں۔ یہاں مسائل بھی ہیں اور ان پر اس انداز سے گفتگو کی گئی ہے کہ صنفِ نعت کے فنی اور فکری امکانات کے افق بھی نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب نعت کے ہر طالبِ علم، خصوصاً نعت پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والے کے لیے ناگزیر حوالہ تا دیر رہے گی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

اردو نعت کی شعری روایت

صبیح رحمانی

ISBN 969540115-5